نئے اُفق

مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیرہ
اقبال بھٹی
مدیر معاون
طاہر احمد قریشی
تزئین
نورالدین

جلد	41
شمارہ	05
جون	2017

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز
رکن چیمبر آف کامرس

NAEYUFAQ PUBLICATION
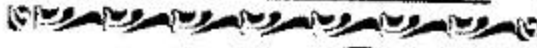
پاکستان (فی پرچہ)..........50 روپے
پاکستان (سالانہ)..........600 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

خط و کتابت کا پتہ "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 کے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل info@aanchal.com.pk

مشتاق احمد قریشی

کیا وزیر اعظم واقعی بچ گئے

پانامہ کیس کا عبوری فیصلہ صادر ہوا تو وزیر اعظم پاکستان کے لیے قومی اخبارات نے شہہ سرخیاں لگائی کہ وزیر اعظم بچ گئے ان کے مشیروں حواریوں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہم سرخرو ہو گئے مدع اور مدعی علیہ دونوں ہی کو اس عبوری فیصلے سے مسرت ہوئی مٹھائیاں کھائی کھلائی گئیں مبارک سلامت کا غلغلہ بلند ہوا حیرانگی کی بات ہے کہ بڑے بڑے اہل سیاست، اہل دانش، اہل قانون، وکلا سب کے سب اس فیصلہ کو اپنی اپنی عینک سے دیکھ رہے ہیں حکمران جماعت والے اپنے مخالفین کو طعنے دے رہے ہیں جھوٹے الزامات لگانے والوں کو شرمندہ ہونے اور منہ کالا ہونے کی بات کر رہے ہیں جتنے منہ اتنی باتیں کی جا رہی ہیں جناب آصف علی زرداری کے مطابق عدلیہ نے عوام سے مذاق کیا ہے انہوں نے اس عبوری فیصلے کو مسترد کر دیا ہے اور حکمران وقت کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا ہے انہوں نے میاں صاحب سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کر دیا ہے ان کا کہنا ہے کہ دو سینئر جج صاحبان جسٹس آصف سعید کھوسہ اور جناب جسٹس گلزار احمد نے اپنے اختلافی نوٹ میں وزیر اعظم کو نا اہل قرار دے دیا ہے ان کے نوٹ کے مطابق وزیر اعظم امین اور صادق نہیں رہے اس لیے الیکشن کمیشن ان کی نا اہلی کا نوٹیفکیشن جاری کرے جبکہ تین جج صاحبان نے اپنے فیصلے میں وزیر اعظم کی اہلیت یا نا اہلیت کا فیصلہ کرنے کے لیے مزید تحقیق کے لیے جے آئی ٹی بنا دی ہے جو براہ راست عدالت عظمیٰ کو جوابدہ ہوگی محترم جج صاحبان کے مطابق جے آئی ٹی کی رپورٹ کی روشنی میں فوجداری کارروائی کے احکامات دیے جا سکیں گے۔

حیرانگی کی بات یہ ہے کہ وزیر اعظم کے تمام مشیر دوست احباب جو خوشیاں منا رہے ہیں کہ وزیر اعظم کا عہدہ بچ گیا وہ اس عبوری فیصلے سے صرف اس لیے مطمئن اور خوش نظر آ رہے ہیں ان کے خیال میں ہوگا کہ فیصلہ آنے پر وزیر اعظم فارغ ہو جائیں گے اسی لیے وہ سب کے سب یک زباں ہو کر بار بار یہی کہتے رہے کہ پانامہ لیکس سے وزیر اعظم کا کوئی تعلق نہیں ان کا نام پانامہ لیکس میں نہیں آیا اس نشے میں میاں صاحب اور ان کے حواری وکلا پے در پے غلطیاں کرتے رہے اس عبوری فیصلے نے وزیر اعظم پاکستان کو گلے گلے پانامہ کی اس دلدل میں دھنسا دیا ہے عدالت عظمیٰ نے جے آئی ٹی کے لیے جو سوالات دیے ہیں وہ سب کے سب وزیر اعظم کے گرد حصار بنا رہے ہیں اختلافی نوٹ میں بھی وزیر اعظم کا صادق وامین نہ ہونا بتایا گیا ہے اس پر کسی کا کوئی اختلافی نوٹ بھی نہیں ہے ہاں اس کے بارے میں ہی تحقیق و تفتیش ہونا ہے کہ وزیر اعظم نے یا ان کے وکلا نے جس قدر حقائق کو چھپایا اور عدالت کو حقائق بتانے سے گریز کیا ہے اس کے پس پردہ کیا حقائق ہیں پہلے جب مقدمہ چلا تو اس وقت سارے الزامات ان کے بچوں کی طرف منتقل ہو رہے تھے خود وزیر اعظم بھی بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ بچے خود مختار اور خود کفیل ہیں ان کے کاروبار سے وزیر اعظم کا کوئی کاروباری تعلق نہیں ہے لیکن جیسے جیسے پیروی آگے بڑھتی گئی معاملات بننے کی جگہ بگڑتے گئے اور مقدمہ کا رخ وزیر اعظم کی طرف مڑتا چلا گیا میاں صاحب جس اہم ترین منصب پر فائز ہیں اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کرتے اور تمام معاملات کو ٹھیک ٹھیک بتاتے لیکن ان کے تاجر ذہن نے اور ان کے مشیروں نے انہیں حق و سچ کی راہ سے ہٹا کر غلط بیانی کرنے پر اکسایا جو ان کے گلے پڑ رہا ہے اگر میاں صاحب بغیر ہوشیاری دکھائے سچ سچ سب کچھ ظاہر کر دیتے تو ان کی عزت وقعت میں اضافہ ہوتا اور ان پر یوں بد دیانتی بے ایمانی کی سیاہی نہ لگتی اب میاں صاحب چاہے جو بھی کر لیں ان پر جو اس عبوری فیصلے سے کالک لگ چکی ہے وہ کم یا ختم نہیں ہونے والی اس میں مزید اضافہ ہی ہوگا کیونکہ عدالت عظمیٰ کے اس بینچ کے باقی تین

جج صاحبان جناب جسٹس عظمت سعید جناب جسٹس اعجاز افضل صاحب جناب جسٹس اعجاز الاحسن صاحب نے جو اختلاف جناب جسٹس آصف سعید کھوسہ اور جناب جسٹس گلزار احمد کے نوٹ سے کیا وہ صرف اتنا ہے کہ وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف کے وکلا نے جو آدھی ادھوری شہادتیں پیش کی ہیں وہ قطعی طور پر عدلیہ کو مطمئن نہیں کر سکیں ان سے کہیں بھی پوری طرح وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف کی بریت ثابت نہیں ہو رہی اس لیے ہی ان تین جسٹس صاحبان نے جے آئی ٹی بنا کر تحقیق کا حکم دیا ہے تاکہ ملزم کو مجرم ثابت کرنے سے قبل تمام حقائق جو پردے میں ہیں سامنے آسکیں اور فیصلہ قطعی اور حتمی اور مشترکہ صادر کیا جا سکے ویسے تو یہ عبوری فیصلہ بھی کہیں سے ایسا اختلافی فیصلہ نہیں ہے جس سے کہیں بھی وزیراعظم یا ان کے خاندان کے کسی فرد کو کلین چٹ مل رہی ہو ان تینوں جسٹس صاحبان نے اپنے سینئر سے کوئی بڑا اور نیا اختلاف نہیں کیا ہاں حتمی فیصلے کو مزید مدلل اور شفاف اور تاریخی بنانے کے لیے تحقیق مزید کا حکم صادر کیا ہے ان صاحبان عدل نے کہیں بھی جسٹس آصف سعید کھوسہ اور جسٹس گلزار احمد کے فیصلے کو نہ رد کیا نہ اس سے اختلاف ہی کیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان محترم جسٹس صاحبان کے فیصلے کو مزید تقویت دینے اور مضبوط دلیل کے ساتھ بھرپور اشتراک کے ساتھ نافذ کرنے اور اسے واقعی ایسا تاریخی فیصلہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ برسوں یاد رکھا جائے ساٹھ دن آگے بڑھا دیا ہے تاکہ اس عرصے میں متعلقہ تیرہ سوالات کی تحقیق و تفتیش ہو جائے اور ایک جامع اور مربوط فیصلہ صادر کیا جا سکے میاں نواز شریف کے صادق و امین ہونے پر تو نشان لگا دیا گیا ہے اس پر کوئی اختلاف بھی نہیں اس کا مقصد یہ ہوا کہ بنچ کے دیگر جسٹس صاحبان نے دراصل اس کی حمایت کی ہے کہ وزیراعظم صادق و امین نہیں رہے، جس کا اظہار وہ جے آئی ٹی کی رپورٹ کے بعد واضح طور پر کر سکیں گے۔ میاں صاحب کے پاس ابھی موقع ہے کہ وہ مستعفی ہو کر تمام اسمبلیاں تحلیل کر کے عبوری حکومت بنا کر نوے دن یا ساٹھ دنوں میں نئے الیکشن کا اعلان کر دیں تو ان کی عزت بچ سکتی ہے اس طرح ان کے تمام مخالفین پر وقت پڑ جائے گا۔ تمام اہل سیاست اور خصوصاً جناب آصف علی زرداری صاحب نے جے آئی ٹی پر اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے ان کے خیال کے مطابق جے آئی ٹی کے ارکان تقریباً 19 گریڈ کے افسر ہوں گے جو اپنے اوپر گریڈ کے افسران کے ماتحت ہوتے ہیں وہ اپنے عالی افسر یا وزیر صاحب کے دباؤ میں رہیں گے تو وہ درست اور حقیقی تحقیق و تفتیش کیسے کر سکیں گے ان کے خیال کے مطابق اب تک جتنی بھی جے آئی ٹی بنی ہیں ان کی رپورٹ کبھی منظر عام پر نہیں آسکیں اس بار بھی ایسا ہی ہوگا اور شفاف رپورٹ نہیں بن سکے گی، حالانکہ عدالت عظمیٰ نے ان ہی خدشات کے پیش نظر حکم دیا ہے کہ ہر پندرہ دن میں عدلیہ کو رپورٹ کی جائے اور جے آئی ٹی کی رپورٹ حکومت کو نہیں عدالت عظمیٰ کو پیش کی جائے ہے اسی کا حکم بھی عدالت عظمیٰ نے ہی دیا ہے اور اس کی ترتیب و تنظیم کا طریقہ بھی عدالت عظمیٰ نے ہی بتا دیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ وزیراعظم کے بچ جانے کے خواب دیکھنے والوں کو ساٹھ یا کچھ اور زیادہ دنوں بعد کیسی اور کیا تعبیر ملتی ہے۔ کیا واقعی وزیراعظم بچ جائیں گے اللہ تعالیٰ وطن عزیز کی حفاظت فرمائے اور عدلیہ کو عظمت عطا کرے اور حق سچ کا بول بالا کرے آمین

گفتگو

اقبال بھٹی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی شخص کی حرام مال کی کمائی میں سے نہ صدقہ قبول کیا جاتا ہے نہ اس کے خرچ میں برکت دی جاتی ہے اور جو شخص حرام مال چھوڑ مرتا ہے وہ مال اس کے جہنم کا زاد راہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ برائی کو برائی کے ذریعہ نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو بھلائی کے ذریعہ مٹاتا ہے کیوں کہ خبیث خبیث کو نہیں مٹا سکتا۔

(بخاری۔ مسلم۔ احمد)

عزیزان محترم...... سلامت باشد!

جون کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے امید ہے آپ کے ذوق مطالعہ پر پورا اترے گا' رمضان المبارک کی آمد آمد ہے' بازار اور مارکیٹوں سے ضروری استعمال کی اشیاء غائب ہو رہی ہیں یا پھر اس کے داموں میں اضافہ ہو رہا ہے، ہمارے تاجر اور دکاندار حضرات رمضان المبارک کے لیے ذخیرہ کررہے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک رمضان میں ذخیرہ اندوزی اور ہر شے پر چار گناہ منافع کمانا جائز ہے۔ ماہ صیام کو سیزن کا نام دے کر عام مسلمانوں کو لوٹنا جائز سمجھتے ہیں ان کے نزدیک صارفین کو فائدہ پہنچانا صرف عیسائیوں کا کام ہے جو کرسمس پر سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک کی قیمتوں میں خصوصی ڈسکاؤنٹ دیتے ہیں اور اسے اپنے ایمان کا حصہ قرار دیتے ہیں جبکہ ہم...... ان للہ وانا علیہ راجعون اللہ ہمارے حال پر رحم کرے ہماری تو کوئی بھی کل سیدھی نہیں۔

ہمارے کئی پیارے قارئین نے پوچھا کہ ہم نے خوب صورت خط پر انعام کا سلسلہ کیوں ختم کردیا ہے تو عرض ہے کہ ہم یہ سلسلہ بڑی دیانت داری اور غیر جانبداری سے چلا رہے تھے مگر بعض قارئین نے جنہیں کسی وجہ سے انعامی رقم نہیں مل سکی' ہماری نیت پر شک وشبہ کا اظہار کیا اور الزام تراشی تک پر اتر آئے۔ وضاحتوں کے باوجود جب ان کی تشفی نہ ہوئی تو ہم نے فیصلہ کیا کہ اب یہ سلسلہ ہی بند کردیا جائے تو بہتر ہے' لہٰذا یہ ختم کردیا گیا۔

اس ماہ معروف مصنف تفسیر عباس بابر کا ناول سرفروش شامل اشاعت ہے جو تین اقساط پر مشتمل ہے۔ تفسیر عباس کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان شاء اللہ وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے جبکہ جولائی میں ایک نئی قسط وار کہانی مرشد شروع کی جارہی ہے جسے ساحر جمیل سید تحریر کررہے ہیں گو ساحر جمیل کم کم ہی لکھتے ہیں مگر جب بھی لکھتے ہیں کمال لکھتے ہیں ان کا انداز تحریر سب سے جدا اور منفرد ہوتا ہے یقیناً آپ مرشد کو مدتوں یاد رکھیں گے۔

مجید احمد جائی...... ملتان شریف مزاج گرامی! اُمید واثق ہے خیر خیریت سے ہوں گے۔ اپنے پیدا کرنے والے خالق ومالک سے یہی دُعا ہے کہ جب تک زندگی ہے خوش حال رہیں۔ صحت وتندرستی کے ساتھ مسکراتے رہیں، ایمان کی سلامتی اور امن وسکون بھری زندگی بسر ہو، خاتمہ ایمان پر، کلمہ طیبہ نصیب اور دیدار مصطفی ﷺ نصیب ہو آمین ثم آمین! اللہ تعالیٰ دین و دُنیا اور آخرت کی فکر نصیب فرمائے بے شک ہم نے لوٹ کر جانا ہے۔ دین اسلام کا بول بالا

رہے، اہل ایمان، اہل مسلم جہاں بھی رہیں خوش حال، اور امن کی زندگی بسر کریں۔ دین اسلام امن کا درس دیتا ہے اور ملک پاکستان کی خیر اور اس کے دُشمن نیست و نابود ہوں آمین ثم آمین! ماہ مئی 2017 کا نئے اُفق میرے ہاتھوں میں پھولوں کی طرح بڑا خوشبو دے رہا ہے۔ گرمی زوروں پر ہے اور لوگوں کے مزاجوں میں بھی گرمی عود کر آئی ہے لیکن ہم ملتانی ہیں ہماری دھرتی گرم ضرور ہے لیکن دل کے نرم اور مہمان نواز ہیں۔ میں نہیں کہتا تاریخ کہتی ہے جو بھی ملتان آیا ملتان کا ہو کر رہ گیا۔ ملتانی پیار کرنے والے، مٹھاس میں مالا مال ہیں یہ الگ بات ہے کہ پہچانے والے اپنے اپنے ظرف سے پہچانتے ہیں۔ ماہ اپریل رخت سفر باندھ رہا ہے لیکن جاتے جاتے ان گنت زخم سینے پر لگا کر جا رہا ہے۔ ادب کی دُنیا کے کئی پھول جو معاشرے کو اپنی خوشبو سے معطر کر رہے تھے اُن کو لے کر جا رہا ہے۔ ادب کی دُنیا کو ویران کرتا چلا جا رہا ہے۔ یکم اپریل کو "رفعت خاں آپی" اللہ تعالیٰ کو پیاری ہوگئی جب خبر ملی تو ہم یہی کہتے رہ گئے کہ لوگوں نے یکم اپریل یعنی اپریل فول منایا ہے لیکن حقیقت کو کون ٹال سکتا ہے۔ آپ نے جسمانی معذوری کو کبھی اہمیت نہیں دی اور ہمت اور جذبے سے "قلم کی روشنی" تن تنہا ہر ماہ نکال رہی تھیں۔ اسی طرح آواز دوست کے خالق، میرے ملتان کے نامور قلم کار "مختار مسعود" جن کی بیگم کے نام پر ملتان کے اُردو بازار کو شاہین مارکیٹ کا نام دیا گیا، انتقال کر گئے۔ دل غمگین ہے تو قلم رو رہا ہے۔ پھر خبر آئی کہ کئی کہانیوں، کتابوں کے مصنف، "ایم اے راحت" وفات پا گئے۔ آہ۔۔۔۔ کتنے کرب سے گزر رہا ہوں جیسے کسی نے میرے دل پر ہتھوڑے چلا دیئے ہوں۔ فضا سوگوار ہے۔ آپ کمال کی شخصیت تھے، کسی کو نہیں معلوم ہوگا کہ آپ ایک وقت میں تین تین کہانیوں کی ریکارڈنگ کرواتے تھے، کہانی کے لئے کبھی کوئی نوٹس نہیں بنایا تھا۔ ذہین شخص تھے۔ ان کی بات یاد آ رہی ہے کہتے تھے "میں اپنا لکھا اپنے ساتھ تھوڑا لے کر جاؤں گا، بندے کا اخلاق اچھا ہونا چاہیے" اسی طرح ناگہانی موت "اسلام آباد میں قومی کتاب میلہ کے اختتامی پروگرام میں، مشہور شاعرہ "فرزانہ ناز" اسٹیج سے گر کر وفات پا گئیں۔ بارہ فٹ اونچے اسٹیج سے گر کر ریڑھ کی ہڈی اور سر کی چوٹ کی وجہ سے کوما میں چلی گئیں اور جانبر نہ ہوسکیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس ہمیشہ کے لئے چلی گئیں۔ ان کی ناگہانی موت ان گنت سوال چھوڑ گئی۔ بڑے بڑے ادیب یکے بعد دیگرے صفحۂ ہستی سے چلے جا رہے ہیں۔ ادب کی نگری ویران ہوتی جاتی ہے۔ ہم ان جانے والوں کا خلاء تو پورا نہیں کر سکتے مگر ہم نئے لکھنے والے ضرور پیدا کر سکتے ہیں۔ نئے آنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے منفی رویوں کی وجہ سے یہ ادب کی دُنیا اُجڑ جائے۔ ماہ مئی کا ٹائٹل کسی جنگل کی شکاری لڑکی کی وحشت سے مزین تھا۔ شکاری لڑکی اپنے مشن کے لئے بالکل تیار کھڑی تھی۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب "ناموس رسالت ﷺ" پہ لکھ رہے تھے اور خوب لکھ رہے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے گریبان پکڑنے کی بجائے یکجا ہو کر ناموس رسالت ﷺ پر قربان ہونے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ ہر مومن مسلمان پر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا احترام و تعظیم فرض ہے۔۔۔ میری جان آپ ﷺ پر قربان۔۔۔ میرے ماں باپ قربان۔ گفتگو میں اقبال بھٹی صاحب سچ ہی کہہ رہے ہیں۔ غلطی ٹیم کے کسی رکن کی ہوتی ہے اور قصوروار ایڈیٹر کو گردانا جاتا ہے، اس بات کا عملی مظاہرہ روز ہوتا ہے۔ ریاض حسین قمر صاحب! اللہ تعالیٰ بھابھی کی مغفرت فرمائے اور آپ کو اور تمام لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ ہمیں پڑھ کر دلی دُکھ ہوا، بے شک جانے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جا سکتا مگر اصول زندگی ضرور بدل جاتے ہیں۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں۔ ہم مغفرت کے لئے دُعا ضرور کر سکتے ہیں۔ گفتگو کی محفل میں ہر ساتھی تبصرہ نگار نے اپنے اپنے عقل و فہم کے مطابق خوبصورت لکھا، تمام کے لئے سلامتی کی دُعائیں۔ اقراء "القدوس" پڑھ کر دل کو منور کیا۔ اس بار پھر انٹرویو نہیں تھا، کیا یہ سلسلہ مستقل نہیں چل سکتا؟ کہانیوں میں محبت کا پہلا قرینہ، امین صدرالدین بھایانی واقعی تحفہ خاص لے کر آئے تھے۔ کہانی میں کہیں کہیں تاریخی حوالے دلچسپ تھے۔ کتنا خوبصورت جملہ ہے "محبت میں انتخاب نہیں ہوتا" اسی طرح کہانی کا نچوڑ

جملہ "ادب پڑھ کر محبت کرنا سیکھ پایا اور نہ ہی محبت کر کے ادب کرنا" دھوکا، میں شازیہ نے غلطی تو بہت بڑی کر لی تھی مگر والدین ہی ہیں جو اولاد کی ہر غلطی کو معاف کر کے سینے سے لگا لیتے ہیں۔ پُراسرار پیکٹ "ریاض بٹ" صاحب اس بار آپ نے کمال ہی کر دیا۔ کیا شاندار تحریر لکھی، آپ بوڑھے ہو رہے ہیں اور آپ کا قلم جوان ہوتا جا رہا ہے۔ پانچ روپے "مظہر سلیم نے معاشرے کی حقیقت عیاں کی ہے۔ "خاموشی بُرے خیالات کی ماں ہے" کمال جملہ ہے، ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ "خاموشی عین عبادت ہے" ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں اور اسی طرح ہر بات کے کئی پہلو ہوا کرتے ہیں، ویری گڈ زبردست تحریر لکھی۔ دل کی عدالت ناصر حسین نے سمرن کا کردار خوبصورت لکھا۔ سمرن نے آخری وقت میں اچھا فیصلہ کیا۔ ہر لڑکی کو ایسا ہونا چاہیے اور میں چاہوں گا کہ لڑکوں کو بھی حدیں کراس نہیں کرنی چاہیے، پانی کا بل، موجودہ حالات کے ذمہ دار لوگوں کے منہ پر طمانچہ ہے۔ ہم ایسے ہی بہت سے ٹیکس دے رہے ہیں جن کی ہمیں خبر تک نہیں۔۔۔ غیرت، صرف کہانی ہی نہیں ایک اچھا سبق بھی ہے، روایات کو زندہ رہنا چاہیے اور یہ موجودہ وقت کی اہم ضرورت بھی ہے۔ مستقل سلسلے زبردست رہے۔

صائمہ نور...... ملتان۔ آداب! اُمید کرتی ہوں خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام ٹیم، لکھاریوں، قارئین اور اہل ایمان کو اپنی حفظ و ایمان میں رکھے۔ خوش رہیں اور خوشیوں کا سبب بنیں کیونکہ لکھاری حساس ہوتے ہیں اور لکھاری ہی معاشرے کو درست سمت گامزن کر سکتے ہیں۔ ماہ مئی کا نئے اُفق جلد مل گیا، ابھی ہم نے جھوٹ موٹ کا یوم مئی بھی نہیں منایا تھا۔ جن کے لئے یوم مئی منایا جاتا ہے اُن کو خبر تک نہیں ہوتی لیکن اب تو اپریل ہی قہر برسا گیا ہے۔ سیاسی گفتگو نہیں کروں گی اور نہ ہی مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی ہے۔ ادب کی دُنیا سوگوار ہے۔ نامور ادیب دُنیا سے پردہ کرتے جا رہے ہیں۔ ایم۔ اے راحت صاحب جن کی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتی تھی، گزر گئے، مختار مسعود جیسے قلم کار نہ رہے، فرزانہ ناز، رفعت خان گزر گئیں لیکن ان کے آخری دنوں کی طرف دیکھا جائے تو ان کی آنکھیں اپنے ہم منصبوں کے انتظار میں رہیں۔ کم از کم قلم کار قبیلے کے لوگ تو ان تک پہنچتے۔ آہ۔۔۔ ہم کس سمت چل رہے ہیں، زندہ لوگوں کی خبر تک نہیں لیتے اور ان کے گزرتے ایسے متحرک ہو جاتے ہیں جیسے سب سے متاثر ہی ہم ہوئے ہیں۔ خدارا ایک دوسرے کی خبر گیری کریں، رابطوں میں رہیں۔ ایک دوسرے کے دُکھ سکھ کے ساتھی بنیں۔ جو ہم دوسروں کو سکھاتے ہیں اُس پر خود بھی عمل کریں۔۔۔ ماہ مئی کا نئے اُفق عجیب و غریب ٹائٹل کے ساتھ ملا، دستک میں انکل مشتاق احمد قریشی "ناموس رسالت ﷺ" پر عمدہ لکھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں پکا سچا مسلمان بنائے اور اللہ تعالیٰ پیارے آقا حضرت محمد ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے اور اُن کے احترام و تعظیم کی توفیق دے اور توہین کے مرتکبین کی سرکوبی کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین! گفتگو کی نگری میں پہنچی تو یہ جان کر دلی افسوس ہوا کہ محترم ریاض حسین قمر صاحب کی اہلیہ انتقال کر گئیں ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کی بخشش فرمائے۔ عبدالجبار رومی، شکریہ، ریاض بٹ شکریہ، مجید احمد جائی، عمر فاروق ارشد، عبدالغفار عابد بھابھی کیسی ہیں؟ محمد رفاقت، علی اصغر انصاری، حسین خواجہ سبھی کے خطوط اچھے رہے۔ اقراء، اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا کرے آمین کہانیوں میں سب سے پہلے "پُراسرار پیکٹ" پڑھی، زلفی، کی پُراسرار موت سے شروع ہو کر تیمور کی گرفتاری تک اور برکتے کے بیان تک پُراسراریت قائم رہی، میں کہوں گی یہ سب سے اچھی تحریر تھی۔ اب آپ اپنی کہانیوں کا مجموعہ شائع کروا لیں۔ واپسی محمد سلیم اختر زبردست رہی، پانچ روپے، حقیقی کہانی تھی، اب ہر پڑھا لکھا شخص بھیک مانگنے پر مجبور ہے۔ سماج گزیدہ، خوب رہی، درندے، غیرت، کفن پوش، ڈائنامیٹ عمدہ رہیں۔ پانی کا بل، اس طرح کے ہزاروں بل ہم ادا کرتے ہیں اور پھر سرکاری دفاتر میں جو خجل خواری ہوتی ہے وہ کون نہیں جانتا۔ دل کی عدالت میں سمرن نے اچھا فیصلہ کیا، پریت کی ریت ہی نرالی ہوتی ہے۔ آپ بیتی کے انداز میں لکھی گئی عمدہ تحریر۔ دھوکا شازیہ کے ساتھ بُرا ہوا، اور سجاد بھی

اپنے انجام تک پہنچا۔ محبت کا پہلا قرینہ، بہت پسند آئی، ادب محبت کرنا نہ سکھائے اور جو محبت ادب کرنا نہ سکھائے۔۔ نہ وہ ادب ہے۔۔۔ اور نہ ہی محبت۔۔۔ عمدہ جملے۔ فن پارے کی تحریریں خوب رہیں اور ذوق آگہی، خوش بوئے سخن، ہمیشہ کی طرح اچھے رہے۔

شبیہہ مظہر رانجھا...... بھلوال سٹی آداب میری سچی کہانی بعنوان، کفن پوش، شائع کی بہت شکریہ اور پڑھنے والے ساتھیوں نے بھی پسند کی ان کا بھی بہت شکریہ۔ اس ماہ ایک معیاری پرچہ پڑھنے کو ملا، ریاض بٹ، عشنا کوثر، مہتاب خان اور زرین قمر مستقل اچھے جا رہے ہیں جبکہ محمد رفاقت کی سمجھ نہیں آئی کیا پیغام دینا چاہ رہے ہیں، کفن پوش کا ٹائٹل بھی سمجھ سے باہر ہے۔ موضوع کے مطابق ہوتا تو ضرور سمجھ آتا۔ باقی تبصرہ ساتھیوں کے حصے رہا، رزاق شاہد کو ہلر کی سٹوری کا آغاز اچھا تھا سٹوری کا مرکزی خیال بھی جاندار رہا لیکن ان صاحب کی گرفت کہانی پہ کمزور رہی اور ان کی کہانی کا ہیرو تو اس سے بھی زیادہ کمزور۔ خلیل جبار مناسب، باقی لوگ بھی ٹھیک ہیں، فن پارے والی تحاریر میں سخاوت حسین، فرحین طارق، اچھے رہے۔ مستقل سلسلے بھی اچھے ہیں۔ باقی تفصیل انشاءاللہ پھر سہی۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم ماہ مئی 2017ء کا شمارہ بلکہ اعزازی پرچہ اس بار جلدی یعنی چوبیس اپریل کو ہی بذریعہ ڈاک مل گیا بہت شکریہ، سرورق کا تذکرہ اس بار گول کر کے آگے بڑھتے ہیں مشتاق احمد قریشی صاحب اس بار ناموس رسالت ﷺ کے متعلق بتا رہے تھے سوشل میڈیا پر طرح طرح کے بیانات سے ہمارے یعنی اہل ایمان کے جذبات کو مجروح کیا جا رہا ہے اس پر اہل اختیار کو توجہ دینی چاہیے اور ایسے چینل پر قدغن لگانی چاہیے اس بار محفل میں قدم رکھتے ہی صدمے کا ایک شدید جھٹکا لگا ہمارے محترم اور پیارے بھائی ریاض حسین قمر کی اہلیہ کی وفات کا پڑھ کر یقین جانیں اتنا دکھ ہوا جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے ریاض حسین قمر بھائی زندگی کا ساتھی جب ساتھ چھوڑ کر جاتا ہے تو واقعی بہت دکھ اور رنج ہوتا ہے لیکن بھائی انسان اس معاملے میں بالکل بے بس و لاچار ہے موت برحق ہے ہر ذی روح کو اس کا مزہ چکھنا ہے آپ کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا ہے مگر بھائی ہمت سے کام لیں اسے رضائے الٰہی سمجھ کر قبول کریں اپنے بچوں کا خیال کریں اگر آپ ہی ہمت ہار بیٹھے تو ان کو کون تسلی دے گا خدا بزرگ و برتر آپ کو یہ غم برداشت کرنے کی سکت عطا فرمائے صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین ثم آمین۔ سب نئے افق کے کہنے والے آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں عبدالجبار رومی انصاری آپ کا خط اور قطعہ حسب معمول بہت خوب صورت ہے میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ مجید احمد جائی بھائی آپ کا خط اور تبصرہ لاجواب ہے آپ نے مزدوروں کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ قابل غور ہے یہاں واقعی مزدور کا استحصال ہو رہا ہے اور ہم لوگ یوم مئی سو کر گزارتے ہیں بہت کم لوگ اس دن کو مناتے ہیں اور اپنی جان کی قربانی دینے والے مزدوروں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں میری کہانی اور خط پسند کرنے کا شکریہ صائمہ نور بہن بھائی کی طرف سے پرخلوص سلام قبول کرو خدا تمہیں خوش رکھے، آمین۔ میری کہانی اور خط حسب معمول پسند کرنے کا بہت شکریہ عمر فاروق ارشد بھائی آپ کا تبصرہ بھی خوب ہے آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں برملا کہہ جاتے ہیں یہی آپ کی خوبی ہے عبدالغفار عابد میرے بھائی کیسے ہو آپ کا تبصرہ بھی قابل تعریف ہے آپ کا فون نمبر میں نے نوٹ کر لیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ خط آنے سے پہلے میں آپ کو کئی بار کال کر لوں خاطر جمع رکھیں میری تفتیشی کہانی جرم کہانی پسندیدگی کی سند دینا آپ کے ادبی اعلیٰ ذوق کی نشانی ہے آپ کا شعر بھی اچھا ہے محمد رفاقت بھائی اس بار آپ کا خط قدرے بہتر ہے یعنی طویل ہے آپ اچھا تبصرہ لکھنے والوں میں شامل ہو چکے ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ایم حسن نظامی آپ کا خط بھی خوب صورت اور مدلل ہے آپ نے ہمیں نئے افق کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کا کریڈٹ دیا ہے۔ بھائی ہم تو صرف کوشش کر رہے ہیں بہرحال بہت شکریہ مہربانی اور نوازش علی اصغر

انصاری بھائی آپ نے وقت نکال کر محفل میں حاضری دی بہت مہربانی آپ نے مجھے نمبرون کہا بھائی یہ سب آپ لوگوں کی محبتیں ہیں نوازشیں ہیں ورنہ میں کیا میری اوقات کیا؟ بس آپ لوگوں کے لیے تفریحی اور سبق آموز کہانیاں تحریر کرنے کی سعی کرتا ہوں اور یہ میں اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک ہاتھوں میں لکھنے کی سکت باقی ہے حسین خواجا آپ نے کہا ہے کہ مجھے آپ کی اگلی کہانی کا انتظار ہے اگلی کہانی تو موجود ہے پراسرار پیکٹ کے نام سے لیکن آپ نے پچھلی کہانی جرم کہانی پر کوئی رائے نہیں دی بہرحال خوش رہیں اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف محبت کا پہلا قرینہ امین صدرالدین بھایانی کی واقعی محبت کرنے والوں کے لیے ایک تحفہ خاص ہے ایک سو سولہ چاند کی راتیں بھی بڑی خوب صورتی اور اچھے انداز میں آگے بڑھ رہی ہے مہتاب خان کی درندے پڑھ کر احساس ہوا کہ اس دنیا میں اشتیاق جیسے مسیحا کا روپ دھار کر انسانی اعضا کی اسمگلنگ کا مذموم دھندہ کرنے والے بھی ہیں جو انسانیت کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں انہیں خونی درندے کہنا زیادہ مناسب ہوگا بہرحال ایسے لوگوں کا انجام دیکھ کر ایسے درندوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے ارے اس بار ایک خوشگوار حیرت کا دھچکہ لگا محمد رفاقت صاحب کی کہانی سماج گزیدہ پڑھ کر ارے آپ تو چھپے رستم نکلے ویل ڈن اب تو آپ کو ایڈیٹر صاحب سے کوئی شکایت نہیں ہوگی آپ کی مزید کہانیوں کا انتظار رہے گا خلیل جبار کی دھوکا، رزاق شاہد کوہلر کی پریت کی ریت بھی پسند آئیں باقی کہانیاں ابھی پڑھ نہیں سکا ہوں اس لیے کہانیوں پر تبصرہ یہاں تک ہی باقی سلسلوں کے متعلق بات ہو جائے کترنیں پرچے کی شان بڑھا رہی ہیں جن میں محمود آغاز، حسن اختر، زین الدین شانی کا انتخاب لاجواب ہے ذوق آگہی کا سارا انتخاب تعریف کے قابل ہے اب اجازت یار زندہ صحبت باقی۔

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ امید کرتا ہوں کہ مزاج بخیر ہوں گے مئی کا نئے افق موسلا دھار بارش کے دوران موصول ہوا اللہ نے خاص رحمت کی ہے اور گرمی کا زور بڑی حد تک ٹوٹ گیا ہے آگے بھی اللہ جی اپنا خاص کرم جاری رکھیں گے ان شاء اللہ دستک میں بڑے قریشی صاحب نے بڑی ہی حساس گفتگو فرمائی حیرانی والی بات ہے کہ حکومت پاکستان اس نازک معاملے پر کوئی ٹھوس قدم اٹھانے کی بجائے اگر مگر میں الجھی ہوئی ہے اگر کسی عدالت یا حکومتی توہین کا معاملہ ہوتا تو پھر سب کچھ بہت جلدی سے طے ہو جاتا تھا یہاں معاملہ ناموس رسالت ہے اور کوئی سنجیدہ نہیں ہو رہا اللہ ہر مسلمان کو اس معاملے میں اپنا درست کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے گفتگو کی محفل میں ایک بڑا صدمہ ہمارا منتظر تھا ریاض قمر صاحب کو یقیناً نہایت بڑا صدمہ ہمارا منتظر تھا ریاض قمر صاحب کو یقیناً نہایت بڑا صدمہ پہنچا ہے زندگی کی دھوپ چھاؤں میں ساتھ نبھانے والی ہستی جس سے جدا ہوتی ہے یہ دکھ وہی جانتا ہے آپ نے بہت دیر سے اطلاع دی ورنہ ہم بہرصورت پہنچنے کی کوشش کرتے آپ کی اہلیہ محترمہ کے بارے میں پہلے بھی آپ سے غائبانہ سن کر ہم ان کے قدردان تھے میں سمجھتا ہوں کہ جن خاتون کا شوہر ان سے اتنا ان کا شکر گزار ہے اس خاتون سے خوش قسمت اور کوئی نہیں، بلاشبہ ان کی اسی خوبی کو اللہ بخشش کا ذریعہ بنا دے گا، ان شاء اللہ آپ خود کو سنبھالیے تاکہ میرے بہن بھائی آپ کو دیکھ کر حوصلہ پکڑ سکیں اللہ ان پر باپ کا سایہ سلامت رکھے آمین۔ ان شاء اللہ میں اپنے محلے کی مسجد میں مسلسل ایک ماہ تک اپنی ماں کے لیے دعائے مغفرت کراؤں گا روحانی اولاد ہونے کے ناتے اتنا حق ہم رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ مرحومہ کی انسانی خامیوں کوتاہیوں سے صرف نظر فرما کر انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ ریاض قمر صاحب کا خط پڑھ کر دل میں عجیب سی اداسی نے ڈیرے ڈال دیے ہیں طبیعت میں اتنا بوجھل پن عود کر آیا ہے کہ مزید کوئی کہانی پڑھنے یا کچھ تبصرہ کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی ان شاء اللہ زندگی رہی تو آئندہ حاضر ہوں گا۔ والسلام۔

پرنس افضل شاہین...... بھاولنگر۔ اس بار مئی کا نئے افق جلد ہی مل گیا سرورق دیکھ کر ہونٹوں پر یہ شعر مچلنے لگا۔

کبھی تو ٹوٹنے والا حصار بن جاؤں
وہ میری ذات میں رہنے کا فیصلہ تو کرے

دستک میں آپ گستاخان رسول مقبول کو درست لتاڑ رہے تھے یہ لوگ واقعی معافی کے لائق نہیں ہیں انہیں واقعی عبرت کا نشان بنا دینا چاہیے اقرا میں بھائی طاہر قریشی القدوس اللہ کے صفاتی نام کے بارے میں بتا رہے تھے گفتگو میں اپنا خط نہ پا کر بہت ہی زیادہ دکھ ہوا شاید آپ کو لیٹ ملا ہو، وہ خط اور یہ خط اکٹھے کر کے آئندہ شمارے میں شائع کر دیجیے گا۔ ریاض حسین قمر کا خط پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ ہماری آنٹی کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے ہم تمام رائٹرز آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اللہ تعالیٰ آپ سب لواحقین کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی ہمت دے آمین۔ عبدالجبار رومی آپ سرورق پر خوب شعر لکھتے ہیں شعر پڑھ کر مزہ آ جاتا ہے میری نگارشات پسند فرمانے پر رومی انصاری، ریاض بٹ، مجید احمد جائی، صائمہ نور، علی اصغر، عبدالغفار عابد، ایم حسن نظامی، حسین خواجہ کا بہت بہت شکریہ آپ لوگوں کے خطوط بھی زبردست تھے ریاض بٹ کی ہونہار بیٹی عائشہ بٹ نے بھی خوب اچھی سی انٹری دی ہم انہیں خوش آمدید کہتے ہیں قسط نمبر 9 عشنا کوثر سردار نے ایک سو سولہ چاند کی راتیں خوب لکھی باقی کہانیوں میں پراسرار پیکٹ، دھوکا، محبت کا پہلا قرینہ، پریت کی ریت، واپسی، غیرت، سماج گزیدہ پسند آئیں۔ ذوق آگہی میں تہمینہ تبسم، نسرین بانو، حسین خواجہ، ریاض بٹ، خوش بوئے سخن میں ثمینہ سید، ایم حسن نظامی، نسیم سکینہ صدف، عنبرین اختر، ریاض حسین قمر چھائے رہے کچھ عرصہ سے انعامی لیٹر کے بارے میں نہیں بتایا جا رہا کیا گفتگو میں پہلا لیٹر ہی انعامی ہوتا ہے یا پھر انعام کا سلسلہ ہی ختم کر دیا گیا ہے پلیز انعامی لیٹر کا سلسلہ جاری رکھیں کیونکہ اس سے مقابلے کا رجحان بڑھتا ہے اور ہر ماہ کسی ایک لیٹر لکھنے والے ساتھی کو خوشی بھی ملتی ہے امید ہے سب بہن بھائی میری اس تجویز سے اتفاق کریں، اللہ حافظ۔

عبدالجبار رومی انصاری...... لاہور۔

یہ کس دیس کی لڑکی ہے
فوجی بنجارن سی لگتی ہے
معصومانہ انداز اور ہونٹوں پہ مسکان ہے
بس خود کو دیکھ دیکھ کے چلتی ہے

دستک میں ناموس رسالت ﷺ پہ سوشل میڈیا کی مذموم حرکتوں پہ تحریر ایسے لوگوں کے لیے بھرپور جواب ہے جو کمینگی سے باز نہیں آتے اور آئے روز سوشل میڈیا پر شرانگیزی پھیلاتے رہتے ہیں حکومت ایسے فتنہ کو ختم کرنے کے لیے آگے آئی تو ہے لیکن کوئی موثر عمل ہوتا دکھائی نہیں دیتا لیکن ناموس رسالت ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کرنے والے جان رکھیں دنیا و آخرت میں ان کے لیے سخت سے سخت عذاب ہے۔ گفتگو میں ایڈیٹر بھیا کی مجبوریاں ہم سمجھ سکتے ہیں انسان خطا کا پتا ہے کہیں نہ کہیں چوک تو ہو ہی جاتی ہے ریاض حسین قمر کی رفیق حیات کا سن کر بہت دکھ ہوا اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ریاض حسین کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور ان کے لیے دل سے دعا گو ہیں۔ ریاض بٹ کا خوب صورت تبصرہ اچھا لگا اور آپ کی کہانی پراسرار پیکٹ بھی عمدہ رہی لڈوؤں کا پیکٹ آیا تو زلفی کے لیے تھا جس نے تیمور کی بیوی سے فراڈ کیا تھا اور وہ بے چاری صدمے سے نڈھال زہر کھا کے مر گئی، زلفی کی موت ہوئی تو فرزند اپنی ہی کرنی میں موت سے دوچار ہوا توفیق تو سزا کا مستحق تھا ہی لیکن برکتے سے بیان دلواتا کچھ عجیب سا لگا مجید احمد جائی کا تبصرہ زبردست تھا اسی طرح صائمہ نور نے بھی بہترین لکھا عمر فاروق ارشد بھی خوب گرج رہے

تھے عمدہ لکھا عبدالغفار عابد بھی تعریف وتنقید میں بہترین رہے، نئے افق کے پیارے سے فین محمد رفاقت نے بھی عمدہ تبصرہ نگاری کی ایم حسن نظامی جواب آں تعریف وتنقید میں مصروف رہے آخر یہ تبصرہ نگاروں میں سرد جنگ کی سی کیفیت کیوں ہے پلیز ختم کریں علی اصغر انصاری اور حسین خواجہ کے تبصرے بھی اچھے رہے عائشہ بٹ کا مختصر ساخط بھی اچھا تھا لکھنے سے حوصلہ افزائی ہوتی ہے آپ کی کہانی بھی اچھی تھی ناصر حسین کی تحریر دل کی عدالت میں سمرن کو تعلق کی وجہ معلوم نہ تھی لیکن وہ سیماب سے محبت کر بیٹھی تھی آخر اس نے محبت کے انجام پر ایک خوب صورت فیصلہ کیا اور والدین کی عزت رکھ لی بہت اچھی کہانی تھی مجھے بہت پسند آئی یقیناً عزت دار لڑکیوں کو ایسے موقع پر ایسا ہی فیصلہ کرنا چاہیے درندے معاشرے کے معصوم لوگوں کو نقصان پہنچانے والے جو خدا کو بھول جاتے ہیں کہ اس کی لاٹھی بے آواز ہے ایسے ہی درندہ صفت اشتیاق اینڈ کمپنی بھی قانون کی گرفت میں آئے اور اپنے انجام کو پہنچے مہتاب خان کی کہانی اثر انگیز رہی ادب محبت کا پہلا قرینہ ہے اور شیراز نے ادب کو پایا تو اس نے اپنی زندگی کو خوب صورت بنالیا یہ الگ بات کہ وہ اپنے دوست علی سے دور ہوا تھا اور ادب سے روشناس کرانے والی شاہانہ تھی جو شیراز کی صرف دوست تھی محبت نہیں امین صدرالدین بھایانی کی کہانی بھی خوب صورت تھی گلاب سی خوشنما عجیب کیفیت میں پھنس گئی ہے امید ہے اس کی عزت محفوظ رہے گی اور بلوائی بھی کچھ نہ بگاڑ سکیں گے دوسری طرف پریوں کی سی عین شہاب کی نظروں اور اشاروں کے زیر عتاب ہی لگتا ہے شہاب کو اب منہ کی کھانا پڑے گی کیونکہ عین کے تیور ہی بتا رہے ہیں عشنا کوثر سردار کی ایک سو سولہ چاند کی راتیں بہت اچھی جا رہی ہے نہیں یہیں ملتا ہوں اگر تم ملنا چاہو تو مہنگائی اور غربت کے مارے شکیل نے اپنی انا اور خودداری کے ہاتھوں مجبور ہو کر بھکاری کا لبادہ اوڑھ لیا 5 روپے حکومت کے منہ پر تمانچہ ہے جو اعلانات تو بڑے بڑے کرتی ہے لیکن غریبوں کی بھی پرسان حال نہیں بنی مظہر سلیم کی کہانی اچھی لگی۔

''ڈائنامیٹ'' راجر کو پتا تھا کہ اس کا پیار سے رکھا یہ نام اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوگا زرین قمر کی یہ خوب صورت تحریر افسردہ کرگئی حسین خواجہ کی مختصر کہانی غیرت بہت اچھی لگی نوجوان بیٹے کی اچھی تربیت کے ساتھ ساتھ برائی سے روکنے کا سدباب بھی کر دیا زبردست تحریر تھی، ابن عبداللہ کی تحریر خوابوں کا موسم عمدہ رہی ایسی ہی لفظوں کی جادوگری سے مزین ریمل آرزو کی تحریر آوازیں بھی اچھی رہی وادی فراق کی تڑپتی کوئل ثنا نے سرفراز کو بھی تڑپا کے رکھ دیا مگر دیر ہو چکی تھی سخاوت حسین کی کہانی بہترین رہی ذوق آگہی سے ملک جواد، بشیر احمد اور تہمینہ تبسم اور نسرین بانو کے مراسلے جبکہ خوش بوئے سخن سے ثمینہ سید، ماجد جہانگیر مرزا اور تسیم سکینہ صدف کا کلام اچھا رہا، والسلام۔

عبدالغفار عابد...... چیچہ وطنی۔ محترم اقبال بھٹی ادارے اور محفل گفتگو سے وابستہ سبھی لوگوں کو میرا خلوص بھرا سلام قبول ہو عزیز ساتھیو ہم پینڈو لوگوں کی زندگی بہت مصروف ہوتی ہے گندم کی کٹائی کے سیزن میں اس مصروفیات میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اس مصروفیات کو دیکھتے ہوئے لگتا نہیں تھا کہ اس بار آپ سے یہاں ملاقات ہوگی مگر اک دکھ بھری خبر نے یہ سطریں لکھنے پر مجبور کر دیا برصغیر کی عظیم شخصیت اردو ادب کے بے تاج بادشاہ جاسوسی ناول میں نام پیدا کرنے والے ایم اے راحت ہمیں چھوڑ گئے (ان للہ وانا الیہ راجعون) محروم کو مرحوم کہتے ہوئے دل دکھتا ہے انہوں نے ایک انتہائی بھرپور ادبی زندگی گزاری اور سیکڑوں نوواردان علم وادب کی رہنمائی کی ایم اے راحت اہل نظر اور صاحب مطالعہ دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ بہت خوش گوار شخصیت کے بھی حامل تھے ان کی حسن مزاجی انہی کی طرح خوب صورت تھی ہم تمام ادب کے طالب علم ایم راحت کی وفات پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین، دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی نبی کریم ﷺ کی شان میں نازیبا کلمات پر پریشان دکھائی دے رہے تھے اگر آج 313 والا جذبہ ہوتا تو کبھی ایسا نہ ہوتا نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی ہماری مرکزیت کو کمزور ظاہر کر رہی ہے محفل گفتگو میں پہنچے تو پتا چلا

کہ ریاض حسین قمر کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا ہے اور اس کے علاوہ پیارے بھائی حسین خواجہ کی والدہ بھی اس فانی دنیا سے کوچ کر گئیں محترم ریاض حسین قمر اور بھائی حسین خواجہ میرے لکھے لفظ آپ کے دکھ کو دور نہیں کر سکتے کیونکہ آپ دونوں کا دکھ میرے لفظوں سے کہیں زیادہ ہے رب العزت سے دعا ہے کہ مرحومین کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ اہل خانہ کو صبر جمیل کی طاقت سے نوازے آمین، ریاض بٹ بھائی میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ میں ہر بار اس محفل میں حاضری لگاؤں پر نہ چاہتے ہوئے بھی غیر حاضری ہوجاتی ہے خیر آپ کی محبت کا بھرم رکھنے کی کوشش ضرور کروں گا ایم حسن نظامی، حسین خواجہ اور علی اصغر انصاری آپ کی محبتوں کا شکریہ کوشش کروں گا کہ آئندہ بھی آپ کو اچھا تبصرہ پڑھنے کو ملے علی اصغر انصاری آپ نے مجھے استاد کہا میرے بھائی میرا نام تو شاگردوں کی لسٹ میں بھی کہیں نظر نہیں آتا آپ مجھے استاد کہتے ہیں مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کی حوصلہ افزائی جاری رہی تو میں لکھنا پڑھنا سیکھ لوں گا فرواہ بٹ آپ کے القابات نے شرمندہ کر دیا سسٹر جتنی آپ نے میری تعریف کی میں اتنا بڑا ادیب نہیں ہوں ادیبوں سے ملاقات کرنی ہو تو فیس بک کا مطالعہ کریں وہاں آپ کو وہ ادیب بھی ملیں گے جو ایک رات میں تین تین کہانیاں لکھ لیتے ہیں آپ کی محبتیں میرے لیے استاد کا درجہ رکھتی ہیں، شبینہ مظہر رانجھا آداب عرض کے بعد ہمارا رابطہ نئے افق نے کرایا میرا نمبر ملتے ہی آپ نے ایس ایم ایس کیا اتنے عرصے بعد آپ سے بات کر کے بہت خوشی ہوئی آپ کی تحریر کفن پوش نئے افق کے قارئین کے لیے اعزاز کا درجہ رکھتی ہے، ایسی تحریریں آزادی کی جنگ لڑنے والے مجاہدین کے حوصلے بڑھاتی ہیں اس کے علاوہ آپ نے محبت کی تعریف بھی خوب صورت انداز میں کی اللہ آپ کو صحت والی لمبی زندگی دے آمین۔ حسین خواجہ کی کہانی غیرت کے نام سے اختلاف کروں گا اس کہانی کا نام منفی سوچیں یا جاہلیت ہونا چاہیے تھا شک کی بنا پر ہونے والے فیصلے غیرت کے زمرے میں نہیں آتے بلکہ جاہلیت کے زمرے میں آتے ہیں شک کی بنا پر باپ نے اپنے بیٹے کی شادی کر دی باپ نے بیٹے سے اس کی رائے لینا بھی گوارا نہ کیا زرین قمر کی تحریر ڈائنامیٹ حسب معمول جاندار کہانی تھی باقی کہانیاں مصروفیات کی بنا پر پڑھ نہ سکا ان شاء اللہ اگلے ماہ مصروفیات کو شکست دے کر بھرپور تبصرہ کروں گا اس وقت تک اجازت دیں خوشیاں آپ کا مقدر رہیں رزق حلال کی آپ پر برسات ہو ایمان کامل، دین و آخرت کی بھلائی سکھ، صحت و تندرستی گھر بھر کے تمام افراد کو نصیب ہو، آمین۔

محمد رفاقت...... واہ کینٹ۔ محترم جناب اقبال بھٹی صاحب اور آپ کی ساری ٹیم کو سلام عرض ہے اس دفعہ میرے محترم اقبال بھٹی صاحب آپ نے کمال کر دیا مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا کہ میری کہانی بھی آپ نے شائع کر دی جناب آپ کو اور آپ کے تمام ساتھیوں کو بہت بہت سلام پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی شکریہ بھی ادا کرتا ہوں سچ جانیے مجھے بہت خوشی ہوئی ان شاء اللہ اور بھی کہانیاں ارسال کر رہا ہوں رسالہ اپنی مثال آپ ہے میرے محترم بھائی ریاض حسین قمر کی شریک حیات اس دنیا سے کوچ کر گئیں دل کو بہت صدمہ ہوا اللہ ان کو صبر دے اور مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے ہم سب قارئین دعا گو ہیں جناب عبدالجبار رومی صاحب، ریاض بٹ مجید احمد جائی، ایم حسن نظامی ان سب کا تو میں دل سے فین ہوگیا ہوں ان ہی کی وجہ سے مجھے حوصلہ ملتا ہے میں ان سب کا شکر گزر ہوں محترمہ صائمہ نور نے بھی میرے خط کو پسند کیا جس کے لیے میں شکر گزار ہوں اس دفعہ کہانیاں لاجواب تھیں جن میں مجھے سب سے زیادہ پسند آئیں وہ کہاں یہ ہیں محبت کا پہلا قرینہ، درندے، دھوکا، پریت کی ریت، پر اسرار پیکٹ، کفن پوش، واپسی، 5 روپے، غیرت، دل کی عدالت، پانی کا بل، ڈائنامیٹ یہ سب کہانیاں ایسی ہیں جن کو عرصے تک یاد رکھا جائے۔ فن پارے زرق آگہی، خوش بوئے سخن بھی اپنی مثال آپ تھے ان سب لکھنے والوں کو بہت بہت مبارک ہو، سب نے اچھا لکھا ہے بلکہ بہت ہی اچھا لکھا ہے۔ ایک سو سولہ چاند کی راتیں بھی قسط وار ناول اپنا آپ منوا رہا ہے اور خوب جا رہا ہے۔ ایک دفعہ پھر سب لوگوں کا شکریہ خاص کر

اقبال بھٹی صاحب کا اور ان کی تمام ٹیم کا بھی بہت بہت شکریہ ان شاء اللہ زندگی رہی تو اگلے خط میں ملاقات ہوگی۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم جناب اقبال بھٹی صاحب سلام مسنون رب کریم آپ کو اور نئے افق کے تمام عملے کو اپنی رحمت کے گہرے سائے میں رکھے، آمین۔ زخم کتنا ہی بڑا ہو اس میں سے اٹھنے والی ٹیسیں اگرچہ ختم نہیں ہوتیں لیکن کم ضرور ہو جاتی ہیں پھر وقت کا مرہم گہرے سے گہرے گھاؤ کو بھرنا شروع کر دیتا ہے خونی رشتوں کے گھاؤ ساری زندگی بھرتے تو نہیں ہیں لیکن ان میں اٹھنے والی ٹیسیں تمام عمر محسوس ہوتی رہتی ہے زندگی اور موت کا نظام رب کریم کا ایک بہت ہی پیارا نظام ہے اور فرمان خداوندی کے مطابق ہر ذی النفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے، والدین نے اپنے اپنے وقت پر فوت ہونا ہے ان کی جگہ اولاد نے والدین کے روپ میں آنا ہے پھر انہوں نے رب کائنات کے حضور اپنی باری پر حاضر ہو جانا ہے یہ سلسلہ ذی النفس میں سے سب سے پہلے ذی النفس جنہوں نے موت کا ذائقہ چکھا وہ ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت ہابیل ہیں جنہیں ان کے بھائی قابیل نے قتل کر دیا تھا اور یہ سلسلہ قیامت کے روز آخری ذی النفس کے موت کا ذائقہ چکھنے تک جاری رہے گا اب ذرا طبیعت اس قابل ہوئی ہے کہ اپنے محبوب میگزین نئے افق کے لیے کچھ لکھ سکوں، اپریل اور مئی کے شمارے اکٹھے ہی مل گئے تھے مئی کے شمارے کا ٹائٹل بہت پسند آیا دستک میں لائق صد احترام جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے جس طرح ایک بہت ہی نازک مسئلے پر قلم اٹھایا ہے اور جس طرح اس مسئلے کے بارے میں لکھا ہے وہ قابل ستائش ہے خدا انہیں اس کاوش پر اجر عظیم عطا فرمائے، آمین۔ آپ نے گفتگو کے آغاز میں جو پیاری حدیث بیان فرمائی ہے وہ مسلمانوں کے لیے کتنی حوصلہ افزا ہے کاش ہم ہر مسلمان بھائی سے بامعانقہ ملنے کو اپنا شعار بنالیں باقی آپ نے میری اہلیہ محترمہ کے وصال پر جس طرح دکھ کا اظہار فرمایا ہے اس کے لیے آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں آپ نے میرے خط کو من و عن شائع فرما کر جس طرح میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے وہ مجھ پر احسان عظیم ہے میری پھر نئے افق کے تمام قارئین سے گزارش ہے کہ میری شریک حیات کے لیے مہینے میں ایک بار ضرور فاتحہ خوانی کر کے ان کی روح کو ایصال فرما دیا کریں میں قارئین کا عمر بھر ممنون احسان مند رہوں گا اور ان کے بچوں اور والدین کے لیے دعا گو رہوں گا، جن میرے پیارے دوستوں نے مجھے اپنے دلوں میں یاد رکھا ہے خصوصاً جناب عبدالجبار رومی انصاری صاحب نے میرے تبصروں کو پذیرائی بخشی ہے میں ان کا شکر گزار ہوں پیارے بھائی ریاض بٹ صاحب یاد فرمائی کا شکریہ اس بار میں آپ کی تفتیشی کہانی پراسرار پیکٹ نہیں پڑھ سکا وجہ آپ کے سامنے ہے مجید احمد جائی صاحب خط پسند فرمانے کا شکریہ صائمہ نور صاحبہ آپ کو میرا تبصرہ پسند آیا میرے لیے باعث فخر ہے پیارے بھائی عمر فاروق ارشد صاحب غزل پسند فرمانے پر شکریہ آپ کا خط بھرپور تبصرہ لیے ہوئے تھا باقی قارئین کے خطوط اور تبصرے خوب تھے اقرا میں جناب طاہر قریشی صاحب جس طرح اللہ تعالیٰ کے ناموں سے جس طرح آگاہ فرماتے ہیں یہ ان کا حصہ خدائے لم یزل انہیں اجر عطا فرمائے، آمین۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف۔ سلام مسنون امید ہے آپ اور نئے افق سے وابستہ بھی احباب بخیریت ہوں گے مئی کا پرچہ ہاتھوں میں ہے اس کا ہر لفظ اور فقرہ بہار کے انمول رنگوں سے مزین ہے اور آپ کی بیکراں محنتوں اور کوششوں کا منہ بولتا ثبوت ہے اس میں ایڈیٹر صاحب کی پرمعنی سوچ آپ کی نمایاں محنت، ریاض حسین قمر کے لاتعداد دکھ عبدالجبار رومی کی بیکراں کوشش ریاض بٹ کے لازوال جذبے صائمہ نور کی شیریں گفتگو عمر فاروق ارشد کی انمول نصیحتیں عبدالغفار عابد کے دلی جذبات حسین خواجہ کے احساسات طاہر قریشی صاحب کی ایمان افروز باتیں سن کے بھی جذبوں کو منور کر گئیں۔ امین صدر الدین کی بے مثال محبتوں کا قرینہ عشنا کوثر سردار کی مدھر بھری چاندنی راتوں کے خواب مہتاب خان کے معاشرتی ناسور، درندے خلیل جبار کی منفرد تخلیق، رزاق کو ہلر کی تاریخی فکر اور پرمعنی جملے، ریاض بٹ کا عمدہ

طرز عمل شبیہ رانجھا کے قلم کا طلسم کبریٰ سلیم اختر کے سحر بھرے فقرے مظہر سلیم کے قیمتی پانچ روپے محمد رفاقت کی انمول سوچ کی پرچھائیاں خواجہ حسین کی غیرت پر تحقیق ناصر حسین کے منفرد دلی جذبات کی عدالت اور آخر میں زرین قمر صاحبہ کا عملی تجربہ سبھی کچھ مل کر افق پہ جگمگایا تو پرچہ نئے افق کہلایا جو آئندہ ماہ تک دلوں میں افقی پھیلاتا رہے گا۔ ساتھیو تو ہمات مسرتیں نگل جاتی ہیں ہم دوسروں پر تو ہمات لگاتے ہوئے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی سے سدا خوشحال اور تہی دامن نہیں رہیں گے اور براوقت کیا ہم یہ نہیں آ سکتا یہ زندگی برف کی مانند ہے جو لحہ بہ لحہ پگھل رہی ہے اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مطابق گزاریں کیونکہ پگھلتی ہوئی برف جلد ختم ہونے والی ہے اور پھر پھر کیے گناہوں سے معافی کی مہلت بھی نہ مل سکے شاید بس خوش رہیے خوشیاں بانٹیے اور اپنا خیال رکھیں، والسلام۔

سانحہ ارتحال

ہم بڑے افسوس سے اطلاع دے رہے ہیں کہ ہمارے دوست ساتھی اور معروف قلمکار مرغوب علی راحت (ایم اے راحت) اب ہم میں نہیں رہے' ان للہ وانا علیہ راجعون۔ ان کا اور نئے افق کا ساتھ بہت ہی پرانا تھا انہوں نے نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز کے ہر پرچے ابن صفی میگزین' نیا رخ' حجاب اور ایکشن میں سلسلے وار اور مکمل ناول لکھے اور خوب لکھے جنہیں قارئین نے پسند بھی کیا۔ بعدازاں وہ کراچی کے حالات سے تنگ آ کر لاہور شفٹ ہو گئے لیکن ان کا اور نئے افق کا تعلق کسی نہ کسی طرح برقرار رہا۔ لاہور میں انہوں نے بڑی مردانگی کے ساتھ بیماری کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دی' تندرست ہوئے پھر قلم سنبھالا ہی تھا کہ دوبارہ بیمار ہو کر کوما میں چلے گئے' اسی میں اللہ کو پیارے ہو گئے' اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عنایت کرے' ہم ان کے لیے ہمیشہ دعا گو رہیں گے۔

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں' صرف نیلی یا سیاہ روشنائی کا ہی استعمال کریں
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں ان میں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجی جانے والی تمام تحریروں میں کتابی حوالے ضرور تحریر کریں۔
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔
☆ ''گفتگو'' کے لیے آپ کے ارسال کردہ خطوط ادارہ کو ہر ماہ کی 3' تاریخ تک مل جانے چاہیے۔
☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 7' فرید چیمبرز' عبداللہ ہارون روڈ' کراچی۔

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

السلام

(پناہ دینے والا)

السلام = امان، سلام، سالم یہ سلم یسلم کا مصدر ہے، اس کے معنی عیوب و آفات سے سلامت رہنے، اس سے چھٹکارا پانے اور بری ہونے کے ہیں۔ امام راغب اصفہانی نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں تحریر کیا ہے کہ سلم اور سلامت کے معنی ظاہری اور باطنی آفتوں سے الگ رہنے کے ہیں۔ حقیقی سلامتی جنت کے سوا کہیں اور نہیں ہے کیونکہ وہاں بقاء ہے فنا نہیں ہے۔ غناء ہے احتیاج نہیں ہے۔ عزت ہے ذلت نہیں ہے، صحت ہے بیماری نہیں ہے، اللہ جل جلالہ کو سلام کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام خلق کے لئے اختلال اور تفاوت سے۔ سالم رہنے کو وسیع و عام کر دیا ہے۔ کیونکہ ہر چیز نظامِ حکمت پر چل رہی ہے اسی طرح تمام جن وانس حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے کسی ظلم و جور کے ہونے سے سلامت ہیں۔

اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے تمام افعال میں سلام ہے۔ مفسرین نے اس اسم سلام کے متعلق تحریر کیا ہے کہ حق تعالیٰ کو اس سے اس لئے موسوم کیا جاتا ہے کہ وہ تمام عیوب و آفات سے سالم ہے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ تمام آفتوں کے واقع ہونے اور ہر قسم کے نقائص کے آنے سے پاک ومحفوظ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کو السلام کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذاتِ الٰہی سراسر سلامتی ہی سلامتی ہے۔ اس کی ذاتِ عالی تمام آفات، کمزوری ہر خامی سے پاک ہے اس کے کمال کو زوال نہیں ہے۔

مومن اپنے ربّ کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ایک اللہ کے جوارِ رحمت میں امن پاتا ہے، اس کی ہر قسم کی بے اطمینانی دور ہو جاتی ہے اور وہ کائنات کی ہر چیز کا دوست بن جاتا ہے۔

ترجمہ:۔ ان لوگوں کے واسطے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے محبت رکھتا ہے ان کے اعمال کی وجہ سے۔ (الانعام۔۱۲۷)

آیتِ مبارکہ کے مخاطب ایسے اہلِ ایمان ہیں جو شیطان کے بہکانے، پھسلانے میں نہیں آئے اور راہِ حق پر جمے رہے اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت و بندگی میں لگے رہے۔ ایسے ہی نیک متقی صالح بندوں کو خوش خبری سنائی جا رہی ہے کہ ان کے واسطے اللہ کے پاس سلامتی عافیت وحفاظت کا گھر موجود ہے اور اللہ اپنے ایسے پرہیزگار بندوں سے ان کے اعمالِ صالحہ کی وجہ سے محبت وشفقت کا معاملہ فرماتا ہے۔

ترجمہ:۔ اور اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف تم کو بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے راہِ راست پر چلنے کی توفیق دیتا ہے۔ (یونس۔۲۵)

انسان تو اس ناپائیدار زندگی کی رنگا رنگ دل فریبی جسے شیطان اور دل فریب بنا کر پیش کرتا ہے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تمام شیطانی حربوں سے خود کو بچانے' محفوظ کرنے کی ہدایت اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دے دی' سمجھا دی ہے۔ اس فانی دنیا میں زندگی بسر کرنے کے تمام بہترین طریقے جو آخرت کی دائمی زندگی کو بہتر بنانے اور انسان کو دارالسلام یعنی سلامتی والے گھر کا مستحق بنائے' اس کی ہدایت دے دی ہے۔ سلامتی کا گھر وہ جگہ ہے جہاں اہلِ ایمان کی دائمی زندگی گزرے گی یعنی جنت' دنیا میں راہِ راست اختیار کرنے کے اجر میں جنت ہی نہیں ملے گی بلکہ مزید انعامات الٰہی بھی بخشے جائیں گے۔

ترجمہ:۔ مہربان پروردگار کی طرف سے انہیں "سلام" کہا جائے گا۔ (یٰسین۔۵۸)

آیت مبارکہ میں رب کائنات اپنے صالح نیک متقی بندوں کو خوش خبری سنا رہا ہے کہ اللہ مہربان اپنے پرہیز گار بندوں کو دائمی قیام کے لئے سلامتی کا گھر جنت تو عطا فرمائے گا ہی ان کے استقبال کے وقت جنت میں اللہ تعالیٰ اپنا سلام بھی پہنچائے گا بعض مفسرین کے مطابق یہ سلام الٰہی فرشتوں کے ذریعے پہنچایا جائے گا اور کچھ کے مطابق اللہ تعالیٰ خود سلام سے نوازے گا۔

ترجمہ:۔ کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو صبر کے بدلے' کیا ہی اچھا (بدلہ) ہے اس دارِ آخرت کا۔ (الرعد۔۲۴)

یہ آیتِ مبارکہ بھی اہلِ ایمان کو خوش خبری دے رہی ہے کہ جو اللہ کی راہ پر اس دنیا کی مختصر ترین زندگی میں جم جائے گا اور راہِ حق پر چلتا رہے گا اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتا رہے گا۔ اسے اس راہِ حق پر قائم رہنے اور صبر اختیار کرنے پر اس کی دائمی زندگی کو خوشگوار پرسکون ماحول ہی مہیا نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کی عزت و توقیر کے اظہار کے لئے ملائکہ ہر طرف سے آ آ کر اُس کو سلام کریں گے اور ملائکہ اُسے خوش خبری سنائیں گے کہ اب تم ایسی جگہ آ گئے ہو جہاں تمہارے لئے سلامتی ہی سلامتی ہے۔ اب یہاں تم ہر آفت سے' ہر تکلیف و مشقت اور خطرے سے یہاں تک کہ ہر اندیشے تک سے محفوظ ہو۔

ترجمہ:۔ یہ جزا (صلہ) ہے ان کے اعمال کی جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔ وہاں وہ کوئی بیہودہ یا گناہ کی بات نہیں سنیں گے۔ صرف سلام ہی سلام کی آواز ہو گی۔ (الواقعہ۔۲۴ تا ۲۶)

آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ جنت اور جنت کی نعمتوں کے بارے میں ارشاد فرما رہا ہے جسے قرآن کریم میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔ انسان وہاں ہر قسم کی برائی' بری بات' جھوٹ' غیبت' چغلی' بہتان' گالی' لاف وگزاف' طنز و تمسخر و طعن و تشنیع کی باتیں سننے سے محفوظ رہے گا۔ جنت ان تمام اخلاقی گندگیوں سے نہ صرف پاک ہو گی بلکہ وہاں ہر طرف سلام' سلام کی آوازیں سننے میں آئیں گی۔ فرشتوں کی طرف سے بھی اور اہلِ جنت کی طرف سے بھی۔

جو شخص بھی السلام کا ورد کثرت سے کرے گا وہ ان شاء اللہ تمام آفات سے محفوظ و مامون رہے گا۔ جو شخص اس اسم سلام کو ایک سو پندرہ مرتبہ پڑھ کر بیمار پر دم کرے گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ مریض کو شفاء عطا فرمائے گا۔

جنون

مہتاب خان

جذبے جب حد سے بڑھ جائیں تو جنون کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور جنون پاگل پن کا دوسرا نام ہوتا ہے اسی لیے کسی بھی شعبہ میں کامیابی حاصل کرنے والی شخصیات کو لوگ پاگل ہی قرار دیتے ہیں۔

ایک نوجوان کے جنون کا احوال

اس کے خواب نے اس کے دشمن کو بھی دوست بنا دیا تھا

سیٹھ داؤد بہت خوش نظر آرہا تھا۔ اپنی ہر فلم کی مہورت کے موقع پر وہ ایسا ہی خوش نظر آتا تھا۔ اس فلم کا ہدایت کار عادل مہدی تھا' ایک شاٹ کی عکس بندی سے فلم کا افتتاح ہونا تھا۔ سیٹ تیار تھا۔ وہ دونوں سیٹ پر پہنچے وہاں فلم انڈسٹری کے بڑے بڑے لوگوں کا مجمع تھا۔ سیٹھ داؤد سہانی رات کی کامیابی پر مبارکبادیں وصول کررہا تھا جبکہ عادل عکس بندی کے اہتمام میں مصروف تھا۔

وہاں ''جنت'' کا ہدایت کار ساحر مراد بھی موجود تھا۔ جنت ریلیز ہوگئی تھی اور بہت کامیاب فلم ثابت ہوئی تھی۔ رش ایسا بڑھا تھا کہ ٹکٹ ملنا دشوار ہوگیا۔ ہر فلم بین اس کی فلم کی تعریف کررہا تھا۔ ساحر سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ لوگ اسے مبارک باد دے رہے تھے۔ اس نے اپنی فلم میں سب نئے چہرے لیے تھے اور ان نئے آرٹسٹوں سے بہت اچھا کام لیا تھا۔

''اگلی فلم کب بنا رہے ہیں ساحر صاحب؟ اس کے حقوق مجھے دیجیے گا۔'' ایک مشہور ڈسٹری بیوٹر نے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے اس پر بعد میں بات کریں گے۔'' ساحر نے کہا۔

❀......❀❀......❀

مطلوبہ شاٹ ایک ہی ٹیک میں اوکے ہوگیا۔ پورا سیٹ مہمانوں کی تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس کے بعد مٹھائی اور مشروبات کا دور شروع ہوگیا۔

عادل مہدی کو یہ بات بڑی ناگوار گزر رہی تھی کہ ساحر سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا اس طرف آگیا جہاں ساحر ڈسٹری بیوٹرز کے درمیان گھرا کھڑا تھا۔

''ہیلو ساحر کیسے ہو؟''

''اللہ کا کرم ہے تم سناؤ' مہورت مبارک ہو اور سہانی رات کی کامیابی بھی۔'' ساحر نے خلوص دل سے کہا۔

''شکریہ ساحر۔'' پھر کچھ دیر ٹھہر کر وہ بولا۔ ''لڑکے بتا رہے تھے کہ تمہاری فلم بھی کچھ کامیاب ہوئی ہے لیکن سہانی رات کی ٹکر کی نہیں۔''

''میں اسے سہانی رات کی صف میں رکھنا پسند نہیں کروں گا۔''

''تم حد سے بڑھ رہے ہو۔'' عادل غصیلے لہجے میں بولا۔

''تم مجھ پر چوٹ کررہے ہو۔''

''میں نے تو ایک بات کی ہے میں پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں ان گھٹیا فلموں سے نکلو اور معیاری فلمیں بناؤ۔ یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے مانو یا نہ مانو تمہاری مرضی۔''

''تم ہوتے کون ہو مجھے مشورہ دینے والے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں تمہیں انڈسٹری میں آئے ہوئے وہ بھی اپنے باپ کی دولت کے بل بوتے پر۔ چلے ہو عادل مہدی کو مشورہ دینے۔'' عادل نے استہزائیہ انداز میں کہا پھر بولا۔ ''ایک فلم بنا کر خود کو بڑا ڈائریکٹر سمجھنے لگے ہو' چلتے ہو تم مجھ سے اپنے باپ کی دولت سے ہٹ کر کچھ کر دکھاؤ تو مانوں۔''

سیٹھ داؤد نے یہ صورت حال دیکھی تو تیزی سے آگے بڑھا۔

''اے عادل کاہے کو مہمان سے بدتمیزی کررہے ہو۔''

''رہنے دیں داؤد صاحب ہم تبادلہ خیال کررہے ہیں۔'' ساحر نے جلدی سے کہا۔

''جھوٹ نہ بولو ہم جھگڑا کررہے تھے۔''

''جھگڑا تم کررہے تھے میں تو تبادلہ خیال کررہا تھا۔'' ساحر نے کہا۔

''ٹلفڑ مت کرو بابا۔'' سیٹھ داؤد ان دونوں کے درمیان آتا ہوا بولا۔

عادل بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ آج کی یہ صورت حال دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس وقت کے بدترین کاروباری حریف کبھی بہترین دوست بھی رہے ہوں گے۔

☆......☆......☆

ساحر اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ٹی وی ڈرامہ پروڈیوسر رمیش بیٹھا تھا۔ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کررہے تھے۔ ان میں بڑی اچھی دوستی تھی۔

''اخبارات میں تمہارے اور عادل کے اختلافات کی خبریں چھپی ہیں۔''

''اختلافات تو ہیں ہمارے درمیان۔'' ساحر نے کہا۔ ''میں نے اسے آئینہ دکھانے کی کوشش کی تھی۔ آخر میں اس کا دوست ہوں۔ اسے سیدھا راستہ دکھانا چاہتا ہوں۔ فلم' ٹی وی' ڈرامے وغیرہ ایک ایسا میڈیم ہیں' جو بہت کم وقت میں بہت سے افراد کو ایجوکیٹ کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

ہم ان ذریعوں سے مثبت پیغام لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ جو بہت تیزی سے لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دلچسپ پیرائے میں کہی ہوئی باتیں انسانی دل پر جلد اثر کرتی ہیں۔ میں یہی کچھ اسے سمجھانا چاہتا ہوں مگر وہ راستہ بھٹک گیا ہے۔''

''تمہاری باتیں اپنی جگہ مگر وہ تمہارے بارے میں بڑی گھٹیا باتیں کر رہا ہے جبکہ تمہارا کہنا ہے کہ وہ کبھی تمہارا بہترین دوست تھا۔''

''دراصل محرومی کے احساس نے اسے حسد میں مبتلا کر دیا ہے۔ جس قسم کی فلمیں وہ بنا رہا ہے یہ اس کا مزاج نہیں ہے۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں' وہ انڈسٹری کی بھیڑ چال میں چل پڑا ہے۔ ان کے رنگ میں رنگ گیا ہے اور چاہتا ہے میں بھی رنگ جاؤں۔ وہ مجھ سے سینئر ہے۔ میری کامیابی اسے شکست کا احساس دلاتی ہے۔ میرا سراہا جانا اس کے لیے ناقابل برداشت ہے۔''

''چھوڑو یار یہ باتیں چلو پہلے ڈنر کرتے ہیں' پھر میرے ساتھ شوٹ پر چلنا تھوڑا سا کام باقی ہے۔'' رامیش نے کہا۔

''کہاں چل رہی ہے شوٹنگ؟''

''کلفٹن میں میری آنٹی کے بنگلے میں ہو رہی ہے۔''

اسی وقت آفس کا دروازہ کھلا اور سیٹھ داؤد اندر آیا..... آتے ہی اس نے ہانک لگائی ''اندر آ سکتا ہوں ساحر صاحب۔''

ساحر اسے یہاں دیکھ کر حیران تھا۔ وہ اندر آ گیا اور گرمجوشی سے ساحر سے ہاتھ ملایا پھر رامیس کی طرف مڑ کر بولا۔ ''آپ کی تعریف۔'' اس نے رامیس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ ٹی وی ڈرامہ پروڈیوسر رامیس ہیں۔'' ساحر نے کہا۔

''اور سنائیں کیسے آنا ہوا؟''

''تم کو مبارکباد دینے آیا ہوں' اور تم سے کاروبار کی بات بھی کرنی تھی۔'' سیٹھ داؤد نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ فلم بنانا چاہتا ہوں۔'' وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''لیکن آپ تو عادل کے ساتھ.....'' ساحر کو حیرت ہوئی۔

''میں اس کے ساتھ دو فلمیں بنا رہا ہوں سوچا ایک تمہارے ساتھ بھی بنا لوں.....''

''عادل یہ برداشت نہیں کرے گا۔''

''کیسی بات کرتے ہو' میں اس کا پابند ہوں؟ نہیں کرے گا تو نہ کرے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''میری فلم کی کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں ہے اس میں آپ کی فلموں کی طرح مرچ مسالہ نہیں ہوتا مطلب فلم گرم نہیں ہوگی سمجھ گئے نا آپ۔''

''او بابا میں کچھ نہیں جانتا جیسی مرضی بناؤ..... میں تمہارے ساتھ فلم ضرور بناؤں گا۔''

کچھ دیر وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلا گیا..... اس کے جانے کے بعد رامیس نے کہا۔

''کیا خیال ہے اس کے لیے فلم بناؤ گے؟''

''سوچوں گا۔''

''اور تمہارا وہ خواب وہ کہانی جس پر تم فلم بنانا چاہتے تھے وہ کب شروع کرو گے؟''

''جب تک وہ لڑکی مل نہیں جاتی جسے میں اس فلم کی ہیروئن بنانا چاہتا ہوں' وہ فلم نہیں بن سکتی۔''

ڈنر کے بعد وہ دونوں شوٹنگ پر آ گئے تھے۔ رامیس کی آنٹی کا یہ بنگلہ کلفٹن کے ایک پوش ایریا میں واقع تھا۔ یہ ایک بڑی وسیع و عریض اور دیدہ زیب عمارت تھی۔ رامیس نے عمارت کے باہر سے کچھ شاٹس لیے پھر وہ بنگلے کے اندر آ گئے جہاں یونٹ کے افراد نے تمام انتظامات مکمل کیے ہوئے تھے۔ یہ ایک ہال نما کمرہ تھا۔ کمرے میں چاروں طرف کیمرے نصب کر دیے گئے تھے لائٹس لگا دی گئی تھیں اور عکسبندی کے تمام انتظامات مکمل تھے۔

''تم نے سویرا کو ریہرسل کروا دی۔'' رامیس نے اپنے اسسٹنٹ سے پوچھا۔

''جی سر۔''

''کیمرے کا رخ دروازے کی طرف کرو۔'' رامیس نے ایک کیمرہ مین کو ہدایت دی سویرا کمرے میں داخل ہونے سے باہر جانے تک کیمرے کی زد میں رہنی چاہیے اور تم ہیرو کو فوکس کرنا۔'' اس نے دوسرے کیمرہ مین سے کہا۔ اس نے اسسٹنٹ کو اشارہ دیا۔

''سویرا اندر آ جائیے۔'' اس نے انٹر کام پر کہا۔

''لائٹس آن۔'' رامیس نے آواز لگائی' لائٹس آن کردی گئیں' پورا کمرہ بقعہ نور بن گیا۔
اسی وقت دروازہ کھلا۔ ساحر اور رامیس کیمروں کی رینج سے باہر کھڑے تھے۔ ساحر کی نگاہ کیمرے پر تھی۔
''اوہ یہاں کیا ہورہا ہے؟'' کمرے میں گونجنے والی سریلی' کھنک دار اور حیران آواز نے ساحر کو بے اختیار نظریں اٹھانے پر مجبور کردیا' وہ متوحش سی کھڑی کیمروں کو حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے اس کی نظر ساحر سے ملی تھی اور اس کے دل کی دنیا کو زیروزبر کرگئی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے زمین کی گردش ایک دم تھم گئی ہے۔ اس کی نگاہ لڑکی کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ وہ تھی ہی اتنی حسین' ترشے ہوئے لب' گوری کھلتی ہوئی رنگت' شہد رنگ حسین ساحر آنکھیں اور آنکھوں پر پلکوں کی گھنی جھالر اور سب سے بڑھ کر معصومیت' وہ ملکوتی حسن کا شاہکار تھی۔
''کون ہیں آپ؟ یہاں شوٹنگ چل رہی ہے۔ آپ اندر کیسے آئیں اور یہ سویرا کہاں رہ گئی؟'' رامیس چلاتے ہوئے بولا تو ساحر جیسے ہوش میں آ گیا۔ اسی وقت سویرا نامی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔
''میں انٹری دینے والی تھی کہ یہ لڑکی اندر چلی گئی میں سمجھی کہ......''
''آپ کہاں سے ٹپک پڑیں محترمہ' کچھ بولیں گی یا یونہی بت بنی کھڑی رہیں گی۔'' رامیس جھنجلا کر بولا۔
وہ جو متوحش کھڑی تھی گڑبڑا کر بولی۔ ''میں نتاشا کی دوست ہوں' اس سے ملنے آئی تھی۔''
''نتاشا اپنے کمرے میں ہوگی۔'' رامیس بولا۔
''سوری۔'' کہتی ہوئی وہ مڑی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔
فلم انڈسٹری اور ذاتی زندگی میں ساحر نے بے شمار حسین لڑکیاں دیکھی تھیں مگر یہ ملکوتی حسن اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کے برسوں پرانے خواب کو تعبیر ملنے والی تھی۔ وہ چہرہ جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا مل گیا تھا' وہی تیکھے نقوش' وہی ساحر آنکھیں ویسے ہی لانبے اور گھنے بال اور وہی بھرپور سراپا سب کچھ وہی تھا جو اس نے اپنی آئیڈیل فلم کی ہیروئن کے بارے میں سوچا تھا۔
اسے اپنا حلق خشک محسوس ہورہا تھا۔ یہ جھٹکا تھا ہی اتنا شدید کہ وہ خود کو سنبھال نہیں پارہا تھا۔ وہ پسینے میں شرابور ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔
''تمہیں کیا ہوا ساحر؟ طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' رامیس جو اسے دیکھ رہا تھا کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا۔
''پپ...... پانی۔'' اس نے اس کے لیے پانی منگوایا۔ لائٹ مین کا لایا ہوا پانی کا گلاس اس نے ایک سانس میں خالی کردیا۔
''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''
''ڈاکٹر کے پاس چلیں۔'' رامیس فکرمندی سے بولا۔
''نہیں کچھ دیر میں ٹھیک ہوجاؤں گا۔''
''آج کی شوٹنگ کینسل۔'' رامیس نے یونٹ کے افراد سے کہا۔ ''چلو باہر کھلی فضا میں بیٹھتے ہیں۔'' اس نے ساحر سے کہا۔ وہ دونوں باہر جاکر لان میں بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
''اب کیسا محسوس کررہے ہو؟'' کچھ دیر بعد رامیس نے پوچھا۔
''پتا نہیں اچانک کیا ہوگیا تھا' اب ٹھیک ہوں۔'' ساحر نے کہا۔
''وہ وہی تھی۔''
''کون وہی۔''
''وہی چہرہ جسے میں برسوں سے تلاش کررہا ہوں۔''
''اوہ سمجھا...... تمہارا برسوں پرانا خواب وہ فلم تو تم اسے اپنی فلم میں ہیروئن لینا چاہتے ہو...... سویرا کو؟''
''نہیں یار سویرا سے پہلے جو کمرے میں آئی تھی۔''
''تم نتاشا کی دوست کی بات کررہے ہو۔'' اس کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔
''ہاں وہی۔''
''اگر وہ فلموں میں کام کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوئی تو۔'' رامیس نے کہا۔
''اس نے انکار کیا تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔ چلو ہمیں ابھی اس سے بات کرنی چاہیے۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔''
''اتنی جلدی کیا ہے؟ میں نتاشا کے ذریعے اس سے بات کرلوں گا۔''
''نہیں اٹھو ہم ابھی بات کریں گے۔'' ساحر نے اٹھتے

ہوئے کہا۔

وہ دونوں نتاشا کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ رامیس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

ساحر بھی اس کے ساتھ تھا..... نتاشا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی میک اپ کر رہی تھی..... جبکہ وہ صوفے پر بیٹھی تھی..... وہ غالباً کہیں باہر جانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

''بھائی جان آپ۔'' نتاشا آئینے میں رامیس کے عکس کو دیکھ کر چونکی پھر پلٹ کر بولی۔ ''آپ نے میری دوست کو بلاوجہ کیوں ڈانٹا اسے پتہ نہیں تھا کہ یہاں شوٹنگ چل رہی ہے۔'' پھر وہ ساحر کی طرف دیکھ کر چونکی اور سوالیہ نظروں سے رامیس کو دیکھنے لگی۔

''میں ان سے سوری کہنے ہی آیا ہوں۔ مجھے ان سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' وہ اس لڑکی کی جانب دیکھ کر بولا جسے ساحر پہلے ہی ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔

''یہ ساحر مراد ہیں مشہور فلم پروڈیوسر اور میرے بہترین دوست۔'' اس نے ساحر کا تعارف کروایا تو وہ ایک دم چونکا۔

''یہ ربیکا ہے میری دوست۔'' نتاشا نے ربیکا کا تعارف کروایا۔ ''آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں بیٹھ جائیں۔'' نتاشا نے صوفے کے قریب پڑی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ساحر صاحب آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ میں اور ربیکا آپ کی فلمیں بہت شوق سے دیکھتے ہیں اور اس وقت بھی ہم جنت دیکھنے جا رہے تھے۔'' ربیکا بھی دلچسپی سے ساحر کو دیکھ رہی تھی۔

''اوہ واقعی ..... یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔'' ساحر نے کہا۔

''ہم اس وقت ان کی ایک فلم پر ہی بات کرنے آئے ہیں۔'' رامیس نے تمہید باندھی۔ ''جیسا کہ مس ربیکا آپ جانتی ہیں کہ ساحر صاحب بہت صاف ستھری اور اچھی فلمیں بناتے ہیں' ایسی ہی ایک گریٹ فلم وہ مستقبل میں بنانا چاہتے ہیں جس کا خواب انہوں نے برسوں پہلے دیکھا تھا۔ لیکن وہ فلم اس لیے نہیں بن سکی تھی کہ ان کے ذہن میں ہیروئن کا جو تصور تھا اس پر کوئی لڑکی پوری نہیں اترتی تھی..... لیکن آج آپ ان کے اس تصور پر پوری اتری ہیں اور انہیں یہ امید پیدا ہوگئی ہے کہ اب ان کا وہ برسوں پرانا خواب پورا ہو سکتا ہے۔''

وہ ہونق بنی باری باری انہیں دیکھ رہی تھی۔

''میں سمجھی نہیں..... آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟'' کافی دیر بعد وہ بولی تھی۔ نتاشا بھی حیران نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''ربیکا صاحبہ! بلاشبہ آپ بے حد حسین ہیں مگر میری پسندیدگی کی وجہ صرف آپ کا حسن نہیں بلکہ میری حیرت اور مسرت کی وجہ یہ ہے کہ میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو آپ کے ذریعے تکمیل تک پہنچ سکتی ہے۔ میں اس فلم کے ذریعے حب الوطنی کا پیغام اپنی قوم کو دینا چاہتا ہوں۔ وہ کیریکٹر صرف آپ کر سکتی ہیں۔ میں جس لڑکی کی تلاش میں برسوں سے سرگرداں ہوں' وہ آپ ہیں' اب آپ ہی بتایئے اتنے طویل انتظار کے بعد کسی کو اچانک اپنے خوابوں کی تعبیر مل جائے تو اس کا کیا حال ہوگا۔''

''آ..... آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔'' ربیکا کی آواز میں لرزش تھی۔

''ہرگز نہیں..... میری آپ سے التجا ہے میری بات مان لیں۔''

''یہ میرے بس میں نہیں۔''

''آپ مجھے بتایئے کیا قباحت ہے؟''

''میری والدہ اجازت نہیں دیں گی۔ آپ کو تو پتا ہے فلمی دنیا کا ماحول۔''

''اب تو بہت اچھے اور شریف گھرانوں کی لڑکیاں اس طرف آ رہی ہیں۔ ماحول تو انسان خود بناتا ہے۔ میرے پاس اس کا حل ہے۔ میں آپ کی والدہ کو منالوں تو کیا آپ مان جائیں گی۔'' وہ نیم رضامند دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''آپ بات کر کے دیکھ لیں۔''

☆......☆......☆

ساحر مستقبل کے حسین تصور میں کھویا ہوا تھا' اس کے برسوں کے خواب کی تعبیر ملنے والی تھی۔ وہ اور رامیس نتاشا کے ساتھ ربیکا کے گھر جا رہے تھے۔ جو نتاشا کے گھر کے قریب ہی ساحل سمندر پر بنی ایک شاندار بلڈنگ کے

دوسرے فلور پر واقع ایک لگژری اپارٹمنٹ تھا۔

ربیکا اور اس کی امی نے بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا تھا۔ جب انہیں ساحر کی ان کے ہاں آمد کا مقصد معلوم ہوا تو وہ کچھ پریشان نظر آنے لگی تھیں اور انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ رامیس اور نتاشا کے سمجھانے بجھانے ساحر کے یقین دلانے اور کافی بحث و مباحثے کے بعد نیم رضامند ہوئی تھیں۔ ربیکا کو انہوں نے صرف ساحر کی ایک فلم میں کام کرنے کی اجازت دی تھی لیکن اس کے ساتھ انہوں نے انہیں اس بات پر خبردار بھی کیا تھا کہ ربیکا کے ددھیال والے اس کے فلم پر کام کرنے پر اعتراض کر سکتے ہیں اور کوئی رکاوٹ بھی کھڑی کر سکتے ہیں۔

اپنے ماضی کے حوالے سے انہوں نے جو تفصیل بتائی تھی اس کے مطابق وہ چوہدری افضل نامی شخص کی دوسری بیوی تھیں جن کا دو سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ چوہدری صاحب نے یہ لگژری اپارٹمنٹ اور خاطر خواہ رقم ان کے اکاؤنٹ میں چھوڑی تھی۔ جس سے یہ ماں بیٹی عیش و عشرت کے ساتھ تمام زندگی باآسانی گزار سکتی تھیں لیکن جاتے جاتے وہ ایک غلط فیصلہ بھی کر گئے تھے۔ اپنی بیٹی ربیکا کی منگنی اپنی بہن کے بیٹے چوہدری فرزین کے ساتھ کرنے کا فیصلہ جو ان ماں بیٹی کو بالکل پسند نہیں تھا کیونکہ فرزین ایک بگڑا ہوا رئیس زادہ تھا' اور معاشرے کی تمام برائیاں اس کے اندر پائی جاتی تھیں۔ چوہدری افضل کی وفات کے بعد وہ ان کے خاندان سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی تھیں اس لیے انہوں نے ربیکا کی منگنی توڑنے کا فیصلہ کیا تھا جو انہیں پہلے ہی ناپسند تھا۔ اور اس پر تین ماہ پہلے ہی عمل درآمد کیا تھا۔ جسے فرزین نے اپنی توہین سمجھا تھا اور بڑا سیخ پا ہوا تھا۔ بہرحال وقت گزرنے کے ساتھ شاید اس نے یہ فیصلہ قبول کر لیا تھا اب اس خاندان کا ان کے گھرانے سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔

☆......☆......☆

ربیکا بڑی ذہین لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ ساحر بڑا خوش تھا۔ اس نے اسکرپٹ ربیکا کو پڑھنے کے لیے دیا تھا۔ جلد ہی اس نے اپنا کردار اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ یہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ایک فائٹر لڑکی کا کردار تھا' جو وطن عزیز کی حفاظت کے لیے اپنی جان قربان کر دیتی ہے۔

ساحر نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ فلم کی شوٹنگ زیادہ تر آؤٹ ڈور کرے گا۔ ان دنوں وہ اسی سلسلے میں لوکیشنز تلاش کر رہا تھا۔ کبھی کبھی ربیکا بھی اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ ورنہ زیادہ تر وقت ان کا اسٹوڈیو میں گزرتا تھا۔ وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتا تو ربیکا باہر نکل جاتی اور ادھر ادھر دوسرے اسٹوڈیو کے چکر لگانے لگتی۔

اس روز اس کو اپنی فلم کا ٹائٹل سانگ ریکارڈ کرنا تھا۔ تمام دن کی محنت کے بعد کہیں جا کر گانا ریکارڈ ہوا تھا۔ وہ جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے ربیکا کا خیال آیا' اس نے اس کی تلاش میں چاروں طرف دیکھا وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ اس نے پیون سے پوچھا تو اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ اسے ڈھونڈنے باہر نکل گیا۔

اچانک اس کی نظر عادل پر پڑی جو اسی طرف چلا آرہا تھا اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی۔ وہ بھی اس کی طرف بڑھنے لگا۔ عادل کو علم ہو گیا تھا کہ ساحر اپنی نئی فلم کا گانا ریکارڈ کر رہا ہے۔ ذرا آگے جا کر ساحر کی نظریں عادل کی ساتھی لڑکی پر پڑیں تو وہ ٹھٹک گیا۔ وہ ربیکا تھی۔

وہ دونوں ہنستے ہوئے اسکے قریب آ گئے۔

''ہیلو۔'' عادل نے بڑی خوش دلی سے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''بھئی بڑی خوشی ہوئی یہ سن کر کہ تم نے اپنی مشہور زمانہ فلم شروع کر دی ہے۔''

ساحر نے کوئی جواب نہیں دیا بس ناراضگی سے ربیکا کو دیکھتا رہا۔

''عادل صاحب تو بڑے خوش مزاج اور دل چسپ آدمی ہیں۔'' وہ معصومیت سے ہنستے ہوئے بولی۔

''کیا بات ہے ساحر۔'' عادل نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اتنے گم صم کیوں ہو؟''

''وجہ شاید تم کو معلوم ہے۔'' ساحر نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اوہ'' عادل نے قہقہہ لگایا۔ ''تمہاری تازہ دریافت ہے بڑی باصلاحیت' میں انہیں اپنی آئندہ آنے والی فلم میں کاسٹ کر رہا ہوں۔'' ربیکا نے چونک کر عادل کو دیکھا۔

''تم جا کر آفس میں بیٹھو میں آ رہا ہوں۔'' ساحر نے ربیکا سے کہا تو وہ وہاں سے چلی گئی۔

''وہ میرے علاوہ کسی اور فلم میں کام نہیں کرے گی اس کی والدہ نے اسے صرف ایک فلم میں کام کرنے کی اجازت دی ہے۔''

''اجازت لینا میرا کام ہے۔ تمہیں پتا ہے میں ہمیشہ ٹیلنٹ کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ میری فلم میں تو وہ کام ضرور کرے گی۔'' عادل نے بے پروائی سے کہا۔

ساحر یہ سن کر ششدر رہ گیا۔ ساحر کو ایسا لگا کہ جیسے عادل نے اس کی زندگی اس سے چھین لی ہو۔ عادل فلم تیزی سے بناتا تھا اگر وہ کسی طرح ربیکا کو آمادہ کر لیتا اور اپنی بے ڈھنگی فلم میں چانس دے دیتا تو اس کا امیج تباہ کر دیتا۔ یہ سوچ کر وہ پریشان ہو گیا۔ ساحر کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

ساحر نے چونک کر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''تم اسے اپنی فلم میں رول نہیں دو گے۔''

''اس میں کیا حرج ہے؟ وہ اس نگری میں آئی ہے تو دوسرے پروڈیوسر بھی اسے کاسٹ کریں گے۔ وہ تمہاری ملکیت تو نہیں ہے جو تم سے اجازت لی جائے۔'' عادل کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ ساحر کو کتنی بڑی چوٹ دے سکتا ہے۔ عادل کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔

''میں تم سے پرانے تعلقات کے حوالے سے التجا کرتا ہوں کہ فی الحال اسے کاسٹ نہ کرو۔ میری فلم ریلیز ہونے دو میری بات مان لو۔'' ساحر کو ڈر تھا کہ وہ اپنی چرب زبانی سے ربیکا اور اس کی امی کو اپنی فلم میں کام کرنے پر آمادہ کر لے گا۔

عادل اس کی حالت زار پر خوش ہو رہا تھا' اب آیا نا اونٹ پہاڑ کے نیچے' اب دیکھوں گا تمہیں۔ اس نے سوچا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہو؟''

''تم نہیں سمجھو گے' خدا حافظ۔'' ساحر تیزی سے گھوما اور چلا گیا۔

''تم باہر کیوں گئی تھیں۔ عادل سے کیوں ملی تھیں؟'' وہ اپنے آفس میں پہنچتے ہی ربیکا پر برس پڑا۔

''تو کیا ہوا' اس میں پریشانی کی کیا بات ہے اور یہ آپ مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہیں۔'' وہ خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

''پریشانی کی بات ہے کان کھول کر سن لو تم عادل کی کوئی آفر قبول نہیں کرو گی بلکہ کسی کی بھی کوئی آفر قبول نہیں کرو گی۔''

''جی۔'' ساحر کا یہ رویہ اس کے لیے ناقابل فہم تھا۔

''وہ فارمولا فلمیں بناتا ہے اور اس کی ہیروئن عریانیت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ وہ تمہیں اس طرح فوکس کرے گا کہ تمہیں پتا ہی نہیں چلے گا بے وقوف لڑکی وہ تمہارا امیج خراب کرنا چاہتا ہے' وہ تمہیں تباہ کرنا چاہتا ہے اور مجھے برباد کرنا چاہتا ہے۔''

''وہ ایسا کیوں چاہیں گے۔ وہ بتا رہے تھے کہ آپ دونوں بچپن کے دوست ہیں۔'' وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

''ہونہہ دوست......'' کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ''چلو اٹھو تمہیں گھر چھوڑ دوں۔'' وہ خاموشی سے اٹھی اور اس کے ساتھ باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن ساحر حسب معمول دیر سے سو کر اٹھا تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے انگڑائی لی اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے اخبار اٹھایا جو ملازم صبح رکھ گیا تھا۔ اس نے اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑائی' وہی گھسی پٹی خبریں تھیں' ملکی سیاست کی ابتری کی حادثات' قتل' ڈاکہ' اغوا کی وارداتوں کی خبریں اس نے شوبز سے متعلق صفحہ کھولا' نمایاں انداز میں شائع شدہ ایک تصویر نے اسے چونکا دیا۔ اس کے سارے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے تصویر کو گھورے جا رہا تھا۔ وہ ربیکا کی تصویر تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کا انٹرویو چھپا تھا۔ اس کا سر گھوم گیا اس نے اسی وقت اپنا موبائل اٹھایا اور ربیکا کا نمبر ڈائل کیا۔

''ہیلو۔'' ربیکا کی آواز آئی۔

''تم نے یہ انٹرویو کب دیا؟''

''کون سا انٹرویو......میں نے کوئی انٹرویو نہیں دیا۔''

''آج کا اخبار اٹھا کر دیکھو......شوبز کی چکا چوند نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔ اگر تمہیں پبلسٹی دینی ہوتی تو میں یہ کام بہت پہلے کر چکا ہوتا۔''

''ایک منٹ......'' ربیکا نے کہا پھر فون پر خاموشی

چھا گئی۔

''یقین کیجیے میں نے کوئی انٹرویو نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولی تھی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا...... وہ یاد آیا میں عادل صاحب کے سیٹ پر گئی تھی وہاں ایک لڑکی آ کر مجھ سے باتیں کرنے لگی تھی' وہ صحافی تھی لیکن اس نے مجھے یہ بات نہیں بتائی تھی کہ وہ انٹرویو لے رہی ہے۔''

''میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ کسی اجنبی سے بات نہیں کرو گی...... یہ پبلسٹی اس موقع پر تمہارے اور میری فلم کے لیے کتنی خطرناک ہے تمہیں اندازہ نہیں ہے۔'' ساحر جھنجلا کر بولا۔

''آپ میری طرف سے بدگمان نہ ہوں...... میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔''

''تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ فلم میرے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے۔ میں آج تمہیں سب کچھ بتاؤں گا تم ابھی اسی وقت میرے پاس میرے گھر آ سکتی ہو۔''

''کیوں نہیں۔''

''ٹھیک ہے تم پہنچو۔''

آدھے گھنٹے میں ربیکا اس کے ڈرائنگ روم میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ساحر کے ڈیڈی بھی وہاں موجود تھے۔ ساحر نے ربیکا کا تعارف ڈیڈی سے کرایا پھر چائے کے دوران ساحر کے ڈیڈی ربیکا سے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کرید کرید کر سوالات کرتے رہے اس دوران ساحر کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا' کچھ دیر بعد ڈیڈی وہاں سے چلے گئے تو ساحر نے کہا۔

''تم اس دن مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ عادل میرا بچپن کا دوست ہے تو اب ہم دونوں میں اتنی دوری کیوں ہے؟''

''جی۔''

''آج میں تمہارے سامنے اپنی زندگی کی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔'' پھر ساحر نے اپنے ماضی کے ورق پلٹنے شروع کیے۔

☆......☆......☆

پہلی بار ان کا ساتھ اسکول کی چوتھی جماعت میں ہوا تھا۔ پس منظر کے اعتبار سے دونوں مختلف تھے۔ ساحر مراد نے ایک دولت مند گھرانے میں آنکھ کھولی تھی' اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے اس کی پرورش بڑے نازونعم سے ہوئی تھی۔ اس کے برعکس عادل مہدی کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا وہ اپنے پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس کا باپ ایک سرکاری ادارے میں کلرک اور ماں اسی سکول میں ٹیچر تھیں۔ ٹیچر ہونے کے باعث ہی عادل کا داخلہ اس اسکول میں ممکن ہوا تھا ورنہ اس اسکول میں صرف اعلیٰ اور امیر طبقے کے لوگ ہی اپنے بچوں کو پڑھا سکتے تھے۔

بہرحال ان تضادات کے علاوہ ان میں کئی قدریں مشترک تھیں۔ ان کے درمیان بلا کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ان کی سوچوں میں پختگی آتی گئی' یہ احساس اور بھی قوی ہوتا گیا' وہ دونوں ایک ہی انداز سے سوچتے تھے۔ دونوں آرٹ کے دلدادہ تھے۔ وہ ساتویں کلاس میں پہنچ گئے تھے۔ ان دونوں کی دلچسپیاں مشترک تھیں' دونوں فلمیں دیکھنے کے شوقین تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں بہت ذہین اور پڑھائی میں بھی بہت اچھے تھے۔ ان دونوں کا زیادہ تر وقت اب ایک ساتھ گزرتا تھا۔

اسکول سے چھٹی کے بعد بھی شام کو ان کا ایک دوسرے سے ملنا معمول بن گیا تھا۔ کبھی ساحر عادل کے گھر چلا آتا تو کبھی عادل اسکے ہاں آجاتا...... یوں وہ اکثر ساتھ ہی رہتے تھے۔ دونوں پہلی بار فلم دیکھنے گئے تو آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ یہ فلم انہوں نے گھر والوں سے چھپ کر دیکھی تھی۔

پھر وہ ہر ہفتے فلم دیکھنے جانے لگے۔ اکثر وہ ہالی وڈ کی فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ یہ بات عادل کے لیے سوہان روح ہوتی تھی کہ وہ فلم کے ٹکٹ اور کھانے پینے کا تمام خرچ ساحر اٹھاتا تھا۔ عادل کے پاس پیسے ہوتے نہیں تھے یہ بات اسے بہت کھٹکتی تھی لیکن فلم دیکھنے کے شوق کے آگے وہ بے بس ہوجاتا تھا۔ ان کے اندر فلم کو سمجھنے کا شعور فطری تھا' ان کی چھپی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہونے لگی تھیں۔ فلم کی تکنیکی باریکیوں کے بارے میں عادل ساحر سے کہیں آگے تھا۔ جلد ہی یہ نوبت آگئی کہ وہ فلم دیکھتے ہوئے اس کی تکنیکی خامیوں کی نشاندہی کرنے لگا۔

''یار لگتا ہے تم فلم ڈائریکٹر بنو گے۔'' ایک دن ساحر نے کہا۔

''موقع ملا تو ضرور بنوں گا' پھر دنیا کو بتاؤں گا کہ فلم کیسے بنائی جاتی ہے۔''

میٹرک کے بعد ان دونوں کا ساتھ کالج میں بھی رہا۔ ایک اہم بات یہ ہوئی کہ ساحر نے شعروشاعری شروع کردی ساتھ ہی وہ کہانیاں اور افسانے بھی لکھنے لگا۔ فلم سے دلچسپی کا بہرحال وہی حال رہا۔ عادل کو شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دوسری طرف شاعری کی وجہ سے ساحر کا حلقہ احباب وسیع ہو گیا تھا۔ ان دونوں کی دوستی ویسی ہی تھی مگر اب ساتھ گزرنے والا وقت کم ہو گیا تھا۔

وہ انٹر کے امتحانات سے فارغ ہوئے تھے جب ایک دن اچانک عادل کے ابا کا ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں انتقال ہو گیا' عادل اتنے بڑے صدمے سے سنبھل نہیں پارہا تھا' ساحر بھی اس فیملی کے لیے بڑا فکرمند تھا۔ انہی دنوں یونیورسٹی میں ایڈمیشن شروع ہو گئے وہ دونوں انٹرمیڈیٹ امتیازی نمبروں سے پاس کر چکے تھے۔ جب ساحر نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن کی بات کی تو وہ بولا۔

''سوری ساحر میں تو شاید اب تعلیم جاری نہ رکھ سکوں۔''

''کیوں؟''

''ابا کے مرنے کے بعد اس گھر کی ذمہ داریاں مجھ پر ہیں۔ امی کی تنخواہ سے گھر نہیں چل سکے گا۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔''

''تم کیا کرو گے؟''

''ملازمت کروں گا۔''

''گریجویشن کرلو گے تو اچھی ملازمت مل جائے گی۔''

''نہیں مجھے فوری طور پر کوشش کرنی ہوگی۔''

''اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟''

''کہو' عادل نے ہنکارا ابھرا۔

''جب تک تمہارا گریجویشن کمپلیٹ نہیں ہو جاتا میں.....''

''ہرگز نہیں میں اپنے بل بوتے پر زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا ایک اور راستہ بھی ہے۔ میں تمہیں ملازمت دلوا سکتا ہوں' وہاں پارٹ ٹائم کام کرو اور اپنی تعلیم بھی جاری رکھو۔''

''تم اپنے ڈیڈی کے آفس کی بات کر رہے ہونا۔''

''ہاں اس میں کیا حرج ہے۔ جیسے کہیں اور جاب کرو گے ویسے ہی وہاں کرنا۔''

''حرج تو کوئی نہیں لیکن میں فلم انڈسٹری میں قسمت آزمانا چاہتا ہوں۔ تمہیں پتا ہے وہ میرا پہلا عشق ہے۔''

''یہ بالی وڈ یا ہالی وڈ نہیں ہے' بھائی یہ پاکستانی فلم انڈسٹری ہے۔ اس کی زبوں حالی کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے۔''

''میں وہاں زیادہ ٹھوکریں نہیں کھاؤں گا۔ دشواری ہوئی تو تمہارے پاس ہی لوٹ کر آؤں گا۔ تمہارے علاوہ میرا اور کوئی دوست نہیں ہے۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''تمہاری مرضی......'' ساحر نے دل گرفتگی سے کہا۔

''مجھے افسوس ہے تم مجھے اپنا نہیں سمجھتے۔'' عادل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ساحر کے چہرے پر اداسی تھی اور آنکھوں میں نمی۔ اس نے ساحر کو لپٹا لیا۔

''کیسی باتیں کرتے ہو یار' تم میرے واحد دوست ہو۔''

''بس دیکھ لی تمہاری دوستی آگے بھی دیکھ لیں گے۔'' وہ اداسی سے بولا۔

یوں وہ جدا ہو گئے۔ ان کے درمیان سیکڑوں میلوں کے فاصلے حائل ہو گئے۔ عادل قسمت آزمانے لاہور چلا گیا۔ یہ مکمل جدائی تھی' لیکن ساحر کو یقین تھا کہ وہ دوبارہ ملیں گے کب کہاں اور کن حالات میں یہ پتا نہیں تھا۔

☆......☆......☆

گورا رنگ' سیاہ چمکیلی بڑی بڑی آنکھیں' خوبصورت بال اونچے قد اور کسرتی جسم والا ساحر مراد بہت جلد یونیورسٹی میں مقبول ہو گیا تھا۔ خاص طور پر طالبات میں اس کے بڑے چرچے تھے۔ گفتگو وہ بڑی خوبصورت کرتا تھا۔ خوش اخلاق تھا' خوش لباس تھا اور سب سے بڑی بات وہ اپنی چمکتی دمکتی قیمتی کار میں یونیورسٹی آتا تھا۔ شاعر تھا افسانہ نگار تھا اسی لیے جلد مقبول ہو گیا تھا۔ لڑکیوں میں وہ مغرور مشہور تھا اور کسی سے بات نہیں کرتا تھا کتنی ہی لڑکیوں نے اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تھی مگر خوش اخلاقی اور دلکش گفتگو سے زیادہ بات آگے نہیں بڑھی تھی۔

ساحر سب کچھ جانتا تھا...... وہ جانتا تھا کہ کتنی لڑکیاں اس کے قرب کی خواہش مند ہیں۔ وہ حسن پرست تو تھا مگر عیاش نہ تھا۔ عیاش ہوتا تو نہ جانے کیا نتیجہ نکلتا۔ بہرحال لڑکیاں اسے اچھی لگتی تھیں مگر ابھی وہ شادی یا محبت کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے سینے میں تو کوئی اور شعلہ روشن تھا اور اس کے ذہن میں آئیڈیے پرورش پا رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن وہ بہترین فلم بنائے گا۔ اسی لیے اس نے یونیورسٹی میں ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کا انتخاب کیا تھا۔

اسے پاکستانی فلم انڈسٹری سے شکایت تھی۔ جہاں زیادہ تر فارمولہ فلمیں بنائی جارہی تھیں لچر اور بے مقصد ان کا معیار مسلسل گر رہا تھا۔ کوئی پڑھا لکھا ذہن اس میدان میں اترنے کو تیار ہی نہیں تھا۔

ساحر جانتا تھا کہ ایک جاندار کہانی' اسکرین پلے اور حقیقت سے قریب ترین کردار نگاری ایک کامیاب فلم کی ضمانت ہوتے ہیں۔ وہ سوچا کرتا اوہ ایسی فلم بنائے گا...... کافی عرصے تک یہ خیال اس کے ذہن پر چھایا رہا' اس نے کسی کے سامنے اپنے اس خیال کا تذکرہ نہیں کیا تھا پھر اس کے پاس کوئی ایسا موضوع یا خیال بھی نہیں تھا جو وہ کسی کے سامنے پیش کرتا۔

یونیورسٹی کے فائنل ایگزام سے فارغ ہونے کے بعد اس کا زیادہ تر وقت لکھنے لکھانے میں صرف ہونے لگا ڈیڈی اب اسے اکثر کاروبار سنبھالنے کو کہتے تھے مگر اس کا رجحان ادھر تھا ہی نہیں...... وہ تو فن کی دنیا میں ڈوبا ہوا ایک حساس انسان تھا۔

وہ فلم کے لیے ایک منفرد کہانی لکھنا چاہتا تھا۔ کہانیاں تو اس نے اب تک بے حساب لکھی تھیں مگر فلم کے لیے لکھنا اور بات تھی جس کا اسے اب تک کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ہالی وڈ کی فلموں سے اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ذہین تھا' وہ تصور میں اپنی فلم کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا رہتا جو کہانی اس نے لکھنا تھی وہ پوری اس نے اپنے ذہن کی اسکرین پر دیکھ ڈالی تھی' اب صرف اسے کاغذ پر منتقل کرنا تھا۔ وہ پوری فلم اس نے لکھ ڈالی' ایک ایک منظر' ایک ایک شاٹ اس نے لکھ لیا...... آخر کار اسکرپٹ مکمل ہوگیا' لیکن وہ مطمئن نہیں تھا...... وہ بڑا پرفیکشنٹ تھا...... چوتھی بار لکھنے کے بعد وہ کہیں مطمئن ہوا تھا۔ اب مرحلہ تھا اسکرپٹ کو کسی فلم ساز کو دکھانے کا...... جہانگیر حسن اس وقت فلم نگری کا کامیاب ترین پروڈیوسر تھا' اس سے ملنے ساحر نے لاہور جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

اس دوران اس کا عادل سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے شاید اپنا موبائل نمبر بھی چینج کردیا تھا۔ وہ اس کی والدہ سے ملنے اس کے گھر گیا تو وہاں اجنبی لوگوں کو دیکھ کر حیران ہوگیا تھا۔ وہاں جاکر پتا چلا تھا کہ اس کی والدہ کرائے کا یہ مکان چھوڑ کر اپنے بچوں کے ساتھ لاہور شفٹ ہوگئی ہیں۔ لاہور کا ایڈریس کسی کے پاس نہیں تھا یوں عادل سے دوبارہ ملنے کی ہر امید وہیں دم توڑ گئی تھی۔ وہ تھک ہار کر واپس آ گیا تھا اس نے سوچا تھا لاہور جاکر وہ عادل کو تلاش کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

لاہور پہنچ کر اس نے سوچا کہ پہلے جہانگیر حسن سے فون پر بات کرلی جائے تاکہ ملاقات میں آسانی ہو۔ یہی سوچ کر اس نے جہانگیر کے اسٹوڈیو کا نمبر ملایا جو اسے کافی مشکل سے ملا تھا۔ دوسری طرف سے ''ہیلو'' کہا گیا۔

''مجھے جہانگیر صاحب سے بات کرنی ہے۔''

''آپ کون؟'' بے حد رکھائی سے پوچھا گیا۔

''میں ساحر مراد بات کررہا ہوں کراچی سے آیا ہوں اور ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''وہ فلم کے سیٹ پر گئے ہیں۔'' اس بار نرم لہجے میں کہا گیا۔

''وہ کب تک واپس آئیں گے؟'' اس نے بے حد وقار سے پوچھا۔

''کچھ کہا نہیں جاسکتا' آپ رات بارہ کے بعد فون کریں۔''

ساحر نے بارہ بجے فون کیا تو پتا چلا کہ وہ ابھی مزید ایک گھنٹے اور مصروف رہے گا۔ اسے بھی ضد ہوگئی تھی' بالآخر دو بجے وہ اس سے بات کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

''جہانگیر صاحب ہیں۔''

''بول رہا ہوں بابا۔'' دوسری طرف سے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا گیا۔ ساحر کو یقین نہیں آیا۔ ''آپ جہانگیر صاحب بات کررہے ہیں؟''

''ارے ہاں کیا بات کرنی ہے تم کو بولو۔'' ساحر دم بخود

تھا۔

یہ وہی جہانگیر تھا جس کا فلم انڈسٹری میں اتنا بڑا نام تھا۔ وہ لہجے سے تو چٹا ان پڑھ لگ رہا تھا۔

"میرا نام ساحر ہے میں رائٹر ہوں' کراچی سے آیا ہوں' میں نے ایک فلم لکھی ہے' یہ اسکرپٹ میں آپ کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"تمہارا نام تو میں نے نہیں سنا...... اس سے پہلے کتنی فلمیں لکھ چکے ہو؟"

"یہ میرا پہلا اسکرپٹ ہے۔ ویسے میں اتنا گم نام بھی نہیں ہوں۔" ساحر جلدی سے بولا۔

"بھئی میرے کو ضرورت نہیں اسکرپٹ کی۔"

"آپ ایک نظر دیکھ تو لیں۔"

"ٹھیک ہے تم اتنی دور سے آئے ہو تو دیکھ لیتا ہوں' کل شام کو آ کر مل لینا۔"

اگلے روز شام چھ بجے ساحر اسٹوڈیو پہنچا تو گیٹ بند تھا اور ایک لمبا تڑنگا بڑی بڑی مونچھوں والا چوکیدار گیٹ کے پاس اسٹول پر بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ ساحر نے کچھ فاصلے پر گاڑی پارک کی اور گیٹ سے اندر جانا ہی چاہتا تھا کہ چوکیدار نے آواز دی۔ "رکو...... کدر جاتا ہے؟"

"اندر جانا ہے۔" ساحر نے کہا۔

"نہیں جاسکتا۔"

"کیوں نہیں جاسکتا......" ساحر کو اس لہجے کا کبھی سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

"مجھے جہانگیر صاحب نے بلایا ہے۔" وہ بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا۔ چوکیدار نے بڑے مشکوک انداز میں اسے دیکھا۔ "پر اس نے تو میرے کو نئیں بتایا' وہ کسی کو بلاتا ہے تو ام کو پہلے بول دیتا ہے' یہاں ہیرو بننے بڑے لڑکا لوگ آتا ہے اور اندر جانے کا نیا نیا بہانہ بناتا ہے۔"

ساحر نے تو یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں اسے اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا...... وہ واپس جانے کے لیے پلٹنے ہی والا تھا کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا...... اس نے پلٹ کر دیکھا' چند لمحے تو وہ اسے پہچان ہی نہیں سکا...... وہ بہت بدل بھی تو گیا تھا۔

"نہیں پہچانے۔"

قابل رشک

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں' جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید لیکن قیامت کے دن اللہ کی طرف سے ان کو ملنے والے رتبے اور مقام پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے' یہ وہ لوگ ہوں گے جو بغیر کسی رشتے داری اور لین دین کے صرف اللہ کی رضا کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ان کے چہرے روشن ہوں گے اور وہ نور کے منبروں پر جلوہ افروز ہوں گے۔

(سنن ابوداؤد)

قسموں کو پورا کرنا

حضرت براء بن عارف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم لوگوں کو سات چیزوں کا حکم فرمایا۔ "جنازوں کے پیچھے چلنا' بیماروں کی مزاج پرسی کے لیے جانا' چھینک کا جواب دینا' (یعنی جس وقت کوئی چھینکنے والا شخص الحمدللہ کہے تو اس وقت یرحمک اللہ کہنا) اور جب کوئی شخص دعوت کرے تو اس کو قبول کرنا' اور مظلوم کی مدد کرنا (یعنی جس شخص پر ظلم ہو یا یا ظلم ہو رہا ہو تو اس کی مدد کرنا جس طریقہ سے بھی ممکن ہو سکے) اور قسموں کو سچا کرنا (جائز قسم کھانے کے بعد اس کو پورا کرنا)' سلام کا جواب دینا۔

(سنن نسائی شریف باب ابرار القسم)

ایسا ہوتا ہے

دنیا میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب بیٹے کو دنیا حاصل ہوتی ہے' روزی کی بہتات ہوتی ہے' اس کے خزانے مال و دولت سے پر ہو جاتے ہیں' بہت زیادہ کشادگی حاصل ہو جاتی ہے اور خوب صورت بیوی اسے اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے تو وہ اپنے والدین سے بے توجہی برتنے لگتا ہے' اپنے باپ کو اور جو کچھ اس نے اس پر خرچ کیا اور جو احسانات کیے تھے وہ سب بھول جاتا ہے' اس پر کچھ خرچ کرنے سے اپنا ہاتھ روک لیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس پر اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے۔

نورالدین...... کراچی

آواز سنتے ہی وہ اسے پہچان گیا۔ ''عادل تم......'' وہ اس سے لپٹ گیا تھا۔

وہ برسوں کے بعد ملے تھے دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ پھر دونوں نے پیچھے ہٹ کر ایک دوسرے کو بغور دیکھا۔

''تم بالکل نہیں بدلے۔'' عادل نے کہا۔

''اور تم بہت بدل گئے ہو۔'' ساحر بولا۔

چوکیدار عادل کو جانتا تھا' انہیں ایک دوسرے سے بغلگیر دیکھ کر وہ بے پروائی سے اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا۔

''مجھے تو بدلنا ہی تھا دوست...... وقت بھی تو کتنا بدل گیا ہے۔'' عادل نے افسردگی سے کہا۔

''ہاں چھ سال ہو گئے۔'' ساحر نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''میں تمہارے گھر گیا تھا' وہاں پتا چلا کہ سب گھر والے لاہور شفٹ ہو گئے ہیں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس طرح یہاں تم سے ملاقات ہو گی۔''

''زندگی بدل گئی ہے یار۔'' عادل نے کہا۔

''میں نے تم سے رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی' مگر تم نے شاید اپنا فون نمبر تبدیل کر لیا ہے۔ تمہیں بھی میری یاد نہیں آئی۔''

''ان گزرے ماہ و سالوں میں خود کو بھی بھول چکا ہوں۔ کسی کی یاد کیا آتی۔ حالات کی سختیوں نے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہارے پاس دوستوں کو یاد کرنے کی فرصت ہے۔'' اس کے لہجے میں بلا کی تلخی تھی۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ یہاں کیسے آنا ہوا؟''

''بس یار ایک اسکرپٹ لے کر آیا تھا جہانگیر صاحب کے پاس۔ کل ان سے فون پر بات ہوئی تھی مگر یہ چوکیدار مجھے اندر ہی نہیں جانے دے رہا۔''

''یہ بے چارہ مجبور ہے' یہاں روز بہت سے لوگ آتے ہیں اور ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں' خیر تم نے لکھا ہے اسکرپٹ...... ابھی تک دماغ میں وہی خناس موجود ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''نہ صرف موجود ہے بلکہ پہلے سے تو انا بھی ہو گیا ہے لیکن تم بتاؤ تم یہاں کیسے؟''

''مزدوری کر رہا ہوں۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''جہانگیر صاحب کا اسسٹنٹ ہوں۔''

''زبردست یار۔'' ساحر خوشی سے بولا۔

''یہ دنیا ہماری سوچوں اور خوابوں سے بہت مختلف ہے دوست۔ لیکن تم ابھی نہیں سمجھو گے۔ چلو اپنے ارمان پورے کر لو میں تمہیں ان سے ملوا دیتا ہوں۔''

وہ اسے اندر لے گیا...... سامنے خوبصورت لان تھا اور اطراف میں اسٹوڈیو کی عمارت تھی۔ نچلی منزل پر ایک لمبی سی راہداری تھی اور بے شمار دروازے تھے۔ دروازوں پر مختلف ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ عادل اسے جہانگیر پکچرز کے دفتر میں لے گیا۔

جہانگیر اس کے تصور سے زیادہ مایوس کن تھا۔ پچاس پچپن سالہ فربہ جسم' گول چہرہ' چھوٹی چھوٹی بے چین آنکھیں سر سے گنجا اپنی کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس کے پہلو میں لگی کرسی پر ایک بھڑکیلے میک اپ اور قابل اعتراض لباس میں کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کا کھلا گریبان دعوت نظارہ دے رہا تھا۔

جیسے ہی عادل بمعہ ساحر کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اچھل پڑا۔

''ارے بابا دور ہٹ کر بیٹھ کتنی بار تیرے کو بولا ہے چپکا نہیں کر۔''

''دور سے آپ کو نظر نہیں آتا نا۔ اسی لیے دوسری لڑکیوں کو چانس دے رہے ہیں' میں تو آپ کو نظر ہی نہیں آتی۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔

''چانس دوں گا نہ بابا' تیرے کو ہیروئن بناؤں گا نازو تو پھکر نہ کر بول دیا نا۔ وہ نازو نامی اس لڑکی کا گال سہلاتا ہوا بولا۔

ساحر نے گلا کھنکارا جہانگیر نے چونک کر اسے دیکھا پھر عادل پر نظر پڑتے ہی مسکرایا۔ ''اچھا ہوا تو آ گیا ذرا سیٹ پر جا' سنبھال لے گا نا آج۔'' جہانگیر نازو کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''سنبھال لوں گا آپ فکر نہ کریں۔'' عادل نے کہا۔

''یہ میرا دوست ہے ساحر۔''

''آؤ آؤ۔'' اس نے ساحر سے ہاتھ ملایا۔ ''ہیرو بننے کا ہے کا؟''

''نہیں جناب......بس......''

''ارے کیوں نہیں بننا چاہتا' تم تو بنا بنایا ہیرو ہے کیوں عادل؟'' اس نے عادل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ رائٹر ہے'' عادل بولا۔

''میری کل رات آپ سے بات ہوئی تھی۔'' ساحر نے یاد دلایا۔ وہ جہانگیر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اچھا تو تم عادل کا دوست بھی ہے۔''

''جی۔''

''کیا کہانی ہے؟''

ساحر نے اسکرپٹ کا پلندہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ لیجیے۔ اس پر میں نے بہت محنت کی ہے۔''

''ارے بابا ہٹاؤ اسے اس کا میں کیا کروں گا مجھے کہانی سناؤ کہانی۔'' جہانگیر نے بےزار لہجے میں کہا۔

ساحر حیرانی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ ''کہانی سناؤں۔''

''ہاں بابا آئیڈیا کیا ہے' اچھا لگا تو فلم بناؤں گا۔''

''اسکرپٹ پڑھے بغیر۔''

اسکرپٹ کا ٹینشن تم کیوں لیتا ہے' وہ میں خود لکھوالوں گا۔ تم خالی آئیڈیا سناؤ۔''

ساحر کو چکر آ گیا۔ ''جہانگیر صاحب میں اسکرپٹ پڑھ کر آپ کو کہانی سنادوں گا۔'' عادل نے بات سنبھالی۔

''ٹھیک ہے جیسی تیری مرضی۔'' جہانگیر نے بے دلی سے کہا۔

''تم ایسا کرو ایک دو دن میں چکر لگاؤ میں تمہیں بتادوں گا۔''

ساحر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا۔ وہ دونوں اسٹوڈیو کی کینٹین میں چلے آئے تھے۔ عادل نے چائے کا آرڈر دیا۔

''یہاں سیٹ پر ہی کام ہوتا ہے' اسکرپٹ اور مکالمے سیٹ پر ہی لکھے جاتے ہیں تاکہ اگر ایکٹر کو ادائیگی میں مشکل پیش آ رہی ہو تو تبدیل کیے جاسکیں۔'' عادل نے کہا۔

ساحر ابھی تک شاک کی کیفیت میں تھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا یہاں کیسے کام ہوتا ہے؟''

''پہلے میری بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا' لو چائے پیو' کچھ سمجھنے کی کوشش نہ کرو جیسا چل رہا ہے چلنے دو۔'' اس نے چائے کی پیالی ساحر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ جو کچھ دیر پہلے بیرا رکھ گیا تھا۔

''میں یہ فلم ضرور بناؤں گا۔'' اس نے اسکرپٹ کے پلندے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس بے قاعدگی سے نہیں بلکہ طریقے سے بناؤں گا۔''

''تم نہیں بنا پاؤ گے۔'' عادل نے بے رحمی سے کہا۔ وہ عادل کو دیکھ کر رہ گیا۔

''خیر چھوڑو میں اسکرپٹ پڑھ کر جہانگیر سے خود بات کرلوں گا' تم ایک ہفتے بعد آنا۔''

''ٹھیک ہے یار۔'' دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

اتنے برسوں بعد ملے ہیں دل چاہ رہا ہے خوب باتیں کریں مگر مجھے ایک شوٹنگ نمٹانی ہے۔ خیر پھر بھی سہی' آؤ میں تمہیں چوکیدار سے ملوا دوں وہ آئندہ تمہیں نہیں روکے گا۔ پھر دونوں کے درمیان فون نمبرز کے تبادلے ہوئے اور ساحر اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ وہ اسٹوڈیو سے بڑا دلگرفتہ لوٹا تھا۔ وہاں اس کی کوئی پذیرائی نہیں ہوئی تھی۔

جہانگیر سے دوسری ملاقات اس کی فلم کے سیٹ پر ہوئی تھی۔ اس بار اس نے دیکھا کہ فلم کیسے بنائی جاتی ہے اسکرپٹ کیسے لکھا جاتا ہے' وہ دیکھ رہا تھا اور عبرت پکڑ رہا تھا۔ اسی وقت جہانگیر کی نظر اس پر پڑی۔

''عادل اس کا اسکرپٹ واپس کردو۔'' عادل جو کیمرہ مین کو کوئی ہدایت دے رہا تھا ان کے قریب چلا آیا۔

''بہتر۔'' قریب آ کر وہ بولا۔

''کیا وہ آپ کو پسند نہیں آیا؟'' ساحر کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''دیکھو تم نوجوان نہیں سمجھے فلم ایسے نہیں بنتی۔ عادل تو سمجھا اپنے دوست کو۔''

عادل اس کا ہاتھ تھامے جہانگیر کے آفس میں لے آیا میز پر اس کا اسکرپٹ رکھا تھا وہ اٹھایا اور کہا چلو کینٹین میں چل کر بات کرتے ہیں۔ چائے کا آرڈر دینے کے بعد عادل نے بات شروع کی۔

''میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا کہ یہاں کس طرح کام ہوتا ہے۔''

''لیکن یہ غلط ہے۔''

''مانتا ہوں مگر میں اور تم کیا کرسکتے ہیں' یہی زندگی کی اصل حقیقت ہے۔ تمہارے دماغ میں ابھی تک کتابی

باتیں لکھی ہوئی ہیں جن کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ تم جیسے سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے لوگوں کو کیا پتا کہ قدم کیسے جمائے جاتے ہیں۔ کچھ دن یہاں ٹھوکریں کھاؤ سب سمجھ جاؤ گے۔" ساحر ہکابکا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی دولت کا حوالہ دیتے ہوئے اس کے لہجے میں جو نفرت تھی اس نے ساحر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اتنا پرانا اور اچھا دوست جو کبھی اس کا ہم خیال تھا آج کس انداز میں بات کر رہا تھا۔ کیا وہ اس سے حسد کرتا تھا' اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"تم نے میرا اسکرپٹ پڑھا ہے۔" کافی دیر بعد ساحر نے پوچھا۔

"بہت اچھا ہے...... مگر اس پر فلم بنانا آسان نہیں ہے۔ اس پر فلم بنی تو فلاپ ہوگی۔ ہمارے ماحول میں یہ فلم نہیں چلے گی' یہاں صرف مرچ مسالہ ٹائپ فلمیں ہی کامیاب ہوتی ہیں۔"

"یہ ایک صاف ستھری بامقصد اور خوبصورت فلم ہوگی جو تم کر رہے ہو یہ تمہارا کام نہیں یار' ڈائریکشن تو تم سیکھ ہی چکے ہو' تم یہ فلم ڈائریکٹ کرو۔ سرمایہ میں لگاؤں گا۔ ایسی فلم بنانا ہم دونوں کا خواب تھا۔"

"نہیں دوست تمہارا خواب تمہیں مبارک ہو۔ میرے خواب تو کب کے اپنی موت آپ مر چکے ہیں۔ مجھے فلم بنانی ہوگی تو خود بناؤں گا۔ تمہاری مالی مدد تو میں نے اس وقت بھی قبول نہیں کی تھی جب مجھے اس کی اشد ضرورت تھی۔ دولت سے تم مجھے نہیں خرید سکتے۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔" عادل نے تلخی سے کہا۔ "اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے تم خود جدوجہد کرو جیسے میں نے کی ہے۔ دیکھ لو میں تمہاری دولت نہ لینے کے باوجود تم سے کہیں آگے ہوں۔"

عادل کے تلخ و ترش جملوں پر وہ بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا۔ اس کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

"تم بہت بدل گئے ہو عادل۔" ساحر نے مایوسی سے کہا۔ اور میز پر رکھا ہوا اپنا اسکرپٹ اٹھالیا۔ "لگتا ہے تم گزرے ہوئے ان برسوں کا ساتھ بھول گئے' اب شاید ہماری کبھی ملاقات نہ ہو۔"

"میں بھی تم سے ملنا نہیں چاہتا۔" عادل نے سفاکی سے کہا۔

یہ جان کر ساحر کو بڑی تکلیف پہنچی تھی کہ جسے وہ جگری یار سمجھتا تھا وہ اس سے حسد میں مبتلا تھا۔ حیران و پریشان ساحر وہاں سے نکل گیا۔

عادل اپنی جگہ بیٹھا کھولتا رہا۔ وہ اس وقت ساحر سے نفرت محسوس کر رہا تھا۔ اسکرپٹ پڑھنے کے بعد سے اس کا یہ حال تھا۔ وہ سوچتا رہا تھا کہ ایسی عظیم فلم بنانا تو اس کا خواب تھا جو وہ اپنی کم مائیگی کی بنا پر پورا نہیں کر پایا تھا۔

ساحر اس کا بچپن کا دوست تھا۔ اس کا دولت مند ہونا اس وقت بھی اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ ساحر کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوتی تھیں اور وہ خالی ہاتھ ہوتا تھا۔ دولت کے حوالے سے ساحر ایک ایسا آئینہ تھا جس میں عادل کو اپنی محرومیاں نظر آتی تھیں۔ وہ اس کے سامنے احساس کمتری میں مبتلا رہتا تھا۔ وہ کامیاب و کامران ہونا چاہتا تھا اس کے لیے اس نے بڑی جدوجہد کی تھی۔ بڑی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ اب جب کہ وہ کامیابی کی سیڑھیوں پر قدم رکھ رہا تھا' وہ نہ جانے کہاں سے دوبارہ آ گیا تھا' اس کی محرومیوں کا احساس دلانے اسے ناکام ثابت کرنے۔ وہ ایک کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹک رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اس کانٹے کو نکال دینا چاہتا تھا۔

ساحر کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ پھر فلم نگری کا رخ کرتا۔ اس کی ایک جھلک ہی اس کے لیے کافی تھی لیکن دکھ اسے اس بات کا تھا کہ وہ اپنا عزیز ترین دوست کھو بیٹھا تھا۔ عادل کے رویے سے اسے بڑی تکلیف پہنچی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ عادل ابتدا ہی سے احساس محرومی کا شکار تھا اور اس سے حسد کرتا تھا' اس طبقاتی فرق نے ان کی دوستی کو نگل لیا تھا۔

اب اس کے سامنے عادل کا چیلنج تھا' اس نے کہا تھا اپنے خواب پورا کرنے کے لیے خود جدوجہد کرو' ساحر نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا تھا مگر دل میں اس نے یہ چیلنج قبول کر لیا تھا۔

اب اسے نئے سرے سے جدوجہد کرنی تھی۔ اسی سلسلے میں وہ ڈیڈی سے بات کرنے آیا تھا۔ وہ اپنے بیڈ پر نیم دراز تھے۔

''آؤ بیٹے خیریت تو ہے بیٹھو۔'' وہ بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''آپ سے اک ضروری بات کرنی تھی۔''

''اچھا مجھے بھی تم سے بات کرنی ہے۔''

''آپ کیسے ڈیڈی کیا بات ہے؟''

''تمہاری تعلیم مکمل ہو چکی ہے اب کاروبار سنبھالو۔''

''ڈیڈی آپ جانتے ہیں یہ کاروبار میرے بس کا نہیں۔'' ساحر نے کہا۔

''تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''میں اسی سلسلے میں آپ کے پاس آیا تھا۔ میں فلم بنانا چاہتا ہوں' فلم بھی ایک بزنس ہے اور اس میں منافع بھی زیادہ ہے۔''

وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر ان کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''تم اس میدان میں بھی بزنس نہیں کرو گے مجھے معلوم ہے خیر اگر یہ تمہاری خواہش ہے تو ضرور پورا کرو۔ بچپن سے میں نے تمہاری ہر خواہش کو پورا کیا ہے تو آج کیسے انکار کر سکتا ہوں۔'' اس کی ماں کی وفات کے بعد اس کے ڈیڈی اس کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھنے لگے تھے۔

''لیکن ڈیڈی اس سے پہلے میں فلم پروڈکشن کی تربیت لینے باہر جانا چاہتا ہوں۔''

''یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں جو چاہو کرو۔'' آخر کار وہ باہر چلا گیا۔

☆......☆......☆

دو سال بیت گئے تھے۔ دی اسٹینڈر فلمز کے آفس میں بڑی سی میز کے عقب میں ریوالونگ چیئر پر عادل مہدی بیٹھا تھا۔ آفس کا دروازہ کھلا اور پیون اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں اخبارات کا پلندا تھا' جو اس نے عادل کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ عادل نے ایک مشہور اخبار کا فلمی صفحہ اٹھایا' عادل کو مسکراتے دیکھ کر اس کا اسسٹنٹ بولا۔

''کیا خبر ہے سر؟''

''ہماری فلم جوانی دیوانی کو سراہا جا رہا ہے۔'' عادل بولا۔

''فلم ہے ہی اچھی۔'' اسسٹنٹ نے کہا۔

عادل اخبار پر نظریں دوڑا رہا تھا اچانک اس کی نظر ایک سرخی پر جم کر رہ گئی۔ ''یہ کیا بکواس ہے کیا بے تکا تبصرہ لکھا ہے۔''

''کیا ہماری کسی فلم پر۔'' اسسٹنٹ نے کہا۔

''نہیں۔'' عادل نے جھٹکے سے کہا۔ اس بے وقوف ساحر کی فلم کے بارے میں لکھا ہے۔ اسے سال کی سب سے بہترین فلم قرار دیا گیا ہے۔''

''ارے سر وہ امریکا پلٹ ہے اسی لیے سب صحافی اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ کامیابی کا فیصلہ تو باکس آفس میں ہوتا ہے۔''

''ایک تو تم بولتے بہت ہو۔''

''ہونہہ فلم بنانے چلے ہیں۔'' عادل نے اخبار ایک طرف اچھالا۔ ''تم نے اس کی فلم دیکھی ہے۔''

''بکواس ہے سر میرے تو سر کے دو فٹ اوپر سے گزر گئی۔'' اسسٹنٹ نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

''خاموش رہو پھر اس کی اتنی تعریف کیوں ہو رہی ہے؟''

''اس نے مٹھی گرم کی ہوگی صحافی کی جبھی اس نے اتنی تعریفیں لکھی ہیں۔ آپ کو نہیں پتا آج کل کیا چل رہا ہے۔ سب بکاؤ ہیں۔ ہماری فلم جوانی دیوانی کا ایک شو بھی نہیں ٹوٹا ہے' پہلے دن کی طرح رش لے رہی ہے' یہ ہے اس کی مقبولیت کا عالم اور یہ احمق صحافی ساحر کے گن گا رہا ہے۔''

داؤد ربانی کاروباری معاملات میں بڑا تیز تھا' اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ کامیاب فلمیں بنانے کے لیے جس پروڈیوسر کی ضرورت ہے وہ عادل ہی ہے۔ عادل کے ساتھ اس نے دو فلمیں بنائی تھیں جو بڑی دھانسو ثابت ہوئی تھیں۔ اس کے بعد داؤد ربانی نے عادل کے ساتھ معاہدہ کر لیا تھا۔ اب دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ ان کی نئی فلم جوانی دیوانی نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی تھی۔ یہ ایک عریاں وفحاشی سے بھرپور مسالہ فلم تھی' سیٹھ کی تجوری بھر گئی تھی۔

عادل اس وقت سیٹھ داؤد کے سامنے اس کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔

''کیا ہوا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟''

''بات ہی ایسی ہوگئی ہے۔''

''کیا ہوا؟'' داؤد نے تشویش زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''مجھے غصہ آ رہا ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی' محنت ہم

برسوں سے کر رہے ہیں اور وہ کل کے آئے ہوئے پروڈیوسر کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔''

''ارے بابا بولنے دو ان کو ان کا کام ہی بولنا ہے' پبلک جو مانگتی ہے پبلک کو دو اور مال بناؤ خلاص...... اپن کو کونسا ایوارڈ لینا ہے۔ اپنے کو خالی پیسہ چاہیے پیسہ...... یہ باتیں چھوڑو نیکسٹ فلم کے بارے میں سوچو...... کوئی دھانسو آئیڈیا لاؤ۔ اور سنو اس فلم میں جس لڑکی سے آئیٹم سانگ کروایا تھا' اسی سے نیکسٹ فلم میں آئیٹم کروانا۔ اسے دیکھ کر تو میری حالت خراب ہو جاتی ہے' پبلک کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ بڑی گرم لڑکی ہے یار۔''

ساحر نے تمام اخبارات بڑے غور سے پڑھے تھے۔ وہ مطمئن تھا' اس کی پہلی فلم جنت لوگوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ ''آسمان تک'' اس کی دوسری فلم تھی۔ اخبارات میں اس پر مثبت تبصرے شائع ہو رہے تھے۔ فلم کے پریمیئر میں فلم انڈسٹری کے تمام بڑے اور اہم لوگوں نے شرکت کی تھی وہاں صحافیوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اب اگلا مرحلہ اسے عام نمائش کے لیے پیش کیے جانے کا تھا۔ اسے عوامی ردعمل دیکھنا تھا' کیونکہ اصل فیصلہ تو عوام ہی کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ تھا کہ فلم باکس آفس پر کتنا بزنس کرتی ہے۔ خود اسے پرواہ نہیں تھی مگر ڈیڈی کے نکتہ نظر کا بھی اسے خیال رکھنا تھا۔ اس کے ڈیڈی ایک کامیاب بزنس مین تھے وہ اسے بھی کامیاب دیکھنا چاہتے تھے۔

وہ اسٹوڈیو جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اس کے ڈیڈی آ گئے۔

''مبارک ہو بیٹے اخبارات میں تمہاری اس فلم کو بہت سراہا گیا ہے۔ بزنس کے اعتبار سے فلم کیسی رہے گی؟'' انہوں نے پوچھا۔ وہ ملک کے ایک نامی گرامی صنعت کار تھے اور بچپن سے ہی کاروبار میں پڑ گئے تھے۔ انہوں نے یہ مقام اپنی ذہانت اور محنت سے حاصل کیا تھا۔ آج ملک کے امیر ترین لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ ساحر کو بھی اپنی طرح ایک کامیاب بزنس مین دیکھنا چاہتے تھے مگر اس کا مزاج الگ تھا۔ بہرحال انہوں نے ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ انہیں حیرت اس بات کی تھی کہ اپنی پہلی فلم جنت پر اس نے زیادہ سرمایہ نہیں لگایا تھا یہ فلم کم بجٹ میں بنی تھی اور ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی تھی۔ اسے بہت منافع ہوا تھا۔

''فیصلہ تو فلم کی ریلیز پر ہی ہوگا ڈیڈی۔'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ابھی تو مجھے وہ فلم بنانی ہے جس کا خواب میں نے برسوں پہلے دیکھا تھا۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ تمہارا کوئی خواب بھی ہے۔'' انہوں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں ڈیڈی بہت پہلے میں نے ایک اسکرپٹ لکھا تھا جو فلم انڈسٹری نے مسترد کر دیا تھا۔ میں اس پر فلم بنانا چاہتا ہوں۔ یہ کسی کا چیلنج بھی ہے۔ صرف اسی چیلنج کو قبول کرتے ہوئے میں اس انڈسٹری میں آیا ہوں۔''

''یہ تو بڑی جذباتیت ہے بیٹے' کاروبار میں جذبات نہیں چلتے بہرحال تمہاری باتیں تم جانو۔'' انہوں نے کہا اور کمرے سے چلے گئے۔

وہ فلم بنانے سے پہلے ساحر کو اپنی ساکھ بنانی تھی پھر وہ فلم...... موو آن فلمز کے بینر تلے اس کی دو فلمیں کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھیں اور فلم بینوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

راتوں رات ساحر سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ لوگ اسے مبارک باد دے رہے تھے۔ اب باری تھی اس فلم کی جس کے لیے اس نے یہ تمام جدوجہد کی تھی۔ وہ لڑکی اسے مل گئی تھی جسے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کرنا تھا۔ ربیکا اس کے تصور کے عین مطابق تھی۔ لیکن عادل اسے ناکام کرنے کے لیے سازشوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عادل اسے شکست سے ہمکنار کرنے کے لیے ہر حربہ آزمائے گا۔ اس نے ربیکا کے ذریعے اس پر شب خون مارا تھا۔ وہ ربیکا کو ورغلانے کی کوششوں میں مصروف تھا ساحر کو ڈر تھا کہ ربیکا اپنی سادگی اور معصومیت کی وجہ سے اس شاطر کے جال میں پھنس سکتی تھی۔ اسی بات نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ وہ ازحد پریشان تھا۔ اسی لیے وہ اپنی فلم اور ربیکا کی پبلسٹی بھی نہیں کر رہا تھا بلکہ ربیکا کو صحافیوں سے دور رہنے کا مشورہ دیا ہوا تھا' لیکن آج صبح جب اس نے ربیکا کا انٹرویو اخبار میں پڑھا تو اس کے پیر تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ بہت افسردہ تھا۔ اسے

اپنا خواب بکھرتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ جب اسے کچھ سجھائی نہ دیا تو اس نے ربیکا کو بلوایا تھا اور اپنی داستان حیات کا ایک ایک ورق اسے دکھایا تھا۔

ربیکا یہ تمام داستان سن کر آبدیدہ اور گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ ساحر کی باتوں نے اس کی سوچوں کا رخ بدل دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اس فلم کے لیے اتنی سنجیدہ نہیں تھی۔ اس کے وجود میں ایک شعلہ سا روشن ہوگیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی انسان کی شخصیت میں انقلاب کتنی آسانی سے رونما ہوتے ہیں۔ اس کی شخصیت میں بھی ایک انقلاب آیا تھا اب وہ یہ کردار ادا کرنے کے لیے بے چین تھی۔

''آپ کا خواب اب میرا خواب ہے۔ ہم اس فلم کو جلد از جلد تکمیل کریں گے۔'' وہ بغور ساحر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ آپ کو اب مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی، آپ شوٹنگ کا شیڈول بنالیں میں تیار ہوں۔''

ساحر کے دل سے جیسے کوئی بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ ربیکا کو رخصت کرکے وہ پرسکون انداز میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب دیر نہیں کرنا چاہیے۔ فلم کی شوٹنگ شروع کردینی چاہیے۔

ساحر نے اس فلم کے کچھ مناظر کی شوٹنگ کے لیے لوکیشن تلاش کرلی تھی۔ یہ ملک کے شمالی علاقے کا ایک دور دراز گاؤں تھا۔ ساحر کو یہ جگہ بہت پسند آئی تھی۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے جو راستہ تھا وہ انتہائی دشوار گزار تھا راستے کے ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف کھائیاں تھیں۔ یونٹ کے افراد اس کے اسسٹنٹ کے ہمراہ پہلے ہی وہاں جاچکے تھے اور شوٹنگ کی تیاریاں کررہے تھے۔

ربیکا ساحر کی گاڑی میں پچھلی نشست پر اس کے ساتھ بیٹھی تھی گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ گاؤں تک پہنچنے والا دشوار گزار راستہ شروع ہوگیا تھا۔ ساحر بہت خوش تھا۔ اس کی برسوں کی خواہش تکمیل پارہی تھی۔

عادل نے ربیکا سے رابطہ کرنے کی بڑی کوشش کی تھی مگر وہ ناکام رہا تھا نہ تو وہ اس کا فون سن رہی تھی نا ہی میسج کا کوئی جواب دے رہی تھی۔ وہ نہ جانے کیوں اس سے کترا رہی تھی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ ساحر فلم کی شوٹنگ کے لیے شمالی علاقے کی طرف گیا ہے۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اگر یہ فلم بن گئی تو ایک عظیم فلم ثابت ہوگی جو مدتوں یاد رکھی جائے گی۔ کسی طرح یہ فلم نہ بن سکی تو ساحر کی تباہی یقینی تھی، لیکن کیسے...... اس کا منصوبہ ساز ذہن کئی منصوبے بنا کر رد کرچکا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا ذہن جواب دے چکا تھا۔ اس وقت اس کی یہ حالت تھی کہ انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ وہ اس وقت اندھا دھند ڈرائیونگ کررہا تھا۔

ہر طرف شام کا ملگجا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ وحشیانہ انداز میں ڈرائیو کررہا تھا۔ اس کے دانت بڑی سختی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے اور ماتھے پر شکنوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ اس کی مطلوبہ کار سے اس کا فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا۔ اس دن کا اس نے بڑی بے چینی سے انتظار کیا تھا۔ یہ موقع قدرت نے اسے فراہم کیا تھا کہ اس کی موت حادثہ نظر آتی۔ اور وہ صاف بچ جاتا۔ فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا۔

ساحر کا ڈرائیور سمجھا کہ پیچھے آنے والی کار آگے نکلنا چاہتی ہے۔ اس نے سائیڈ ہوکر گاڑی کو آگے جانے کا اشارہ دیا، مگر یہ کیا پیچھے آنے والی سفید کار تیزی سے اس کے برابر آئی اور اسے ایک زوردار ٹکر ماری...... ساحر کی گاڑی تیزی سے لہرائی، ڈرائیور نے ماہرانہ انداز میں اس پر قابو پالیا اور اسپیڈ بڑھادی۔ ربیکا کی سریلی چیخ کار میں گونجی، ساحر بھی متوحش ہوگیا۔ پچھلی کار نے بھی اسپیڈ بڑھادی تھی وہ دوبارہ اس کے برابر آگئی۔ اس کی ٹکر زوردار تھی، اس بار ساحر کی کار ڈرائیور کے قابو سے باہر ہوگئی اور لہراتی ہوئی کھائی کی طرف بڑھنے لگی۔ ساحر اور ربیکا کی آنکھوں میں حیرت، بے یقینی اور خوف کے تاثرات منجمد ہوکر رہ گئے تھے۔ جبکہ ڈرائیور کار پر قابو پانے کی سرتوڑ کوشش کررہا تھا مگر بے سود، کار کھائی میں گرچکی تھی۔ پچھلی کار کے ڈرائیور نے مڑ کر اس کار کو کھائی میں گرتے ہوئے فاتحانہ انداز سے دیکھا اور مطمئن ہوکر کار آگے بڑھادی۔

یہ سب کچھ چشم زدن میں ہوگیا تھا۔ اتفاق سے ان کے پیچھے ایک مال بردار ٹرک بھی تھا جس کے ڈرائیور نے حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے ٹکر مارنے والی کار کا نمبر نوٹ کرلیا تھا۔ کار کی نمبر پلیٹ لاہور کی تھی۔ اس حادثے کے نتیجے میں ڈرائیور موقع پر ہی ہلاک ہوگیا تھا۔ جبکہ لڑکی کا چہرہ لہولہان تھا مگر اس کی سانسیں چل رہی تھیں، جبکہ نوجوان

بے ہوش تھا' بظاہر اس کے جسم پر کسی زخم کا نشان نہیں تھا...... ان کی قسمت نے یاوری کی تھی اس مقام پر کھائی زیادہ گہری نہیں تھی' ان کے زندہ بچ جانے کی بظاہر یہی وجہ نظر آرہی تھی۔ ٹرک ڈرائیور نے مقامی لوگوں کی مدد سے ڈرائیور کی لاش اور دونوں زخمیوں کو قریب ترین اسپتال پہنچادیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں پولیس جائے حادثہ پر پہنچ گئی تھی اور ابتدائی تفتیش مکمل کرلی تھی۔ ربیکا کی حالت بڑی تشویش ناک تھی اس کے چہرے اور گردن پر گہرے زخم آئے تھے۔ جبکہ ساحر کی ریڑھ کی ہڈی کو نقصان پہنچا تھا اور حادثے کے بعد سے وہ مسلسل بے ہوش تھا۔ ساحر اور ربیکا کو لاہور کے ایک بڑے اور پرائیویٹ اسپتال میں لے جایا گیا تھا جہاں ساحر کا آپریشن جاری تھا' اس کی ریڑھ کی ہڈی میں فریکچر تھا۔ آپریشن ناکام ہوا تھا' اس کا نچلا دھڑ ناکارہ ہوگیا تھا لیکن ڈاکٹرز نے امید ظاہر کی تھی کہ ایک آپریشن بعد میں مزید کیا جائے گا جس سے وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوجائے گا۔ ربیکا کے چہرے اور گردن کے ٹشوز پھٹ گئے تھے۔ اسٹچز کی وجہ سے اس کا خوبصورت چہرہ متاثر ہوا تھا۔ ربیکا کو اس کی ماں کسی اور اسپتال لے گئی تھیں۔ بہرحال ان دونوں کی جان بچ گئی تھی۔

ساحر کی آنکھ اسپتال کے بیڈ پر کھلی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ بیڈ کے برابر کرسی پر ڈیڈی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اپنی عمر سے کہیں بوڑھے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی آنکھیں سوجھی ہوئی اور چہرے پر شدید تھکن تھی۔ اسے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ اس کے قریب آگئے اور اس پر جھک کر بولے۔

''کیسی طبیعت ہے بیٹے؟''

''مجھے کیا ہوا ہے ڈیڈی میں اسپتال میں کیوں ہوں؟''

''تمہارے ساتھ ایک حادثہ ہوگیا تھا' تم بے ہوش ہوگئے تھے۔''

''تو کیا وہ خواب نہیں تھا؟' ساحر کا لہجہ عجیب سا ہوگیا۔

''ربیکا......''اس کی آنکھوں سے وحشت جھانکنے لگی۔

شکر ہے اللہ کا کہ تم دونوں کی جان بچ گئی۔ ڈرائیور موقع پر ہلاک ہوگیا تھا' اس کی تدفین ہوچکی ہے۔ اگر تمہیں فوری طبی امداد نہ دی جاتی تو......''

''کاش ایسا ہی ہوتا۔''

''ایسا نہ کہو بیٹا' تم میری زندگی ہو۔ میرے جینے کا سہارا' میری آخری امید۔''

''پولیس آئی تھی تمہارا بیان لینے لیکن تم بے ہوش تھے۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ کسی سے تمہاری ذاتی دشمنی تو نہیں یا کسی پر شک تو نہیں جو تمہاری جان لینا چاہتا ہو...... میں نے عادل پر شک کا اظہار کر دیا تھا' اسے پولیس نے حراست میں لے لیا ہے۔''

''عادل۔'' اس نے دانت بھینچ کر کہا۔ اس کے جسم میں لہو کی گردش تیز ہو گئی تھی۔

اسی وقت ایک نرس کمرے میں آئی۔

''انہیں ہوش آ گیا۔'' وہ بولی۔ ''ڈاکٹر نے کہا تھا انہیں ہوش آ جائے تو انہیں اطلاع دی جائے۔''

''ابھی ہوش آیا ہے۔''

''میں ڈاکٹر صاحب کو بلاتی ہوں۔'' نرس کمرے سے چلی گئی۔

یہ حادثہ حادثہ نہیں اقدام قتل تھا۔ گزرے ہوئے واقعات اور حالات واضح طور پر عادل کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ وہ مجرم تھا۔ شدید زخمی ہونے والے ساحر کے والد نے بھی عادل پر شک ظاہر کیا تھا' انسپکٹر نے ایک گھنٹے کے اندر ہی اسے حادثے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے گرفتار کر لیا تھا جس کے نتیجے میں ایک شخص ہلاک اور دو شدید زخمی تھے لیکن تفتیش کی گاڑی آگے نہیں بڑھ پا رہی تھی۔

عادل نے صحت جرم سے صاف انکار کر دیا تھا۔ حادثے میں استعمال ہونے والی سفید کار کا بھی پتہ چل گیا تھا۔ وہ کار چوری کی تھی۔

کوئی عام آدمی ہوتا تو پولیس دو گھنٹے میں اس سے حقیقت اگلوا لیتی لیکن عادل کوئی عام آدمی نہیں تھا' ایک مشہور و مقبول فلم پروڈیوسر تھا۔ اس پر تھرڈ ڈگری نہیں آزمائی جا سکتی تھی۔ عادل نے پولیس کو حادثے کے وقت جائے حادثہ سے دوری اور لاہور میں اپنی موجودگی کے ٹھوس ثبوت فراہم کر دیے تھے۔ پولیس کا اسے اب حراست میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ پولیس اسے آزاد کرنے پر مجبور تھی۔ عادل کو پولیس نے چھوڑ دیا تھا اس وارننگ کے ساتھ کہ اسے دوبارہ کسی وقت بھی طلب کیا جا سکتا ہے۔ اس نے بھی پولیس کو اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا تھا۔

عادل رہا ہو گیا تھا لیکن ساحر جانتا تھا کہ اس حادثے کے پیچھے عادل کا ہاتھ ہے۔ وہی اس وقت اس کا بدترین دشمن تھا۔ اسپتال سے وہ گھر آ گیا تھا اور وہیل چیئر تک محدود تھا اس کا نچلا دھڑ بے جان تھا۔ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر ٹوٹ چکا تھا بکھر چکا تھا۔ وہ انتہائی افسردہ اور مایوس تھا' اس کی تو دنیا ہی تاریک ہو گئی تھی۔ اس کا خواب تعبیر پانے سے پہلے ہی بکھر گیا تھا۔ وہ خواب جس کی تعبیر کے لیے اس نے برسوں محنت کی تھی اور لامتناہی انتظار کیا تھا۔ اس کی وہ فلم آغاز سے پہلے ہی انجام کو پہنچ گئی تھی۔ اس نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا تھا۔ نا کسی سے ملتا تھا نہ بات کرتا تھا' ایک رامیس ہی تھا جس سے کبھی کبھار وہ مل لیتا تھا' ورنہ تو اس نے دنیا سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ رامیس سے ہی اسے پتا چلا تھا کہ ربیکا کی ماں اسے ملک سے باہر علاج کے لیے لے جانا چاہتی ہیں۔

''حوصلہ رکھو ساحر تمہارا غم بہت بڑا ہے لیکن جو غم دیتا ہے وہی حوصلہ بھی دیتا ہے' بس آدمی کو ذرا ہمت سے کام لینا چاہیے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے اور پہلے کی طرح.....'' رامیس نے کہا۔

''نہیں اب کچھ نہیں ہو سکتا۔'' ساحر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ سسک سسک کر رو رہا تھا۔

''ساحر یار حوصلے سے کام لو تم تو بڑے ہمت والے ہو۔'' رامیس اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے تسلی دے رہا تھا۔

ساحر نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیے تھے لیکن اس کا جسم اب بھی لرز رہا تھا۔

اس دوران متعدد بار عادل بھی اس سے ملنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ ڈیڈی اور رامیس کو نہ جانے کیسے اپنی بے گناہی کا یقین دلایا تھا مگر وہ اس پر یقین کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

''بیٹا ایک بار اس سے مل لو...... سن لو وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ سچ پوچھو تو مجھے یقین نہیں ہے کہ اس جرم کے پیچھے اس کا ہاتھ ہے۔ وہ تمہارا بچپن کا دوست ہے تم اس کے ساتھ

پلے بڑھے ہو' ساتھ رہے ہو۔" عادل اس شام ساحر کے گھر آیا تو ڈیڈی نے ساحر سے کہا تھا۔

"ڈیڈی آپ نہیں جانتے وہ بچپن سے مجھ سے حسد میں مبتلا رہا ہے۔ میری اس حالت کا ذمہ دار صرف اور صرف وہ ہے۔ آپ ایسے شخص کی حمایت کر رہے ہیں۔" ساحر نے بے یقینی سے کہا تھا۔

"میں اس کی حمایت نہیں کر رہا صرف یہ چاہتا ہوں ایک بار مل لو۔"

"اچھا بلایئے۔"

کچھ ہی دیر میں عادل اس کے کمرے میں موجود تھا۔ ساحر کو دیکھتے ہی وہ بانہیں پھیلائے اس سے ملنے کو آگے بڑھا' تو ساحر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟ میری شکست میری بے بسی کا تماشا دیکھنے؟" ساحر نے کہا۔

"میرے بھائی میرے دوست میں اس حادثے کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ میں حلف اٹھانے کے لیے تیار ہوں' میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ تمہاری پے درپے کامیابیوں کو دیکھ کر میں حسد میں مبتلا ہو گیا تھا مگر صرف کام اور کاروبار کی حد تک میں تمہارا حریف تھا۔ ذاتی طور پر تو میں تمہیں کوئی کانٹا چبھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اتنے برسوں کی انتھک محنت اور ٹھوکروں کے بعد بھی میں ان خوابوں کو نہیں پا سکا تھا جو ہم دونوں نے مل کر دیکھے تھے او رتم آتے ہی اس انڈسٹری پر چھا گئے تھے۔ میں تمہارے کام میں رخنے ڈال رہا تھا مگر تمہیں یا تمہاری ٹیم کو کوئی تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"بس بند کرو اپنی فالتو باتیں' اور نکل جاؤ میرے گھر سے۔ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔" ساحر نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

"مجھے غلط نہ سمجھو دوست۔" عادل نے شرمندگی سے کہا۔ "تمہاری اس حالت پر میں بہت رنجیدہ ہوں۔ اس ایلیسے نے ہمارے درمیان ہر اختلاف کو ختم کر دیا ہے۔ میں غلطی پر تھا مجھے معاف کر دو۔" وہ زمین پر اس کے قدموں میں بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"میں تمہارا وہی دوست ہوں' جو تم سے محبت کرتا تھا۔ تمہارے ساتھ گھر والوں سے چھپ چھپ کر فلمیں دیکھتا تھا۔

اس بار ساحر سے ضبط نہ ہوا اور رونے لگا۔ عادل بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

"فکر نہ کرنا دوست تمہارا وہ خواب ضرور پورا ہوگا۔" عادل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور آنسو پونچھتا ہوا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

یہ عادل سے اس کی آخری ملاقات تھی۔ پھر عادل کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ وہ لاہور میں نہیں تھا۔ اس کے عزیز و اقارب کو بھی معلوم نہیں تھا یا وہ اس کی روپوشی پر پردہ ڈال رہے تھے۔ بہرحال کسی کو معلوم نہیں تھا کہ عادل کہاں گیا۔ اس کی زیر تکمیل فلمیں التوا کا شکار تھیں' فلمساز اور دیگر متعلقین اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے۔

ربیکا کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ اپنے علاج کے سلسلے میں لندن چلی گئی تھی' اور ہنوز واپس نہیں آئی تھی۔

تین سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران ساحر کے متعدد آپریشن ہوئے تھے بالآخر خدا کے فضل سے وہ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا لیکن اس نے پلٹ کر فلم انڈسٹری کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ اب وہ اپنے ڈیڈی کا بزنس سنبھال رہا تھا وقت نے بہت سے زخموں پر مرہم رکھ دیا تھا۔ اس کی زندگی رواں دواں اور پرسکون تھی بس کبھی کبھی ایک کسک سی اس کے دل میں ہوتی تھی۔ اس کا خواب ادھورا رہ جانے کی کسک۔

اس حادثے کی تفتیش میں پولیس ناکام رہی تھی اور اصل مجرم کا سراغ انہیں نہیں مل سکا تھا۔ اس کیس کی فائل پر وقت کی دھول جم گئی تھی کہ اس پولیس اسٹیشن میں جہاں حادثے کا مقدمہ درج کیا گیا تھا' ایک نیا انسپکٹر تبادلہ ہو کر آیا تھا۔ انسپکٹر جہاں زیب ایک ذہین' دیانت دار اور فرض شناس افسر تھا اس نے اس کیس پر از سر نو تفتیش شروع کر دی تھی۔

کڑیوں سے کڑیاں ملتی گئیں۔ اور تفتیش کا دائرہ لاہور کے علاقے ڈیفنس تک پھیل گیا جہاں مجرم کی رہائش گاہ تھی۔

یہ ایک خاصے متمول گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ جب انسپکٹر جہاں زیب نے ساحر کے ڈرائیور کے قتل اور ساحر اور ربیکا کو شدید زخمی کرنے کے الزام میں اسے گرفتار کیا تو

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے عرصے بعد پولیس اسے گرفتار کرلے گی۔
وہ پولیس کی تفتیش کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکا اور اس نے اقبال جرم کرلیا۔ اسی سلسلے میں انسپکٹر جہاں زیب نے ساحر کو پولیس اسٹیشن بلایا تھا۔
ٹھکرائے جانے کا احساس کسی جذباتی فرد کے لیے بڑا شدید ہوا کرتا ہے جو اسے ایک پل بھی چین نہیں لینے دیتا اور یہاں تو اس لڑکی نے اسے ٹھکرایا تھا جسے اس نے بچپن سے اپنے دل میں بسایا ہوا تھا۔ وہ طاقتور' گھمنڈی اور جذباتی نوجوان تھا' وہ اس سے انتقام لینا چاہتا تھا' منگنی توڑ کر گویا ربیکا نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا تھا۔ وہ اپنی یہ ہتک بھولا نہیں تھا اور اس دن اخبار میں ربیکا کی تصویر دیکھ کر اور فلمی دنیا میں اس کی وابستگی کی تفصیل پڑھ کر تو وہ غصہ میں آپے سے باہر ہوگیا تھا۔ ربیکا کا فلم میں کام کرنا اس نے اپنے اور اپنے خاندان کے لیے بے عزتی تصور کیا تھا...... اس خبر نے اس کے جذبہ انتقام کو سہ آتشہ کر دیا تھا۔
اس کے بعد فردین ربیکا کی کھوج میں رہنے لگا تھا اور مسلسل اس کا تعاقب کرتا رہتا تھا۔ جلد ہی اسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ ساحر کے ساتھ فلم کی شوٹنگ کے لیے شمالی علاقوں کی طرف جا رہی ہے۔ یہ اس کے لیے بہترین موقع تھا' وہاں راستے بڑے دشوار گزار تھے۔ وہ ربیکا کی موت کو بڑی آسانی سے حادثے کا رنگ دے کر صاف بچ سکتا تھا۔
ساحر سے اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ تو صرف ربیکا سے انتقام لینا چاہتا تھا...... لیکن اس حادثے میں ساحر اور ربیکا بچ گئے تھے اور ایک بے گناہ انسانی جان ضائع ہوگئی تھی۔
اس کا انتقام ادھورا رہ گیا تھا۔ ربیکا ملک سے باہر علاج کی غرض سے چلی گئی تھی۔ یوں وہ اس کی پہنچ سے بہت دور ہوگئی تھی۔ بے گناہ ڈرائیور کا لہو رائیگاں نہیں گیا تھا۔ اتنے عرصے بعد اس نے فردین کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیا تھا۔
فردین کو قانون کے شکنجے میں دیکھ کر ساحر حیران رہ گیا تھا۔ عادل کے حوالے سے وہ اپنے دل میں ندامت محسوس کر رہا تھا۔
اس کی بدگمانی سے عادل اتنا دل برداشتہ ہوا تھا کہ فلم انڈسٹری ہی چھوڑ گیا تھا۔ ''کہاں ہو دوست آ جاؤ' میں بہت شرمندہ ہوں۔'' ساحر نے سوچا تھا۔
اس دن رامیس ساحر کے آفس میں اس کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا۔
''تم نے کچھ سنا ساحر عادل اپنی کسی فلم کی شوٹنگ کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں اسے لاہور میں دیکھا گیا تھا۔ اس کی فلم تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔''
''کیا؟'' ساحر اچھل پڑا کہاں ہے وہ؟''
''آج کل وہ لاہور سے باہر آؤٹ ڈور شوٹنگ کر رہا ہے۔''
''اچھا جیسے ہی وہ لاہور آئے مجھے اطلاع ضرور دینا۔''
''ہوں۔'' پھر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہ چلا گیا تھا۔
ایک مہینہ بیت گیا تھا' عادل کی کوئی خیر خبر نہیں تھی نہ ہی عادل اس سے ملنے آیا تھا بلکہ آج ہی اسے عادل کی فلم ''آزادی'' کے پریمیئر شو کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔
پریمیئر شو میں فلم انڈسٹری کے بڑے بڑے لوگ مدعو تھے ان میں صحافی بھی موجود تھے۔ ساحر ڈیڈی کے ساتھ آیا تھا۔ وہ ڈیڈی کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا' اس نے ہال میں چاروں طرف نظر دوڑائی عادل اسے کہیں نظر نہیں آیا۔
فلم شروع ہوتے ہی ہال میں سناٹا چھا گیا۔ پہلے سین کو دیکھ کر ہی سب متحیر رہ گئے۔ عادل مہدی جو فارمولا فلموں کا روایتی ہدایت کار تھا اس سے اتنی موثر ابتدائی منظر کی عکس بندی کی توقع نہیں تھی۔ یہ ایک صحرا کا منظر تھا جسے عادل نے اپنی تمام تر جذباتیات کے ساتھ فلمایا تھا۔ اس خوبی کی توقع عادل سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ جوں جوں فلم آگے بڑھتی گئی۔ لوگوں پر سحر طاری کرتی گئی۔ ہر شخص محویت کے عالم میں فلم میں کھویا ہوا تھا۔ ہر چیز حقیقی اور جان دار تھی۔ ہیروئن کے روپ میں ربیکا کو دیکھ کر وہ بری طرح چونکا...... وہ اپنے کردار میں مکمل طور پر ڈھلی ہوئی تھی۔ ربیکا سے وہ اتنی اچھی اداکاری کی توقع نہیں کر سکتا تھا...... وہ اگر یہ فلم بناتا تو اتنے بھرپور تاثرات کے ساتھ فلم بند نہیں کر سکتا تھا' ساحر نے سوچا۔

وہ محویت کے عالم میں اپنے خواب کی تعبیر دیکھ رہا تھا۔ عادل نے فلم کے ایک ایک شاٹ پر محنت کی تھی۔ وہ فلم ساحر کے تصور سے بڑھ کر ثابت ہو رہی تھی۔ عادل کو خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ فلم اس نے بنائی ہے۔ اسے بنانے کے لیے اس نے بڑی محنت کی تھی۔ ربیکا کی صحت یابی اور پلاسٹک سرجری کے جانگسل مشکلات کو سہا تھا۔ جب جا کے اس خواب کو تعبیر ملی تھی۔ اور یہ اس کی محنت کا صلہ ملنے کا دن تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی خوبصورت اور بامقصد فلم بھی بنا سکتا ہے۔ یہ اس کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔

اچانک پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ عادل نے متلاشی نظروں سے ساحر کی طرف دیکھا جہاں ستائش کی تحریر لکھی تھی۔ فلم کی کامیابی اور مقبولیت کی سند اسے مل گئی۔ وہ خوشی سے کھل اٹھا...... فلم ختم ہو گئی تھی...... ساحر اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا فلم کے ٹائٹل آ رہے تھے...... آخری آنے والا ٹائٹل اس کے لیے دھماکا خیز تھا۔ ہدایت کار ساحر مراد...... ساحر نے بے یقینی سے اسکرین کو دیکھا لیکن یہ اس کی نظروں کا وہم نہیں تھا...... وہ اسی کا نام تھا' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

لوگ ہال سے نکل رہے تھے...... مگر وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے روئے جا رہا تھا...... اسے نزدیک ہی کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے آنسوؤں سے بھیگا ہوا اپنا چہرہ اوپر اٹھایا...... سامنے عادل کھڑا تھا۔

وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تم نے ایسا کیوں کیا عادل...... یہ فلم تمہاری ہے تم نے اس پر میرا نام کیوں دیا؟"

جواباً عادل نے اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ "دوست خواب چھینتے نہیں بلکہ انہیں تعبیر دیا کرتے ہیں۔" اس کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

"اتنے عرصے میں تم نے میری پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔" ساحر نے شکایتاً کہا۔

"تمہارے اس جنون نے مجھے مہلت ہی نہیں دی۔"

"کوئی بات نہیں' تم نے اس فلم کی شکل میں مجھے وہ تحفہ دیا ہے جس کا کوئی بدل نہیں آج تمہیں مجھ سے ایک وعدہ بھی کرنا ہوگا' آج کے بعد تم ایسی ہی صاف ستھری بامقصد فلمیں بناؤ گے۔ ہمیں اپنی قوم کو ایجوکیٹڈ کرنا ہے انہیں مفید اور اچھا انسان بنانا ہے۔"

"بے شک ہم دونوں مل کر ایسی ہی خوبصورت اور بامقصد فلمیں بنائیں گے۔"

"ویسے مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ تم نے ربیکا سے اتنی اچھی اداکاری کیسے کروالی۔ ربیکا نے تو کمال کر دیا۔"

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا وہ بڑی باصلاحیت ہے۔ لو وہ آ گئی' خود ہی اس کے سامنے اس کی تعریف کر دو۔ اس نے بڑی محنت کی ہے۔" وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا میک اپ سے بے نیاز سادہ سے لباس میں وہ بہت خوبصورت اور باوقار لگ رہی تھی۔ اس نے ساحر کو سلام کیا اور شرمیلے انداز میں کہا۔

"میں نے آپ کو مایوس تو نہیں کیا؟"

"نہیں تم نے تو کمال کر دیا۔"

"تمہارا خواب تو پورا ہو گیا بیٹا' میرے خواب کا کیا ہوگا؟" ڈیڈی نے کہا۔

"کونسا خواب؟" ساحر نے چونک کر کہا۔

"میری بہو اور پوتے پوتیوں کا خواب۔"

"آپ کا خواب ربیکا کی شکل میں یہاں موجود ہے۔ ساحر کے لیے اس کے دل میں چھپی محبت کا میں گواہ ہوں۔ اس عرصے میں پل پل اس نے تمہیں یاد کیا ہے۔" عادل نے ساحر کی طرف دیکھ کر کہا۔

ربیکا نے چونک کر عادل کو دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

❖

ہم سفر

یاسین صدیق

کچھ ہستیاں قریب ہوتے ہوئے بھی دل سے بہت دور ہوتی ہیں ہم سفر ہوتے ہوئے بھی ساتھ نہیں ہوتیں ایسے میں زندگی کسی عذاب سے کم نہیں ہوتی۔

ایک ادیب کا احوال حالات نے اسے تنہا کر دیا تھا

شبنمی رات دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ وہ دنوں لیٹے ہوئے تھے۔ عذرا نے رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھا۔

''آج بارہ فروری ہے۔ دو دن قبل ہماری شادی کو اٹھارہ سال ہو گئے تھے۔''

''مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ سالگرہ کے دن کا۔ اب میرے لیے صبح و شام، دن رات ایک جیسے ہو چکے ہیں سب دن ایک جیسے سب راتیں ایک جیسی...... نیا کیا ہے ان میں جو یاد رکھوں۔ تاریخ بدلنے سے کیا ہوتا ہے۔ زندگی بدلے تو۔۔۔۔'' وہ ایک لمحے کو رکا پھر کہا۔ ''تم ہی یاد دلا دیتیں۔''

عذرا نے پہلو بدلا۔ کہنے لگی۔

''کیا فرق پڑتا؟''

فیضان نے اس کی جانب دیکھا، اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔ غربت نے، اس کی ان سوچوں نے، اس کی ذہنی مسافت سے جو نتیجہ نکالا وہ بھیانک تھا اب اسے نہ اس کے بدن کا گداز پن محسوس ہوتا تھا، نہ بازو پر سر رکھنے سے انجانی وادیوں کے خواب آتے تھے، نہ ہی اب وہ فیضان کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی۔ وہ پاس پاس ہوتے۔ ساتھ ساتھ رہتے لیکن سوچوں کے دائرے الگ الگ ہوتے وہ کہہ رہا تھا۔

''ہر جاندار کے لئے ایک مخصوص دائرہ ہے۔ سب اپنے اپنے دائرے کے پابند ہیں۔ کوئی توڑ نہیں سکتا اس دائرے کو۔ زمین بھی اپنے دائرے میں گھوم رہی ہے۔''

فیضان کے لہجے میں حزن کی آمیزش نمایاں تھی۔ آنکھوں میں نیند بھری ہوتی۔ وہ عذرا کو دھیرے دھیرے سمجھاتا۔

''پرائے گھر میں دم گھٹتا ہے۔ کسی وقت بھی خالی کرنا پڑ سکتا ہے۔ پرائی نوکری ہے کسی وقت بھی چھٹی ہو سکتی ہے۔ اب باس کا رویہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ باس نے جتنے وعدے کیے تھے بار بار مجھے کہا تھا ''میرے پاس آ جاؤ کوئی پریشانی نہیں ہوگی' اب بھی اس نے پوچھا تک نہیں کہ ''کیسی گزر رہی ہے'' سلام دعا، اپنے اپنے کام کو روبوٹ کی طرح کرنا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر موڈ بن جانا۔ بلاضرورت بات تک نہ کرنا۔ میں اس کا وفادار رہوں۔ چاہے پانچ سال اور ایسے صبح شام کر دوں۔ کون سا اس نے اپنا کام کروا دیتا ہے حالانکہ اسٹامپ فروشی کا کام کروانے کا بھی اس نے وعدہ کیا تھا۔''

اسے اپنے باس سے کئی درجن شکایتیں تھیں۔ ایسی شکایتیں بیشتر چھوٹا کام کرنے والوں کو ہوتی ہیں۔ اس کے روز روز سمجھانے سے بتانے سے وہ تنگ آ جاتی۔ وہ کہتا رہتا اس کی آواز میں پچھتاوے ہوتے۔

''میں نے اتنا پڑھا ہی کیوں؟ مجھے پڑھنا ہی نہیں چاہئے تھا اور اب کیا ہوسکتا ہے تین سو روپے کی دہاڑی کرتے کرتے زندگی گزر جائے گی۔ اب کیا کیا جاسکتا ہے؟''

''آپ تو بہت سے کام کرسکتے ہیں۔ سبزی کی ریڑھی لگا سکتے ہیں۔''

وہ سوچتا۔

''نیا کام سیکھا نہیں جاسکتا۔ پچیس سال سے لکھنا پڑھنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہوا ہے۔ اپنا گھر ہو وہاں کوئی چھوٹا موٹا کام کروں گا'' بربادی کیسے ہوئی وہ دن یاد آتے اور پھر وہ اپنی بیوی سے آس بھرے لہجے میں کہتا

''ابھی بچوں کی شادیاں ہونی ہیں۔ کون کرے گا ان سے رشتے۔ بچیوں کا سوچو آج تجھے میں کہتا ہے ماں جیسی۔ کل تیری بیٹیوں کو اس کے سسرال والے کہیں گے ماں جیسی۔ دیکھو صرف اپنے گھر، اپنے بچوں اور اپنے خاوند کو سوچو۔''

عذرا کا صبر اس تقریر سے لبریز ہوگیا اور وہ بولی۔

''یہ تو اس وقت سوچنا تھا جب مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔''

وہ طیش اور بے بسی کے ملے جلے جذبات میں آکر کہنے لگا۔

''اچھا! تو تم بدلہ لے رہی ہو۔'' ایک لمحہ توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ''خاندان میں دیکھو سب کی زندگی اسی ضد اور بدلے نے تباہ کردی ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ بدلہ لینے کا نہیں ہوتا۔ وہ ایسا کرتے رہے ہیں یہ آگ ان

کے بچوں تک آ گئی ہے۔ ہم دونوں تک آ گئی ہے۔ اس آگ سے ہم نے اپنے بچوں کو بچانا ہے تو یہ ضد اور بدلہ چھوڑنا ہوگا۔"

"اللہ نے حضرت آدم وحوا کو پیدا کیا اور ان سے کہا کہ جنت میں خوش ہو کر رہو"

خوش ہو کر رہو پر وہ خاص کر زور دے رہا تھا۔

"وہ جنت میں خوش ہو کر رہنے لگے۔ شیطان سے میاں بیوی کا خوش ہو کر رہنا برداشت نہ ہوا۔ وہ ان کے پیچھے پڑ گیا کہ اس نے اماں حوا کے ذریعے اللہ کی نافرمانی کروائی اور ان کو جنت سے نکلوا کر دم لیا۔"

اسے صاف محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ تمہاری وجہ سے میں اپنی جنت سے الگ ہوا ہوں۔ تم نے مجھے جنت سے نکلوایا ہے۔ ماں باپ سے الگ کیا ہے۔ یہ بات تو وہ اکثر کہتا رہتا تھا۔

"میں خوش نہیں ہوں۔ تم بھی خوش نہیں ہو۔ ہماری خوشی ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔ میرے خوش رہنے سے تم خوش رہ سکتی ہو۔ میں اکیلا جتنی مرضی کوشش کر لوں۔ خوش نہیں رہ سکتا۔ نہ ہی تم ایسا کر سکتی ہو۔" کبھی وہ کہتا۔

"اچھی بیوی مل جائے تو زندگی جنت بن جاتی ہے۔"

عذرا کو محسوس ہوتا رہتا جیسے وہ اسے بری بیوی کہہ رہا ہے۔ پھر وہ میاں بیوی کے فرائض بتانے لگا۔

"اللہ نے کچھ بیوی کے فرائض رکھے وہ میاں کے حقوق ہیں ایسے ہی کچھ بیوی کے حقوق رکھے وہ میاں کے فرائض ہیں۔ اپنے اپنے فرائض ادا کرنے کے بعد اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا چاہیے۔"

"تمہیں ساری احادیث اور قرآن کی آیات وہی یاد ہیں جو میرے خلاف ہیں میں اگر اتنی ہی بری ہوں تو مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔" وہ اکتا کر کہتی۔

"اپنے چین وسکون کی خاطر تم میری زندگی کا سکون غارت کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ حالانکہ تم بھی چین اور سکون سے نہیں ہو۔ میں تمہارے بغیر اور بچوں کے بغیر چین سے تو کیا، بے چینی کے ساتھ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایسا ہی والدین کے بارے میں ہے۔ سوچو کیا ہم چین سے ہیں۔ جب میں سکون سے نہیں تو تم کیسے ہو سکتی ہو۔ ہمارا تو دکھ سکھ سانجھا ہے۔ اس لیے کہ میں آخری حد تک تم کو سمجھا رہا ہوں۔ چھوڑ دینا کون سا مشکل کام ہے۔ مشکل کام تو اصلاح کرنا ہے۔ پھر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ بچے ماں سے دور ہو جائیں۔"

"یہ جو تم مجھے حدیث وقرآن سناتے ہو۔ مجھے ان سب باتوں کا علم ہے۔"

"علم کا کوئی فائدہ نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو"

"تم خود تو پابندی سے نماز تک نہیں پڑھتے"

"نماز بہت ضروری ہے۔ لیکن دین اسلام صرف نماز روزے کا نام نہیں اس میں حقوق العباد بھی ہیں"

اس کے بعد فیضان حقوق العباد پر تقریر شروع کر دیتا۔ پھر سچائی کا پیمانہ بتانے لگتا۔

"ہم غلط ہوتے ہیں لیکن ضد پر اڑ جاتے ہیں۔ خود کو سیدھے راستے پر سمجھتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول کیا کہتے ہیں۔ یہ سمجھنا چاہیئے۔ جب بھی اختلاف ہو اللہ کی طرف پلٹ جاؤ اور جو فیصلہ ہو اسے مان لو۔ اللہ کی خوشنودی کے لیے اس میں ہی خوشی ہے۔ سچائی ناپنے کا پیمانہ ہمارے پاس اللہ اور اس کے رسول کے اقوال وافعال یعنی قرآن وحدیث ہی ہیں۔"

وہ بات بدل دیتی۔

"جتنا پیار تم بچوں سے کرتے ہو۔ اس سے زیادہ پیار میں کرتی ہوں۔"

"جب تم اپنی ضد کے لیے بچوں کو چھوڑ کر میکے چلی گئی تھیں تب ممتا کہاں تھی۔؟" فیضان طنزیہ لہجے میں کہتا۔

"تیری ان باتوں نے زندگی عذاب بنادی ہے۔" اس

کے لہجے میں جھنجلاہٹ اور بے زاری ہوتی۔

''ان باتوں میں سچائی ہے۔اب بھی اگر ایک طرف تمہاری ضد ہو اور دوسری طرف بچے۔۔تو تم بچوں کو چھوڑ دو گی ضد قربان نہیں کرو گی۔ میں جانتا ہوں پہاڑ تو اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے لیکن تم اپنی ضد۔''

اس بات پر وہ لاجواب ہو جاتی۔اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے۔وہ غصے میں آ جاتی۔کچھ اور نہ سوجھتا تو رونے لگتی۔تعلقات ختم کرنے کی دھمکیاں دینے لگتی۔فیضان ایک نظر بچوں پر ڈالتا۔ایک نظر اس پر اور ہار مان لیتا۔خاموش ہو جاتا۔یا بات بدل دیتا۔بعض اوقات وہ کہتا۔

''ایک وقت آئے گا تمہارے پاس صرف پچھتاوے رہ جائیں گے۔تمہاری ضد رہ جائے گی۔یہ سامان رہ جائے گا۔تم سوچو دنیا میں بھی خوش نہیں ہو اور آخرت میں کیسے خوش رہ سکو گی۔تمہارا مجازی خدا تم سے خوش نہیں ہے خدا کیسے خوش ہو گا۔تم میری باتوں کو خود پر طنز سمجھنے کی بجائے یہ سمجھو کہ اچھی بیوی کی جو خوبیاں اسلام نے بیان کی ہیں۔وہ کیا ہیں اور ان کو اپنے اندر اجاگر کرو۔اسلام جو تمہیں حق دیتا ہے وہ مجھ سے لو اور جن فرائض کے پورا کرنے کا حکم دیتا ہے وہ پورا کرو۔تیرے میرے تمام مسائل کا حل یہ ہی ہے۔''

اس کے بعد دونوں کے درمیان طویل خاموشی حائل ہو جاتی۔

☆☆

وہ بھی کیا دن تھے۔وہ اس قدر خوش ہوتی تھی کہ خوشی ان کے سارے بدن سے چھلک رہی ہوتی تھی۔ہنستے ہنستے آنکھوں سے آنسو اُمڈ آتے تھے۔بدن ہلکورے کھانے لگتا تھا۔وہ اپنی ساس کے ساتھ، دیورانی اور نندوں کے ساتھ بیٹھ کر چوکا کھیلا کرتی تھی۔معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہنس ہنس کر دہری ہو جاتا۔پھر یوں ہوا کہ شیطان سے یہ خوشی دیکھی نہ گئی۔اس کے امتحان کے دن آ گئے۔زندگی میں ایک کالی صبح طلوع ہو گئی۔معمولی معمولی باتوں پر دوریاں بڑھ گئیں۔روز لڑائی معمول بن گئی۔وہ دن خواب و خیال ہو گئے۔عذرا کی زندگی کبھی دوسروں سے، کبھی خاوند سے، کبھی دل ہی دل میں اپنے ماں باپ سے کبھی خود اپنے آپ سے گلے شکوے کرتے ہوئے خرچ ہوتی چلی گئی ہر وقت خود سے جنگ میں دن، ہفتے، مہینے گزرتے چلے گئے۔ایک ایک دن ایک ایک لمحہ عذرا نے سوچوں کے سمندر میں غوطے کھاتے گزارا تھا۔

عذرا نے اپنے بیٹے کی اس کی شرارتوں کی وجہ سے پٹائی کی وہ اپنی دادی کے پاس شکایت لے کر چلا گیا۔فیضان کی ماں، عذرا کی ساس نے اسے برا بھلا کہا اور خوب سنائیں کہ ''معصوم کو مارتے ہوئے ترس نہیں آیا تم کو''

عذرا نے کہا۔''میرا بیٹا ہے جو مرضی کروں۔آپ کون ہوتی ہیں ہمارے معاملے میں بولنے والی'' ساس نے الٹا ہاتھ مارنا چاہا جسے عذرا نے روک لیا۔یوں دونوں ساس اور بہو گتھم گتھا ہو گئیں۔فیضان کو علم ہوا تو اس نے عذرا کی پٹائی کر دی ایک طرف عذرا کی زبان اور دوسری طرف فیضان کے ہاتھ چلتے رہے۔بعد میں سب کو اپنی اپنی غلطی کو احساس ہوا لیکن تب تک وقت گزر گیا تھا۔اس حادثے کے بعد عذرا اپنے ماں باپ کے گھر میں آ گئی تھی۔بات ختم ہو سکتی تھی لیکن خاندان میں کم ہی افراد اسے ختم کرنا چاہتے تھے۔ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنا بدلہ ان کے کاندھوں پر بندوق رکھ کر لینا چاہتے تھے۔ان میں ایک عذرا کا ماموں بھی تھا۔جو عذرا کو اپنے شہر ملتان لے گیا۔ایسے ہی چھ ماہ گزر گئے۔بچے فیضان کے پاس تھے۔جو چپ چاپ رہتے۔ان کی خاموشی اس کا سینہ برماتی رہتی۔چھوٹی بیٹی اکثر بیمار رہنے لگی۔زیادہ بچوں کی وجہ سے ہی فیضان نے بیوی کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

وہ مانتا تھا کہ اس سے غلطی ہوئی تھی لیکن اس کی غلطی

معاف نہیں کی گئی۔اس کو پوری سزا دی گئی۔دوسری طرف اس کی بیوی کا خیال تھا کہ اس نے جو کیا درست کیا ہے ۔جیسے جیسے وقت گزرا تنگی نے گھیرا اس کی سوچ بدلتی چلی گئی۔وہ سوچتا اس نے بیوی کے کہنے پر اپنا گھر چھوڑ کر غلطی کی ہے۔وقت کے ساتھ فیضان کے اندر پہلے تو احساسِ ندامت نے جنم لیا۔جو رفتہ رفتہ جسے احساسِ جرم میں تبدیل ہو گیا۔بعض اوقات فیضان کے اندر اپنے ماحول سے نکل کر بھاگنے کی خواہش اس قدر شدید ہو جاتی کہ اس پر قابو پانا ناممکن سا لگنے لگتا۔

ان کے بچے لڑکپن کی جانب اور وہ دونوں بڑھاپے کی جانب اور ان کے ماں باپ قبر کی جانب یکساں رفتار سے رواں دواں تھے۔انسان چاہے تو خوش رہ سکتا ہے لیکن ضد اور بدلہ، ایک دوسرے کے قصور معاف نہ کرنا، ہمیشہ خود کو ہی درست خیال کرنا، اللہ نے جو ذمہ داریاں دی ہیں ان کا پورا نہ کرنا، ناشکری وغیرہ ایسے اسباب ہیں جن کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں خوشیاں اپنا گزر چھوڑ دیتی ہیں۔عذرا کا فیضان اس کا نہیں رہا تھا۔بے شک وہ اسے اس کے ماں باپ سے دور لے آئی تھی لیکن وہ پاس ہو کر بھی دور تھا۔

یکسانیت، ایک سے رات دن، ہر روز سونا جاگنا، ایک سی مشینی زندگی نے ہر سکھ چین چھین لیا تھا۔اس شام اس نے فیضان سے کہا۔

''ہفتے کے پانچ کام پر گزار لینے کے بعد چھٹا دن اپنے لیے ہونا چاہیے۔ہفتے میں ایک چھٹی ہونی چاہیے ۔جو زندگی کا احساس دلا دے۔دائرے میں گھومتے گھومتے تھم کر ذرا بیٹھ سکیں۔''

عذرا کا لہجہ انتہائی ٹوٹا ہوا اور آواز بے حد دھیمی تھی۔

''میرا دل بھی کرتا ہے ایک دن تمہارے ساتھ گزاروں۔ہفتے عشرے بعد ماں باپ کے پاس جایا کروں لیکن چھٹی کروں تو تنخواہ سے پیسے کٹ جاتے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ سرد اور طویل سانس لے کر رہ گیا۔اپنے شوہر سے عذرا کے دلی یا جذباتی مراسم کبھی استوار نہیں ہو سکے تھے۔وہ شوہر پرست بیوی نہ بن سکی تھی۔ہاں جسمانی تعلق قائم ہو گیا تھا۔اس طرح وہ چار بچوں کی ماں بن گئی تھی۔

☆☆

عذرا کا روزمرہ کا معمول تھا کہ وہ صبح اٹھ کر بچوں کے بستر سمیٹتی، صفائیاں کرتی، پانی گرم کر کے باتھ روم میں رکھتی، ناشتہ تیار کرتی، بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرتی، بچیوں کی چوٹی بناتی اور پھر انہیں باہر تک چھوڑ کر آتی۔اس کے بعد برتن، کپڑے دھونا اور بچوں کے لیے دوپہر کا کھانا تیار کرنا۔بچے اسکول سے واپس آتے، تو ان کی وردیاں ، بستے، جوتے سنبھالنا، بچوں کو سمجھانا بجھانا، ٹیوشن پر تیار کر کے بھیجنا اور پھر شام کا کھانا تیار کرنے پر جت جانا اور جب شام ہونے لگتی تو وہ بستر بچھا دیتی اور بچوں کا انتظار کرنے لگتی۔بچے ٹیوشن سے آتے تو گھر کو کباڑ خانہ بنانے میں چند منٹ لگاتے۔ایک طرف سے وہ ہر چیز اس جگہ رکھتی، دوسرے لمحے وہ وہاں نہ ہوتی۔تنگ آ کر وہ بلند آواز سے بولنے لگتی۔جب کبھی اس کی چیخ و پکار فیضان سنتا، تو لیکچر دینے شروع کر دیتا۔

''اللہ نے سب سے بری آواز گدھے کی آواز کو کہا ہے ۔آہستہ بولا کر۔تم نرمی سے بات کرو گی تو یہ بھی تمیز سے بات کریں گے۔''

ایک لمحہ ٹھہر کے پھر کہتا۔

''جیسی کو کو ویسے بچے ہوتے ہیں''

اس کی یہ کڑوی کسیلی باتیں اور لیکچر زندگی کو مزید بدمزہ کر دیتے۔کبھی کبھی وہ سوچتی کہ کیا سب کی زندگی ایسے ہی گزرتی ہے کہ گزاری نہ جائے ایسے میں اکتاہٹ اور چڑچڑاپن عود کر آتا۔وہ اپنے اردگرد دوسرے گھروں کو دیکھتی۔ان کی عورتوں کو دیکھتی۔کیسی شان سے وہ زندگی

گزار رہی تھیں تو اسے اپنے نصیب پر رونا آجاتا۔
گزشتہ ایک ہفتے سے وہ کہہ رہی تھی۔
"گیس ختم ہو چکی ہے۔ گیلی لکڑیاں ہیں۔ تین وقت کھانا تیار کرنا مشکل ہے۔ پھونکیں مار مار کر لگتا ہے میرا دماغ خالی ہو گیا ہے۔"
وہ روز کہتا۔
"آج کچھ پیسوں کا انتظام کروں گا۔" اور روز یہ بھول جاتا۔
آج تو وہ فیضان کے انتظار میں جلی بھنی بیٹھی تھی۔
اِدھر اس نے چٹخنی کھولی۔ فیضان نے گھر کے اندر قدم رکھا۔ اُدھر وہ اس پر برس پڑی۔
"آج بھی نہیں لائے ہوں گے۔"
بچیاں جو باپ کو دیکھ کر کھل اُٹھی تھیں اور اس کی جانب لپکنا ہی چاہتی تھیں کہ اچانک رک گئیں۔ سات سالہ بیٹا دور کھڑا مسکرا رہا تھا۔
فیضان اپنے حق میں وہ دلائل جو مسلسل کئی روز سے دہرا رہا تھا، ایک مرتبہ پھر دہرا رہا تھا۔
"تم ٹھیک کہتی ہو۔۔۔ مگر سات سو روپے!"
بچے مسکراتے رہے۔ فیضان کپڑے بدلتا رہا۔ وہ پیچ و تاب کھاتی رہی۔
"بھلی لوک! کیا میں تیری ضرورتوں سے بے خبر ہوں۔ ان تمام چیزوں کا مجھے تجھ سے زیادہ احساس ہے۔ لیکن اچھے دن آلینے دے۔"
"اچھے دن میرے نصیب میں کہاں۔ اٹھارہ سال سے اچھے دنوں کا انتظار کر رہی ہوں۔ اب تک نہیں آئے تو کب آئیں گے۔"
"میں کام پر جاتا ہوں تم کون سا مصلے پر بیٹھ جاتی ہو۔ ہر وقت اللہ کا شکر کرتی ہو۔ جو دن بدل جائیں۔ جس دن تم بدل گئیں۔ دن بدل جائیں گے۔"
وہ کہتی۔

اہل و عیال کا فتنہ

حضرت ابن مسعود و حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا آدمی کی ہلاکت اس کی بی بی اور ماں باپ اور اولاد کے ہاتھوں ہوگی کہ یہ لوگ اس شخص کو ناداری سے عار دلائیں گے۔ اور ایسی باتوں کی فرمائش کریں گے جن کو یہ نہ اٹھا سکے گا۔ سو یہ ایسے کاموں میں گھس جاوے گا جس سے اس کا دین جاتا رہے گا پھر یہ برباد ہو جائے گا۔
(بیہقی حیٰوۃ المسلمین)

مسلمان بھائی سے بحث و دل لگی

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اپنے بھائی (مسلمان) سے (خواہ مخواہ) بحث نہ کیا کرو اور نہ اس سے ایسی دل لگی کرو (جو اس کو ناگوار ہو) اور نہ اس سے کوئی ایسا وعدہ کرو جس کو تم پورا نہ کر سکو۔"
(ترمذی۔ حیٰوۃ المسلمین)

غیبت پر حمایت

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جس کے سامنے اس کے مسلمان بھائی کی غیبت ہوتی ہو اور وہ اس کی حمایت پر قدرت رکھتا ہو اور اس کی حمایت کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی حمایت فرمائے گا اور اگر اس کی حمایت نہ کی حالانکہ وہ اس کی حمایت پر قادر تھا تو دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ اس پر گرفت فرمائے گا۔"
(شرح السنہ۔ حیٰوۃ المسلمین)

''مرد کو شادی تب کرنی چاہیے جب اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔تم روز کام بدلتے رہتے ہو۔ہنر کوئی آتا نہیں۔چھوٹے موٹے کام کو تم توہین سمجھتے ہو۔کہتے ہو صاف ستھرے رہو۔تنگی کیسے جائے گی۔میرے بھائی نے کہا کہ سبزی کی ریڑھی لگا لو۔اس میں کافی بچت ہو جاتی ہے لیکن اس سے تمہاری شان میں فرق پڑتا ہے۔ہم بے شک بھوکے رہیں۔''

''ہمارا اپنا گھر تھا۔میں پرائیویٹ کالج میں ایڈمن تھا۔اپنا موٹر سائیکل تھا۔ایک دو جگہ ٹیوشن پڑھا رہا تھا۔میری کبھی جیب خالی نہیں ہوئی تھی۔معاشرے میں میری عزت تھی۔سب کچھ تیری وجہ سے برباد ہوا۔اپنا گھر، کام، ماں باپ چھوڑ کر تمہاری ضد کی وجہ سے میں یہاں ذلیل ہو رہا ہوں۔نہ تم پہلے خوش تھی نہ اب خوش ہو۔نہ پہلے کبھی شکر کیا تھا نہ اب شکر کرتی ہو۔''

جملے کے اختتام تک اس کی آواز بلند ہو جاتی۔

......☆☆......

دس سال وہ ماں باپ کے ساتھ رہے تھے۔پھر اپنے ہی گھر میں الگ ہو گئے تھے تین سال ایسے گزارے۔لیکن چونکہ گھر ایک ہی تھا۔ساس، نندیں، دیورانی وغیرہ سب وہاں ہوتی تھیں۔ایک دو چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے بعد عذرا بچوں کو فیضان کے پاس چھوڑ کر میکے چلی گئی تھی۔اس وقت چھوٹی بچی کی عمر تین سال تھی۔

اس نے صلح کے لیے والدین سے الگ ہونے کی شرط رکھی۔فیضان نے کہا کہ اپنے ہی گھر میں الگ ہو جاؤ۔لیکن وہ ضد پر اڑ گئی کہ اسے اس شہر میں آنا ہو گا جس میں عذرا کے ماں باپ رہتے ہیں۔چار ماہ کی سوچ بچار، بچوں کی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے، کچھ خاندان کے افراد کی شمولیت سے فیضان نے ہار مان لی۔

وہ اپنے ماں باپ سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔اس کی ماں نے سمجھایا۔

''تم ویسا کرو جیسا عذرا کہہ رہی ہے۔بچوں سے ان کی ماں دور نہ کرو۔ہمارا کیا ہے زندگی گزر گئی ہے۔میرے باقی چار بیٹے ہیں وہ خیال رکھ لیں گے۔لیکن تمہارے بچوں کا کون ہے۔سب اپنی اولاد کے لیے قربانی دیتے ہیں۔تم بھی قربانی دو۔ان سے ان کی ماں دور نہ کرو۔خود اپنی ماں سے دور ہو جاؤ۔''

......☆☆......

بچوں کی وجہ سے ہی میاں بیوی کی لڑائی ہوئی تھی۔فیضان نے اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔جس کا انجام ان کی جدائی کی صورت میں نکلا۔بچوں کے لیے ہی اب فیضان سسرال کے شہر آ گیا۔اب چاہیے تو یہ تھا کہ عذرا اپنے بچوں کا سوچتی اپنے والدین سے ضد کرتی اور رہائش و کاروبار کے لیے مدد مانگتی۔تاکہ وہ اپنے پاؤں جما سکتا۔لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔کرائے کے مکان میں رہائش اور ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب ملی۔اس سے پہلے کوئی مالی تنگی نہیں تھی۔برے دنوں کی ابتدا یہاں سے ہوئی۔اب گھر میں دودھ بند ہو گیا۔فیضان چائے پینے کا عادی تھی اب وہ خاموشی سے قہوا پی کر کام پر جانے لگا۔بچوں کا دودھ بند ہو گیا تھا۔اس کا اسے بہت صدمہ پہنچا تھا۔وہ مجبور تھا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔اسکول سے اتنی قلیل آمدنی تھی کہ بجلی کا بل اور گھر کے اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے تھے۔بچے پرائیویٹ اسکول میں پڑھ رہے تھے۔فیضان نے دل پر جبر کر کے انھیں ایک سال بعد سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا۔حالانکہ وہ جانتا تھا کہ سرکاری اسکول میں کیا پڑھائی ہوتی ہے۔پھر اس نے اسکول کی نوکری چھوڑ دی۔ایک اسٹام فروش کے ساتھ کام کرنے لگا۔وہاں سے تین سو روپے مل جاتے۔ایک سال ایسے گزر گیا۔اس دوران اس پر قرض چڑھتا گیا۔فیضان کا ایک ماموں مسلسل اس کے مکان کا کرایہ دے رہا تھا اور یہ قرض بڑھتا جا رہا تھا۔عذرا کا چھوٹا بھائی کبھی کبھی راشن لے کر دے دیتا

۔فیضان کا تایازاد بھائی خلیل احمد اس کی خاموشی سے مدد کرنے لگا ہزار دو ہزار بھیج دیتا۔وہ مسلسل کسی اچھے کام کی تلاش میں رہا۔اس نے اپنے سب جاننے والوں سے کام کی تلاش کا کہا ہوا تھا۔لیکن کوئی اچھا کام مل نہیں رہا تھا۔وہ ذہنی مریض بنتا جا رہا تھا۔اس کی خود اعتمادی ختم ہونے لگی۔وہ زندگی بھر سر اٹھا کر جیا تھا لیکن اب اس کے حالات نے سر جھکا دیا تھا۔رمضان کا مہینہ تھا۔وہ مسجد نماز پڑھنے جانے لگا۔مولوی عبدالعزیز سلفی سے تعلق قائم ہوا۔ایک دن اپنے حالات کے بارے میں اسے بتایا ۔مولوی عبدالعزیز سلفی ہر سال عید پر فنڈ اکٹھا کر کے غربا میں عام گھریلو ضرورت کی اشیاء بانٹا کرتا تھا۔اس سال اس کے گھر میں آٹا،چینی،گھی،دالیں وغیرہ دوسروں سے زیادہ بھیج دیں۔فیضان کو اس کا علم ہوا تو آنکھیں بھر آئیں ۔یہ دن بھی زندگی میں آنے تھے۔بچوں کے کپڑے نہیں تھے اس نے اپنے بچپن کے دوست غلام مصطفےٰ جو کہ فوج میں ملازم تھا کو فون کیا اس نے پانچ ہزار بھیج دیے جس سے یہ پہاڑ سر ہوا۔ان دنوں وہ کچہری میں ایک اسٹام فروش کے ساتھ کام کر رہا تھا۔باس کا رویہ بھی بدل چکا تھا۔باس جانتا تھا کہ فیضان مجبور ہے۔اس نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔فیضان نے ادھر ادھر بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن بے سود حالات کی ان دیکھی زنجیروں نے اسے جکڑ رکھا تھا۔وہ بڑے صبر سے بچوں کے بڑے ہونے کا انتظار کرنے لگا ۔اس دوران کبھی کبھار ماں باپ سے ملنے چلا جاتا۔ان کو دیکھتا تو دل بھر آتا۔وہ آسمان کی طرف سر اٹھا کر رہ جاتا ۔اس دوران اس کی دوستی ایک اخباری نمائندے سے ہوئی جس کی اپنی الیکٹرونس کی دو دکانیں تھیں۔اس کی آفر پر وہ اس کے ساتھ کام کرنے لگا اور ایک دکان پر بیٹھ گیا۔جس نے دو سال بعد اپنا ایک مکان بھی رہنے کو دے دیا تھا۔اس کے بعد فیضان نے اپنے آبائی مکان کا ملبہ بیچ کر اپنے اس ماموں کا قرض اتارا جس نے دو سال اس کے مکان کا کرایہ دیا تھا۔پہلے جو گھر تھا اب وہاں خالی پلاٹ رہ گیا۔

......☆☆......

فیضان کو اس کا شدت سے احساس تھا۔کہ اگر زندگی ایسے ہی گزرتی رہی تو زندگی تو ناکام ہے ہی آخرت میں بھی ناکامی ہوگی۔وہ خوش نہیں تھا۔بلکہ اس سے بھی کوئی خوش نہیں تھا۔وہ زندگی میں والدین کی خدمت نہ کر سکا۔ اپنے بچوں کے لیے کچھ نہ بنا سکا۔اپنا کام،اپنا گھر نہیں تھا ۔کوئی راستہ نہیں تھا۔مستقبل اندھیرا تھا۔وہ کرتا بھی تو کیا کرتا۔ایک دن کا آسرا نہیں تھا کہ گھر چل سکے۔کوئی ایسا یار دوست بھی نہیں تھا جو بہتر کام کی تلاش میں مدد ہی دے سکے۔مالی حالات خراب تھے۔اس کی جیب میں دس بیس روپے سے زیادہ کبھی پیسے نہیں رہتے تھے۔بعض اوقات تو دو دو دن جیب خالی رہتی۔وہ قیدی نہیں تھا۔لیکن اسے محسوس ایسے ہوتا تھا کہ وہ قید میں ہے۔ان دیکھی زنجیروں نے اسے جکڑا ہوا تھا۔اسے یہ احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ وہ اس دنیا میں تنہا ہے۔جس کو جتنی اس کی ضرورت ہوتی تھی وہ اتنا اس سے کام لیتے اور اپنا مقصد پورا ہونے کے بعد اس سے الگ ہو جاتے۔وہ اپنی سوچوں میں تنہا رہ جاتا۔ایک ایک رشتہ جو اس سے جڑا تھا اس کے سامنے آ رہا تھا۔سب مطلب کے خود غرضی کے رشتے ہیں اس نے سوچا ۔اسے چاروں طرف سے مجبوریوں نے اور بے بسی نے گھیر لیا تھا۔

اب اس کے پاس اتنے پیسے نہ ہوتے کہ وہ ہفتے عشرے میں ہی والدین کے پاس چکر لگا سکے۔وہ کسی آس امید کو دل میں لیے عذرا کے چہرے کو دیکھتا۔پھر بچوں کی طرف دیکھتا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔

فیضان کی اپنی ماں اور بچوں سے شدید محبت۔اپنی بیوی کی شدید ضد۔اپنی بے بسی بے یار و مددگار ہونا۔مالی حیثیت کا روز روز گرتے چلے جانا اس کے اندر محرومی کے احساس نے جنم لینا شروع کر دیا۔وہ اپنے آپ کو شکست

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

خوردہ محسوس کرنے لگا تھا۔غیروں کے ہاتھوں ملنے والی ہار وقتی طور پر انسان کو غمزدہ کر دیتی ہے اور انسان کسی طرح اسے برداشت بھی کر لیتا ہے۔لیکن اپنی بیوی کے ہاتھوں ملنے والی شکست مستقل عذاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔اس وجہ سے گھر میں خوشیوں کا وجود ناپید ہوتا چلا گیا۔ایک طرف فیضان نے مالی مشکلات سے مقابلہ کرنے کے لیے کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔

رات دو بجے اس کا میاں فیضان بیدار ہوا تھا اور کمپیوٹر پر جا بیٹھا تھا۔دو گھنٹے وہاں بیٹھا لکھتا رہا۔اس دوران عذرا کو چار پانچ بار اس نے آواز دی۔سارا دن کی تھکی ہوئی وہ بڑی مشکل سے اٹھی اور اپنے خاوند کے لیے قہوا تیار کر کے دیا۔اس دوران وہ بڑبڑائی

''اتنا پڑھنے کا کیا فائدہ۔گھر میں تو تنگی ہی رہی۔کبھی مالی آسودگی نہ دیکھی۔نہ دن کو سکون نا رات کو سکون۔''

فیضان نے سنی ان سنی کر دی اور اپنی کہانی کے کرداروں میں کھو گیا۔۔۔کہانی میں ایک خاص موڑ آ چکا تھا۔

چار پانچ راتوں کو جاگ کر فیضان نے ایک کہانی لکھی تھی۔ادارے والوں نے 850 روپے بھیجے تھے اس پر ہی وہ بہت خوش تھا۔

اس قدر ذہنی محنت کا اتنا کم معاوضہ ملنے کے باوجود اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نظر نہیں آئے۔بلکہ آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی تھی۔وہ تھکا ہارا کام سے واپس آتا تھا۔حالانکہ وہاں کرنے کا کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔صبح صبح دکان کھولنا ،صفائی کرنا اس کے بعد سارا دن بیٹھ کر گاہکوں کا انتظار کرنا ہوتا تھا۔وہ الیکٹرونکس کی دکان پر سیلز مین تھا۔وہ پانچ سال سے وہاں کام کر رہا تھا۔اس کا باس دو چار اخبارات کا نمائندہ تھا۔فیضان اپنے باس کے اخبار کی خبریں اور آرٹیکل کمپوز کرتا اخبارات کو بھیجتا۔جب کوئی گاہک آتا تو اسے ڈیل کرتا۔یہ کام ایسا نہیں تھا کہ تھکاوٹ ہو جائے۔اسی وجہ سے جب عذرا اسے کہتی۔

''آپ کا کام تو بہت آسان ہے مزے سے ہو۔تھک کیسے جاتے ہو؟''

وہ کہتا۔

''تھکاوٹ صرف سفر کرنے سے نہیں ہوتی ذہنی مسافت بھی تھکا دیتی ہے۔'' کبھی کہتا۔''ایک گھنٹا ذہنی کام انسان کو اتنا تھکا دیتا ہے جتنی تھکاوٹ چھ گھنٹے جسمانی مشقت سے ہوتی ہے۔''

دوسری طرف رات کو دو گھنٹے کمپوزنگ و گرافکس کا کام سیکھنا شروع کر دیا زندگی بدلنے کی اپنی جدوجہد جاری رکھی۔وہ آسانی سے ہار ماننے والوں سے نہیں تھا۔اپنی بیوی کو سمجھانے کی کوشش بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔وہ چاہتا تھا عذرا دین اسلام کو سمجھ جائے۔اپنے حقوق سے واقف ہو اور فرائض کو جان لے وہ اس بات کو سمجھ جائے کہ درخت جڑ سے اکھڑ کر سوکھ جاتا ہے۔انسان اصل سے دور ہو کر خوش نہیں رہ سکتا۔زندگی دوبارہ نہیں ملتی۔وہ پوری کوشش کرتا کہ ان باتوں کو اس کی بیوی سمجھ سکے۔جب فیضان کے دلائل کے سامنے وہ ہار جاتی تو لڑائی جھگڑے پر تل جاتی تب فیضان کنی کترا جاتا۔وہ اس وقت کا انتظار کرنے لگتا جب اسے اپنی اولاد ،اپنے گھر ،اپنے خاوند سے محبت بیدار ہو جائے گی۔

......☆☆......

چشمہ اتار کر آنکھوں کی رگڑائی کرتا۔کمپوزنگ کرتے ہوئے۔آنکھیں دکھنے لگتی۔پانچ سال پہلے آنکھیں ٹیسٹ کروائی تھیں اور چشمہ خریدا تھا۔اب آنکھیں زیادہ کمزور ہو چکی تھیں۔عینک کے شیشوں پر داغ بن گئے۔صاف نظر نہیں آتا۔ہر پندرہ دن بعد وہ سوچتا اگلی مرتبہ جب پیسے ملیں گے نئی عینک خریدوں گا۔ایسے ہی کئی ماہ گزر گئے تھے۔اب تو شیو ایک ایک ماہ کروائے بنا گزر جاتا۔

صبح گھر سے باہر نکل کر جلدی جلدی دکان کی طرف دوڑنا، جیسے کسی کو پکڑنا ہو۔کام سے لوٹ کر آتا تو سارا بدن

اس طرح درد کر رہا ہوتا، جیسے بری طرح سے مارا گیا ہو۔ حالات کی مار ایسے ہی مارتی ہے۔ وقت تیز دھار آری لیے اپنے کام میں لگا تھا۔

آخر زندگی کی دوپہر ڈھل گئی۔ حالات سے لڑتے لڑتے وہ زندگی ہار گیا۔ ایک رات وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ایک کہانی لکھ رہا تھا۔ بچے اور عذرا سو چکے تھے کہ اس کے دل میں درد اٹھا۔ وہ بار بار عذرا کو پکارتا رہا۔ درد بڑھتا چلا گیا۔۔ درد اتنا شدید اٹھا تھا کہ وہ دنیا سے اٹھ گیا۔ فیضان ایک ایسے دیس سدھار گیا جہاں سے کوئی لوٹ کر واپس نہیں آتا۔

جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو اس کی زندگی میں کالی سیاہ رات اتر آئی تھی۔ فیضان اپنے بچوں کو، کتابوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ اندر ہی اندر۔ بہت اندر سے پچھتاوے کا دکھ ابل کر آنکھوں سے بہنے کو بے تاب تھا۔ اس نے ضبط کی ڈور کو مضبوطی سے تھاما۔ نہ جانے کیوں کسی اپنے کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں تنہائی کا احساس ہوا۔ کوئی اپنا نہیں رہا تھا۔ جو اس کا اپنا تھا اسے اس نے زندگی بھر اپنا نہیں سمجھا تھا۔ اب وہ بھی نہیں رہا تھا۔ شائد ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا تھا۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر کی جانب بھاگی۔ جیسے اس حقیقت سے دور بھاگ جانا چاہتی ہو۔

''نہیں۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا'' کہتی ہوئی وہ چکرا کر گری۔ اگلے لمحے وہ سسک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ابل پڑی تھیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ روتے روتے وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆

گھر میں سارا خاندان جمع تھا۔ فیضان کو منوں مٹی کے نیچے دفن کیے تین دن گزر چکے تھے۔ اب رہ رہ کر عذرا کو اس کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ گھر میں بیٹھی خواتین کے درمیان وہ بیٹھی تھی۔ ایک عورت کہہ رہی تھی۔

''مرحوم بڑا نیک انسان تھا۔''

دوسری نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''اس میں کیا شک ہے؟''

تیسری نے کہا۔

''ہم اس جانکاہ صدمے میں آپ کے ساتھ ہیں۔''

ایک اور آواز آئی۔

''ہم تو یہ جانتے ہیں خوشی میں بھلے شریک نہ ہو غم میں ضرور شامل ہو جاؤ۔ آج تیری کل میری باری ہے۔''

عذرا سے وہاں بیٹھا نہ گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آہستہ آہستہ چلتی گھر سے باہر نکل آئی۔ گھر جو اپنا نہیں تھا۔ دروازے کے سامنے سے گزرنے والی سڑک پر لوگ پیدل، کار، موٹر سائیکل پر آ جا رہے تھے۔ دور مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے زندگی کی لمبی مسافت پڑی تھی جس پر اب تنہا سفر کرنا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے چہرے پر دھار کی مانند بہتے اشک صاف کیے اس وقت اس کے چاروں بچے ایک ایک کر کے اس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ چھوٹی بیٹی اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ اس نے ڈوبتے سورج کو دیکھا۔ اس کے کانوں میں فیضان کی آواز آرہی تھی۔

''ایک وقت آئے گا تمہارے پاس صرف پچھتاوے رہ جائیں گے۔ تمہاری ضد رہ جائے گی۔ یہ سامان رہ جائے گا۔ تم سوچو دنیا میں بھی خوش نہیں ہو اور آخرت میں کیسے خوش رہ سکو گی۔ تمہارا مجازی خدا تم سے خوش نہیں ہے خدا کیسے خوش ہوگا۔''

ایک سو سولہ چاند کی راتیں

عشنا کوثر سردار

قسط نمبر 10

یہ ناول 1947ء کے تقسیم ہندوستان کے پس منظر میں ہے، اس کے تمام کردار تقریباً 69 سال قبل کے ہیں جنھوں نے Partition سے ایک سو سولہ دن قبل جنم لیا، انڈو پاک کی تقسیم جب ہونے جا رہی تھی اس دوران اپنا سفر شروع کیا، جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی ہمیں ایک آزاد مملکت کا احساس ملا وہیں محبت نے دلوں میں گھر بھی کیا، یہ سفر تب شروع ہوتا ہے جب ناول کے دو کردار پہلی بار 18 اپریل 1947ء کو ملے۔ اس سے آگے کی ایک سو سولہ راتیں ان کی ان کہی محبت کا ایک سفر ہے۔ جب تاریخ رقم ہو رہی تھی زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی تب خاموشی میں کہیں محبت دلوں کو جوڑ رہی تھی۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں کیا تھا دلوں کو جوڑ دیا تھا اس تقسیم کی جو صعوبتیں ہماری ان نسلوں نے سہی تھیں ان کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے مگر میں نے اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ میرے ناول کے کردار ان مصائب سے گزرے ہیں اور ان کے ساتھ میں نے بھی ان مصائب کی تکلیف کو محسوس کیا ہے وہ ڈر...... وہ خوف...... تمام احساسات میرے اندر کہیں مجھے محسوس ہوتے رہے ہیں۔

نواب زادی عین النور کا چہرہ پرسکون تھا وہ انتہائی مضبوطی سے قدم اٹھا رہی تھی شہاب نے اسے غلیظ نظروں سے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کی تقلید کرنے لگا تھا اس کی بھوکی نظریں نواب زادی کو کسی بھیڑیے کی طرح چھید رہی تھیں نواب زادی اس کی سمت متوجہ نہیں تھی مگر وہ ان آنکھوں کی غلاظت کو صاف محسوس کر سکتی تھی شہاب جسے آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے اسے نگل لینا چاہتا تھا اس کے چہرے پر بھرپور سرشاری تھی جیسے اس نے ابھی کوئی جہان فتح کر لیا تھا وہ مسرور سا قدم اٹھا رہا تھا اور نواب زادی عین النور بہت پرسکون سی بیت الخلا کے سامنے جا رکی تھی۔

شہاب نے اسے بغور دیکھا تھا نواب زادی نے اسے بہت اطمینان سے دیکھا تھا مگر اس کی آنکھوں میں عجیب غیض و غضب دکھائی دیا تھا۔

شہاب اس کے ادارے سمجھ نہیں پایا تھا مگر وہ اسے دیکھتا ہوا سرشاری سے مسکرایا تھا۔

''ارے رک کیوں گئیں آپ، اندر چلیے نا؟'' اس نے کہتے ہوئے ٹرین کے ڈبے کی سمت نگاہ کر کے گویا یقین کیا تھا کہ کوئی متوجہ تو نہیں اور دوبارہ ایک بے قراری سے نواب زادی کی سمت دیکھا تھا۔

'چلیے نا اب انتظار نہیں ہوتا ہم سے' کیا جان لیں گی کب سے ترس رہے ہیں اب اتنا ظلم بھی مت کیجیے آپ کا دو آتشہ حسن ہمیں جلا کر خاکستر کرنے کو ہے اب ہمارے صبر کا اتنا بھی امتحان مت لیجیے۔''

وہ اپنی غلاظت بھری نظروں سے اس کی سمت دیکھتا ہوا بولا تھا اس کے مکروہ چہرے پر ہوس بھری مسکراہٹ تھی نواب زادی نے بیت الخلا کے برابر میں بنے ٹرین کے داخلی دروازے کو دیکھا تھا اور پھر شہاب کی سمت دیکھا تھا۔

''آیئے بیت الخلاء منتظر ہے۔'' نواب زادی نے پر سکوت نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے اور بیت الخلا میں بڑھنے کو کہا تھا۔

شہاب اس کی طرف سرشاری سے دیکھتا ہوا مسکرایا تھا اور قدم آگے بڑھائے تھے۔

......☆☆......

وہ بلوائیوں کی تعداد نہیں جانتی تھی مگر وہ اتنا جان گئی تھی کہ وہ کڑا وقت آ گیا جب اسے زندگی اور موت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا وہ عزت کی زندگی نہیں جی پائی تھی مگر وہ عزت کی موت مرنا چاہتی تھی سو وہ کسی بھی صورت حال کے لیے خود کو تیار کرنے لگی تھی کسی نے دروازے پر دستک دی تھی۔

''جو کوئی بھی اندر ہے دروازہ کھول کر دیدار کرا دے ورنہ ہم دروازہ توڑنا بھی جانتے ہیں۔'' کسی ایک بلوائی نے کہا تھا غالباً ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ غسل خانے میں کوئی موجود ضرور ہے اگرچہ خوش نما ایک لفظ نہیں بولی تھی مگر وہ سہمی ہوئی متلاشی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی تھی، وہ کوئی کپڑا تلاش رہی تھی جس سے وہ خود کو چھپا سکے ایک طرف کھونٹی سے کچھ میلے کپڑے لٹکے تھے اس نے ہاتھ بڑھا کر وہاں کچھ تلاشا تھا وہ اس حالت میں ان کے سامنے نہیں آنا چاہتی تھی وہ جانتی تھی اس کی زندگی اور عزت ان سے محفوظ نہیں رہے گی، وہ اس پر ٹوٹ پڑیں گے مگر وہ خود کو اس طرح برہنہ لانا نہیں چاہتی تھی۔

اسے خود کو چھپانا تھا سو اس نے کھونٹی پر ٹنگے کپڑوں میں سے ایک میلا جوڑا نکالا تھا اور کانپتے ہاتھوں سے پہن کر ایک میلی سیاہ چادر اوڑھی تھی۔

''ہم کہتے ہیں دروازہ کھولو، کون چھپا بیٹھا ہے اندر؟ ہم دروازہ توڑ دیں گے۔'' ایک بلوائی چیخا تھا خوشنما جانتی تھی مگر دروازہ نہیں بھی کھولا تو وہ توڑ دیں گے اگر وہ خود سے دروازہ کھولے گی تو تب بھی وہ ان کی ہوس پرستی کا شکار بن جائے گی اس کے مسلسل دروازہ بجانے پر کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر اس کے باوجود جانے کیوں اس نے دروازہ نہیں کھولا تھا وہ جیسے کسی خدائی مدد کی امید رکھتی تھی ایسے سرد پڑتے وجود کے ساتھ اس نے دروازے کی کنڈی کو چھوا تھا دستک کی آواز بند ہو گئی تھی اس نے سانس روک کر چند لمحوں تک محسوس کیا تھا شاید وہ لوگ وہاں سے چلے گئے تھے پیشانی پر پسینے کے قطرے اس میلی چادر سے پونچھتے ہوئے اس نے سرد ہاتھوں کو کنڈی کی سمت بڑھایا تھا مگر پھر ہاتھ روک لیا۔

''یا اللہ مدد فرما، میں ایسی بے عزتی کی موت مرنا نہیں

چاہتی تو نے اب تک کی زندگی میں جو دیا اس کے لیے ہمیشہ شکر ادا کیا مگر میں وہ بے عزتی اور بدنامی کی زندگی جی کر تھک چکی تھی میں نے یہ سفر اپنی عزت کے لیے کیا عزت کی زندگی جینے کے لیے اور میں چاہتی ہوں اگر آج موت بھی آئے تو عزت سے آئے میری عزت کی حفاظت تیرے حوالے میرے مولا میں تجھے اپنا محافظ بناتی ہوں۔ میری حفاظت فرما۔'' اس نے بنا آواز صدق دل سے دعا مانگی تھی کئی لمحوں تک کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی سو بلوائی چلے گئے تھے اس نے دعا مانگ کر اللہ کا نام لے کر دروازہ کھول دیا تھا اور نگاہ حیرت سے بھر گئی تھی کچھ فاصلے پر بلوائی بیٹھے اسے دیکھ کر مسکرائے تھے انہوں نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا تھا ان کی میلی نظروں میں ہوس تھی۔

''یا اللہ مدد تیری گناہ گار بندی تجھ سے مدد کی درخواست کرتی ہے تیرے علاوہ کوئی آسرا نہیں نہ کوئی مدد گار میں اپنی حفاظت تیرے ذمہ چھوڑتی ہوں میرا توکل تجھ پر ہے مجھے یقین ہے میرا رب مجھے مایوس نہیں کرے گا۔'' اس نے دل سے دعا مانگی تھی اور ان کے اٹھ کر آنے سے قبل ہی دوڑ لگا دی تھی وہ بھاگتی ہوئی گھر کی دہلیز پار گئی تھی بلوائی پاگل ہو کر اس کے پیچھے بھاگے تھے خوش نما کے اندر جانے اتنی ہمت کیسے آ گئی تھی اس کے قدموں کی رفتار نہ تھمنے والی تھی تبھی بادل گرجے تھے اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی گیلی زمین پر ننگے پاؤں بھاگنا دشوار ہو گیا تھا مگر وہ رکے یا مڑے بنا بھاگتی چلی گئی تھی تیز بارش کے باعث نظروں کے سامنے دھند سی چھا رہی تھی اسے دیکھنے میں مسئلہ ہو رہا تھا مگر وہ رک نہیں سکی تھی، یکدم اس کا پاؤں پھسلا تھا وہ دھڑام سے زمین پر گری تھی گھٹنے پر جیسے شدید چوٹ لگی تھی اس کی سمت آنے والے بلوائیوں کی آوازیں اسے صاف سنائی دینے لگی تھیں جیسے وہ قریب آ رہے تھے وہ اپنی اس تکلیف کو بھول کر اٹھی تھی، پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔

اس کا درمیانی فاصلہ کم ہو رہا تھا وہ تیزی سے قریب آ رہے تھے وہ ان کا نوالہ نہیں بننا چاہتی تھی تبھی ہمت کر کے اٹھی تھی اور دوبارہ بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بھاگتی چلی گئی تھی آوازیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں وہ جیسے اس کے بھاگنے سے محظوظ ہو رہے تھے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اس پر گھٹیا جملے کس رہے تھے وہ بلوائی جیسے آج تہیہ کر کے آئے تھے کہ شکار ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے وہ بھاگتی گئی تھی یکدم بجلی چمکی تھی ایک روشنی کی تیز لپک آسمان سے کوندتی ہوئی زمین کی طرف آتی دکھائی دی تھی اور یکدم سارا شور تھم سا گیا تھا۔

......☆☆......

فتح النساء نے دل کڑا کر کے نگاہ پیچھے کیے بنا بوا کو سہارا دے کر اٹھایا تھا۔

''بیٹا تم میری پروا مت کرو، تم جاؤ یہاں سے۔'' بوا نے اسے دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے پر اکسایا تھا مگر وہ سر نفی میں ہلانے لگی تھی۔

''بوا ہم آپ کو چھوڑ کر جائیں یہ مناسب نہیں آپ نے ہماری پرورش کی ہمیں پالا آپ کا قرض ہم پر تمام عمر ہمارے دل پر بوجھ بن کر رہے گا آپ اٹھیے آپ کے بنا ہم نہیں جائیں گے۔'' فتح النسا بولی تھی اور سہارا دے کر بوا کو کھڑا کر دیا تھا اور ان کو لے کر ساتھ چلنے لگی تھی مگر اپنے پیچھے اسے آگ کی لپٹیں دکھائی دی تھیں بلوائیوں نے حویلی کو آگ لگا دی تھی فتح النسا کی خوف کے مارے حالت غیر ہوئی تھی۔

''جلدی چلیے بوا ہمیں جلد سے جلد اس حویلی سے نکلنا ہے آگ تیزی سے پھیل رہی ہے۔'' وہ بوا کو دیکھتی ہوئی بولی تھی۔

''بیٹا میں چل نہیں پاؤں گی تم یہاں سے چلی جاؤ۔'' وہ تھک کر بولی تھیں۔

''میں آپ کو اس آگ کے حوالے کر کے نہیں جا سکتی بوا آپ کو لیے بنا میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔'' وہ انکاری ہوئی تھی۔

''بیٹا، یہ ممکن نہیں رہا مجھ میں ہمت نہیں بوڑھی ہڈیوں میں دم نہیں چلنے کا مجھے گھٹنے میں شدید چوٹ آتی ہے مجھ سے چلا نہیں جا رہا اور میں اپنی بچی کو اپنے باعث مصیبت میں نہیں ڈال سکتی۔'' بوا نے کہا تھا جب فتح النساء نے ان کو کاندھے پر اٹھا لیا تھا اور چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگی تھیں۔

''ماں کا قرض نہیں اتارا جا سکتا بوا آپ نے مجھے ماں

بن کر پرورش کی ہے میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی، وہ بوا کے بوجھ کو کاندھے پر رکھے ایک عزم سے بولی تھیں۔

''اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا فتح النساء میری بچی، تم بہت ہمت والی ہو، جو لوگ عزم رکھتے ہیں ان کی راہیں وہ ذات پاک کھول دیتا ہے۔'' بوا دبلی پتلی تھیں مگر ان کے وجود کا ایک بوجھ بہر حال تھا اور فتح النساء اس کی پروا کیے بنا اس بوجھ کے ساتھ ایک عزم سے آگے بڑھ رہی تھیں۔

......☆☆......

شہاب نواب زادی کی ہمت دیکھ کر مسکرایا تھا وہ بیت الخلاء کے دروازے کے سامنے رکا کھڑا تھا اور نواب زادی عین النور بہت پرسکون انداز سے ان کی سمت دیکھ رہی تھیں۔

''اللہ نے آپ کو بہت فرصت سے بنایا ہے آپ اتنی دلربا ہیں، ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم زندگی میں کسی ایسی دوشیزہ سے ملیں گے آپ کا حسن سچ میں حیران کن ہے اور ہوش اڑا دینے والا ہے ہم ایسے نفس کے کمزور نہیں ہیں مگر آپ کو دیکھ کر ہم خود پر قابو ہی نہیں رکھ پائے ابھی بھی ہمیں یقین نہیں آ رہا کہ ہم آپ جیسی حسین وجمیل لڑکی کے ساتھ۔

وہ بات ادھوری چھوڑ کر مسکرایا تھا اس کی آنکھوں میں بھوک تھی اور انداز مسرور تھا۔

''آپ ہم سے مذاق تو نہیں کر رہیں، کہیں ہم خواب تو نہیں دیکھ رہے۔'' شہاب نے اپنی کلائی کی جلد پر چونٹی کاٹ کر جیسے یقین کرنا چاہا تھا۔

''یا اللہ ہم اتنی حسین دلربا لڑکی کی ہمراہی کے قابل کب تھے یہ تو جیسے کوئی انعام ہاتھ لگا ہے ہم نے اتنی نیکیاں زندگی میں کمائیں نہیں ویسے جو اتنے کرامات کے مستحق ٹھہریں، ہم تو بہت گناہ گار بندے ہیں اس نے آپ کو ہم سے کیسے ملا دیا؟'' وہ مسکرایا تھا اس کی مسکراہٹ میں ایک تفاخر تھا نواب زادی نے خاموشی اور مکمل سکون سے اسے سنتے ہوئے اس کے پیلے دانتوں کی نمائش کو دیکھا تھا وہ کیا کرنے والی تھی اس کے چہرے سے اس کے ارادوں کی خبر شہاب کو نہیں ہو پائی تھی تبھی وہ اس کے کچھ قریب آ کر جذباتی انداز میں گویا تھا۔

''ہم اس ہمراہی کو زندگی پر محیط کرنا چاہیں گے آج جو لمحے ہم آپ کے ساتھ گزاریں گے ان لمحوں کو ہمیشہ جینا چاہیں گے۔ ہم آپ سے شادی کرنا چاہیں گے اور تمام عمر ان لمحوں کی تازگی کو جینا چاہیں گے آپ کا حسن لازوال ہے آپ بے مثال ہیں اور ہم بے صبرے ہوئے جا رہے ہیں ہم سے صبر نہیں ہو رہا اب اس سفر کو یادگار بن جانے دیجیے۔'' شہاب نے کہا تھا اور اس کا چہرہ تھامنا چاہا تھا نواب زادی نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے اس کی پشت پر موجود کھلے ہوئے ٹرین کے داخلی دروازے کو دیکھا تھا اور پھر اس کا چہرہ دیکھ کر ایک عزم سے مضبوط ارادے کے ساتھ اس کے سینے پر دونوں ہاتھ کا دباؤ بڑھا کر اپنی پوری طاقت سے اسے اس کھلے دروازے کی سمت دھکیل دیا تھا شہاب شاید ایسی کوئی توقع نہیں کر رہا تھا اور اپنے جذبات کے نشے میں چور تھا سو وہ ایسا کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا اور ایک چیخ کے ساتھ اس ٹرین سے باہر تھا نواب زادی نے کام تمام کر کے بہت پرسکون انداز میں دروازے کی سمت دیکھا تھا ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے چل رہی تھی سفر آگے بڑھ رہا تھا اور شہاب گزرنے والے اس سفر کا حصہ بن گیا تھا نواب زادی کے چہرے پر اطمینان اور سکون دکھائی دیا تھا جیسے وہ اپنے کیے پر پشیمان نہ تھی شہاب جیسے لوگ جب کسی کی زندگی کو اس موڑ تک لاتے ہیں تو پھر ان کو ردعمل کے لیے تیار رہنا چاہیے شہاب نے اسے آسان ہدف سمجھ لیا تھا وہ اسے کمزور ترین سمجھ کر ہراساں کر رہا تھا مسلسل اس کے اعصاب پر سوار تھا نواب زادی کو اپنا یہ عمل اطمینان کی ایک گہری سانس لینے پر مجبور کر گیا تھا وہ پرسکون ہوئی تھی اس نے اس غلیظ سوچ والے انسان کو جہنم رسید کر دیا تھا گہرا سانس لیتے ہوئے جانے کیوں یکدم اس کی آنکھیں نمی سے بھرنے لگی تھیں شاید وہ اپنی بے بسی پر روئی تھی مگر اس کی اس بہادری نے ایک برے انسان کو اس کے ارادوں کے ساتھ اس سفر سے خارج کر دیا تھا اگرچہ اس کی موت اس کے سر تھی مگر اس نے اس عمل کے لیے خود اسے اکسایا تھا وہ اس کا تر نوالہ نہیں بن سکتی تھی اس نے اس لمحے ٹھان لیا تھا جب وہ مسلسل اپنی خواہشوں کے ساتھ اس سے رجوع کر رہا تھا اور مسلسل اسے ہراساں کر رہا تھا۔

''بیٹی کیا ہوا تم اس طرح بیت الخلا کے سامنے اس دروازے کی سمت کیوں دیکھ رہی ہو؟'' جانے کب وہ خاتون وہاں آئی تھیں نواب زادی نے آنکھیں رگڑتے ہوئے سرنفی میں ہلا دیا تھا اس کا چہرہ کسی ملال کا سایہ نہیں رکھتا تھا وہ اس وقت جس صورت حال سے گزری تھی وہاں جیسے وہ بہت بے حس ہو چکی تھی خاتون نے سہارا دے کر اسے اپنے ساتھ واپسی کے لیے کہا تھا مگر جیسے وہ کوئی آواز نہیں سن رہی تھی مگر وہ خاموشی سے اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگی تھی۔

......☆☆......

فتح النساء حویلی کے پچھلے دروازے سے باہر نکلی تھیں جب گاڑی میں شوفر کو منتظر پایا تھا شوفر نے احتراماً آگے بڑھ کر بوا کو تھام کر سہارا دیا تھا اور ان کو لے کر موٹر کار کی سمت بڑھا تھا فتح النساء نے پلٹ کر جلتی ہوئی شعلوں کی لپٹوں میں گھری اس حویلی کو ایک نظر دیکھا تھا اس گھر سے کئی یادیں جڑی تھیں انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا اس حویلی سے اس طرح نکلنا پڑے گا اس طرح بے یار و مددگار اور افراتفری میں جان بچا کر۔

''بی بی صاحب جلدی نکلیے شعلوں کی لپٹیں بڑھ رہی ہیں اور حویلی کے داخلی دروازے کی سمت بلوائیوں کا شور ہے مجھے ڈر ہے وہ اس طرف آ کر ہمیں گھیر نہ لیں ہمیں یہاں سے جلد سے جلد نکلنا ہوگا۔'' شوفر نے احترام سے کہا تھا اور فتح النساء نے نگاہ حویلی سے ہٹاتے ہوئے سر ہلایا تھا اور موٹر کار کی سمت بڑھنے لگی تھیں۔

......☆☆......

''کیا ہوا میری بچی معاملہ کیا ہے اس طرح شکستہ کیوں لگ رہی ہو؟ صورت حال کا اندازہ تو ہے ہم سب ہی اپنوں کو چھوڑ کر نکلے ہیں ہم میں سے ہر ایک نے اس سفر پر گامزن ہونے کو بہت کچھ گنوا دیا ہے مگر بیٹا یہ تجربات زندگی کا حصہ ہیں اور انہی تجربات سے گزر کر زندگی کا پتا چلتا ہے ہم سب نے جو مصائب اور تکلیفیں اٹھائیں ہیں ان کا پھل ہمیں ضرور ملے گا خدا کرے تمہاری زندگی میں اس کے بعد دکھ اور تکلیف کا کوئی موقع نہ آئے میرا تم سے کوئی رشتہ تو نہیں مگر جانے کیوں تمہیں دیکھ کر میری بچی کا چہرہ تمہارے چہرے میں دکھائی دیتا ہے میں اپنی بچی کا دکھ نہیں بھلا پا رہی مگر تمہارا چہرہ اس کے چہرے میں مدغم ہو کر عجیب راحت دیتا ہے۔'' وہ بھیگتی آنکھوں سے اس کا چہرہ تھام کر بولی تھیں نواب زادی نے ان کا چہرہ بغور دیکھا تھا ان کے نقوش میں یکدم اسے اماں کا چہرہ دکھائی دیا تھا ان کی آوازوں میں اماں کی آوازیں مدغم ہونے لگی تھیں۔

''عین میری بچی۔'' ان کا لہجہ کانوں میں سکون اور راحت دینے لگا تھا وہ میٹھی آواز دل کی تسکین کا باعث بننے لگی تھی۔

''عین میری بچی۔'' ماموں نے جیسے اسے دوبارہ پکارا تھا اور وہ خیالوں اور آوازوں کے پلو کو تھامتی ہوئی گزرے دنوں میں خود کو جانے سے روک نہیں پائی تھی۔

......☆☆......

''عین النور ہماری بچی زندگی میں اتنی معمولی باتوں پر موڈ اتنا خراب نہیں کرتے آپ کو فتح النساء سے کوئی پرخاش ہے تو آپ ان سے ملیں بیٹھیں اور بات چیت کریں دوستی میں یہ سب معمولی باتیں آ جائیں تو دوستی باقی نہیں رہتی وہ آپ کی بچپن کی سہیلی ہیں آپ ان کے بنا ایک پل بھی نہیں رہ سکتیں یہ بات تو ہم جانتے ہیں کہ آپ دونوں کا گزارہ ایک دوسرے کے بنا ممکن نہیں ہے وہ بھی بے چین ہوں گی اور یہاں آپ منہ بگاڑ کر بیٹھی ہیں دیکھیے اتنا تیز بخار چڑھا لیا تم نے خالہ جمن سے کہہ کر آپ کی ان پیاری دوست کو بلوایا ہے سو اب ان سے بات کر کے معاملات رفع دفع کریں باتوں کو پھیلانے سے باتوں کے سمندر بن جاتے ہیں پھر انہی سمندروں کی موجیں اپنی شوریدہ سرسروں سے ہمیں اپنے ساتھ بہانے لگتی ہیں دلوں میں میل کہیں آنا چاہیے اگرچہ ہمیں آپ کی دوستی اور اس درجہ قربت فتح النساء سے قابل قبول نہ تھی مگر ہم نے آپ کی خوشی کی خاطر ان کو ہمیشہ آپ کے اردگرد موجود رہنے دیا کیونکہ ان کی موجودگی آپ کے لیے راحت کا باعث تھی ایک بار آپ دونوں کی لڑائی ہوگئی تھی اس وقت آپ دونوں پرائمری جماعت پاس کرنے کو تھیں انہوں نے آپ کا کھانے کا وہ ڈبہ لے لیا تھا جو آپ کو سب سے زیادہ پسند تھا وہ آپ کی نانی جان کی طرف سے آپ کی سالگرہ کا تحفہ تھا سو اس

چاندی کے کھانے والے ٹفن کے لیے آپ خاص انسیت اور جذبات وابستہ رکھتی تھیں ہم نے آپ سے کہا بھی تھا کہ آپ ان سے اس بارے میں کوئی بات نہ کریں ہم آپ کو چاندی کا ایک ایسا ہی ڈبہ اور دلوا دیں گے مگر آپ ان سے خفا رہی تھیں اور جب انہوں نے خود وہ ڈبہ لا کر آپ کے ہاتھ میں تھما دیا تھا تو آپ نے روتے ہوئے انہیں گلے لگا لیا تھا آپ کہہ رہی تھیں کہ آپ کو دکھ اس کھانے والے ڈبے کے چلے جانے کا نہیں تھا آپ تو صرف اس باعث رنجیدہ تھیں کہ آپ اپنا غصہ دبا نہیں پائیں تو آپ نے ان سے اونچے لہجے میں بات کی اور نتیجتاً فتح النساء نے آپ سے بات بند کر دی اور آپ کو یہی بات کھل رہی تھی کہ آپ سے بات کیوں نہیں کر رہی تھیں آپ دونوں تب بھی ایک دوسرے کے بنا نہیں رہ پائی تھیں اور اب تو آپ دونوں ایک دوسرے کی مزید عادی ہو گئی ہیں ہم تو سوچ رہے تھے کوئی رشتہ دیکھ کر آپ کے نکاح کے ساتھ ہم فتح النساء کا نکاح بھی وہیں مرزا سراج الدولہ بھائی صاحب کی حویلی میں کر دیں۔'' اماں مسکرائی تھیں عین نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا پھر مدہم لہجے میں بولی تھیں۔

''آپ فتح النساء کا نکاح جلال بھیا کے ساتھ کیوں نہیں ہونے دینا چاہتی؟'' ان کا سوال اماں کو خاموش کر گیا تھا وہ لب بھینچ گئی تھیں اور پھر عین کی سمت سے نگاہ پھیر کر بولی تھیں۔

''یہ رشتہ کوئی جوڑ نہیں رکھتا عین' جلال کیوں اس رشتے کی بات کر رہا ہے؟ ہم نہیں جانتے مگر ہمیں فتح النساء قبول نہیں ہے ہم نے کبھی ان کو اس رشتے کی نظر سے نہیں دیکھا ایسا نہیں کہ ہم برابری کے قائل ہیں اور فتح النساء کو اس قابل نہیں سمجھتے ہماری نگاہ ان باتوں پر ہے اور......!''

''معذرت چاہتے ہیں ہم آپ کی بات میں مخل ہو رہے ہیں اماں جان مگر......!'' عین نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے اماں نے ان کی سمت سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں نواب زادی۔'' اماں نے پوچھا تھا اور تبھی عین ان کی سمت سے نگاہ ہٹاتے ہوئے بولی تھیں۔

''اماں پتا نہیں ہمیں فتح النساء پر یہ الزام لگانا بھی چاہیے کہ نہیں مگر جانے کیوں لگتا ہے کہ کسی نہ کسی طور وہ ان واقعات سے جڑ گئی ہیں جن کے توسط سے پتا چلتا ہے کہ وہ مرزا حیدر سراج الدولہ سے......وہ بات کرتے کرتے رک گئی تھیں اماں نے ان کو حیرت سے دیکھا تھا۔

''آپ کو یہ شک کیونکر گزرا اور نواب زادہ جلال کا فتح النساء سے نکاح کرنے پر اصرار کرنا کیا اسی سلسلے سے جڑی کوئی کڑی ہے۔'' اماں نے دریافت کیا تھا اور تبھی نواب زادی نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی تھیں۔

''یہ تو ہم نہیں جانتے اماں جان مگر فتح النساء نے مرزا حیدر سراج الدولہ پر الزامات لگائے ہیں وہ کہتی ہیں کہ حیدر میاں نے ان کو میلی نظروں سے دیکھا ہے۔''

''یا اللہ۔'' اماں نے اپنا دل پکڑا تھا۔

''یہ کب ہوا آپ نے ہمیں کیوں بے خبر رکھا ہم نے منع کیا تھا نا کہ فتح النساء سے اتنی دوستی مت بڑھائیں آپ تو سننے کو تیار ہی نہیں تھیں بات اس نہج تک پہنچ گئی اور آپ نے ہمیں بے خبر رکھا۔'' اماں حیران تھیں نواب زادی شرمندہ ہو گئی تھیں۔

''معذرت چاہتے ہیں اماں ہم آپ کو بے خبر رکھنا نہیں چاہتے تھے مگر ہمیں اس رشتے کو خراب نہیں کرنا تھا فتح النساء ہماری دوست ہیں وہ ہم سے برابری کا نہیں سوچ سکتیں اور حیدر میاں ان کی مذاق کی عادت ہے ان کی مذاق میں کہی گئی باتوں کو لے کر جیسے فتح النساء نے رائی کا پہاڑ بنا دیا اور ہمارا رشتہ اس پہاڑ کے نیچے دب کر سسکنے لگا۔'' عین مدہم لہجے میں گویا ہوئی تھیں اماں اسے پر خیال نظروں سے دیکھنے لگی تھیں۔

''حیدر میاں ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں ہم ان پر شک نہیں کر سکتے وہ سلجھے ہوئے مزاج کے نوجوان ہیں یقیناً فتح النساء کو کوئی غلط فہمی رہی ہو گی ہم محض فتح النساء کے کہنے پر حیدر میاں پر شک نہیں کر سکتے، ہو سکتا ہے فتح کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔'' ان کے کہنے پر عین نے ان کو شاکی نظروں سے دیکھا تھا۔

''آپ کو واقعی ایسا لگتا ہے اماں؟ ہم حیدر میاں سے منسوب ہیں ان کے لیے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں شاید ہم

حیدر میاں کو کسی قدر خاص رعایت دے رہے ہوں مگر آپ غیر جانبداری سے ان معاملات کو دیکھ کر بتائیں کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے حیدر میاں ہمارے ساتھ کبھی ہم کلام ہوتے ہیں تو وہ دوسرا کوئی ذکر نہیں کرتے ایک خاص احترام اور حرمت ان کے لہجے میں ہوتی ہے ہم ان کی منگیتر ہیں اگر وہ ہمارے لیے اس احترام اور عزت کی سطح سے نیچے نہیں اترتے تو ہم کیسے مان لیں وہ فقط ہماری سہیلی کے لیے اپنا ضبط ہار جائیں گے جبکہ وہ ہم سے برابری بھی نہیں رکھتیں۔ معذرت چاہتے ہیں ہم چھوٹی بات کر رہے ہیں اماں ہم نے یہ نہیں سیکھا مگر ہم ہر پہلو سے اس مدعا کو جانچنا چاہتے ہیں ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ دراڑ کس باعث رونما ہوئی؟'' نواب زادی نے بردبار لہجے میں کہا تھا اور اماں کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

☆☆......

''ہم نے ٹھان لی ہے چاہے اماں جان اس کو حکم عدولی تصور کریں مگر ہم محل میں واپس نہیں جائیں گے ہم اس مدعا پر کوئی بات کرنا ضروری خیال نہیں کرتے۔'' فتح النساء نے کہا تھا بوا ان کو چپ چاپ دیکھنے لگی تھیں فتح النساء کچھ الجھی دکھائی دی تھیں۔

''بیٹی یہ معاملات حساس ہیں معاملہ دوستی کا ہے اور اس گھر سے آپ کے تعلق کا' اس گھر میں آپ کو بہت عزت ملی ہے اگر بیگم صاحبہ آپ کو بلا رہی ہیں تو آپ کو ان سے ملنے جانا چاہیے اس وقت اس سے زیادہ ضروری کوئی معاملہ نہیں ہونا چاہیے۔'' بوا نے سمجھایا تھا مگر فتح النساء کا چہرہ اندرونی خلفشار کی عجیب کہانی بیان کر رہا تھا۔

''ہم نہیں جائیں گے ہمیں فی الحال بات نہیں کرنی آپ جمن بوا کو کہہ دیں ہماری طبیعت ٹھیک نہیں ہم پھر کبھی جا کر بیگم صاحبہ سے مل لیں گے ان سے کہیے گستاخی معاف مگر فی الحال ہماری طبیعت اس قابل نہیں کہ ہم فوری طور پر حاضر ہو جائیں۔'' فتح النساء نے کہا تھا اور تب بوا نے ملازمہ کو بلا کر جمن بوا کو واپس جانے کی ہدایت دی تھی اور پھر ان کی سمت دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔

''یہ کیا معاملات ہیں فتح النساء معمولی ناراضگی اتنی کیسے بڑھتی جا رہی ہے کیا آپ ہم سے کوئی بات چھپا رہی ہیں۔'' بوا نے کہا تھا اور تب اس نے سر ان کی گود میں رکھ دیا تھا بوا جان گئی تھیں کہ وہ دل گرفتہ ہیں اور مشکل وقت سے گزر رہی ہیں تبھی ان کے سر پر آہستگی سے ہاتھ پھیرنے لگی تھیں انہوں نے فوری طور پر ہی مدعا پر بات کرنا ضروری خیال نہیں کیا تھا اور اس لمحے جانے کیوں فتح النساء کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

''جس سہیلی پر ہمیں اتنا اعتبار تھا جن پر ہم بہت مان اور بھروسہ کرتے تھے وہ سہیلی ہم پر اعتبار کرنے سے قاصر ہیں وہ ہمارے کہے کو بھی جھٹلا رہی ہیں ہم نہیں جانتے تھے کہ وہ ایک روایتی نواب زادی بن جائیں گی اور ہم کو محض اپنے ٹکڑوں پر پلنے والی ایک بے سہارا لڑکی سمجھا ہم ان کی برابری کرنا نہیں چاہتے تھے کبھی نہ ہم نے کبھی نواب زادی کی برابری کرنا چاہی ہم اپنی حیثیت کبھی بھولے نہیں تھے ہم جانتے ہیں ہم نواب صاحب کے ٹکڑوں پر پلے ہوئے ہیں ہمیں مراعات ملی ہیں مگر ہم ان مراعات سے نواب زادی نہیں بن جاتے ہم ایک عام سی لڑکی ہیں اور یہ بات ہم اپنی یادداشت سے نکال نہیں پائے ہیں۔'' بوا نے ان کی سمت دیکھا تھا مگر انہوں نے اسے بولنے دیا ان کی آنکھوں کے کنارے گرم گرم آنسوؤں سے جلتے ہوئے لگ رہے تھے مگر بوا نے ان کھولتے پانیوں کو پونچھنے کی کوشش نہیں کی تھی وہ چاہتی تھیں کہ اندر سے یہ غبار بہہ جائے اور وہ ایک ہی بار رہ کر اپنے اندر کے اس لاوے کو باہر نکال دیں۔ بوا ہم یقین نہیں کر پائے کہ نواب زادی نے ہم پر ایسا الزام کیوں لگایا، ہم پر شک کیونکر کیا اور جب ہم نے تمام حقائق بیان کر دیے تو وہ ہماری بات کو رد کیونکر کرنے لگیں ایک طویل عرصے کی دوستی کیا اعتبار کرنا نہیں سکھاتی ہم نے ان سے حیدر میاں کی اصلیت کہہ دی اور وہ بجائے ہمارا اعتبار کرنے کے الٹا ہمیں کو اپنے شک کے دائرے میں لے آئیں، ہم خود سے نگاہ نہیں ملا پا رہے بوا انہوں نے ہمیں ہماری نظروں میں ہی گرا دیا ہے ہم نے ان سے کہا کہ حیدر میاں اچھے کردار کے نہیں ہیں وہ ہم کو میلی نظروں سے دیکھتے رہے ہیں اور ہمیں ہوس پرست منصوبوں کا شکار کرنا چاہتے ہیں محبت ایسی اندھی ہوتی ہے کیا کہ کسی اپنے اتنے عزیز دوست کے کہے پر بھی اعتبار نہ

آئے ان کو لگا کہ میں غلط ہوں اور حیدر میاں درست ہیں ان کو لگا حیدر میاں ایسا کبھی کر ہی نہیں سکتے وہ حقائق پر نگاہ کرنے کو تیار نہیں ان کی نگاہ میں ہم نے جو کہا وہ جھوٹ ہے تو پھر کیا فائدہ اس دوست کا جب ان کو ہم پر اعتبار بھی نہیں ان کی نگاہ میں ہم اتنے گرے ہوئے ہیں تو پھر تعلقات کو آگے بڑھانے سے فائدہ۔ کوئی دوستی نا مستقل دوستی رہ سکتی ہے نا مستقل دشمنی سو اگر یہ دوستی اپنا وجود کھو رہی ہے تو ہمیں اس دوستی کو خیر باد کہہ کر کنارہ کشی کر لینا چاہیے۔'' وہ دکھ کی کیفیت سے نڈھال تھیں بوا نے ان کو اس طرح روتے ہوئے یا اس طرح رنجیدہ ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا یقیناً ان کے دل کو بہت ٹھیس لگی تھی بوا کا دل ان کی کیفیت پر کٹ کر رہ گیا تھا۔

''آپ وضاحت دینے کی کوشش کریں ہوسکتا ہے نواب زادی کو آپ پر اعتبار آ جائے۔'' بوا نے محض ان کا دل رکھنے اور دوستی میں دراڑ کو ختم کرنے کی غرض سے کہا تھا مگر وہ نفی میں سر ہلانے لگی تھیں۔

''رشتے اس طور بسر نہیں ہوتے بوا مجھے یہ بات آپ کو سمجھانا نہیں چاہیے آپ جانتی ہیں بوا رشتے کیسے بنائے جاتے ہیں میرا آپ سے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں مگر آپ نے مجھے اولاد سے بڑھ کر چاہا ہے اتنی محبت کوئی اپنی اولاد کو بھی نہیں دیتا اور میرے رشتے نے کیا دیا مجھے' مجھے میری نظروں سے گرا دیا۔'' اس کے آنسو تھم نہیں رہے تھے بوا نے ان کی آنکھوں کو ضبط سے پونچھا تھا اور اسے مزید نہ رونے کا اشارہ کیا تھا۔

''بیٹا غلط فہمیاں رشتوں میں دراڑوں کا باعث بن جاتی ہیں مگر یہ وقتی توڑ پھوڑ ہوتی ہے اگر چہ یہ تکلیف دہ ہوتی ہیں مگر اس سے گزرنا بھی ایک آزمائش ہے جو اس آزمائش سے گزر جاتا ہے اللہ اس پر اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔'' بوا نے مثبت انداز فکر کے تحت اسے سمجھایا تھا۔

''ہم نہیں جانتے بوا اگر چہ یہ توڑ پھوڑ یا دراڑیں وقتی عمل نہیں مگر یہ انتشار جان لیوا ہے ہم اس آزمائش سے گزرنے کی سکت نہیں رکھتے یہ عمل بہت کٹھن ہے ہم سب کی باتوں کو بھول بھی جائیں تو اس بات کو نہیں بھول پائیں گے کہ کسی طور ہمیں ہماری نظروں سے ہی گرا دیا گیا ہمارا وقار، ہماری عزت نفس دو کوڑی کی نہیں رہی ہمارا خود پر مان غرور کچھ باقی نہیں رہا کوئی ہمارے بارے میں کیا سوچتا ہے اور وہ کوئی بھی ان کو تسلی دیتے میں ناکام رہی تھیں مگر ان کی خود کی آنکھیں اس غم میں بھیگنے لگی تھیں۔

......☆☆......

نواب صاحب نے کھانا نوش فرماتے ہوئے بیگم کو دیکھا تھا۔

''یہ کیا مدعا ہے بیگم۔'' ہم نے سنا ہے ہمارے صاحبزادے اپنی مرضی سے فتح النساء کے ساتھ نکاح کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے؟ آپ اس معاملے میں کیا کہتی ہیں؟'' نواب صاحب نے رسانیت سے پوچھا تھا تبھی بیگم صاحبہ نے ان کو ترچھی نظروں سے دیکھا تھا۔

''کیا آپ اس معاملے میں رضا مندی دینے کا سوچ رہے ہیں؟'' ان کا لہجہ حیرت سے بھرپور تھا نواب صاحب خاموشی سے کھانا تناول فرماتے رہے تھے۔

''ہم نہیں سمجھتے یہ رشتہ قائم ہونا چاہیے اگر چہ ہم فتح النساء کو اپنی بیٹی کی طرح ہی عزیز جانتے ہیں مگر......!'' وہ مدہم لہجے میں بولے تھے تبھی بیگم صاحب نے انہیں دیکھا تھا۔

''یہ کیا معاملہ ہے نواب صاحب آپ کا اپنے سپوت پر اختیار نہیں رہا، کسی کو بھی نکاح میں لینے کا عندیہ ظاہر کرے گا تو کیا ہم اس طور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے خاموش بیٹھے رہیں گے نواب زادے چاند سے کھیلنے کی ضد کرتے ہیں مگر ہمیں نہیں لگتا فتح النساء وہ چاند ہیں۔'' بیگم صاحبہ کا لہجہ ترش تھا نواب صاحب نے ان کو رسانیت سے دیکھا تھا پھر نرمی سے بولے تھے۔

''نواب خاندان کا خون ہے پر جوش اور ضدی تو ہوگا مگر ہمیں حقائق پر بھی نگاہ رکھنا چاہیے۔'' وہ مدبرانہ لہجے میں بولے تھے بیگم صاحبہ نے کھانے سے ہاتھ روک کر انہیں دیکھا تھا۔

''یہ آپ کے انہی دوست کی بیگم کی اولاد ہیں نا جن سے آپ محبت فرما رہے تھے۔'' بیگم صاحبہ کے لہجے کی کاٹ صاف محسوس کی جاسکتی تھی مگر نواب صاحب خاموش

رہے تھے۔

''ہم یہ نکاح کسی صورت میں نہیں ہونے دیں گے نواب صاحب اگر آپ بھی خاموش رہے تو یہ بھیانک ترین ہوگا۔'' بیگم صاحبہ نے نواب صاحب کو جتایا تھا وہ خاموشی سے کھانا تناول فرماتے رہے تھے۔

''نواب صاحب ہم اس مدعا پر بحث کرنا نہیں چاہتے ہم آپ کا فیصلہ نہیں جانتے لیکن آپ سچائی سے واقف ہیں آپ نے فتح النساء کی ذمہ داری پوری کی اس کی دیکھ بھال پر خاص توجہ دی ہم خاموش رہے آپ نے اپنی وراثت میں اس کا حصہ رکھا ہم اس پر بھی خاموش رہے مگر یہ مناسب نہیں ہے۔'' بیگم صاحبہ نے کہا تھا اور نواب صاحب خاموشی سے کھانا نوش فرماتے رہے تھے۔

......☆☆......

''ابا جان ہم آپ سے کچھ بات چیت کرنے کے خواہاں تھے اگر آپ کے پاس وقت ہو تو کیا ہم اپ کا کچھ وقت لے سکتے ہیں۔'' جلال نے بہت بردبار انداز میں ابا کے سامنے آتے ہوئے کہا تھا اور ابا نے ان کو خاموشی سے بغور دیکھا تھا پھر نرمی سے بولے تھے۔

''کوئی سیاسی مسئلہ آ گیا ہے کیا؟'' وہ جان بوجھ کر معاملے کو نظر انداز کرنا چاہتے تھے جیسے جلال نے ان کو بغور جانچا تھا۔

''کیا آپ اس معاملے پر بات کرنے کے خواہاں نہیں؟'' وہ صاف گوئی سے کوئی لگی لپٹی رکھے بنا بولا تھا نواب صاحب نے گھڑی کو دیکھا تھا۔

''ہم کسی ضروری کام سے نکل رہے تھے کیا ہم کسی اور وقت اس بارے میں بات کر سکتے ہیں۔'' نواب صاحب جیسے قصداً نظر انداز کرتے ہوئے بولے تھے جلال الدین نے سر ہلا دیا تھا اور پلٹ کر زینہ اترنے لگا تھا۔ نواب صاحب اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔

جلال الدین دادی جان کے پاس تخت پر بیٹھ کر جانے کیا بات کرنے لگا تھا نواب صاحب چلتے ہوئے وہاں سے نکل گئے تھے۔

''دادی جان ہم نکاح کرنا چاہتے ہیں مگر ابا اس معاملے پر بات کرنے کے جیسے خواہاں دکھائی نہیں دیتے

آپ کے خیال میں ہم اس معاملے میں درست قرار دیے جائیں گے اگر ہم اپنی مرضی اور منشا سے اس نکاح کو منعقد ہونے دیں؟'' جلال نے دادی جان کے سامنے معاملات کو کھول کر رکھا تھا دادی جان نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

''آپ عاقل اور بالغ ہیں چھوٹے نواب آپ کو کون قرار دے سکتا ہے شرعی طور پر یہ نکاح جائز ہوگا اور آپ کے ابا جان کو اصولاً اس نکاح پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔'' دادی اماں نے نرم خوئی سے کہا تھا۔

''لیکن پھر بھی ابا جان کو کوئی اعتراض ہو تو؟'' جلال الدین نے پوچھا تھا تب دادی جان نے انہیں لحہ بھر کو خاموش ہو کر دیکھا تھا۔

''آپ کے لیے کیا اہم ہے چھوٹے نواب آپ اپنے دل کی سننا چاہتے ہیں؟'' دادی جان نے ان کے اندر کی مرضی جاننا چاہی تھی وہ جواب دیے بنا گردن پھیر گئے تھے۔

''آپ دل کے معاملات کو اہمیت دینا ضروری خیال کرتے ہیں؟'' دادی جان نے پوچھا تھا جلال الدین نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

''دادی جان ہم دل کے معاملات کی بات کب کر رہے ہیں؟'' وہ گویا حیران ہوئے تھے اور ان کی یہ حیرت دادی جان کو دوگنا حیران کر گئی تھی۔

''چھوٹے نواب آپ کے معاملات خاصے پیچیدہ دکھائی دیتے ہیں آپ مخالفت مول لے کر شادی کرنے کے خواہاں ہیں اور اس شادی کے بندھن میں محبت کا سرے سے کوئی ذکر نہیں یہ کیسی وابستگی ہے جو محبت کے بنا قائم ہے اور اس درجہ مضبوطی سے قائم ہے؟'' دادی جان نے ان کو جیسے چشمے کے پیچھے سے بغور جانچا تھا۔

''کبھی کبھی معاملات دل ضروری نہیں ہوتے دادی جان۔'' جلال بولے تھے اور دادی جان سر ہلانے لگی تھیں۔

''بہر حال آپ کی خوشی اہم ہے چھوٹے نواب کیا چاہتے ہیں یہ ضروری ہے باقی سب غیر ضروری ہو جاتا ہے ویسے آپ ہم سے کیا توقع کرتے ہیں ہم آپ کے ابا حضور سے بات کریں۔'' دادی نے پوچھا تھا جلال نے سر ہلایا تھا۔

''آپ سمجھ دار ہیں دادی جان آپ معاملات کو سنبھال سکتی ہیں۔'' وہ سر جھکا کر بولا تھا دادی جان نے ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''ہم کوشش کریں گے چھوٹے نواب ہمارے خاندان کے چشم و چراغ ہیں آپ ہم آپ کی خوشیوں کو اہم جانتے ہیں۔'' دادی جان نے کہا تھا اور مسکرا کر پوتے کا ماتھا چوما تھا۔

''سلامت رہیے۔'' دادی جان نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔

☆☆

''آپ کیوں باتوں کو اپنے زاویے پر موڑ رہی ہیں؟'' تیمور بہادر یار جنگ نے کہا تھا اور وہ الجھی ہوئی سی اس کی سمت دیکھنے لگی تھی پھر مدھم لہجے میں بولی تھی۔

''آپ چیزوں کو اپنے طور پر اخذ کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔'' عین نے کسی قدر برہمی سے تیمور کو دیکھا تھا۔

''کبھی کبھی معاملات کا کھل کر بیان کرنا ضروری نہیں ہوتا نواب زادی عقل کے لیے لامحدود کناروں تک رسائی ممکن ہوتی ہے خرد اتنی محدود نہیں ہے۔'' تیمور نے جتایا تھا عین اسے دیکھ کر رہ گئی تھی پھر آہستگی سے پوچھنے لگی تھی۔

''آپ کو کیسے خبر ہوئی؟'' وہ جیسے جان گئی تھی کہ وہ معاملات تک رسائی رکھتا ہے تیمور نے اسے لحہ بھر کو خاموشی سے دیکھتے ہوئے شانے اچکا دیے تھے۔

''آپ نے کہا میرا جاننا ضروری نہیں۔''

''اور آپ پہلے سے سب جان چکے ہیں؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''مگر آپ نے مطلع کرنا ضروری خیال نہیں کیا۔'' تیمور کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''یہ ضروری نہیں تھا۔'' وہ قطعی لہجے میں بولی تھی۔

''آپ کے لیے ضروری کچھ بھی نہیں تھا نواب زادی۔'' تیمور کے لہجے میں ایک شکوہ تھا وہ خاموش رہی تھی اور نگاہ چرا گئی تھی جب وہ بولا تھا۔

''محبت اس قدر اندھی نہیں ہوتی نواب زادی۔'' وہ

جیسے اس کو بغور پڑھتے ہوئے بولا تھا اس کا انداز جتانے والا تھا۔

''ہم اس بارے میں بات کرنا ضروری خیال نہیں کرتے۔'' اس کا انداز لاتعلق تھا مگر وہ نظر انداز کرتے ہوئے بولا تھا۔

''زندگی میں کوئی ایک رشتہ چن کر بقا ممکن نہیں ہے نواب زادی تمام دیگر رشتوں سے بھی ہماری زندگی اس قدر شدت اور مضبوطی سے جڑی ہوتی ہے کہ ہم حقائق کو نظر انداز کرسکیں۔'' وہ جیسے اسے سمجھانا ضروری خیال کررہا تھا وہ خاموشی سے دیکھنے لگی تھی پھر بولی تھی۔

''ہم جانتے ہیں تیمور بہادر یار جنگ مگر دیگر رشتوں کو بھی اپنی حدود کا یقین کرلینا ضروری ہے اگر وہ اپنی حدود پھلانگنے لگیں تو ایسے رشتے مسلط شدہ بوجھ بن جاتے ہیں ہم جانتے ہیں آپ کے ذہن میں اس وقت فتح النساء ہے اور اس سے جڑے کئی سوال اور آپ ان مسائل کا سدباب چاہتے ہیں مگر بعض اوقات چیزوں کو قبل از وقت سمیٹنا چیزوں کو اور بکھیر دیتا ہے اور یوں بھی یک طرفہ مدعا سن کر کچھ بھی قیاس کرلینا مناسب نہیں ہے۔'' وہ پرسکون لہجے میں بولی تھی تیمور نے سر ہلایا تھا۔

''جانتا ہوں نواب زادی ہمیں آپ کے نجی معاملات پر نکتہ چینی کرنے اور مداخلت کرنے کا کوئی اختیار نہیں مگر اچھے دوست مشکل سے ملتے ہیں انہیں ہاتھ سے نکال دینا بے وقوفی ہے اور نکال کر ہاتھ ملنا کو تدارک باقی نہیں رکھتا سو یہ موقع آنے سے قبل صورت حال کو سنبھال لینا ضروری ہے۔'' تیمور نے سمجھایا تھا۔ نواب زادی نے سر ہلایا تھا۔

''آپ دوست ہیں اس مدعا پر بات کرنے کی اجازت رکھتے ہیں مگر فی الحال آپ پوری بات نہیں جانتے اور آدھی بات سن کر الجھنا مناسب نہیں۔''

''آپ سمجھتی ہیں فتح النساء حیدر میاں پر ڈورے ڈال رہی ہیں؟'' تیمور نے رسانیت سے کہتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

''ہم اس معاملے پر بحث نہیں چاہتے۔'' وہ لاتعلق لہجے میں بولی تھی۔

''آپ سمجھتی ہیں فتح النساء حیدر میاں پر ڈورے ڈال رہی ہیں۔'' تیمور نے رسانیت کہتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

''ہم اس معاملے پر بحث نہیں چاہتے۔'' وہ لاتعلق لہجے میں بولی تھی۔

''آپ حماقت کررہی ہیں نواب زادی یہ حماقت ہے محبت نہیں محبت فرد خاص کے عیب گننے نہیں دیتی کیونکہ محبت کی آنکھوں کو ایسے عیب سرے سے دکھائی ہی نہیں دیتے سوان پر نظر کرنا محبت کے لیے ممکن نہیں۔'' تیمور نے مناسب لفظوں کا انتخاب کرکے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''حیدر میاں میں کتنے عیب ہیں تیمور بہادر یار جنگ۔'' وہ تنک کر پوچھنے لگی تھی وہ مسکرا دیا تھا۔

''حیدر میاں کے عیب ہم نے گننا ضروری نہیں جانا۔ ہمارا حیدر میاں سے واسطہ نہیں ہے نواب زادی حیدر میاں آپ کا نجی معاملہ ہیں مگر ہم فتح النساء کی فکر کررہے ہیں اگرچہ ہمیں آپ کی فکر بھی ہے مگر آپ اس حالات ایسے وقت سے گزر رہی ہیں جہاں آپ کو کسی کی خیر خواہی مطلوب نہیں آپ کو لگتا ہے ساری دنیا اگر حیدر میاں کے خلاف ہے تو آپ کو ان کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے کیونکہ آپ کی نگاہ نہیں دیکھتی کہ ساری دنیا اندھی نہیں ہے نا ان کو حیدر میاں سے یا آپ سے کوئی دشمنی ہے۔'' وہ مدہم لہجے میں بولا تھا وہ بغور دیکھنے لگی تھی۔

''ہم نہیں جانتے تیمور! حیدر میاں واقعی غلط ہیں مگر ہم ان کی منگیتر ہیں اور ان کے متعلق ایسی بے سروپا باتیں ہم سے نہیں سنی جاتیں چاہے وہ کیسے بھی ہوں۔'' وہ تھک کر بولی تھیں۔ تیمور کچھ دیر کو خاموش ہوئے پھر بولے تھے۔

''ہم نہیں جانتے ہیں عین النور آپ اپنے اندر کی مخالفت کیوں کررہی ہیں آپ جانتی ہیں کہ وہ غلط ہیں آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ آپ کو ان سے محبت نہیں ہے پھر بھی آپ اپنے کو رد کرنا ضروری خیال کیوں کرتی ہیں اس بات کا جواب صرف آپ ہی اپنے اندر ڈھونڈ سکتی ہیں۔'' تیمور نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا تھا وہ دیکھ کر رہ گئی تھیں تیمور نے انہیں بغور دیکھا تھا ان نگاہوں میں کیا بات تھی جو بھرپور انداز میں جتانے کی کوشش میں تھی کہ عین کی آنکھوں نے رخ پھیرنا ضروری خیال کیا تھا۔

''جلال بھائی نے بتایا ہے کہ آپ کے لیے کوئی رشتہ موجود ہے اور آپ کی والدہ آپ کو اس رشتے کو باندھنے کے لیے بھی اکسا رہی ہیں۔'' اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا تھا تیمور نے ان کی طرف خاموشی سے دیکھا تھا ان کی نگاہ جیسے کہہ رہی تھی کہ آپ کو کیا فرق پڑتا ہے یا کیا یہ جاننے کے بعد آپ صورت حال کو بدلنے کا ارادہ باندھ لیں گی؟

''یہ ضروری نہیں نواب زادی فی الحال جو آپ کی زندگی میں چل رہا ہے وہ زیادہ الجھا ہوا ہے ہم اپنی زندگی کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔'' وہ سرسری انداز میں بولے تھے جیسے یہ ذکر انتہائی غیر اہم ہو۔

''اوہ، مگر آپ تو بتا رہے تھے آپ کو کسی سے بہت دھواں دھار سی محبت ہوئی تھی آپ نے کہکشاؤں میں ستاروں میں ان کو ڈھونڈ نکالا تھا پھر آپ اور کس بات کا انتظار کر رہے ہیں؟'' وہ جیسے اس ذکر کے خاتمے سے کس قدر نسبتاً کم الجھی ہوئی دکھائی دی تھیں گویا تیمور کی زندگی کو ڈسکس کرنا ان کو قدرے پرسکون کر رہا تھا یا وہ غور نہیں کرنا چاہتی تھیں کہ ان آنکھوں کی بے چینی کتنی بڑھتی جا رہی تھی۔

''کہکشاؤں پر رشتے آباد نہیں ہوتے نواب زادی، نہ کہکشاؤں اور ستاروں پر گھر بنتے ہیں اگر بن سکتے تو ہم اپنا گھر وہاں بنانا چاہتے مگر محبت کی کمیت اور ہیبت ان کہکشاؤں پر اپنا وجود کھونے لگتی ہے اور محبت اس ثقیل آب و ہوا اور ماحول کی عادی نہیں رہتیں۔'' وہ مدہم لہجے میں بولا تھا اور جانے کیوں نواب زادی نے ان کی طرف دیکھنے سے مکمل گریز کیا تھا وہ اٹھے تھے اور چلتے ہوئے باہر نکلتے چلے گئے تھے نواب زادی عین النور پٹوڈی نے تب ایک نگاہ ان کی سمت کی تھی مگر جانے کیوں اگلے ہی لمحے اجنبی بن جانا ضروری خیال کیا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھیں کہ کیوں وہ تیمور بہادر یار جنگ کی سمت دیکھنے کی خواہاں نہیں تھیں یا اپنے اندر کی تھی کیوں کر رہی تھیں کیا واقعی ان کو حیدر میاں سے محبت نہیں تھی؟ ان کے اندر ایک بے چینی سی پھیلنے لگی تھی۔

''تیمور نے کیوں کہا کہ ہمیں حیدر میاں سے محبت نہیں کیا ایسا انہوں نے ہمارے چہرے پر پڑھا مگر ہم تو حیدر میاں سے ایک خاص تعلق سے وابستہ ہیں اور اس رشتے سے ایماندار رہنا ہماری ذمہ داری ہے اور محبت۔'' وہ سوچتے سوچتے تھکنے لگی تھیں انہیں لگتا تھا یہ لفظ جیسے ان کے لیے انتہائی اجنبی ہو یا جیسے ان کا واسطہ اس لفظ سے کبھی پڑا ہی نہ ہوا انہوں نے لحہ بھر کو جیسے تھک کر آنکھیں میچی تھیں۔

''محبت ہمیں یہ لفظ اتنا دقیق کیوں لگ رہا ہے۔'' انہوں نے حیرت سے سوچا تھا اور جانے کیوں آنکھوں کے سامنے تیمور بہادر یار جنگ کا چہرہ آ گیا تھا ان نظروں کی بے چینی تھی یا کوئی اور کیفیت عین النور پٹوڈی نے جھٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں وہ الجھ کر رہ گئی تھیں۔

تیمور کی ان بے چین نظروں کا ان سے کیا واسطہ تھا یا تعلق تھا وہ کیوں ان آنکھوں کے بارے میں سوچنے لگی تھیں کیوں ان نظروں کی بے چینی ان کو اپنے وجود کے اندر سرایت کرتی محسوس ہوئی تھی۔

''ہمیں حیدر میاں کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہے ان کی زندگی سے ہماری زندگی جڑی ہے، ان کے علاوہ ہمیں کسی اور کا نہ بننا ہے نا واسطہ رکھنا ہے ہمیں حیدر میاں کا ساتھ دینا ہے ہم نہیں جانتے ان سے جڑی باتیں حقیقت میں یا ان کا کوئی وجود نہیں ہم اس بارے میں سوچ کر اپنی توانائی ضائع نہیں کر سکتے ہم جس رشتے سے آغاز سے منسوب ہیں ہماری ذمے داری بنتی ہے کہ ہم اس رشتے کے ساتھ وفادار رہیں ہماری وفاداریاں اس رشتے کے لیے وقف رہنا ضروری ہے ہم نواب خاندان کی عزت ہیں اگر یہ رشتہ کسی باعث ختم ہوتا ہے تو سب لوگ باتیں ہمیں سے منسوب کریں گے انگلیاں پٹوڈی خاندان پر اٹھیں گی ہم ان تہمتوں کے جواب میں کچھ وضاحت نہیں دے سکیں گے ہم نہیں چاہیں گے کوئی حرف پٹوڈی خاندان کی عزت و حرمت پر ہمارے باعث آئے اس خاندان کی عزت و حرمت بچانا ہماری ذمہ داری ہے۔

ہم اس خاندان کی سمت ہماری وجہ سے انگلیاں اٹھتے نہیں دیکھ پائیں گے ہم صرف وہ کر رہے ہیں جو ہمارا فرض ہے ہم وہ کر رہے ہیں جو پٹوڈی خاندان کی ہونہار بیٹی کو کرنا چاہیے ہمارے ابا کی عزت، ان کا نام ان کا رتبہ بہت بڑا

ہے اور اگر کوئی واقعہ پیش آتا ہے یا ہم اس رشتے کی ڈور توڑتے ہیں تو اس بات کا شور ایوانوں تک جائے گا ان ایوانوں میں لوگ منہ جوڑ جوڑ کر اسے ڈسکس کریں گے اور نواب خاندان کی عزت کو خوب اچھالیں گے سو ہم یہ سب نہیں دیکھ پائیں گے ابا کی عزت ان سب باتوں سے بہت زیادہ بڑھ کر ہے اور فتح النساء۔

وہ ہماری دوست ہیں ہمیں ان سے ایسا رویہ رکھنا زیب نہیں دیتا۔ وہ خود کا محاسبہ کرتے کیوں خود کو کسی قدر چھوٹا محسوس کرنے لگی تھیں۔

......☆☆......

فتح النساء نے اپنے سامنے کھڑے اس مضبوط وجود والے شخص کو حیرت سے دیکھا تھا وہ وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھی ان کے مقابل کھڑا رہنا نہیں چاہتی تھی مگر جلال الدین پٹوڈی نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا وہ چونکتے ہوئے انہیں دیکھنے لگی تھیں۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے چھوٹے نواب ہمارا ہاتھ چھوڑیے آپ ہم آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتے۔“ فتح النساء کا انداز قطعی تھا مگر جلال الدین پٹوڈی ان کا ہاتھ تھام کر باہر کی سمت نکلنے لگے تھے۔

وہ حیرت زدہ سی رہ گئی تھیں اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھڑانا چاہا تھا مگر جلال کی گرفت مضبوط تھی۔

”یہ سب کیا ہے جلال، آپ ہم سے اس طرح پیش کیوں آرہے ہیں؟ یہ کیا طریقہ ہے کہاں لے جارہے ہیں آپ ہمیں، ہمیں آپ سے کوئی سروکار نہیں نہ کوئی واسطہ آپ ہماری بات سن کیوں نہیں رہے۔“ ان کی بات ختم ہونے سے قبل ہی یکدم پلٹ کر جلال نے ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا وہ ساکت رہ گئی تھیں جلال ان کی سمت بغور دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

”ہم کوئی ایک آواز بھی سننا نہیں چاہتے اس وقت اتنا سمجھ لیجیے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے ہم آپ کو نہ ایسا کوئی ہمارا ارادہ ہے ہم جس خاندان سے ہیں اس خاندان کا نام نہیں ڈبوئیں گے ہمیں اس بات کا پورا خیال ہے ساتھ ہی ہمیں آپ کی عزت کا بھی مکمل خیال ہے ہم کوئی غلط قدم نہیں اٹھائیں گے اگر آپ ہم پر یقین کرسکتی ہیں تو

کرلیں۔'' وہ مدھم لہجے میں بولا تھا فتح النساء نے ساکت نظروں سے ان کی سمت دیکھا تھا جلال کا لہجہ سپاٹ تھا جذبات سے عاری آنکھوں میں کوئی محسوسات نہیں تھے سو وہ ان کا چہرہ دیکھ کر قیاس نہیں کر پائی تھی کہ اس وقت ان کے دماغ میں کیا چل رہا ہے یا وہ سوچ رہے ہیں وہ خود کو ان کے رحم و کرم پر نہیں ڈال سکتی تھیں ان پر اس طرح انحصار نہیں کر سکتی تھیں تبھی مدھم لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

''ہم جاننا چاہتے ہیں چھوٹے نواب یہ سب کس بات کا پیش خیمہ ہے، کہاں جارہے ہیں آپ اور ہم کیوں آپ سے کوئی سوال پوچھنے کا بھی اختیار نہیں رکھتے؟'' وہ سلگ کر بولی تھیں۔ جلال نے قطعی انداز میں ان کی سمت تکتے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔

''ہم سوال سننا نہیں چاہتے فتح النساء کیونکہ ہمارے پاس فی الحال کوئی جواب نہیں ہے سو اپنے سوالوں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں۔'' ان کا انداز قطعی تھا اس کے ساتھ ہی وہ فوراً ان کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنے لگے تھے اور وہ ان کے ہمراہ کھنچتی چلی گئی تھیں۔

''چھوٹے نواب یہ استحقاق جتانے کا طریقہ غلط ہے آپ کی رعایا ہیں مگر آپ کو جان لینا چاہیے کہ رعایا کی مرضیات میں اہم ہوسکتی ہیں آپ اس طرح رعب ہم پر نہیں جما سکتے۔'' وہ بولی تھی مگر جلال نے سنی ان سنی کر دی تھی اور چلتے ہوئے موٹر گاڑی کے پاس آن رکے تھے مگر وہ بیٹھنے سے انکاری تھی سو ان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی مکمل سعی کی تھی مگر چھوٹے نواب نے زبردستی ان کو گاڑی میں بٹھا کر موٹر کار اسٹارٹ کر کے راستوں پر ڈال دی تھی۔

......☆☆......

''کیا بات ہے تیمور بچے آپ اس طرح الجھے ہوئے سے کیوں دکھائی دے رہے ہیں سب خیریت تو ہے نا؟'' حکمت صاحب کی بیگم نے بیٹے سے پوچھا تھا تیمور نے انکار میں سر ہلایا تھا۔

تب وہ ان کے مقابل بیٹھ گئی تھیں اور شفقت سے بیٹے کے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے بولی تھیں۔

''بیٹا ہم چاہتے ہیں آپ زندگی کو آگے بڑھنے دیں، چلیں ہم آپ کو تمام اختیار دیتے ہیں ساتھ اس بات کی بھی گارنٹی دیتے ہیں کہ حکمت صاحب اس معاملے میں آپ سے کوئی باز پرس نہیں کریں گے، آپ اپنی پسند کی کوئی ایک لڑکی منتخب کرلیں ہمیں اس گھر کو آباد کرنے کا عندیہ دے دیں۔'' حکمت صاحب کی بیگم بیٹے کا چہرہ محبت سے تھام کر مسکرائی تھیں تیمور مسکرا دیے تھے۔

''ممی، محبت اتنی آسان نہیں ہے یہ عمل دقیق ترین ہے ہم کسی سمیت نگاہ اٹھا کر اشارہ نہیں کر سکتے کہ محبت بس یہی ہے اور آپ اسے آگے بڑھ کر ہمارے لیے سمیٹ دیں کیونکہ اگر یہ اس قدر آسان ہوتا تو ہم ان سب باتوں سے قبل اسے اختیار میں لے کر آپ کو مطلع کر چکے ہوتے۔'' وہ مسکرایا تھا لہجہ عجب بجھا بجھا سا تھا۔ بیگم حکمت نے تیمور کا چہرہ پیار سے تھاما تھا۔

''میرے بچے آج تک ایسی کوئی خواہش ہے ایسی جو منہ سے نکلی ہو اور پوری نہ ہوئی ہو بچوں کی خوشی سے بڑھ کر اور کیا ہوتا ہے اور آپ تو ہماری اولاد ہیں ہماری دنیا کی روشنی آپ کے ہی تو دم سے ہے اگر آپ خوش نہیں تو ہماری خوشی کیا معنی رکھتی ہے۔'' بیگم حکمت کا لہجہ ماتا کی چاشنی سے بھرا تھا تیمور نے ان کے ہاتھ لبوں سے لگا لیے تھے۔

''بتاؤ کون ہے وہ ایسی کیا رسائی ممکن نہیں ہے اس دنیا سے ہیں نا۔ پرستان سے بھی ہوئی تو ہم جا کر ان کو آپ کے لیے منا لیں گے کچھ خبر تو دو، نام بتاؤ۔'' بیگم حکمت نے بیٹے کو بولنے پر اکسایا تھا۔

''ممی یہ ممکن نہیں ہے آپ ان کو جانتی ہیں اور اس رشتے کی ضرورت نہیں ہے وہ پہلے سے کسی سے وابستہ ہیں۔'' تیمور مسکرایا تھا۔

''اوہ، آپ کو پہلے سے شادی شدہ لڑکی سے محبت ہوگئی؟'' بیگم حکمت نے سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''نہیں ممی وہ میرڈ نہیں ہیں۔'' تیمور نے وضاحت دی تھی۔

''تو پھر؟'' بیگم حکمت کا چہرہ حیرت سے کھلا تھا۔

تیمور چند ثانیوں تک خاموش رہا تھا پھر مدھم لہجے میں بولا تھا۔

''ان کا رشتہ طے ہے وہ انگیجڈ ہیں۔'' وہ سر جھکا کر بولا تھا۔

''اوہ۔'' بیگم حکمت کا منہ حیرت سے کھلا تھا۔

''نواب زادی عین النور پٹوڈی۔'' بیگم حکمت کو قیاس کرنے میں دیر نہیں لگی تھی وہ کچھ نہیں بولا تھا اور وہ حیرت سے بیٹے کی سمت تکنے لگی تھیں۔

''آپ کو محبت کے لیے ساری دنیا چھوڑ کر وہی ملی تھیں؟'' ہم نے آپ کو اڑنے کو آسمان دے دیا ستاروں پر کمند ڈال آئے آپ اور محبت کی تو ان نواب زادی سے؟'' بیگم حکمت کا لہجہ بے یقینی سے بھرا تھا تیمور کچھ نہیں بولے تھے خاموشی سے ماں کی سمت دیکھ کر سر جھکا گئے تھے۔

''ان باتوں میں اعداد و شمار کام نہیں آتے ہم نے تخمینے نہیں لگائے نا جانچ پڑتال کرنا ضروری خیال کیا کیونکہ اس عمل میں یہ سب نہیں دیکھا جاتا محبت ایسی باتوں کو نہیں دیکھتی۔'' تیمور بہادر یار جنگ نے عجب منتشر سے لہجے میں کہا تھا۔

''ان نواب زادی میں کیا خاص دکھائی دیا آپ کو؟ دنیا میں ان سے خوب صورت لڑکیاں بھی موجود ہیں۔'' بیگم حکمت نے جتایا تھا۔

''محبت خوب صورتی سے نہیں ہوتی ممی یہ انسیت پرانی ہے ہمیں ان کی عادت سی ہوگئی تھی ان کا بارعب انداز ہمیں بھاتا تھا جب چھوٹے تھے تو وہ اکثر ہم پر حکم چلاتی تھیں اور ہم چپ چاپ ان کی سنتے جاتے تھے ہمیں ان کے احکامات کے سامنے سر جھکانا اچھا لگتا تھا ان کی تابعداری میں عجب ایک خوشی ملتی تھی ان کی کھری کھری سن کر ہم مسکرا دیتے تھے ان کی سزائیں عجب تسکین دیتی تھیں اور تب تو ہم محبت کے معنی بھی نہیں جانتے تھے تب تو ہمیں خبر ہی نہیں تھی کہ محبت ہے یا محبت ایسی ہوتی ہے جب اسکول مکمل کر کے ہم اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر گئے تب ہم نے ہر چہرے میں وہ چہرہ ڈھونڈا بے اختیاری میں کئی بار وہ نام پکارا اور تب علم ہوا کہ محبت ایسی ہوتی ہے۔ ہم نے خسارہ نہیں دیکھا ہم نے نفع شمار کرنا ضروری خیال نہیں کیا ہم گنتی بھول گئے ہمیں کچھ یاد نہیں رہا نواب زادی کی آنکھوں نے کچھ یاد نہیں رہنے دیا وہ آنکھیں تمام سفر میں ہمارے ساتھ رہیں ہمیں دیکھتی رہیں، مسکراتی رہیں جتاتی رہیں لفظ نہیں تھے مگر فضاؤں میں نا سمجھ میں آنے والے حرفوں کی سرگوشیاں تھیں اور ان سرگوشیوں میں محبت تھی کہ نہیں ہم نے جاننا ضروری نہیں سمجھا ہم ہندوستان لوٹے تو پہلا خیال یہی تھا کہ نواب زادی کسی ہو چکی ہوں گی۔ ان کی آنکھیں کیسی دکھتی ہوں گی ان کی روشنی اور بڑھ گئی ہوگی؟ اور ہم نے جب ان آنکھوں کو دیکھا تو جسم میں جیسے جان نہ رہی سینے میں دل کہیں تھا بھی کہ نہیں ہم نے جاننا ضروری خیال نہیں کیا ہماری سماعتیں ان لہجوں کو سننے کو پاگل ہوئی تھیں اور ہم اس کے علاوہ دیگر کوئی خیال نہ سوچ پاتے تھے نا کوئی آواز سن پاتے تھے ہم پر کھلا تھا کہ وہ لڑکپن کی یا بچپن کی محبت ہمارے اندر کس قدر گھر کر چکی تھی ہم نے یہ بھید جانا کہ ہم کیوں ہر چہرے میں وہ ایک چہرہ تلاشتے رہے تھے ہم کیوں نواب زادی عین النور کا چہرہ بھول کیوں نہیں پائے تھے اور کسی اور کا چہرہ ان کی جگہ کیوں نہیں لے پایا تھا یہ اسرار ہمارے اندر خموشی میں کھلنے لگا تھا وہ ہمارے ان محسوسات سے واقف نہیں تھیں اور شاید نہ کبھی ہوں گی مگر......!'' تیمور لحہ بھر کو رکا تھا بیگم حکمت نے ان کو ٹوکنا مناسب خیال نہیں کیا تھا اور تبھی وہ مدہم لہجے میں بولے تھے۔

''محبت یکطرفہ یا دوطرفہ ہونا اہم نہیں محبت کا ہونا اہم ہے ہم نے ان آنکھوں سے اپنی دنیا کو منور دیکھا ہے جن سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں وہ مرزا حیدر سراج الدولہ سے منسوب ہیں ان کی محبت کا دم بھرتی ہیں اور انہی کے ہمراہ زندگی گزارنا چاہتی ہیں۔'' تیمور نے کہا تھا اور بیگم حکمت نے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''مرزا حیدر مگر ان کی شہرت تو کچھ اچھی نہیں، حکمت صاحب کئی بار ان کا تذکرہ کرتے دکھائی دیے ہیں مرزا سراج الدولہ شہر کے امرا میں شمار ضرور ہوتے ہیں مگر ان کے کالے کرتوتوں سے بھی واقف ہیں یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے اگر یہ بات ہم جانتے ہیں تو نواب صاحب بھی تو ضرور واقف ہوں گے نا؟ کیا اس کے باوجود بھی وہ اپنی دختر کا نکاح ایسے لڑکے سے کرنا چاہیں گے جن کو اپنی اقدار کا کوئی ہوش نہیں۔'' بیگم حکمت نے نکتہ اٹھایا تھا شاید ان کو امید کی ایک مبہم سی کرن دکھائی دی تھی مگر تیمور ان کے دل کی بات جیسے جان گئے تھے تبھی بولے تھے۔

"آپ یا ڈیڈ ان باتوں کی سچائی دانستہ نواب چاچا کے سامنے ظاہر نہیں کریں گے ہمیں اس طور تعلق نہیں بنانا یہ دیانت داری نہیں کسی کے عیب سامنے لا کر اپنی خصوصیات جتانا دانش مندی نہیں اگر نصیب میں ہوا تو سے تعلق بن جائے گا۔" وہ مایوس نہیں تھے ان کے لہجے میں کوئی نا امیدی نہیں تھی اور تبھی بیگم حکمت گویا ہوئی تھیں۔

"تیمور بہادر یار جنگ کوئی معجزہ ہی آپ کو اس زندگی میں نواب زادی سے ملوا سکتا ہے۔" وہ بیٹے کے دل کا احوال سن کر سراسیمہ سی رہ گئی تھیں۔ مگر ان کے لیے اس خوشی کو ڈھونڈ لانا جیسے ممکن نہیں تھا۔

"محبت بھی تو معجزہ ہی ہے نا اگر ایک معجزہ اس روئے زمین پر رونما ہو سکتا ہے تو ہم اس اللہ پاک کی ذات سے مایوس نہیں ہیں وہ ناممکنات کو ممکنات کرنے والی ذات ہے سب اس کے اختیار میں ہے وہ بھی جو ہمارے اختیارات سے باہر ہے اور دسترس میں نہیں۔" تیمور کے چہرے پر بہت پھیکی سی مسکراہٹ تھی بیگم حکمت نے بیٹے کی پیشانی کو چوم لیا تھا۔

"میرے بچے اگر مجھ سے بن پڑا تو میں اس چاند کو تیرے آنگن کی زینت ضرور بناؤں گی۔" ممی نے مضبوط لہجے میں کہا تھا مگر تیمور نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

"ممی یہ مناسب نہیں اس صورت حال میں جب ہم برسوں کے مراسم اس خاندان سے وابستہ رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ عین کسی اور سے منسوب ہیں ایسے ہیں ان کا ہاتھ مانگنا بہت غیر مناسب ہوگا۔" تیمور نے کہا تھا مگر بیگم حکمت نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا تھا پھر بیٹے کی سمت شفقت سے دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔

"ہم خواتین باتوں باتوں میں بہت کچھ کہہ سکنے کا ہنر رکھتی ہیں میں بیگم صاحبہ سے بات ضرور کروں گی اگرچہ واضح رشتے کی بات نہیں ہوئی مگر میں کہنا چاہوں گی۔" ان کا لہجہ مضبوط تھا جیسے وہ بیٹے کے لیے سب ایک پل میں ممکن کر دینا چاہتی تھیں۔

"ممی وہ ہمارے آسمان کا چاند نہیں ہیں ہم ان کو اپنے آسمان پر لا کر نہیں سجا سکتے وہ کسی اور سے منسوب ہیں ایسے میں ان کا ہاتھ مانگنا بہت غیر مناسب ہوگا۔" تیمور نے کہا تھا مگر بیگم حکمت نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا تھا پھر بیٹے کی سمت شفقت سے دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔

"ہم خواتین باتوں باتوں میں بہت کچھ کہہ سکنے کا ہنر رکھتی ہیں میں بیگم صاحبہ سے بات ضرور کروں گی اگرچہ واضح رشتے کی بات نہیں ہوئی مگر میں کہنا چاہوں گی۔" ان کا لہجہ مضبوط تھا جیسے وہ بیٹے کیلئے سب ایک پل میں ممکن کر دینا چاہتی تھیں۔

"ممی وہ ہمارے آسمان کا چاند نہیں ہم ان کو اپنے آسمان پر لا کر نہیں سجا سکتے وہ کسی اور سے منسوب ہیں نواب خاندان اس رشتے کو ختم کرنا نہیں چاہے گا یہ ناممکن ہوگا۔" تیمور نے ماں کو روکنا چاہا تھا مگر وہ آہستگی سے مسکرا دی تھیں۔

"آپ اس کی فکر مت کریں ہم اس رشتے کو تڑوانے کی منصوبہ سازی نہیں کر رہے۔" انہوں نے بیٹے کا چہرہ تھاما تھا۔

"مگر ہم اپنے بیٹے کی خواہش کو اس طرح رد ہوتے نہیں دیکھ سکتے ہم جائز طریقے سے ذکر کریں گے اور کسی معاملے کو متاثر کیے بنا حقیقت کھولنے کی کوشش ضرور کریں گی۔"

"لیکن ممی۔" تیمور نے ان کو روکنا چاہا تھا ممی نے ہاتھ اٹھا کر ان کو دیکھا تھا اور مضبوط لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

"آپ ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کریں گے تیمور بہادر یار جنگ۔" اور تیمور کچھ مزید بول نہیں پایا تھا۔

☆☆

اس شام عجیب سانحہ ہوا تھا فتح النساء تا دیر اپنی قسمت پر روتی رہی تھی اگرچہ اس کی خواہشات میں وہ شخص شامل رہا تھا مگر وہ اسے اس طور پانا نہیں چاہتی تھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا جلال الدین چھوٹے نواب اسے اپنے نکاح میں لے لیں گے اور بنا کوئی نگاہ غلط انداز ڈالے نکاح کے فوراً بعد ان کو واپس گھر کی دہلیز پر چھوڑ جائیں گے وہ حیرت سے ان کو دیکھ رہی تھیں وہ ایسا کیونکر کر سکے تھے اور اس نکاح کو کرنے کا کیا مقصد تھا کیا وہ اس کو اپنی ہمشیرہ عین النور پٹوڈی سے کیے کی سزا دینا چاہتے تھے؟ ان نگاہوں میں کوئی انسیت نہیں تھی وہ نگاہ انجان تھی جیسے کوئی واسطہ نہ

رکھتی ہو اور ایسے میں اس سے اتنا بڑا رشتہ قائم کرنا؟ اپنے پیچھے کئی سوال چھوڑ گیا تھا۔

وہ اس نکاح کے لیے آمادہ نہیں تھا مگر جلال نے سخت لہجے میں کہا تھا۔

''اگر آپ خاموشی سے ہاں نہیں کریں گی اور نکاح نامے پر دستخط نہیں کریں گی تو ہم زبردستی بھی ایسا کروا لیں گے۔'' وہ جلال الدین پٹوڈی کے مزاج سے واقف تھیں وہ جو ٹھان لیتے تھے کر کے دم لیتے تھے اور وہ اس لمحے خود کو لاچار سمجھ رہی تھیں ان کے رحم و کرم پر ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ چپ چاپ اس نکاح نامے پر دستخط کر دیتیں ان کا وجود نا تواں سا ہو رہا تھا وہ چکرا کر گر جانے کو تھیں جب جلال نے ان کو سہارا دیا تھا۔

''فتح النساء آپ تو ابھی سے ہمت ہارنے لگیں جانے کیا چل رہا ہے آپ کے دل و دماغ میں مگر ہمیں رشتوں کو ان کے مقام پر رکھنا آتا ہے، ہماری منکوحہ ہونے کا اعزاز آپ کو حاصل ہے اور اس اعتبار سے جو بھی مرتبہ یا عزت آپ کو ملنا چاہیے یا جس کی آپ حق دار ہیں وہ ضرور آپ کو ملے گا مگر آپ کا کوئی حق چھوٹے نواب جلال الدین پٹوڈی پر نہیں ہوگا اور نہ ہی آپ اس معاملے میں کبھی کوئی پیش رفت کریں گی۔'' انہوں نے سرد لہجے میں کہا تھا اور فتح نے نگاہ اٹھا کر ان کو دیکھا تھا۔

''ہمیں اپنے ساتھ اس رشتے میں باندھنے کا مقصد کیا تھا چھوٹے نواب کیا ہم جان سکتے ہیں؟'' ان کا لہجہ دھیما مگر مضبوط تھا وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھ رہی تھیں اور تب جانے کیوں چھوٹے نواب نے ہاتھ بڑھا کر ان کی نازک کلائی کو تھام لیا تھا ان کی گرفت سخت ترین تھی فتح النساء کی کلائی کی کئی چوڑیاں ٹوٹ کر ان کی نازک کلائی میں پیوست ہوتی چلی گئی تھیں مگر جلال کو جیسے سرے سے اس بات کا اندازہ بھی نہیں ہوا تھا۔

''اس نکاح کا مقصد کیا ہے چھوٹے نواب؟'' وہ پوچھ رہی تھی مگر وہ خاموشی سے اس چہرے کو دیکھنے لگا تھا پھر یکدم ان کی کلائی کو ایک جھٹکے سے چھوڑا تھا اور پلٹ کر چلتے ہوئے باہر نکل گئے تھے ان کی خاموشی کیا کہہ رہی تھی فتح النساء جان نہیں پائی تھیں مگر جلال وہ تھے جن کی انہوں نے آرزو کی تھی وہ ان سے محبت میں مبتلا تھی ان کی خواہشوں میں جی رہی تھی خاموشی میں بندگی کر رہی تھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا کبھی ان کا نام فتح النساء کے نام سے جڑے گا بھی اور آج جب وہ ان کے نکاح میں تھی وہ خوش نہیں تھی ان کا ذہن سوچوں سے بھرا ہوا تھا۔

اس رشتے کا سبب کیا تھا کیا جلال الدین پٹوڈی سے بدلہ لینا چاہتا تھا صرف کیونکہ ان کو شک تھا کہ فتح النساء حیدر میاں جو کہ ان کی ہمشیرہ سے وابستہ ہیں وہ ان کے متعلق سوچنے لگی ہے؟ کیا ان کے اس اقدام کا مقصد صرف اپنی ہمشیرہ کی زندگی کو محفوظ کرنا چاہا تھا کیا ان کو واقعی لگتا تھا کہ وہ ان کی ہمشیرہ کی زندگی کے لیے خطرہ ہے؟

کیا ان کو واقعی یقین تھا کہ وہ حیدر میاں کے لیے ایسا کچھ سوچنے لگی ہے، سوچ کہنے کے باوجود وہ اسے مجرم سمجھ رہے تھے اور ان کی مخلصی پر شک کر رہے تھے؟ وہ سمجھتے تھے کہ وہ مخلص دوست نہیں ہیں اور اپنی سہیلی کی خوشیوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں سو یہ رشتہ کسی اور کی خوشیوں کی ضمانت کے لیے بنا تھا؟ اگر وہ جلال کے نکاح میں ہوگی تو وہ اسے اپنا پابند رکھ سکیں گے؟ کیا وہ ایسا سوچتے تھے؟

ان کی خاموشی کچھ نہیں کہہ رہی تھی مگر ان کا عمل بہت کچھ ظاہر کر گیا تھا ان کی نفرت یقیناً عروج پر تھی وہ صرف اپنی بہن کے لیے سوچ رہے تھے انہوں نے ایک بے سہارا لڑکی کو اپنی بہن کے لیے تختہ مشق بنایا تھا دوسرے لفظوں میں اپنی بہن کی راہ کا کانٹا صاف کیا تھا۔ فتح النساء کو اپنا آپ بہت چھوٹا لگا تھا کوئی اس کو کسی زاویے سے دیکھ اور پرکھ رہا تھا اگرچہ یہ زاویہ کس کا اپنا تھا مگر منظر کشی اس کی ذات اور زندگی کی ہو رہی تھی اور وہ زاویہ اس کو وہ بنا کر پیش کر رہا تھا جو وہ نہیں تھا اس کی کردار کشی کی گئی تھی حیدر میاں کے ساتھ اس کے کردار کو جوڑتا اس کو اس کی نظروں میں گرا رہا تھا وہ جلال سے محبت کرتی تھی اس نے اسے بہت بلندی پر دیکھا تھا، محبت کر کے اسے مزید بلندی پر رکھ دیا تھا اور نواب زادہ جلال الدین پٹوڈی نے اسے کس قدر پستی میں دیکھا تھا ان کے زاویوں میں وہ پستیوں میں گری تھی اور پستیوں کا حصہ تھی۔

محبت کیسے مقام دیتی ہے کس درجہ عزت دیتی ہے کیسی

مراعات دیتی ہے اور نفرت کس درجہ چھوٹا کر دیتی ہے یہ اس پر اب کھلا تھا۔

وہ جیسے سانس نہیں لے پا رہی تھی اس نے چند گہرے گہرے سانس لیے تھے اور پھر اس کی آواز حلق سے برآمد ہوئی تھی اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی بوا اس کی آواز پر تیزی سے چلتی ہوئی دروازے پر آن رکی تھیں وہ زمین پر جھکی زار و قطار رو رہی تھی وہ فوری طور پر آگے نہیں بڑھ پائی تھیں اتنا تو وہ جانتی تھیں کہ کچھ ہوا تھا مگر کیا یہ وہ نہیں جانتی تھیں مگر اس طرح فوری سہارا دینا اسے مزید کمزور کر سکتا تھا اور بوا اسے مزید کمزور کرنا نہیں چاہتی تھیں وہ چاہتی تھیں اس کے اندر کا غبار ڈھل جائے اس کے اندر سے وہ سب نکل جائے جو تکلیف کا باعث بن رہا ہے سو وہ اس کی سمت رنجیدگی سے تکتے ہوئے واپس لوٹ گئی تھیں۔

......☆☆......

''کیا آپ نے شادی کرلی؟'' اماں نے ان کو بے یقینی سے دیکھا تھا۔

''شادی نہیں کی ہم نے نکاح کیا ہے رخصتی آپ سب کی رضامندی سے کروا کر لائیں گے ہم نافرمان اولاد نہیں ہیں ہم نے ثابت کر دیا ہے جلال نے رسانیت سے بھرے لہجے میں کہا تھا اماں اس کو دیکھ کر رہ گئی تھیں ان کے چہرے پر شدید حیرت تھی جلال نے ان کا ہاتھ تھاما تھا۔

''سوری اماں بیگم، ہم نے آپ کی اور ابا کی مرضی کے بنا یہ قدم اٹھایا مگر یقین کیجیے ایسا کرنا ضروری تھا۔'' جلال نے وضاحت دینا چاہی تھی اماں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا جلال نے ان کے انتہائی ردعمل کو دیکھا تھا تبھی وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی تھیں۔

''آپ نے گناہ کیا ہے نواب زادے یہ گناہ عظیم ہے فتح النساء سے آپ کا رشتہ آپ نہیں جانتے مگر یہ کچھ ایسا متنازعہ ہے کہ اس کا خمیازہ اور کفارہ آپ کبھی ادا نہیں کر پائیں گے بہتر ہوگا آپ اس رشتے سے مستعفی ہو جائیں فتح النساء کو طلاق دیں۔'' اماں بیگم کی بات پر وہ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

''کیا مطلب اماں جان ہم آپ کی بات نہیں سمجھے کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟ ہم گناہ کے مرتکب کیسے ہوئے ہیں یہ نکاح کیونکر ناجائز ہے برائے کرم کھل کر بات کیجیے۔'' جلال الدین پٹوڈی نے کہا تھا جب اماں نے کچھ کہے بنا اٹھنا چاہا تھا۔

''اماں ہم جاننا چاہتے ہیں یہ رشتہ متنازع کیونکر ہے کیا بات ہے جو اس رشتے کو گناہ کے زمرے میں ڈال رہی ہے آپ ہم سے کیا چھپا رہی ہیں۔'' جلال نے پوچھا تھا اماں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے جلال کو دیکھا تھا اور مدہم لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

''فتح النساء کے خون میں ملاوٹ ہے ہمیں شک ہے وہ نواب سیف الدین پٹوڈی کی اولاد ہیں۔'' اماں نے کہا تھا اور جلال حیرت زدہ رہ گئے تھے۔

''کیا؟ یہ کیسے ممکن ہے اماں کیا ابا جان نے کوئی نکاح کیا تھا، یہ وہ سچائی جاننے کو بے صبر ہوئے تھے اماں سے سر نفی میں ہلایا تھا۔

''نہیں ان کا کوئی نکاح نہیں ہوا تھا ہم ان کی اکلوتی زوجہ ہیں۔ وہ ہم سے وفادار رہے ہیں مگر ہمارے نکاح سے قبل وہ اپنی جس پھوپی زاد کو چاہتے تھے ان سے ان کا نکاح نہیں ہو سکا تھا کسی خاندانی مخالفت کے باعث نواب صاحب کو محبت میں ناکامی کا سامنا رہا تھا ان کی محبت اپنی پھوپی زاد کے لیے جنوں کا درجہ رکھتی تھی۔

کئی بار ان دونوں کو چوری چھپے خلوت میں ملاقاتیں کرتے دیکھا گیا نواب صاحب کے لیے اپنی محبت سے دستبردار ہونا آسان نہیں تھا مگر شاید ان کی پھوپی زاد نے کسی طرح ان کو میرے اور نواب صاحب کے نکاح کے لیے رضامند کر لیا تھا کیونکہ آپ کی دادی جان کی خواہش تھی کہ یہ شادی ہو ہمارا خاندان سیاسی اعتبار سے مضبوط تھا سو آپ کی دادی اماں کو خدشہ تھا مخالف بڑھ گئی تو بات ہاتھ سے نکل جائے گی سو انہوں نے ان پھوپی زاد کو حکم دیا کہ وہ نواب صاحب کو ہمارے نکاح کے لیے رضامند کر کے ان کی زندگی سے دور چلی جائیں ان پھوپی زاد کی جن سے شادی ہوئی وہ نواب صاحب کے اچھے دوستوں میں سے تھے، مگر ان کو پھوپی زاد کے نواب صاحب سے عشق کی خبر نہیں تھی ہمیں گمان ہے فتح النساء نواب صاحب کا اپنا خون ہے کیونکہ ہمارے نکاح کے بعد بھی نواب صاحب اپنی

پھوپی زاد سے متواتر ملتے رہے تھے وہ اس عشق کو بھلا نہیں پا رہے تھے۔

ان پھوپھی زاد نے قسم نہیں توڑی تھی مگر نواب صاحب کے قدم ان کی سمت بڑھنے لگے تھے جب آپ کی پیدائش کے بعد عین ہماری گود میں آئیں اس کے کچھ دن بعد فتح النساء نے اس دنیا میں آنکھ کھولی محل میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں کہ یہ نواب صاحب کی اولاد ہیں مگر نواب صاحب خاموش رہے انہوں نے اس معاملے میں کوئی بات نہیں کہی نہ تردید نہ وضاحت نا تصدیق جیسے ان کو اس سے سروکار نہیں تھا کہ لوگ ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں یہ بات نواب صاحب یا ان کی پھوپھی زاد کے علاوہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ ان خلوتوں کی کہانی کیا تھی مگر محلوں میں ایسی باتیں معمول کا حصہ ہیں امرا اور روسا کے محل ایسی کہانیوں سے بھرے پڑے ہیں ہم نے بھی چپ سادھ لی نواب صاحب سے کوئی وضاحت نہیں مانگی، آوازوں پر کان بند کر لیے اور اپنی وفاداریوں کے ساتھ نواب صاحب کی اس غلطی کو فراموش کر دیا اگر نواب صاحب سچے ہوتے تو کوئی تردید ضرور کرتے یا ہمیں ایک وضاحت ضرور دیتے چاہے ہم نے اس معاملے میں ان سے کچھ پوچھا تھا کہ نہیں مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا پھر ان کے اس دوست اور پھوپی زاد کا ایک کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوا تو نواب صاحب بے چینی سے دوڑے بھاگے گئے اور ایک ملازم خاص کو اس بچی کی پرورش کی ذمہ داری سونپ کر ان کو اپنی ایک حویلی میں اٹھا لائے اور تب سے وہ بچی یعنی فتح النساء اور ان کی بوا اس حویلی میں رہائش پذیر ہیں اور نواب صاحب ان کی تمام تر ذمہ داری اٹھائے ہوئے ہیں فتح النساء کا ددھیال بہت امیر تھا مگر تمام رشتے دار لالچی نکلے کسی نے پلٹ کر خبر نہیں لی سب نے جائیدادوں پر قرعہ فال ڈال کر مل بانٹ لیا اور فتح النساء کی ایسی دگرگوں حالت نواب صاحب کو ان کے مزید قریب کھینچ لے گئی ہم نے کسی پرائی بچی کے لیے اس طرح ان کی بے چینی پہلی بار دیکھی۔

ایک بار عین فتح النساء کھیلتے ہوئے گر گئے تو نواب صاحب نے بے چینی سے لپک کر فتح النساء کو زمین سے اٹھایا ہم دور کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے سوچتے ہوئے پاس آئے اور عین کو زمین سے اٹھا کر ان کے خون رستے زخم پر مرہم پٹی کی یہ بات ہمیں کھلتی رہی مگر نواب صاحب نے کئی مواقع پر ایسی بھرپور پدرانہ شفقت کا مظاہرہ کیا مگر جہاں ان کو لگا کہ کوئی ان کو بغور جانچ رہا ہے وہ جان بوجھ کر بے خبر بننے لگے یا جان بوجھ کر دنیا دکھاوے کو ظاہر کرنے لگے کہ فتح النساء سے ان کو کوئی لگاؤ نہیں مگر اس بچی کے لیے ان کی شفقت کا امڈ آنا اور اس درجہ محبت اور خیال ظاہر کرنا صاف بتا تا رہا تھا کہ فتح النساء ان کے لیے کسی حوالے سے بہت خاص ضرور ہے۔'' اماں کہہ کر خاموش ہوئی تھیں جب جلال نے ان کو دیکھا تھا اور ہاتھ بڑھا کر ان کی آنکھوں کو پونچھا تھا اور نرمی سے بولے تھے۔

''ہم اس راز سے پردہ اٹھا کر رہیں گے اماں اور اگر یہ ثابت ہو گیا کہ فتح النساء نواب صاحب کی اولاد ہیں تو ہم یہ رشتہ ختم کر دیں گے فی الحال ہم نے رازداری سے یہ رشتہ باندھا ہے گواہوں اور مولوی صاحب کے علاوہ اس راز سے کوئی واقف نہیں آپ فکر مت کریں اگر یہ گناہ ہے تو ہم یہ گناہ کی زندگی یقیناً جینا نہیں چاہیں گے مگر اس کے لیے ہمیں اس راز کو کھولنا ضروری ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولے تھے۔ اماں بیگم بیٹے کو دیکھ کر رہ گئی تھیں وہ اٹھے تھے اور چلتے ہوئے وہاں سے نکل گئے تھے۔

☆☆

نواب زادی نے دور سے دیکھا تھا جلال تیمور کے ساتھ کھڑا تھا اور دونوں بہت سنجیدگی سے کسی پہلو پر بات چیت کرتے دکھائی دیے تھے جانے کیوں نواب زادی کو لگا تھا وہ کسی خاص پہلو پر بات کر رہے ہیں تیمور اور جلال اچھے دوست تھے ان کا ملنا اور گفتگو کرنا عجب نہیں تھا مگر جیسی کشمکش جلال کے چہرے پر دکھائی دی تھی اور جس طرح تیمور نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مدھم لہجے میں کوئی تسلی دی تھی اس سے وہ چونک گئی تھی تیمور کا رخ اس کی سمت تھا سو وہ جان گیا تھا کہ نواب زادی ان کی سمت متوجہ ہیں شاید تبھی اس نے جلال کو مزید بات چیت کرنے سے روک دیا تھا اور کوئی اور ذکر چھیڑ دیا تھا یہ دانستہ عمل کسی گمبھیرتا کو ظاہر کرتا تھا؟

ایسا کون سا موضوع زیر گفتگو تھا اور تیمور کو اندازہ

ہونے پر کہ وہ متوجہ ہے تو انہوں نے موضوع کیوں بدل دیا تھا۔

جلال سر ہلانے لگے تھے تیمور نے جیسے اسے بتا دیا تھا کہ فی الحال یہ ذکر مناسب نہیں اور وہ سر ہلا کر پلٹے تھے اور چلتے ہوئے اپنی موٹر کار کی طرف بڑھ گئے تھے تب تیمور بھی جانے کو پلٹے تھے جب نواب زادی چلتی ہوئی ان کے مقابل آن رکی تھی۔

تیمور نے سرسری انداز میں ان کی طرف دیکھا تھا اس کا انداز سوالیہ تھا گویا وہ پوچھ رہے تھے کہ اس طرح راستہ روکنے کا مقصد کیا ہے؟'' نواب زادی کو کچھ عجیب لگا تھا تبھی بنا کوئی تمہید باندھے گویا ہوئی تھیں۔

''تیمور بہادر یار جنگ کیا ہم جان سکتے ہیں کہ آپ جلال بھیا سے کس موضوع کو لے کر بات چیت کر رہے تھے۔'' اس کے براہ راست پوچھنے پر تیمور چونکا نہیں تھا نرمی سے مسکرا دیا تھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا نواب زادی کیا ہم دوست کوئی بات راز داری سے نہیں کر سکتے کم آن جلال ہمارا دوست ہے۔'' تیمور نے بات کا رخ بدلنا چاہا تھا نواب زادی نے سر ہلایا تھا۔

''جانتے ہیں ہم آپ دونوں بہت اچھے دوست ہیں مگر ہم نے جلال بھائی کے چہرے پر ایک تناؤ دیکھا ہے اور ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وہ تناؤ کس باعث ہے کیا ہم جاننے کا حق نہیں رکھتے۔'' وہ عجیب ایک ناز سے تنی گردن سے ان کی سمت تکتی ہوئی گویا ہوئی تھیں تیمور نے فوری طور پر کوئی ردعمل نہیں دیا تھا تبھی نواب زادی منتظر نظروں سے ان کی سمت تکنے لگی تھیں اور وہ بغور ان کو دیکھتے ہوئے بہت دھیمے سے مسکرائے تھے۔

''آپ پر تجسس ہیں نواب زادی؟'' جیسے وہ اسے جتا رہا تھا نواب زادی نے بلا تامل سر ہلا دیا تھا تب وہ سوالیہ نظروں سے ان کی سمت تکنے لگے تھے۔

''ایسا کیوں نواب زادی؟'' تجسس کا مطلب آپ کے اندر سب جان لینے کی لگن ہے مگر کبھی کبھی سب جان لینا مناسب نہیں ہوتا جتنا آپ جانتے ہیں اتنا ہی مناسب ہوتا ہے۔'' وہ جیسے اسے ٹالنا چاہا تھا۔

''آپ ہمیں بتانا نہیں چاہتے تیمور اس کا مطلب ہے کوئی بہت گمبھیر بات ہے جس کا ذکر آپ کے اور جلال بھائی کے درمیان رہنا ضروری ہے اور کسی تیسرے کو اس کی خبر ہونا ضروری نہیں۔'' نواب زادی نے تیکھی نظروں سے دیکھا تیمور نے ان کی سمت بھرپور اطمینان سے دیکھا تھا۔

''اگر ہم کہیں کہ آپ دو دوستوں کے ذاتی معاملات میں مخل ہونے کی کوشش کر رہی ہیں تو؟'' تیمور کچھ بھی بتانے سے گریز کرتا ہوا بولا تھا عین النور خاموشی سے ان کو دیکھنے لگی تھیں پھر مدہم لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

''ہم جانتے ہیں ہم مخل ہو رہے ہیں مگر ایسا اس لیے کہ ہم ان معاملات کو لے کر فکر مند ہیں ہم چھوٹے نواب کی فکر کر رہے ہیں وہ ہمارے بھائی ہیں ہمیں وہ بہت متفکر لگے ہم نے پہلی بار ان کو اس طرح بہت الجھا ہوا دیکھا ہمیں لگا اگر ہم جان پائیں گے تو شاید ان معاملات کی گتھی سلجھا پائیں گے۔

''ہم صرف اپنے بھیا کی مدد کرنا چاہ رہے تھے ہماری نیت آپ کے اور ان کے آپس کے معاملات میں مداخلت یقیناً نہیں تھی۔'' وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی تھیں ان کے چہرے پر بہت سی پریشانی آن رکی تھی تیمور نے اس چہرے کو بغور دیکھا پھر ان کا ہاتھ تھام کر قریبی سنگی بینچ پر بٹھایا تھا اور خود ان کے قریب بیٹھ گئے تھے عین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اور چھلک جانے کو جیسے تیار تھیں۔

''آپ فکر مند نہ ہوں نواب زادی ایسی کوئی بڑی بات نہیں ہے کوئی سیاسی معاملہ تھا اور جلال کو ہم سے مشورہ درکار تھا ہم اسی مدعا پر بات کر رہے تھے کہ آپ کی نظر پڑ گئی اور آپ پریشان ہو اٹھیں۔'' وہ نرم لہجے میں بولا تھا عین نے ان کو نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا۔

''آپ ہمیں ٹال رہے ہیں تیمور ہم جانتے ہیں سیاسی معاملات کو لے کر جلال بھائی ایسے پریشان نہیں ہوتے ان کی قوت برداشت اور چیزوں کو نرمی سے حل کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہے ہم ان کو جانتے ہیں۔'' عین النور بولی تھیں تیمور خاموشی سے انہیں دیکھنے لگے تھے پھر ان کی طرف سے نگاہ پھیرتے ہوئے بولے تھے۔

''ہم آپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتے اس لیے بات کو

آپ تک پہنچانا ضروری خیال کر رہے ہیں مگر آپ وعدہ کریں گے ان معاملات کو لے کر آپ جذباتی نہیں ہوں گی۔" تیمور نے اس سے وعدہ مانگا تھا اور اس نے ایک لمحے میں فوراً سر ہلا دیا تھا۔

"ہم وعدہ کرتے ہیں ہم بہت متانت انداز میں بات کو سنیں گے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے۔" عین النور نے کہا تھا اور تب تیمور نے ان کو دیکھتا ہوا مدھم لہجے میں بولا تھا۔

"جلال نے فتح النساء سے نکاح کرلیا ہے اور عقدہ یہ کھلا کہ....." وہ آدھی بات بتا کر رک گئے تھے کیونکہ نواب زادی کا منہ فقط آدھی بات سن کر ہی کھلا رہ گیا تھا اور آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئی تھیں تیمور کے رک جانے پر اس نے منتظر نظروں سے ان کی سمت دیکھا تھا پھر گہری سانس لے کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی اور بولی تھیں۔

"لیجیے ہم آپ کی بات مکمل پرسکون انداز میں سن رہے ہیں اب کہیے۔" نواب زادی نے یقین دلایا تھا اور تبھی تیمور نے سر ہلاتے ہوئے بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ماحول میں سراسیمگی ہے نواب زادی محل میں چہ میگوئیاں ہوتی رہی ہیں کہ فتح النساء اس محل سے وابستہ ہیں۔" انہوں نے مناسب لفظوں میں بات بیان کردی تھی مگر عین النور ان کو نا سمجھتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔ جیسے وہ بات کو سمجھ نہیں پائی تھیں اس کی نظروں میں سوالیہ نشان واضح طور پر دکھائی دیا تھا تیمور اس سوالیہ نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے اٹھ کر جانے کا قصد کرنے لگے تھے جب عین نے فوراً ان کے ہاتھ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھ دیا تھا یہ عمل بہت فطری تھا تیمور نے اس اقدام پر چونکتے ہوئے انہیں دیکھا تھا اور وہ ان کی سمت سے نگاہ پھیرتے ہوئے بہت آہستگی سے ان کے مضبوط ہاتھ پر سے اپنا ہاتھ ہٹا کر مدھم لہجے میں بولی تھی۔

"ہم الجھ گئے ہیں آپ کی بات سمجھ نہیں سکے، برائے کرم بات کو کسی قدر واضح کریں فتح النساء کسی طور اس محل سے وابستہ ہیں وہ ہماری سہیلی ہیں اور ابا جان کے بچپن کے دوست کی دختر ہیں اگر یہ رشتہ ہی حوالہ ہے تو اس کے لیے چہ میگوئیاں کیسی اور اس ذکر کو اتنی اہمیت کیوں دی جارہی ہے۔" وہ یقیناً بات سمجھنے سے قاصر رہی تھیں اور ان کی لاعلمی پر تیمور نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا اگر بات کا اصل ان کو معلوم کرنا پڑ جاتا تو یقیناً وہ بہت حیران رہ جاتیں مگر ان کے لیے اس معاملے کو جاننا ضروری تھا اور تیمور بھی ان سے کچھ چھپانا نہیں چاہتے تھے تبھی ان کی سمت دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

"ہم نہیں جانتے نواب زادی آپ کا ردعمل کیا ہوگا یا آپ اس بات کی توقع رکھ بھی رہی ہیں کہ نہیں یقیناً یہ بات یا اس سے جڑا کوئی سرا آپ کے دماغ میں نہیں ہوگا بھی ہم چاہتے ہیں آپ اس بات کو مکمل سکون سے سنیں فتح النساء کے بارے میں اور ان کی اس محل سے وابستگی آپ سے نہیں جڑی وہ حوالہ یقیناً آپ نہیں ہیں ان کا نام نواب صاحب سے منسلک کیا جارہا ہے۔" تیمور نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"کیا؟" عین حیرت زدہ رہ گئی تھیں۔

"ابا ان کے ساتھ یا وہ ابا کے ساتھ؟" عین کسی اور حوالے سے بات کو سمجھے ہوئے ساکت رہ گئی تھیں تیمور نے سر انکار میں ہلایا تھا اور گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولے تھے۔

"آپ جو سمجھ رہی ہیں بات وہ نہیں ہے عین آپ نے بات کا رخ یکدم بدل دیا ہے۔" یہ وابستگی اور حوالہ وہ یقیناً نہیں ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں جو آپ نے سوچا ہے وہ اس سے بہت بڑا گناہ تصور کیا جائے گا فتح النساء کو نواب صاحب کی بیٹی سمجھا جارہا ہے ایسا گمان سب کو ہے کیونکہ فتح النساء کی والدہ سے نواب صاحب کے مراسم تھے اور وہ مراسم خلوتوں کی کہانی بھی رکھتے ہیں اگرچہ یہ بات کوئی ثبوت نہیں رکھتی مگر اس محبت کی کہانی کو عجب ایک موڑ پر لاکر سوالیہ نشان بنا دیا گیا ہے اس کی وضاحت یا تردید آج تک نواب صاحب نے نہیں کی اور یہی بات سب کو کھل رہی ہے کہ اتنا کچھ سننے کے بعد بھی نواب صاحب خاموش کیوں ہیں اگر فتح النساء نواب صاحب کی صاحبزادی ہیں تو جلال نے جو نکاح قائم کیا ہے وہ اپنی وقعت کھودیتا ہے

کیونکہ یہ گناہ کبیرہ کے زمرے میں آتا ہے معاملہ بہت پیچیدہ ہے اور فی الحال کوئی سراہاتھ نہیں آرہا اور جلال بھی اسی معاملے کو لے کر پریشان ہیں وہ اس معاملے میں ہم سے مدد چاہ رہے تھے ان کا خیال ہے ہم مل کر اس معاملے کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔'' تیمور نے کہا تھا۔

اور عین النور ساکت رہ گئی تھیں نگاہوں کے سامنے کا فتح النساء کا چہرہ گھوما تھا اور پھر ابا کا۔

''یا اللہ، یہ کیسے ممکن ہے اور جلال بھائی۔'' وہ الجھ کر رہ گئی تھیں۔

''آپ زیادہ مت سوچیں نواب زادی ہم جانتے ہیں آپ کے لیے پریشان ہونا فطری ہے یہ تمام معاملات آپ سے جڑے ہیں مگر فی الحال کسی بات کی کوئی تصدیق نہیں ہوئی ہے سو ان کے بارے میں اتنا سوچنا اور الجھنا مناسب نہیں ہوگا جب تک ثبوت اور تحقیق سے ثابت نہیں ہوجاتا اور نواب صاحب یہ خاموشی نہیں توڑ دیتے آپ کو اس معاملے کو صیغہ راز میں ہی رکھنا ہوگا اور نواب صاحب سے معمول کے مطابق بات چیت کا سلسلہ جاری رکھنا ہوگا آپ اپنی شفیق والدہ سے مراسم خراب نہ کریں یہی دانش مندی ہے جب تک معاملات سلجھ نہ جائیں خاموشی اختیار رکھی جائے جلال اس وقت بہت الجھے ہوئے ہیں اور معاملہ ان کے خلاف جارہا ہے شرعی اور معاشرتی اعتبار سے یہ گناہ عظیم ہے اور اس کی سزا بھی بھیانک ہوسکتی ہے سو ان باتوں کا ذکر کرنا یا ہوا دینا اس معاملے کو بگاڑ سکتا ہے برائے کرم اس بات کو صرف اپنے آپ تک محدود رکھیں۔'' تیمور نے سمجھایا تھا عین النور الجھ کر رہ گئی تھیں۔

''مگر ابا ایسے کیسے؟'' ان کے دماغ کا کوئی حصہ اسی ذکر کے ساتھ بندھ کر رہ گیا تھا جیسے وہ بے یقینی سے سر انکار میں ہلانے لگی تھیں۔

''ہمیں نہیں یقین اس بے ڈھب کہانی پر ہمارے ابا جان ایسا نہیں کرسکتے وہ بہت سلجھے ہوئے مزاج کے انسان ہیں انہوں نے زندگی اپنے اصولوں پر ڈٹ کر گزاری ہے ہم ابا پر اس طرح شک نہیں کرسکتے اور ایسا یقیناً ہے بھی نہیں۔'' عین النور آنسوؤں کے ساتھ مدہم لہجے میں بولی تھیں تیمور نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

''ہم بھی توقع رکھتے ہیں کہ کہانی ایسی بھیانک سچائی کا پہلو نہیں رکھتی ہوگی نواب صاحب کو ہم بھی جانتے ہیں ڈیڈ کے بہترین دوست ہیں وہ ڈیڈ نے کبھی اس بات کا تذکرہ نہیں کیا ہم ڈیڈ سے آج ہی اس معاملے میں باز پرس کریں گے اگر ایسا کچھ ہے تو ڈیڈ کو اس کی حقیقت ضرور معلوم ہوگی۔'' تیمور نے رسانیت سے کہا تھا عین ان کو دیکھ کر رہ گئی تھی ان آنکھوں سے آنسو متواتر بہتے چلے گئے تھے۔

''پلیز نواب زادی آپ اس طرح خود کو ہلکان مت کریں اگر آپ کو یقین ہے کہ نواب صاحب اپنے کردار کے حامل نہیں تو پھر کوئی بات پریشانی کا باعث نہیں بننا چاہیے آپ یہ آنسو پونچھیے ہم اپنے ڈیڈ سے آج ہی اس معاملے کی چھان بین کرتے ہیں۔'' تیمور نے ایک سرا ڈھونڈا تھا۔

''مگر ہم ابا جان سے اس بارے میں بات کیوں نہیں کرسکتے ابا جان سے زیادہ سچائی کون جانتا ہوگا ہم ابا جان پر شک نہیں کر رہے سو ہمیں ان کی ہر بات پر اعتبار ہوگا۔'' عین النور ایک عزم سے بولی تھیں مگر تیمور نے ان کی بات کو رد کر دیا تھا اور نرمی سے بولے تھے۔

''نواب زادی فی الحال آپ چاچا جان سے کوئی بات نہیں کریں گی، ہمیں اپنے ڈیڈ سے بات کرنے دیں تب تک آپ خاموشی سادھے رہیں اور کسی سے اس معاملے کا ذکر نہ کریں۔'' معاملہ حساس تھا سو تیمور اس معاملے کو راز میں رکھنا چاہتے تھے اور عین النور اس بات کو سمجھ رہی تھیں تبھی انہوں نے سر ہلا دیا تھا۔

''ڈیٹس لائک اے گڈ گرل۔'' ان کے سمجھ جانے پر تیمور مدہم لہجے میں بولے تھے اور اٹھ کھڑے ہوئے تھے مگر دو ہی قدم چلے ہوں گے کہ عین نے پکار لیا تھا۔

''تیمور۔'' تیمور یکدم رک گئے تھے انہوں نے پلٹ کر نواب زادی کو دیکھا تھا نواب زادی نے ان کو خاموشی سے دیکھا تھا پھر جانے کیوں بات کہنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے تیمور کو دیکھا تھا اور سر انکار میں ہلا دیا تھا وہ عجب انتشار کی کیفیت سے دوچار تھیں جیسے ان کے اندر اس معاملے کو لے کر عجب توڑ پھوڑ مچی تھی ان کی متفکر آنکھیں بے شمار الجھنیں اپنے اندر سموئے ہوئے تھیں اور تیمور ان کی

سمت چلتا ہوا آیا تھا اور بغور ان کو دیکھتے ہوئے ان کا ہاتھ نرمی سے تھام کر دیکھا تھا مگر جیسے عین اپنا ضبط ہار گئی تھیں اور اٹھ کر ان کے شانے پر سر رکھ کر دھواں دھار رونے لگی تھیں تیمور ان کی کیفیت پر اس یکدم اقدام پر چونک گئے تھے مگر وہ نواب زادی کی کیفیت سمجھ رہے تھے سو انہوں نے فوری طور پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا اور نواب زادی کو چپ چاپ آنسو بہانے دیتے تھے عین النور کئی لمحوں تک خاموشی کے ساتھ ان کے شانے پر سر رکھ کر روتی رہی تھی ان کے اندر کا خلفشار کچھ لمحوں بعد معدوم ہوا تھا تو وہ تیمور کے شانے پر سے سر اٹھا کر بنا اس کی سمت دیکھے ان سے الگ ہوئی تھیں وہ اپنی اس حرکت پر کچھ نادم دکھائی دی تھیں ان کا انداز عجلت بھرا تھا اور تیمور ان کی کیفیت سمجھ رہا تھا سو اس نے خاموشی سے کچھ جتائے بنا ان کی سمت سے نگاہ پھیر لی تھی اور مدہم لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

''ہم آپ کی کیفیت سمجھ سکتے ہیں نواب زادی آپ یقیناً بہت انتشار کا شکار ہیں اور آپ کے اندر بہت سی توڑ پھوڑ ہو رہی ہے ہم ان باتوں کو سمجھ سکتے ہیں مگر آپ کو خود کو سنبھالنا ہے اور خود سے جڑے ان باقی لوگوں کا بھی خیال رکھنا ہے اس وقت آپ کو متانت اور سمجھداری کا مظاہرہ کرنا ہے اس گھر کی اور نواب صاحب کی صاحبزادی ہونے کی بہت بڑی ذمہ داری آپ کے کاندھوں پر ہے آپ کو اس مشکل وقت سے بہت حوصلے سے گزرنا ہے اور بہت ہمت کا بھی مظاہرہ کرنا ہے ہم نہیں جانتے اگر آپ ہماری باتوں کو کوئی اہمیت دیں گی کہ نہیں مگر ہم آپ سے درخواست کرنا چاہیں گے کہ آپ تمام مخالفتوں کو بھول کر اپنی بہترین سہیلی فتح النساء سے دوبارہ بات چیت کا آغاز کریں وہ اس وقت تنہا ہیں ان کو آپ کی اشد ضرورت ہے جب ہم طوفان میں گھرے ہوں تو موجوں کی سمجھ نہیں آتی نا پتا چلتا ہے کہ طغیانی کتنی ہے اور ہم اس طوفان سے کس طور نبٹ سکتے ہیں۔ مگر جب عقل تھوڑی متحرک ہو جائے تو اس کٹھن پیچیدہ وقت میں بھی بہت سی گتھیاں سلجھنے لگتی ہیں آپ فی الحال اپنی طرف سے معاملات کو اخذ کرنے کا عمل متروک کر دیں۔

کوئی انسان نہ تو مکمل فرشتہ ہو سکتا ہے نا شیطان بات حیدر میاں کی تھی اور آپ ان کے لیے ڈٹ گئیں آپ نے کوئی ثبوت اکٹھے کرنا ضروری خیال نہیں کیے نہ بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوئی کوشش کی آپ نے جذباتی ہو کر فتح النساء پر الزامات کی بارش کر دی، جو کہ کسی طور سے مناسب عمل نہیں تھا آپ جیسی دانشمند لڑکی ایسی بے وقوفی کا ثبوت دے گی ہم اس کی توقع نہیں کر رہے تھے اور......!'' تیمور بول رہے تھے جب عین نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

''تیمور وہ دیگر معاملہ ہے اور ہم اس میں غلط نہیں ہیں فتح النساء کو ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔'' وہ یکدم تناؤ میں گھرنے لگی تھیں تیمور نے ان کو بغور دیکھا تھا پھر مدہم لہجے میں بولے تھے۔

''عین فتح النساء آپ کی بچپن کی سہیلی ہیں ان پر ہمیں اعتبار ہے پھر آپ کو کیوں نہیں وہ سلجھے ہوئے مزاج کی لڑکی ہیں وہ اتنا بڑا الزام کسی پر کیوں لگائیں گی آپ بات کو جذباتیت کی نذر کر رہی ہیں آپ کو از سر نو سوچنے کی ضرورت ہے۔''

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

❁

قصہ چہار مفرور

فلک شیر ملک

آپ نے قصہ چہار درویش تو پڑھا ہوگا اگر نہیں پڑھا تو اس کے بارے میں بزرگوں سے کچھ نہ کچھ سنا ضرور ہوگا آیئے آج ہم آپ کو آج کے چار مفروروں کا قصہ سناتے ہیں اس قصے میں آپ کو جاگیردارانہ معاشرہ اپنی پوری غلاظتوں سمیت نظر آئے گا۔

فلک شیر ملک کے قلم سے چار مجرموں کا فسانہ ایک خوب صورت کہانی

گل داد خان کے چہرے پر آج اداسی کی جھلک نمایاں نظر آ رہی تھی مگر وہ اندر سے پرسکون تھا۔ اس کی وجہ اس کے چاروں ساتھی اس سے جدا ہونے والے تھے۔ کیونکہ جہاں اس نے منشیات فروشی والی زندگی کو خیر باد کہا' وہیں اس کے ساتھ اس کی پناہ میں رہنے والے چاروں ڈاکو بھی ایک نئی اور گناہوں سے پاک زندگی کا آغاز کرنے جا رہے تھے۔

نوشہرہ کا رہنے والا گل داد خان پڑھا لکھا نوجوان تھا مگر حالات نے اسے منشیات فروش اور ڈاکو بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ قصہ خوانی بازار پشاور میں دھندا کرتے کرتے جرم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بن گیا۔

ملک کے کونے کونے سے ڈاکو' مفرور اور دہشت گرد اس کے پاس پناہ لینے لگے مگر ایک دن گل داد خان کے دل کی دنیا بدلی' تو اس کے ساتھ اس کی پناہ میں رہنے والے چاروں مفروروں نے بھی گناہوں سے توبہ کر لی۔

آج وہاں ان کی آخری رات تھی۔ صبح سب کو اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹنا تھا اور وہ اس رات کو ایک یادگار بنانا چاہتے تھے۔ گل داد نے ایک شاندار ضیافت کا بندوبست کیا تھا۔ بجی اور پشاوری قہوہ خصوصی طور پر تیار کیا گیا تھا۔

کھانے کے بعد گل داد نے کہا۔ ''یارو! آج ہماری یہاں آخری رات ہے۔ صبح ہم سب بچھڑ جائیں گے۔ ہر ساتھی اپنے اپنے علاقے کی کوئی چھوٹی موٹی داستان سنائے تا کہ یاد کے لمحے ہمیشہ تازہ رہیں۔''

''جی درست ہے سردار۔'' سب نے بیک زبان ہو کر کہا۔

''تو پھر بسم اللہ کریں۔'' گل داد نے جانو رند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جان محمد عرف جانو رند نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور گویا ہوا۔

❁ ...... ❁

''کچے آنگن میں وہ جھلنگا چارپائی پر پیروں پر رلی لپیٹے پڑا سو رہا تھا۔ چارپائی کو چاروں کونوں سے گھیرے اسکول کے بچے کھڑے تھے' جو اسے لینے آئے تھے۔ سورج کافی اوپر چڑھ آیا تھا۔

''جانو...... جانو' سائیں بلاتے ہیں۔''

''اٹھ جا بے' یہ ایسے نہیں اٹھے گا' چلو سائیں کو بلا کر لائیں۔'' ہجوم میں سے دو لڑکے چلائے۔ جانو نے کسی کی آواز نہیں سنی' ویسے ہی سوتا رہا۔ ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر سے کھینچ کر رلی اتاری' لڑکے کا رلی اتارنا تھا کہ جانو تلملا اٹھا۔

''جاؤ جا کر اپنے باپ ماسٹر سے کہہ دو' میں نہیں آنے کا اسکول' نہیں آنے کا۔'' جھٹکا دے کر اس نے رلی کو لڑکے

کے ہاتھ سے چھڑایا اور منہ لپیٹ کر سو گیا۔ لڑکے اپنا سامان لے کر اسکول لوٹ گئے۔

"دلبر! نہیں مانے گا سالا' یہ ضرور سائیں سے جا کر شکایت کرے گا اور کلو بھی تو نمک مرچ لگا کر ساری باتیں سائیں کو بتائے گا' اور رمضان؟ نہیں نہیں' ہاں شاید وہ بھی ایک نمبر کا حرامی ہے وہ بھی کہے گا کہ سائیں! جانو آپ کو گالیاں بک رہا تھا۔ یہی سوچیں سوچتا جانو بجھے دل سے اٹھ بیٹھا۔ چارپائی کے نیچے پڑے پانی کے گھڑے سے منہ دھونے کے لیے کٹورا بھر پانی نکالا تو کتنا ہی پانی ٹوٹے ہوئے گھڑے سے زمین پر بہہ گیا۔

"گھڑا بھی ٹوٹا ہوا ہے' شاید ماں باپ ہوتے تو...... ہوتے تو...... پتا نہیں' کیوں یہ سوچ کر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ چارپائی پر پڑی رلی کی تہہ ٹھیک کر کے رکھی' الٹا سیدھا منہ پونچھا' اسکول جانے کے لیے جوں ہی دروازے کی طرف بڑھا' آنگن میں گرے پانی سے پاؤں پھسلا اور دھپ سے منہ کے بل آ رہا۔

اس کے کالے کپڑے گھٹنوں تک کیچڑ میں گیلے ہو گئے۔ ابھی وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بچوں کا ایک ہجوم اندر گھس آیا۔ ان کے پیچھے ماسٹر صاحب تو نظر نہیں آ رہے تھے البتہ ان کی آواز نمایاں تھی۔

"پکڑ لاؤ خبیث کو باہر۔"

یہ سننا تھا کہ لڑکے جانو کو چمٹ گئے۔ کسی نے ٹانگوں سے پکڑا' کسی نے بازوؤں سے' جھلاتے ہوئے ماسٹر کے پاس لے چلے' جیسے چیونٹیاں مری ہوئی بھڑ کو گھسیٹتی ہوئی اپنے بل کی طرف لے جاتی ہیں۔

''چلو اسکول۔'' ماسٹر کڑکا اور پھر لڑکوں کے جلوس میں جانو کو لے کر آگے آگے چلا۔

''سائیں کیچڑ سے پھسل پڑا ہوں۔'' وہ گھگھیایا۔ ''ان سے کہیں' مجھے ذرا چھوڑ دیں تو میں تالاب سے منہ دھولوں۔''

''بھاگنا چاہتا ہے؟'' ماسٹر نے جانو کی پیٹھ پر بے تکلفی سے نیم کی چھڑی چلاتے ہوئے دانت پچکا کر کہا۔ اسکول پہنچتے ہی ماسٹر نے پکارا۔ ''فرید' اسے بینچ کے ساتھ باندھ دو۔'' فرید ماسٹر کے حکم کی تعمیل میں جانو کو کمر کے بل بینچ سے باندھنے لگا' ایسے کہ منہ سیدھا آسمان کی طرف تھا۔

''اب ٹھیک ہے سائیں۔''

ماسٹر کرسی سے اٹھ کر جانو کے پاس آیا۔ ''ہاں' تو کیا کہہ رہے تھے؟ جاؤ اپنے باپ ماسٹر سے شکایت کردو؟''

جانو کچھ نہیں بولا' بول بھی کیا سکتا تھا؟ چھڑیاں اس کے بدن پر پڑتی رہیں اور اس کی آنکھیں بھرے بادلوں کی طرح برسنے لگیں۔ اسکول میں چاروں طرف خاموشی ہوگئی۔ صرف ماسٹر کی گالیوں کی بوچھاڑ سنائی دے رہی تھی۔ دوسرے دن جب ماسٹر نے لڑکوں کی حاضری لی تو معلوم ہوا کہ جانو پھر غائب ہے۔ اس کے استفسار پر فرید نے بتایا کہ جانو اور رمضان دونوں نہیں آئے۔

''کل گدھے جیسی مار کھائی ہے' آج پھر نہیں آیا' تم میں سے کسی نے اسے دیکھا؟''

مکھن ہاتھ بلند کرتے ہوئے ماسٹر کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتا ڈرتا بولا۔ ''سائیں۔ آج صبح جانو اور رمضان دونوں پھل والے کی دکان سے پرانے مکان کے کنویں کی طرف جارہے تھے۔ میں نے کہا اسکول چلو' تو ٹھینگے دکھانے لگے۔''

''دکان پر کیا خریدنے گئے تھے؟ پیسے کہاں سے لائے؟'' ماسٹر نے حیرت سے پوچھا۔

''سائیں میں بتاؤں......؟'' مکھن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ہاں ہاں...... بات کر...... نہیں پڑے گی مار۔''

''سائیں' سائیں کل ہم نے نورے کے گھر سے گندم چرا کر دکان پر بیچی تھی۔ جس کے پانچ روپے ملے تھے لیکن ان دونوں نے مجھے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ دونوں نے آپس میں بانٹ لیے۔''

''ہاں...... چوری نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے...... ناماں' نہ باپ' کوئی کہنے سننے والا تو ہے نہیں حرامی۔'' ماسٹر صاحب دیر تک بڑبڑاتے رہے۔ ''حیرت تو اس بات کی ہے کہ یہ لوگ روٹی کہاں سے کھاتے ہیں؟'' ماسٹر نے لڑکوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سائیں! کبھی کبھار روکھی سوکھی ہم دے دیتے ہیں۔'' مجو درزی کا بیٹا اٹھتے ہوئے بولا۔

''سائیں! کبھی ہم بھی۔'' وڈیرے کے لڑکے زیب نے دوسرے کونے سے لقمہ دیا اور پھر جیسے ساری جماعت اس کہانی میں کردار بن گئی۔

''بچپن میں مانگے تانگے پر پل جائیں گے' بڑے ہو کر کاہے پر گزارہ کریں گے؟'' ماسٹر نے نفرت سے کہا۔

❁......❁......❁
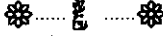
آج سارے علاقے میں جانو کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ بچے تو بچے' اچھے اچھے جوان اس کا نام سن کر کانپتے تھے۔ اب اسے جانو کوئی نہیں کہتا تھا۔ بچپن کا وہ ماسٹر جو چھڑیاں مار مار کر جانو کا بھرکس بنا دیتا تھا' مجو درزی' گاؤں کا وڈیرا' اور دوسرے جن کے سوکھے ٹکڑوں پر پل کر جانو جوان ہوا تھا' اسکول کے ساتھی جو جانو کے ہم جماعت تھے' سب اسے جان منڈ ڈاکو کہتے تھے۔ وہ تھا بھی تو بنا بنایا ڈاکو! انگارہ سی آنکھیں جن میں سے ہر وقت شعلے نکلتے دکھائی دیتے' ان میں کبھی رحم کی لکیر تک نہ جھلکتی دکھائی دیتی۔ درختوں جیسی سخت اور مضبوط بانہیں جن میں آسمان کے تارے نوچنے کی طاقت سمائی ہوئی تھی۔ کندھے پر ہمیشہ چاندی جیسی چمکتی کلہاڑی' آج جانو سر سے پاؤں تک ڈاکو تھا' ایک بھیانک بھوت' انسانیت کے جسم کا رستا ہوا ناسور......!

سال چھ ماہ بعد گاؤں آتا' صرف دو آدمیوں کی

خاطر...... ایک رمضان جو اس کے بچپن کا ساتھی تھا اور دوسرے شاذو' جانو کے گاؤں کی ایک نوجوان بیوہ وہ جانو کی محبوبہ تھی اور یہ بات بھی سب کو روز روشن کی طرح معلوم تھی۔ شاذو تھی بھی بہت حسین' بھنورے جیسی کالی آنکھیں' کٹیلے ہونٹ' ستواں ناک' کپاس جیسا کھلتا رنگ' پتلی کمر اور لمبے سیاہ بال...... جانو آج پورے ایک سال بعد گاؤں لوٹا تھا۔ رمضان کے گھر سے روٹی کھا کر وہ سیدھا شاذو کے پاس آیا تھا۔ وہ دونوں ہی ایک چارپائی پر بیٹھے تھے۔

''کتنے ہی دن لگا دیئے تم نے۔'' شاذو کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''تم تو جیسے کبوتر اڑاتی رہی ہوگی؟''

''اور نہیں تو کیا؟ سب کو اپنے جیسا ہی سمجھ رکھا ہے تم نے۔'' وہ شکایتی انداز میں بولی۔ ''اور تمہارا تو دل ہی نہیں' پتھر ہے پتھر......''

''اور تمہارا......؟'' جانو نے ابھی پوری بات بھی نہیں کی تھی کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ جانو نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر وڈیرے کا آدمی کھڑا تھا۔

''جانو راجا' وڈیرے نے تمہیں یاد کیا ہے۔''

''صبح آؤں گا۔'' جانو نے بے پروائی سے کہا اور دروازہ بند کر کے شاذو کے پاس آبیٹھا۔

''کون تھا؟'' شاذو نے پوچھا۔

''وڈیرے کا آدمی۔''

''کیوں آیا تھا؟''

''وڈیرے نے بلایا ہے' کوئی کام ہوگا صبح چلا جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر جانو پھر شاذو کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ جانو غصے میں اٹھا' دروازہ کھولا تو سامنے وڈیرا کھڑا تھا۔

''سائیں آپ نے کیوں تکلیف کی......''

''بس ایسے ہی...... ویسے خیر ہے' گھبراؤ نہیں۔ رئیس نھتو خان آیا تھا' تمہارا نام سن کر تمہیں بلا بھیجا ہے۔''

نھتو خان کا نام سن کر جانو انکار نہ کرسکا۔ وڈیرے کے ساتھ اٹھ کر اس کی بیٹھک کی طرف چل پڑا۔ نھتو خان کا نام تمام علاقے میں مشہور تھا۔ بڑا کڑاکے کا جاگیردار تھا' اچھے اچھے اس کے آگے پانی بھرتے تھے اور ضلع کے آفیسرز اس کو جھک کر سلام کرتے تھے' علاقے کے جس پولیس آفیسر نے بھی اس سے ضد لگائی اس کا تبادلہ کرادیا۔ گاؤں کی دیواریں اور بیلے کے درخت سب اس سے واقف تھے۔ ہر درخت کا پتا اس سے لرزتا تھا۔ خدا نہ کرے' گاؤں کی کسی حسین لڑکی پر اس کی نظر پڑ گئی ہو اور وہ نھتو خان کے ہاتھ سے بچ نکلی ہو' تو سمجھو اسے نئی زندگی ملی۔ دن دہاڑے راہ چلتے مسافروں کا خون کرادینا اس کے لیے معمولی بات تھی۔ بڑے بڑے نامی گرامی بدمعاش' قاتل اور ڈاکو اس کے غلام تھے' کسی کی کیا مجال کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھتا...... رئیس کہتا تھا۔

''میں جوگی ہوں جوگی' میری گڈری میں کالے سانپ ہیں اور جوگی تو کالے سانپوں کے دانت توڑ کر انہیں دودھ پلاتے ہیں اور ان کے آگے بین بجا کر پیسے کماتے ہیں۔ مجھے تو چاہیے ہی زہریلے دانتوں والے سیاہ سانپ...... ہائے کتنا لطف آتا ہے جب کوئی میرے سانپوں سے ڈسا جاتا ہے۔''

جانو آج اسی رئیس کے مدمقابل تھا۔

''اچھے ہو جان مند۔''

''آپ اچھے ہیں مائی باپ۔'' جانو دونوں ہاتھ باندھے رئیس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''کہاں ہوتے ہو آج کل؟''

''سائیں اللہ کی زمین بہت کشادہ ہے۔''

''پردیس چھوڑ دے لڑکے۔'' رئیس نے رازداری کے انداز میں جانو سے کہا۔ ''تمہارے ہی بھلے کو کہہ رہا ہوں بچے۔ چھوڑ اب پردیس کا پیچھا' آ' آ کر میرے ساتھ رہو' اور بھی تو رہتے ہیں۔ آتے جاتے کہیں پولیس کے پنجے میں نہ پھنس جانا۔''

اس کے بعد جانو اور رئیس میں گہری رازداری ہونے لگی۔ جانو اب رئیس نھتو خان کے پاس رہتا تھا۔ رئیس کے

حکم پر اس نے رئیس کے کتنے ہی مخالفوں اور دشمنوں کو سیدھا کر دیا تھا۔ سیکڑوں کے گھر برباد کیے اور کئی قتل کیے' اسی لیے وہ رئیس کو سب سے پیارا تھا۔

پھر اچانک ایک دن جانو اور رئیس میں ان بن ہوگئی۔ یہ خبر بھی سارے گاؤں میں پھیل گئی' کسی نے کچھ کہا' کسی نے کچھ...... اصل بات کا علم صرف رمضان کو تھا۔ ہوا یوں کہ ایک رات اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''آج رات فجر کے وقت اٹھ کر سویرے سویرے ناشتا تیار کر لینا......''

''کیوں؟'' بیوی نے پوچھا۔

''جان مند روٹی کھا کر ریل میں سوار ہوگا۔''

''کہاں؟'' بیوی نے تعجب سے پوچھا۔

''کہیں بھی' شاید جنوب کی طرف......''

''وہ کیسے؟''

''ہش! کسی سے بات نہ کرنا۔ رئیس نے جانو کی محبوبہ شاذو سے کارا کر لیا ہے اور اب شاذو رئیس کے گھر جا بیٹھی ہے۔ جانو کہتا ہے کہ میں رئیس کا قتل کر دوں گا۔''

ادھر رئیس نے بھی سب بندوبست کر لیے ہیں۔ جانو چار دن سے رئیس کے سامنے نہیں گیا۔ اسے جان کا خطرہ ہے۔ کل تھانیدار مجھ سے جانو کے بارے میں پوچھ رہا تھا پر میں نے کہہ دیا کہ مجھے کیا پتا' جانو کہاں ہے؟'' میں نے یہ بات جانو کو بھی بتا دی ہے۔ کہنے لگا' آج یہاں سے نکل جاؤں گا پھر کل کا دن مجھے نہیں پکڑ سکے گا...... بس آج ہی رات وہ یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔''

صبح سویرے جانو اور رمضان دونوں چارپائی پہ بیٹھے روٹی کھانے لگے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ جانو کا دل تیزی سے دھڑکا لیکن رمضان ہمت کر کے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ تھانیدار پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ گھر میں گھس آیا۔ کئی سپاہی بندوقیں تانے باہر کھڑے تھے۔ اس نے آتے ہی جانو کو دستر خوان سے اٹھایا اور بولا۔

''جانو تمہارے وارنٹ گرفتاری ہیں۔''

صبح سارے گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔ جانو کی گرفتاری کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔

''نامی گرامی ڈاکو جان مند عرف جانو پکڑا گیا۔''

پھر آہستہ آہستہ جانو کا نام لوگوں کو بھول گیا۔

❁ ...... ❁

دو سال بعد ایک دن پھر گاؤں کے لوگوں کی زبان پر جانو کا نام تھا۔ سارے گاؤں میں' چلیوں میں' موچی کی دکان پر' لوہار کی دکان پر' لوگوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔ اسکول کے دروازے پر ماسٹر لوگوں کے ہجوم کی طرف منہ کر کے اخبار پڑھ کر سنا رہا تھا۔

''سندھ کے بدنام زمانہ ڈاکو جانو کو پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے اس پر چھ خون اور دس ڈکیتیوں کا الزام ثابت ہو گیا جس میں رئیس نتھو خان کا قتل بھی شامل تھا۔ جانو بہت عرصے سے لاپتہ تھا' پولیس بھی اس کی تلاش میں ناکام ہو گئی تھی۔ آخر ایک مخبر کی مدد سے پولیس نے اسے اس کے دوست کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ اس کارنامے پر سرکار کی طرف سے مخبر کو ایک لاکھ روپے نقد انعام دیا گیا...... مگر جانو تو آپ کی کچہری میں بیٹھا ہے سردار......!''

❁ ...... ❁
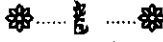
اسٹوری ختم ہوتے ہی قہوے کا دور چلا اور پھر نواز بلوچ نے اپنے افسانے کا آغاز کیا۔

''نرم و نازک بلوریں ہاتھوں پہ مہندی لگائی جا چکی تھی۔ ریشمی رومالوں سے دونوں ہاتھ الگ الگ بندھے ہوئے تھے۔ سہیلیاں چاروں اطراف سے اس کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ان میں کنواریاں اور نوبیاہی لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ دلہن تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جاری تھے۔ وہ پسینے میں نہائی جا رہی تھی۔ خواتین اور بچوں کے ہجوم کی وجہ سے کمرے میں کافی گھٹن تھی۔ دلہن کی سانس بھی ڈوبی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے کس کو جیون ساتھی چنا تھا اور درمیان میں کون آ ٹپکا۔ جس نے پچاس ہزار روپے دے کر اس کو خریدا۔ اس کے جسم کا سودا طے ہو چکا تھا۔ مگر اس کی روح نہیں بک سکتی تھی۔ وہ اپنی زندگی اور روح کا سودا بھی طے کر چکی تھی موت کے

ساتھ' قہر کے ساتھ۔''

باہر ڈھول اور باجے بج رہے تھے۔ نوجوان مستی میں ناچ رہے تھے۔ آدھی رات ہو چکی تھی۔ اچانک ایک نوجوان خنجر ہاتھ میں لے کر چاپ (ناچ) کے دائرے سے نکلا' ڈھول بج رہے تھے ان کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ مسرتیں کھلکھلا رہی تھیں' غم ان کو رلانے آ گئے تھے۔ حنا بندی ہو چکی تھی۔ لوگوں نے ہاتھوں کو سرخ کر لیا تھا۔ اب دھرتی کی حنا بندی ہونی تھی۔ زمین کو سرخ ہونا تھا' خون سے......! ایک شور و غوغا برپا ہوا۔ ایک طرف پورا گاؤں اور دوسری طرف ایک نوجوان......نواز خان بلوچ......!

جو بھی آگے آتا خنجر سے کٹتا چلا جاتا۔ سردار جو دلہا تھا' بڑھاپے اور رعشے سے اس کا سر کانپ رہا تھا' منہ میں ایک بھی دانت نہیں تھا۔ پچاس ہزار روپے میں اس کی محبوبہ کا خریدار تھا۔ نوجوان سب سے پہلے اس کا سر کاٹ چکا تھا اور پھر اپنے ارمانوں کے سوداگروں کے پیچھے پڑ گیا۔ بھوکے شیر کی طرح، پاگل درندے کی طرح! جس طرف رخ کرتا' خنجر جھونکتا ہوا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جس کو بھی خنجر لگتا' چیخ مار کر گرتا اور دم توڑ دیتا...... وہ ناحق خون بہاتا چلا گیا۔

کون جانے شادی غم میں بدل جائے گی۔ سب خوشیاں منا رہے تھے' اس کی محبوبہ کو زندگی بھر کے لیے جس جہنم میں جھونک رہے تھے وہ اسے برداشت نہ کر سکا تھا۔ اس لیے وہ خنجر نکال کر لوگوں پر جھپٹ پڑا تھا۔ زخمی تڑپ رہے تھے مگر وہ بڑی حویلی کے دوسرے دروازے سے نکل چکا تھا۔

ساری رات آہ و فغاں اور فریاد و غوغا برپا رہا' نئے نئے لباس خون میں لت پت تھے۔ لوگ دلہا اور دلہن کو بھول چکے تھے' ہر ایک اپنے غم میں مبتلا تھا۔

صبح کو کوئی حجلہ عروسی میں داخل ہوا تو شیریں پھولوں کی سیج پر تکیہ لگائے بیٹھی تھی' لبوں پر ایک ملکوتی مسکراہٹ تھی۔ آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں اور خود موت کی آغوش میں جا چکی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی' ان دنیا والوں کو' پہاڑوں اور صحراؤں میں بسنے والوں کو' ان کے رسم و رواج کو' ان کے جابرانہ قانون کو اور ان کی خود غرضیوں کو......اس کے باپ نے پچاس ہزار روپے کے بدلے انسانیت کو کتنی زک پہنچائی' جو خود خون میں نہایا ہوا تھا۔

بوڑھے سردار کی لاش پڑی ہوئی تھی' کتنے بے گناہ انسان مارے گئے تھے۔ کتنے زخمی تھے۔ رسم و رواج کے ٹھیکے داروں کی آنکھیں شرم سے جھکی ہوئی تھیں۔ نیلا آسمان' چمکتے ستارے' چاند اور سورج سوچ رہے تھے کہ ان کوہساروں کے باسی اپنی بیٹیوں کو کیوں بیچتے ہیں......؟

❀......☙......❀

نواز بلوچ کی اسٹوری نے سب کو غمگین کر دیا تھا۔ وہ مبہوت بیٹھے تھے کہ لالہ دلدار خان خود بخود بولنے لگا۔

ڈھلتے آفتاب اور عصر کی زردی مائل کرنوں سے ابھی آسمان کے کناروں پر چھائی ہوئی سرخی نظر آ رہی تھی اور شام کے ملگجی سائے مشرق کی طرف آہستہ آہستہ پھیلتے جا رہے تھے...... گاؤں سے دور' بہت دور' دلدار نے پگڈنڈی کے کنارے برگد کے درخت کی اوٹ میں دھیرے سے بندوق کے گھوڑے سے ہاتھ کھینچا اور گل خان سے دریافت کیا۔ ''روزے کی افطاری میں کتنا وقت باقی ہے......؟'' گل نے تسلی دیتے ہوئے جواب دیا۔

''ابھی وقت ہے' آ جائے گا۔'' دلدار نے ٹھنڈی آہ بھری اور کسی سوچ میں ڈوب کر دور چلا گیا۔ کبھی تو قاسم خان' سے انتقام لینے کی خاطر خوفناک رت جگے اس کی نظروں کے سامنے آ جاتے......اور کبھی ایک دوسرے کے بنائے ہوئے گھات کے انجان راستے اس کی آنکھوں کے سامنے پھیل جاتے۔

ابھی وہ انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ گل نے یہ کہہ کر اسے ہلایا۔

''سو گئے کیا؟'' دلدار نے پھر ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ بے صبری اور بے قراری کے ملے جلے جذبات سے کانپتی آواز میں جواب دیا۔

''نہیں تو' آہ! مگر خدا اسے کبھی میری بندوق کی نالی

کے سامنے نہیں لایا۔'' گل کے چوڑے چہرے کی چندھیائی ہوئی آنکھوں میں فخریہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اوراس نے ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اورمہ جبیں کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی نہیں کھائے گا' لیکن ساتھ یہ فیصلہ بھی کیا۔''اگر پہلا فائر تم نے نہیں کیا' تو میری بندوق کی نالی کا دھواں بھی نہیں دیکھو گے۔ ایسا نہ ہو کہ میرے پہلے فائر سے تم مجھ سے بدظن (بددل) ہو جاؤ۔''

دلدار اور گل خان ابھی آہستہ آہستہ باتیں کررہے تھے کہ اسی اثنا میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ دونوں خاموش ہوئے' دلدار کا رنگ زرد ہوا...... بھری بندوق کے گھوڑے پر اطمینان کی خاطر پھر انگلیاں پھیریں اور ٹکٹکی باندھ کر راستے کی جانب دیکھنے لگا...... اس کی رگوں میں خون معمول سے زیادہ تیز دوڑنے لگا...... اسی دوران دراز قد' جوان' خوبصورت' مگر پختہ رو قاسم خان جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے نظر آیا...... دلدار نے اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی رفتار میں مزید سرعت محسوس کی۔ آنکھیں بند کیں اور جب کھولیں تو اس کی نظروں کے سامنے راستے کی دوسری جانب کھیت کے کنارے اس کا مقتول بھائی خون میں ڈوبا ہوا تڑپ رہا تھا۔

دلدار نے اپنی بندوق کی باریک نالی سے قاسم کے سینے پر بائیں پسلی کے اوپر نشانہ باندھا...... مگر اس کا ہاتھ کانپنے لگا...... اس کے ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ نمودار ہوا...... گل نے آواز دی۔''فائر کرو۔''

دلدار خاموش تھا۔ گل نے دوسری دفعہ کہا۔''فائر کرو......قریب آیا۔ دلدار خان پھر بھی خاموش تھا۔ گل نے دانت پیستے ہوئے جب دلدار کی طرف اپنی قہر آلود چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے چنگاریاں برساتے ہوئے دیکھا تو اسے دلدار کی جھکی ہوئی ندامت زدہ آنکھوں سے ایک ساتھ بہتے ہوئے دو موٹے موٹے آنسو دکھائی دیئے۔

قاسم گزر گیا...... گل خان نے خون میں ڈوبی ہوئی نظروں اور لرزتی ہوئی جذباتی آواز میں دلدار کو برا بھلا کہتے ہوئے مخاطب کیا۔

''اوئے خانہ خراب کے بچے......کیوں ایسا کیا؟''

دلدار نے گیریہ گیر ہچکیوں میں صرف اتنا کہا۔

''گلیہ! وہ روزے سے تھا۔ سیدھا جنت میں چلا جاتا۔'' اس بات پر سب نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا اور بچا ہوا پشاوری قہوہ نوش کرنے لگ گئے۔ رات پچھلے پہر میں داخل ہورہی تھی' جب رفیق عرف فیکے کا نمبر لگا۔ اس نے بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیا اور اسٹارٹ پکڑا۔

❁......ﷺ......❁
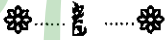
''آپ کو تو پتا ہی ہوگا کہ غریب عورت کا حسن' گاؤں کا جوہڑ ہوتا ہے۔ جس میں جس کا دل چاہے' اپنے مویشی ہانک دے اور غریب عورت کی جوانی گنے کا وہ لاوارث کھیت ہوتا ہے جہاں سے جس کا دل چاہے ایک آدھ گنا توڑے اور مزے سے چوستا ہوا اپنی راہ لے۔ نہ کوئی پوچھنے والا اور نہ ہی کوئی منع کرنے والا' مگر میں نہ تو گاؤں کا جوہڑ ہوں اور نہ گنے کا کھیت' کیونکہ لالچ بھری بری نظروں اور حرص بھرے دلوں والے لوگوں کے مقابلے میں میری حفاظت کرنے والا طاقتور تھا۔ بہت ہی طاقتور...... آج ہی نہیں' سدا سے انسان' انسان کو کھاتا چلا آیا ہے۔ طاقتور کمزور کو' امیر' غریب کو...... ظالم' مظلوم کو...... مگر کیا دنیا سے سارے کمزور' غریب اور مظلوم ختم ہوگئے ہیں؟ نہیں! میں کہتی ہوں' نہ ختم ہوئے نہ ہی ختم ہوسکتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے' کیوں؟ نیلی چھت والا آپ خود تو زمین پر آ کر طاقتور مارنے والے ہاتھ سے ٹوکا تو نہیں چھینتا لیکن وہ کمزور کو اتنا حوصلہ' اتنی طاقت ضرور بخش دیتا ہے کہ جوں' جوں کمزور قتل ہوتے جاتے ہیں' توں توں ان جسموں کی ٹہنیوں پر نئی کونپلیں پھوٹتی جاتی ہیں۔ بڑھتی جاتی ہیں اور مضبوط ہوتی جاتی ہیں۔ پہلے سے بھی زیادہ...... آپ تو پڑھے لکھے انسان ہیں' میری باتیں سمجھ رہے ہیں نا؟ نیلی چھت والا میرا محافظ ہے اور ہمیشہ سے تھا۔

نصیبوں جلی نظریں جھکائے' باتیں کررہی تھی' ساون کی

پل بھر میں گزر جانے والی بوچھاڑ بند ہوئی تو دوپہر کا سورج پہیلے کی طرح سوا نیزے پر آن کھڑا ہوا۔ آگ برس رہی تھی میں جو تین میل کی مسافت طے کرکے آیا تھا اور جس کا دو میل سفر ابھی باقی تھا' ستانے اور دوپہر کی آگ سے بچنے کے لیے آسیب زدہ کھنڈر والے بڑ کے درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ اس سڑک کے کنارے دور دور تک کوئی چھاؤں نہیں تھی' سو نہ چاہتے ہوئے بھی وہی آسیب زدہ جگہ ہی میری جائے امان ٹھہری۔

نصیبوں جلی اپنی گٹھڑی پاس رکھے ہوئے مجھ سے پہلے وہاں بڑ کی گھنی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سفر کی تھکان کی ماری یا گرمی کی بے رحمی سے بچنے کے لیے! کچھ کہا نہیں جاسکتا...... وہ میرے ساتھ والے گاؤں کی رہنے والی تھی۔

آسیب زدہ جگہ پر اس کی موجودگی اور قربت کے تصور سے ایک بار تو میں لرز گیا۔ اس وقت میں اور نصیبوں جلی اپنی مسافت' اپنی راہ اور دھوپ کے دکھ کی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ اس وقت میرے اور اس کے دکھ مشترک تھے اور اسی درد مشترک کی وجہ سے میرا دل اس کے پاس سے کسی نہ کسی طرح پہلو بچا کر گزر جانے کو نہ مانا اور نہ ہی اس کھنڈر جگہ پر وہ پہلی نظر کے بعد مجھے ڈائن' چڑیل' پچھل پیری' یا بچے کھا جانے والی دکھائی دی۔ یہ سارے نام اس کے ہی تھے' لوگ اس کا اصل نام تو کب کا بھول چکے تھے۔ خلق خدا اس سے یوں ڈرتی بچتی جیسے وہ سچ مچ ہی ڈائن ہو۔ میں تو بچپن ہی سے اس سے بہت ڈرا کرتا تھا سبھی مائیں اپنے بچوں کو اس کی نظروں سے چھپائے پھرتیں۔ بڑے بوڑھے لڑکوں کو اس کا سامنا کرنے سے منع کرتے اور اس کا راستہ چھوڑ دینے کی ہدایت کرتے۔

بچیاں' لڑکیاں' مٹیاریں اور سہاگنیں اس کی طرف پیچھا کرکے تیزی سے گزر جاتیں۔ لوگوں کا بس چلتا تو وہ اپنا مال مویشی بھی اس نصیبوں جلی کی نظروں کی پہنچ سے دور رکھتے...... اس وقت اس اشتراک درد کی وجہ سے پہلی بار وہ مجھے شہتوت کی ٹہنی کی طرح نرم' کومل اور سیدھی مگر اندر سے شیشم کی سیاہ لکڑی کی طرح سخت' کالی موٹی اداس آنکھوں والی درمیانی عمر کی ایک بہت ہی خوبصورت عورت نظر آئی۔ گو اس کے چہرے پر ایک درشتی اور پتھر جیسی سختی تھی اور اس کی نظریں جو میرے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں' ڈرا دینے والی تھیں۔ تاہم اس دوپہر میں' اس ویران جگہ پر اس کے قریب ترین' زمین پر اپنی کندھے والی چادر بچھا کر بیٹھا ہوا اس سے بالکل نہ ڈرا' اس کے ہونٹوں پہ ہمیشہ کے لگے ہوئے قفل آپ سے آپ کھلتے گئے اور اس کا بہت سنبھالا ہوا دکھ الفاظ کی شکل میں اس کے اندر سے باہر کو بہہ نکلا۔ اس کے اندر چھپے ہوئے بھید کو پانے کے لیے میں جوانی میں قدم رکھ رہا بیس بائیس برس کا کنوارہ جس کا سارا جسم مٹی کی خوشبو میں لتھڑا ہوا تھا' اس دوپہر اس ڈائن سے اپنا کلیجہ نکلوانے کے لیے تیار تھا۔ پتہ نہیں اس وقت اتنا حوصلہ اور جرات مجھ میں کہاں سے آ گئی تھی۔ میری اس بہادری پر تو اس کی خوبصورت آنکھوں میں ایک بار حیرت کے پھول کھل اٹھے تھے۔ اس سارے علاقے میں اس کے اتنا قریب بیٹھنے کا حوصلہ رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ ڈائن بھی نہیں تھی اور نہ ہی اس کے پاؤں الٹے تھے' مگر گرد و نواح کے دیہات کے تمام لوگ قسم اٹھانے کے لیے تیار تھے کہ وہ چڑیل ہے اور اس نے مرنے والے کئی انسانوں اور مویشیوں کے کلیجے نکال لیے تھے۔

وہ بولی۔ ''آپ نئے علموں کو پڑھنے اور چیزوں کو نئی روشنیوں میں دیکھنے پرکھنے والے ہیں' آپ تو......''

نئے علموں کو پڑھنے اور چیزوں کو نئی روشنیوں میں دیکھنے پرکھنے سے سچ کی لکیریں تو نہیں چھوڑی جاسکتیں' بی بی'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میرا اسے بی بی کہنے پر' ایک بار تو اس کے چہرے پر گلاب کا پھول کھل اٹھا۔ وہ آہ نما لمبی سانس بھر کے بولی۔

''ٹھیک ہے بات لکیر چھوڑنے کی نہیں' ایک پڑھا لکھا انسان سچ اور جھوٹ میں تمیز تو کرسکتا ہے یا نہیں؟' میں تو آپ کو یہ واضح کرنے کے لیے کہہ رہی ہوں' لکیر چھوٹ

سکتی تو میں ہی نہ چھوڑ دیتی! یوں ڈائن' پچھل پیری' نحس تو نہ کہلاتی' بلکہ کسی زمیندار کے گھر چوہدرائن بن کے بس رہی ہوتی۔ آپ میری پوری بات سن لیں پھر جو دل میں آئے فیصلہ کریں۔ آپ کا صحیح یا غلط فیصلہ میرا نہ کچھ سنوار سکتا ہے نہ بگاڑ سکتا ہے۔ کیونکہ چیزیں اب علاج کی حد سے آگے گزر چکی ہیں۔''''

''تم بات کرو بی بی! میں اب درمیان میں نہیں بولوں گا۔'' میں نے کہا۔ اس کی نظریں میرے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں' میرے سارے وجود میں سے کپکپی کی ایک لہر گزر گئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''میری ماں بھی ایک نصیبوں جلی تھی' کیونکہ وہ بھی بہت خوبصورت تھی' لیکن مقدر نے اسے ایک ناکارہ افیونی کے پلے باندھ دیا۔ وہ بیاہ کر اس گاؤں میں آ گئی' جس کی میں بیٹی ہوں۔ میرا گاؤں...... بھی گاؤں اپنی بیٹیوں کو یوں بھی ذلیل کرتے ہیں جیسے میرے گاؤں نے مجھے کیا ہے۔ بات میں اپنی نہیں' اپنی ماں کی کر رہی ہوں۔ اس کی بات کے ساتھ ہی میرا مقدر بندھا ہوا ہے۔ میری ماں بہت ہی خوبصورت' بھرپور جوان' پریوں جیسی عورت تھی' مگر میرے افیونی باپ کو اپنی افیونی گولیوں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔'' وہ پل بھر کے لیے بات کرتے کرتے رک گئی پھر کہیں دور خیالوں میں کھو گئی' جیسے اپنے باپ کے خدوخال دیکھ رہی ہو۔ اچانک اس کی نظریں میرے جسم پر رک گئیں' شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا میں اس کی بات دھیان سے سن رہا ہوں؟ مجھے متوجہ پا کر وہ بولی۔

''گاؤں کی بیٹی ہو یا بہو' اپنے گھر کے آنگن میں بند ہو کے تو اپنی عمر نہیں کاٹ سکتی۔ اسے سو کام کاج کے سلسلے میں گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔ میری ماں اک معزز' نیک دل اور دلیر خاتون تھی۔ اور ایک روز جب میں تین برس کی تھی تو اس گاؤں کے تیسرے حصے کے مالک' ایک نہایت طاقتور جوان نے میری ماں کو گاؤں کا جوہڑ بنا ڈالنے کی کوشش کی۔ میری ماں جوہڑ تو نہ بنی' البتہ اس نے نہایت دلیری کے ساتھ اسی طاقتور جوان کے کنویں میں چھلانگ لگا کر اپنی عزت بچالی مگر اپنی جان دے دی۔

بات یہاں تک تو ٹھیک تھی' لیکن اگر اسے مرنا ہی تھا تو وہ مجھے کیوں اس دوزخ میں چھوڑ گئی؟ اس نے چھلانگ مجھے اپنے سینے سے لگا کر کیوں نہ ماری؟ اپنی ماں کی اس بھول یا غلطی کو میں کبھی معاف نہیں کر سکتی' کبھی بھی۔'' اچانک وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی نظریں کھنڈر کی کچی مٹی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے پریشان کالے بال دوپٹے میں چھپائے اور کہنے لگی۔ ''بات ایک امیر اور زور آور جاٹ (زمیندار) کی تھی۔ کسی نے بھی میرے غریب باپ کا ساتھ نہ دیا۔ سارے گاؤں والوں نے یہ کہہ کر بات دبا دی کہ ایسے ناکارہ' چلنے پھرنے سے عاری ادھیڑ عمر افیونی کے ساتھ ایک بھرپور جوان اور خوبصورت عورت کب تک گزارہ کرتی؟ کنویں میں چھلانگ نہ لگاتی تو اور کیا کرتی؟ تب میں تین برس کی تھی اور میرے ساتویں برس تک پہنچنے تک میرے باپ کو اس کی افیون کھا گئی اور میں اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی...... لاوارث' بالکل لاوارث' مگر پھر اسی امیر اور زور آور زمیندار نے ساری برادری کے سامنے مجھے بیٹی بنا کر گود لے لیا اور خدا گواہ ہے کہ اس نے مجھے سگی بیٹی جان کر ہی پالا پوسا۔

پندرہ برس بعد جب میرے کپڑے میرے جسم پر تنگ ہونے لگے تو اس نے ڈھیروں جہیز دے کر میری شادی اپنے ہی گاؤں کے رکھے سے کر دی۔ رکھا یوں تو بہت خوبصورت کڑیل جوان تھا' لیکن ذرا غریب تھا۔ اپنی دو چار بیگھے زمین تو میرا باپ افیونی کو بخش گیا تھا مگر وہ جس نے مجھے بیٹی بنا کے پالا پوسا' اس نے جہیز میں گھر کا ساز و سامان' مال مویشی اور پانچ ایکڑ اعلیٰ درجے کی زمین دے کر اس کی ساری غربت دور کر دی اور رکھے کو اللہ رکھا بنا دیا۔ میں سچ مچ اپنے آپ کو ایک اچھے نصیبوں والی چوہدرائن سمجھ بیٹھی...... اللہ رکھا کے تو خوشی کے مارے پاؤں ہی زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ تیسرے برس اللہ نے ہمیں چاند سا بیٹا بھی دیا۔ رکھا سارا سارا دن بچے کو اٹھائے پھرتا نہ تھکتا' مگر ہمیں دنیا کی نظر کھا گئی' میرے

اور رکھے کے درمیان پتہ نہیں کون سی دیواریں کھڑی ہوگئیں' وہ مجھ سے دور ہوتا جارہا تھا اور میں کچھ بھی نہ کرسکی' نا جانے کون رکھے کے کانوں میں کون سا سچ گھول رہا تھا۔

آخر ایک دن رات کے وقت رکھا دیسی شراب کے نشے میں دھت گھر لوٹا تو اس نے اپنا سارا زہر جو لوگوں نے وقتاً فوقتاً اس کے لہو میں داخل کردیا تھا' اپنے اندر سے نکال کر میرے منہ پر دے مارا۔ اس نے سیدھا میری ماں کے بالوں کی باتوں کو جا ہاتھ ڈالا اور مجھے میرے افیونی باپ کی بیٹی ماننے سے ہی منکر ہوگیا اور جس آدمی سے عزت بچاتے ہوئے میری ماں نے اپنی جان دے دی تھی۔ مجھے سیدھا اسی آدمی کے گناہ کا ثمر قرار دے دیا۔ اپنی ماں کو اتنی بڑی گالی اور اس پر اتنا بہتان سن کر' میں اپنے آپ میں تو رہی مگر اپنے مجازی خدا کے سامنے چپ نہ رہ سکی اور اکڑ کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ نشے میں دھت اندھا' رکھا' غصے میں مکمل طور پر اندھا ہوگیا' چولہے میں سے ایک جلتی ہوئی لکڑی پکڑ کر اس نے مجھے روئی کی طرح دھنک دیا۔

مجھے ہوش نہیں تھا کہ اس نے مجھے کتنا مارا' لیکن میں نے یہ پورے ہوش وحواس اور کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ لکڑی رکھے کے ہاتھ سے چھوٹی اور بچے کے سر میں جا لگی۔ جو قریب ہی چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ بچے کے سر سے خون کا فوارہ جاری ہوگیا لیکن میرے اس پر گر کر اسے اپنے سینے سے لگا کر چھپا لینے سے پہلے ہی وہ ننھا سا پھول آخری ہچکی لے کر موت کی نیند سو گیا۔ نڈھال ہاری ہوئی' میں نے اسے کھاٹ پر ہی لٹا دیا۔ باقی کیا رہ گیا؟ ڈرا سہا رکھا' میرے لعل کی لاش' اور میں نصیبوں جلی...... پھر ایک دھند سی میری آنکھوں کے آگے آئی اور میرے سر کو چڑھ گئی۔ میں زمین پر گرنے کو تھی پھر پتہ نہیں کیسے میرے خون کی ساری طاقت میرے ہاتھوں میں آگئی۔ اسی لکڑی سے میں نے سامنے کھڑے رکھے کا سر کچل دیا۔ پل بھر میں ہی میرے خاوند کی لاش بھی میرے بیٹے کی چارپائی پر آن گری۔

بیٹے تو سدا ماؤں پر قربان ہوتے ہی آئے ہیں اور میرا معصوم لعل بھی ڈیڑھ دو سال کی عمر میں ہی اپنی ماں پر قربان ہوگیا۔ کیا کبھی بیٹیوں نے بھی اپنے سر کے سائیں اپنی مری ہوئی ماؤں کی عزت پر قربان کیے ہیں؟'' اس کا مجھے کچھ پتہ نہیں! آج تک میں نے ہزاروں' لاکھوں' بار اس پر سوچا ہے مگر ایک بار بھی مجھے اپنے کیے پر پچھتاوا یا افسوس نہیں ہوا۔ ایک بار بھی مجھے اپنے کیے پر ندامت نہیں ہوئی۔''

وہ چپ ہوگئی۔ میں پہلی بار سچ کے سیلاب میں ڈوب کر نکلا۔ کھنڈر اجاڑ اور سنسان تھا' سورج دوپہر کے نقطے پر ہی کھڑا آگ برسا رہا تھا۔ نہ میرے اندر آسیب زدہ کھنڈر کا کوئی ڈر باقی رہ گیا تھا نہ ہی پاس بیٹھی پٹھ پیری (نصیبوں جلی) کی میرے دل پر کوئی دہشت باقی رہی تھی۔ اس کا پتھر جیسا سخت چہرہ اب پگھلے ہوئے موم کی طرح نرم لگ رہا تھا اور اس کی تیز' اندر تک آر پار ہوجانے والی آنکھیں' امن اور پیار کا سمندر لگ رہی تھیں۔ وہ اس وقت مجھے دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت بیٹی نظر آرہی تھی۔

میں نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا! ''مگر ایک اور آدمی بھی تو تمہاری ماں کا مقروض تھا؟''

''ہاں!'' نصیبوں جلی نے میرا فیصلہ شاید میرے چہرے سے پڑھ لیا تھا۔ بڑے حوصلے سے کہنے لگی۔

''ایک برے کام کے پچھتاوے اور شرمندگی میں اس نے پندرہ برس میرا باپ بن کے مجھے پیار دیا' پالا پوسا اور میرے جیسی لاوارث کے سر پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھ کر مجھے گاؤں کا جوہڑ اور گنے کا لاوارث کھیت بننے سے بچائے رکھا' کیا اس کی اتنی بڑی نیکی کے بدلے میں اسے اس کی جوانی کی ایک بھول بھی معاف نہیں کرسکتی؟'' اس نے میری ماں کی جان لے لی' مگر اس نے اگر میری ماں کی عزت لوٹ لی ہوتی تو نیلی چھت والے کی قسم' میں اس کا سر بھی لے لیتی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں اور کچھ نہ کہہ سکا۔

معصوم مجرم

محمد جمیل اختر

انسان کی ذرا سی لغزش بعض اوقات بلکہ ہمیشہ حالات کا رخ تبدیل کر دیتی ہے جیسے کسی دوا میں کسی عنصر کی زیادتی یا کمی تریاقت کو زہر بنا دیتی ہے۔

ایک دیانت دار ماسٹر کی روداد، اسے وقت نے قاتل بنا دیا تھا

اُستاد رب نواز نے خودکشی کر لی تھی

سارے گاؤں کو اس خبر نے ہلا کر رکھ دیا تھا کہ ایک استاد بھلا ایسا کیوں کر سکتا ہے۔۔۔ لیکن ایسا ہو گیا تھا۔۔۔

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب بھی گاؤں کے پرائمری اسکول کے کمروں میں اُستاد رب نواز کی آواز گونج رہی ہے اور وہ بچوں کو اونچی آواز میں پہاڑے یاد کرا رہے ہیں۔۔۔ پچھلے انتیس سال سے یہ آواز اسکول کے در و دیوار میں گونج رہی تھی، لیکن وہ آواز اب نہیں رہی کہ استاد رب نواز نے واقعی خودکشی کر لی ہے۔۔۔

اُستاد رب نواز کی زندگی بالکل ایک سیدھ میں گزر رہی تھی ایسی سیدھی زندگی کہ جیسے ایک شریف آدمی کی گزرنی چاہیئے۔ جنوبی پنجاب کا یہ چھوٹا سا گاؤں کہ جہاں جرائم کی شرح کافی زیادہ تھی لوگوں کو دن دیہاڑے لوٹ لیا جاتا جونہی شام کے سائے ڈھلتے لوگ اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ جاتے شام اِس گاؤں میں ایسی تاریک اور خاموش ہوتی کہ گویا یہاں کسی انسان کا نشان تک نہیں ہے، جہاں دن کو کوئی محفوظ نہ ہو وہاں رات کو کس نے باہر نکلنا تھا۔ اِس گاؤں میں زیادہ تر لوگوں کی آپس میں دشمنیاں چل رہی تھیں لوگوں نے بدلے کے چکر میں کتنے لوگوں کو مار ڈالا تھا ایسے حالات کے باوجود اُستاد جی کی کسی سے دشمنی نہیں تھی، وہ کہتے ”بھلا اُستاد کسی کا دشمن کیسے ہو سکتا ہے، قلم اُٹھالیا ہے اب بندوق نہیں اٹھاؤں گا۔۔۔“

وہ اپنے بیوی بچوں اور ماں کے ساتھ رہ رہے تھے کہ پھر زندگی نے ایک ایسا پلٹا کھایا کہ سب کچھ بدل گیا۔۔۔

☆☆

حکم داد ایک محنتی کسان تھا فصل کی بوائی سے کٹائی تک کھیتوں میں یوں دل لگا کر کام کرتا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے سارا گاؤں اس کی محنت اور جفاکشی کی مثالیں دیتا، اسے خدا نے دو بیٹے دیئے، حق نواز اور شاہنواز، دونوں ہی باپ کی طرح محنتی اور قابل تھے، وقت گزرتا رہا، حکم داد فوت ہو گیا لیکن مرنے سے پہلے اپنی ساری جائیداد دو حصوں میں تقسیم کر گیا، دونوں بھائیوں میں ایسا ایکا تھا کہ وہ مل جل کر ایک ساتھ ہی بوائی کرتے، حق نواز کے کھیتوں کو شاہنواز پانی لگا رہا ہے تو شاہنواز کے کھیتوں کو حق نواز۔۔۔

شاہنواز کے دو بیٹے تھے، کرم داد اور حق داد، دونوں ہی بدمعاش تھے سارے گاؤں کو انھوں نے تنگ کر رکھا تھا چوری چکاری، لڑائی جھگڑا اُن کا معمول تھا۔ حق نواز کی ایک ہی اولاد تھی رب نواز۔۔۔ شاہنواز کے دونوں بیٹے لڑائی جھگڑوں کے علاوہ کھیتی باڑی بھی کرتے تھے جب کہ رب نواز کو پڑھنے لکھنے کی ایسی لگن تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر گاؤں

کے سکول میں استاد بھرتی ہو گیا۔۔۔

کرم داد اور حق داد کا ہر روز کسی نا کسی سے جھگڑا رہتا تھا اور استاد رب نواز چونکہ ان کو سمجھاتا بجھاتا رہتا سو اس سے تو انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔۔۔

......☆☆......

پھر رفتہ رفتہ دونوں بھائیوں کو استاد رب نواز کی زمین قبضے میں لینے کا خیال آ گیا

ایک روز کرم داد جب کھیتوں کو پانی لگا کر ایک درخت کے نیچے بیٹھا تو اُس نے دیکھا کہ حق داد ، رب نواز کی زمینوں کی طرف دیکھ رہا ہے اور کسی گہری سوچ میں گم ہے

''حقو ، کیا تُو بھی وہی سوچ رہا ہے جو میں سوچ رہا ہوں؟''

''کیا مطلب ہے تیرا کرمو؟''

''اِس اُستاد کی زمین کو بھی اگر اپنی زمین میں شامل کر لیں تو ہماری فصل کتنی بڑھ جائے گی'' کرم داد نے کہا

''یہی خیال تو مجھے دن رات تڑپاتا رہتا ہے، آخر یونہی بیکار زمینیں پڑی ہیں ہم کاشتکاری کریں گے تو رب نواز کا کیا جائے گا'' حق داد نے کہا

''ایک دفعہ زمین مل جائے پٹواری سے ایسا کاغذ بنواوں گا کہ رب نواز لاکھ کوشش کرتا پھرے زمین میرے ہی نام رہے گی'' کرم داد نے ایک آنکھ بند کر کے کہا

''تو اور کیا نصیر پٹواری کو بھی تو پیسے چاہیے ہوتے ہیں سوائے بھی حصہ دے دیں گے بس تُو کسی طریقے سے رب نواز کو راضی کر لے'' حق داد نے کہا۔

......☆☆......

وہ آئے روز اسکول آ دھمکتے اور کہتے دیکھو زمین پر کام تو تم نے کرنا نہیں سو ہمیں دے دو، استاد رب نواز کو تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن اس کی ماں ہمیشہ اسے سمجھاتی کہ دیکھو رب نواز پتر زمین کبھی پرانی نہیں ہوتی اور اپنی زمین کبھی نہیں بیچتے تیرے ابا مرحوم کی آخری نشانی ہے اب ان بدمعاشوں کے ہاتھوں بیچ دیں کیا؟ یہ تو آئے روز نئے نئے مطالبے کریں گے سو میں تمہیں نہیں بیچنے دوں گی زمین۔۔۔ استاد رب نواز کو بھی ماں کی باتیں ٹھیک ہی لگتیں۔

وہ دسمبر کا ایک سرد دھند میں لپٹا ہوا دن تھا دوپہر کو سورج نے اپنا چہرہ دکھایا تو اُستاد رب نواز نے بچوں کو اسکول کے میدان میں بیٹھ کر پڑھانا شروع کر دیا کہ دسمبر کی دھوپ کا بھی اپنا ایک الگ لطف ہے وہ بچوں کو پڑھا رہے تھے کہ کرم داد اسکول کے اندر دندناتا ہوا آ گیا۔

''اوئے اُستاد، بس کر یہ پڑھانا وہ میرے کام کا کیا بنا''

''یہ کیا طریقہ ہے کرم داد، اِس طرح اسکول میں بچوں کے سامنے اِس انداز سے بات کرنا؟''

''او بس او بس اُستاد جی ، جو سبق پڑھانا ہے نا انہی

بچوں کو پڑھا دینا میں نے ساری کتابیں پڑھ رکھی ہیں مجھے بس یہ بتا کہ میرے کام کا کیا بنا؟''

''دیکھو ہم اِس پر بعد میں بات کریں گے''

''میں تو ابھی بات کروں گا''

''دیکھو تم مجھے شام کو ملنا''

''نہیں ابھی''

''تم بدتمیزی کر رہے ہو کرم داد''

''میں تو ہوں ہی بدتمیز سارا گاؤں کہتا ہے، تم زمین کا بتاؤ کب دے رہے ہو''

''میں نہیں دے سکتا زمین۔'' اُستاد رب نواز نے فیصلہ کن انداز میں کہا

''کیوں نہیں دے سکتے، تم اُس پر کیا کاشت کر رہے ہو ویسے ہی پڑی ہے نابیکار، میرے کام آ جائے گی تو تمہیں کیا پریشانی ہے آخر چچازاد بھائی ہوں کوئی غیر تھوڑی ہوں۔''

''میں اُس پر اب فصل کاشت کروں گا۔'' رب نواز نے کہا۔

''اچھا تو اب اُستاد بھی کسان بنے گا کب کرو گے کاشت؟''

''اگلے سال میں اُس پر گندم کاشت کروں گا''

''جو تم نہیں کرو گے، مجھے معلوم ہے تم بہانے بنا رہے ہو تم ایک اُستاد ہو لیکن کاشتکاری کی الف ب سے ناواقف ہو سو زمین مجھے دے دو تمہیں جب ضرورت پڑے گی میں واپس کر دوں گا، میرا وعدہ ہے، مجھ میں لاکھ برائیاں سہی لیکن میں وعدے کا پکا ہوں۔''

''ہاں ہاں بڑے وعدے کے پکے ہو جس طرح چوہدریوں کے دو لاکھ لے کر تم نے واپس کر دیے تھے۔''

''بس اُستاد بس وہ میرا ذاتی معاملہ ہے کہ میں انہیں پیسے کب واپس کروں تم زمین کے بارے میں بات کرو'' کرم داد غصے میں پھنکارا۔

''معذرت میں نہیں دے سکتا زمین۔'' اُستاد رب نواز نے کہا۔

اس ساری بحث کو سن کر اسکول کے دوسرے اساتذہ بھی میدان میں جمع ہو گئے تھے۔

کرم داد نے جب دیکھا کہ بات نہیں بن رہی تو استاد رب نواز کا گریبان پکڑ لیا اور اندھا دھند تھپڑ مارنے شروع کر دیئے اسکول کے اساتذہ بیچ میں آئے اور انہوں نے اِس لڑائی کو ختم کرایا کرم داد غصے میں استاد رب نواز کو برا بھلا کہتا ہوا اسکول سے چلا گیا۔

اس واقعے کے بعد استاد رب نواز کی اپنے چچازاد بھائیوں سے بات چیت مکمل ختم ہو گئی، گاؤں کے بہت سے لوگوں نے استاد رب نواز کو مشورہ دیا کہ انہیں تھانے جا کر کرم داد کے جھگڑے کا مقدمہ ضرور درج کرانا چاہیے لیکن انہوں نے کہا کہ نہیں خاندان کی بے عزتی ہے کہ چچازاد بھائی آپس میں مقدمے لڑ رہے ہیں جو ہوا سو ہوا میں نے معاف کیا۔

......☆☆......

''کرمو یہ اُستاد ضد کا بڑا پکا ہے یہ نہیں دے گا زمین'' حق داد نے کہا

''میں نے سوچا تھا گھی سیدھی انگلی سے نکل آئے گا لیکن اب انگلی ٹیڑھی کرنی ہی پڑے گی، تُو دیکھ اب میں اس اُستاد کے ساتھ کرتا کیا ہوں دو ماہ سے اِسے کہہ رہا ہوں کہ زمین دے دو زمین دے دو لیکن مجال ہے کہ اُس کی نہ ہاں میں بدلی ہو'' کرمو نے کہا

''تو اب تمہارا کیا پلان ہے'' حق داد نے پوچھا

''بس تم نے آج شام تیار رہنا ہے'' کرمو نے کہا

......☆☆......

استاد رب نواز کو خدا نے تین بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا تھا سارے بچے ابھی پڑھ رہے تھے ایک شام جب اُن کا بیٹا حسن جو میٹرک میں پڑھتا تھا، محلے کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھ کر باہر نکلا تو کسی نے اُس کے منہ پر رومال رکھ کر بے ہوش کر دیا اور گاڑی میں بٹھا کر اغوا

کرلیا۔

استاد رب نواز نے مسجد سے نکل کر یہ سوچ کر گھر کی راہ لی کہ حسن پہلے ہی نماز پڑھ کر گھر چلا گیا ہوگا زیادہ تر وہ یونہی کرتا تھا وہ جیسے ہی گھر میں پہنچے تو اُن کی بیگم نے کہا

''حسن کو تو ساتھ لے کر آتے، آپ کو تو معلوم ہے کہ گاؤں کے حالات کتنے خراب ہیں؟''

''تو کیا وہ ابھی گھر نہیں پہنچا؟''

''گھر پہنچتا تو میں آپ سے یہ پوچھتی بھلا، جایئے اور اُسے لیکر آیئے دوستوں کے ساتھ کہیں ٹھہر گیا ہو اِن بچوں کو کیا معلوم کہ گاؤں کے حالات کیسے ہیں، آپ جایئے بھی ''

''جاتا ہوں جاتا ہوں نیک بخت یہیں ہوگا کہیں نہیں جاتا'' یہ کہہ کر استاد رب نواز گھر سے نکلے اور پھر اگلے دو گھنٹے میں انہوں نے سارا گاؤں چھان مارا انہیں حسن نہیں ملا

......☆☆......

گاڑی گاؤں سے نکل کر فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی حسن کی آنکھ کھلی تو اُسے سمجھ نہ آئی کہ وہ کہاں ہے پھر اُس نے اردگرد گاڑی کا جائزہ لیا ڈرائیور اور اُس کے ساتھ والی سیٹ پر دو لوگ بیٹھے تھے

اوہ یہ تو اُس کے چچا تھے جو بہت برے تھے اور آئے روز اُس کے ابو سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے تو کیا یہ مجھے اغوا کر کے لے جا رہے ہیں

اُس نے کوئی آواز نہ نکالی اور چپ کر کے حالات و واقعات کا جائزہ لینے لگا۔

''اِس چیک پوسٹ سے نکل گئے تو بس پھر آگے ہمیں کسی نے نہیں روکنا'' کرم داد چچا نے کہا

''کم از کم دو پولیس والے تو اس چیک پوسٹ پر ہوتے ہونگے'' حق داد نے پوچھا

''بھلے دس کھڑے ہوں ہمیں کیا، اِس چھوٹے کو تو ابھی ہوش ہی نہیں آیا ہم کہہ دیں گے شہر جا رہے ہیں بچہ بیمار

ہے'' کرم داد نے کہا

''ہاں یہ ٹھیک ہے ہم کہہ دیں گے اِسے کل رات سے بخار ہے'' حق داد نے کہا

''بس فارم ہاؤس پر پہنچتے ہی ہم استاد سے تاوان کا مطالبہ کردیں گے کہیں گے زمین ہمارے نام لکھواور اپنے بچے کو لے جاؤ'' کرم داد نے کہا

''تمہارا کیا خیال ہے، اُستاد مان جائے گا'' حق داد نے پوچھا

''مانے گا کیوں نہیں اکلوتا بیٹا ہے اُس کا، میں نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلیں وہ ضرور مانے گا تم دیکھتے جاؤ'' کرم داد نے کہا۔

انہی باتوں میں چیک پوسٹ آ گئی

ایک پولیس والا ٹارچ لے کر گاڑی کی طرف آیا

''ہاں بھئی کہاں جا رہے ہو؟''

''صاب جی بچہ بیمار ہے میرا، کل سے بخار نہیں اُتر رہا شہر بڑے اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔'' کرمو نے کہا۔

''اچھا، ذرا پچھلا دروازہ کھولو۔'' پولیس والے نے کہا۔

''صاب بچہ سو رہا ہے جاگ جائے گا۔'' کرمو نے منمناتے ہوئے کہا

''زیادہ باتیں نہ کرو اور دروازہ کھولو'' پولیس والے نے سختی سے کہا۔

''اچھا صاب اچھا یہ لیں'' کرمو نے دروازہ کھول دیا

حسن اِسی موقع کی تلاش میں تھا کہ جیسے ہی دروازہ کھلا اُس نے پولیس والے کے ہاتھ پکڑ لیے

''انکل مجھے بچا لیں، انکل مجھے بچا لیں یہ لوگ مجھے اغوا کر کے لے جا رہے ہیں'' حسن نے روتے ہوئے کہا

پولیس والے کو دروازہ کھلتے ہی کسی ایسے واقعے کی توقع ہرگز نہیں تھی ابھی وہ معاملے کی نزاکت کو سمجھ ہی رہا تھا کہ ڈرائیور اور اُس کا ساتھی گاڑی چھوڑ کر سڑک کنارے گھرے جنگل میں غائب ہو چکے تھے۔

......☆☆......

حسن بری طرح گھبرایا ہوا تھا پولیس والا اُسے چیک پوسٹ کے اندر لے گیا اُسے پانی پلایا اور کہا کہ وہ اطمینان رکھے اب اُسے کچھ نہیں ہوگا

حسن کے حواس کچھ دیر بعد بحال ہوئے تو پولیس والے نے کہا

''ہاں تو بچے اب بتاؤ تم کون ہو''

''جی میں حسن ہوں۔''

''اچھا تو تم حسن ہو، بھئی والد کا کیا نام ہے کہاں رہتے ہو''

''جی میرے ابا گورنمنٹ ہائی سکول روشن پور میں استاد ہیں۔''

''اچھا تو تم روشن پور میں رہتے ہو، روشن پور میں تو میرا بچپن بھی گزرا ہے بلکہ اُسی اسکول سے میں نے میٹرک کیا ہے، کیا نام ہے تمہارے ابا کا؟''

''رب نواز''

''اوہ تو تم اُستاد رب نواز کے بیٹے ہو، اب تو بھئی ہماری ذمہ داری اور بڑھ گئی کہ تم ہمارے استاد کے بیٹے ہو، اب پریشان نہ ہو، تمہیں میں گھر چھوڑ آوں گا''

حسن نے جب پولیس والے کا اتنا اچھا رویہ دیکھا تو مطمئن ہو گیا۔

......☆☆......

استاد رب نواز نے سارا گاوں چھان مارا تھا ایک ایک گھر میں دستک دے کر حسن کا پوچھا تھا لیکن کسی کو حسن کے بارے کچھ معلوم نہیں تھا آخر تھک ہار کر وہ گھر لوٹے۔

''حسن کہاں ہے؟'' ان کی بیگم نے تقریباً روتے ہوئے پوچھا۔

''مل جائے گا نیک بخت، مل جائے گا تو حوصلہ رکھ میں ابھی پولیس سٹیشن جاتا ہوں۔''

''ہائے میرا حسن جانے کہاں ہوگا۔''

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی تو استاد رب نواز نے فون

اٹھایا۔

''وعلیکم السلام، جی رب نواز ہی بات کر رہا ہوں۔''

''اوہ تو حسن آپ کو مل گیا، بہت شکریہ جناب''

''اوہ تو یہ تم ہو صفدر میرے بچے عرصہ ہوا کسی نے بتایا تھا کہ تم پولیس میں بھرتی ہو گئے ہو آج تو گویا مجھے تمہیں پڑھانے کا پھل مل گیا میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا جیتے رہو شاد و آباد رہو، خدا حافظ''

فون رکھ کر استاد رب نواز نے بیگم کو کہا،''نیک بخت مل گیا ہے اپنا حسن میرے ہی ایک شاگرد نے جو کہ اب پولیس میں ہے اُسے ڈھونڈھ نکالا۔''

''اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

دونوں میاں بیوی اور تینوں بیٹیاں سب رو رہے تھے لیکن اب کی بار آنسو خوشی کے تھے۔

☆☆

''استاد رب نواز نے تو ان دونوں بھائیوں کو معاف کر دیا تھا لیکن ان دونوں بھائیوں کو اب تک زمین نہیں بھولی تھی وہ استاد رب نواز کے انکار کو اپنی بے عزتی سمجھتے تھے۔

ایک روز کا قصہ ہے کہ استاد رب نواز اسکول میں پڑھا رہے تھے کہ کرم داد اس کے گھر زمین کا مطالبہ لے کر پہنچ گیا اس کی ماں نے سختی سے منع کر دیا لیکن کرم داد کے پاس پستول تھا اس نے فائر کر دیا۔

استاد رب نواز سکول میں پڑھا رہے تھے کہ کسی نے آواز لگائی ''رب نواز، کرم داد نے تیری ماں نوں فیر مار دتا ہئی۔۔۔۔'' (کرم داد نے تمہاری ماں پر گولی چلا دی ہے)

استاد کو یہ آواز دور جنگلوں سے آتی محسوس ہوئی، وہ دوڑے دوڑے گھر آئے یہ تو واقعی ظلم ہو چکا تھا، استاد رب نواز کہتے تھے، ''قلم اُٹھا لیا ہے اب بندوق نہیں اٹھاؤں گا، بھلا استاد کسی کا دشمن کیسے ہو سکتا ہے''

استاد رب نواز کے اندر طوفان برپا تھا کہ اب بھی بندوق نہیں اٹھاؤ گے اب تو ظلم کی انتہا ہو چکی ہے اب تو بندوق اٹھاؤ۔ استاد نے بندوق اب بھی نہیں اٹھائی اور قلم کا راستہ اختیار کیا اور کرم داد پر مقدمہ کر دیا۔

کرم داد کے خلاف مقدمہ اتنا مضبوط تھا کہ چند ہی پیشیوں میں عدالت نے کرم داد کو پھانسی کی سزا دے دینی تھی۔

اس سے پیشتر کہ کرم داد کو پھانسی ہوتی، کرم داد کی بیوی اپنے بچوں سمیت استاد رب نواز کے گھر آ گئی اور استاد جی کے پاوں پکڑ لئے۔

''بھائی جان مجھے بیوہ ہونے سے بچا لیں میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کو یتیم نہ ہونے دیں۔''

''اُس کو اپنے جرم کی سزا ملی ہے میں کچھ نہیں کر سکتا'' استاد رب نواز نے کہا

''میں مانتی ہوں بھائی جان، وہ بڑا ظالم ہے اُس نے بڑا ظلم کیا ہے لیکن ان معصوموں کا کیا قصور جی، معاف کر دیں جی''

''اب تو عدالت نے فیصلہ سنانا ہے''

''دیکھیں آپ معاف کر دیں عدالت بھی معاف کر دے گی''

کرم داد کے بچوں نے بھی استاد جی کے پاوں پکڑ لیے اور استاد رب نواز جو کہ ایک رحمدل آدمی تھے کہ جو پچھلے انتیس سال سے بچوں کو شفقت اور محبت سے پڑھا رہے تھے ان کا دل پسیج گیا، اگرچہ کہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کرم داد کو پھانسی کے تختے تک ضرور لے کر جائیں گے، لیکن رحمدلی دشمنی پر غالب آ گئی اور کہا ''جا بھرجائی، لے جا ان معصوموں کو، معاف کرتا ہوں میں تیرے شوہر کو''

کرم داد جیل سے واپس آ گیا، کچھ دن تو بالکل ٹھیک رہا لیکن سچ ہے کچھ لوگ کبھی بھی نہیں سدھر سکتے سو تھوڑے عرصے بعد اس کا شیطان پھر جاگ گیا سو وہ آتے جاتے اسکول کی دیوار کے قریب آوازے کستا، کہتا تھا، ''ایک استاد کی ماں کو کسی نے قتل کر دیا ہے، بس قاتل کو ڈھونڈنا

ہے"

ایسے میں استاد جی کا ہاتھ قلم پر مضبوط ہو جاتا، کہ بھلا ایک استاد کسی کا دشمن کیسے ہو سکتا ہے، قلم اٹھایا تھا سو اب بندوق کیسے اٹھائی جا سکتی تھی

لیکن پھر یہ معمول بن گیا، استاد جی ایک کرب میں مبتلا تھے اور سوچتے کاش میں اسے معاف نہ کرتا۔۔۔۔

برداشت کی آخر حد ہوتی ہے سو جب وہ حد آن پہنچتی ہے تو بڑے صابر لوگ بھی وہاں تھک جاتے ہیں سو ایک روز استاد رب نواز بھی تھک گئے،

جب اسکول سے باہر کرم داد کی آواز آئی، "استاد جی قاتل ملیا کہ نہیں؟"

استاد جی کی گرفت آج قلم کی بجائے پستول پر مضبوط ہو گئی اگرچہ کہ ایک استاد کسی کا دشمن نہیں ہو سکتا اور جو قلم اٹھا لے وہ بندوق نہیں اٹھا سکتا لیکن حالات مجبور کر دیتے ہیں، لوگ مجبور کر دیتے ہیں سو استاد رب نواز مجبور ہو گئے تھے، سو انہوں نے پستول اٹھایا اور کرم داد پر فائر کر دیا اور گولی اس کا سینہ چیرتی ہوئی نکل گئی۔

☆☆

استاد رب نواز کے لیے یہ بالکل انوکھا تجربہ تھا وہ کسی کی جان لینے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انہوں نے تو ساری زندگی انسانی رحمدلی اور بھائی چارے کا درس دیا تھا لیکن آج وہ مجبور ہو گئے تھے سو انہیں سمجھ نہ آئی کہ اب کیا کیا جائے سو بھاگ کے بھاگ پہاڑ پر چڑھ گئے جہاں بہت سے مفرور پہلے سے رہتے تھے، یہ علاقہ غیر تھا۔۔۔ اور ایک استاد اب مجرموں کے بیچ رہتا تھا استاد رب نواز کے لیے یہ سب کچھ نیا اور دکھ بھرا تجربہ تھا۔

وہاں انہیں ایک ڈاکوؤں کے گروہ نے پکڑ لیا اور اپنے سردار کے پاس لے گئے کہ اُس علاقے میں یہ ایک نیا فرد تھا

"ہاں بھئی کون ہے تو شکل سے تو بالکل مجرم نہیں لگتا، کوئی پولیس شولیس کا آدمی تو نہیں ہے آجکل وہ سالے بھی بھیس بدل کر آ جاتے ہیں" سردار نے استاد رب نواز سے پوچھا

"جی نہیں میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی یہاں کسی جاسوسی پر آیا ہوں بس ایک قتل ہو گیا تھا سو ادھر نکل آیا"

"باتوں سے لگتا ہے پڑھے لکھے ہو؟"

"جی میں اُستاد ہوں پچھلے انتیس سال سے میں گاؤں کے بچوں کو پڑھا رہا ہوں"

"حیرت ہے ایک استاد بھی مجرم ہو سکتا ہے؟ یقین نہیں آتا"

"یقین مجھے بھی نہیں آتا کہ یہ سب کچھ مجھ سے ہو گیا ہے لیکن حالات نے مجبور کر دیا تھا" یہ کہہ کر استاد رب نواز نے شروع سے آخر تک اپنی کہانی سنا دی

"استاد جی تمہارے ساتھ واقعی بڑا ظلم ہوا ہے اور تم نے بڑی مجبوری میں یہ قدم اُٹھایا ہے لیکن اب کب تک یہاں پڑے رہو گے تم پیشہ ور مجرم نہیں کہ ہمارے گروہ میں شامل ہو کر ڈاکے ڈالو تم ایک استاد ہو اور تمہارے لیے تو یہ اور مشکل کام ہوگا لیکن پھر بھی اگر تم ہمارے گروہ میں شامل ہونا چاہو تو آ سکتے ہو" سردار نے کہا

"نہیں جناب یہ میرے لیے ممکن نہیں آپ بس مجھے یہاں ایک کونے میں پڑا رہنے کی اجازت دے دیں پڑا رہوں گا آپ کو کچھ نہیں کہوں گا"

"رہو استاد جی جب تک جی چاہے رہو، اوئے جوانوں استاد جی کا پورا پورا خیال رکھنا یہ واقعی بڑا اچھا آدمی ہے بس بیچارے کے ساتھ ظلم ہو گیا" سردار نے اپنے ساتھیوں کو کہا۔

ایک ظالم آدمی سے جرم ہونے میں اور ایک شریف آدمی سے ظلم ہونے میں بہت فرق ہے، شریف آدمی کا ضمیر اسے ہر وقت کچوکے لگاتا رہتا ہے سو استاد جی اب ساری ساری رات جاگتے رہتے اور انہیں اپنے بیوی بچے اور گاؤں کے اسکول کے سارے بچے یاد آتے وہ سوچتے

کہ اب گاؤں کے وہ بچے کہ جن میں وہ علم کی روشنی بانٹتے تھے وہ اپنے استاد کے بارے میں کیا سوچتے ہونگے انتیس سال کی محنت کس طرح مٹی ہوگئی تھی، یہ خیال آتے ہی وہ ساری رات روتے رہتے۔۔۔عمر بھر کی ریاضت مٹی ہونا کوئی کم نقصان تھوڑی ہے سو وہ پریشان تھے ہمہ وقت پریشان۔

ایک رات سرداران کے پاس آیا

''اُستاد جی دیکھیں آپ رویا نہ کریں آپ کی آواز سنتا ہوں تو اندر ہی اندر جل تھل ہوجاتی ہے ورنہ یقین مانیں بڑا پتھر دل پایا ہے میں نے کیسے کیسے مقابلے ہوئے ہیں پولیس سے لیکن جی جان سے لڑا ہوں دل نہیں گھبرایا پر جب بھی رات کو آپ کے رونے کی آواز سنتا ہوں لگتا ہے دل پھٹ جائے گا، نہ کریں استاد جی مجھے لگتا ہے چند دن آپ اگر اور اسی طرح روئے تو سردار نے سرداری چھوڑ دینی ہے''

''سردار مجھے گاؤں یاد آتا ہے، بیوی بچے یاد آتے ہیں اور وہ سارے بچے یاد آتے ہیں کہ جن میں میں نے علم بانٹا ہے اور جو، اب مجھے ایک مجرم سمجھتے ہونگے مجھے وہ کتابیں یاد آتی ہیں کہ جو مجھ سے ناراض ہونگی کہ ہم نے تو تمہیں کچھ اور سبق پڑھایا تھا۔ بڑی پریشانی ہے کبھی خود کو اچھا سمجھتا ہوں تو کبھی خود پر ندامت ہوتی ہے عجب حالات ہیں سمجھ نہیں آتی''

''استاد جی آپ کو واپس لوٹ جانا چاہیے، خود کو پولیس کے حوالے کردیں جو ہوگا دیکھا جائے گا''

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہا ہوں مجھے گاؤں واپس چلے جانا چاہیے''

......☆☆......

گاؤں میں وہ اب ایک اشتہاری مجرم کے طور پر مشہور ہو چکے تھے۔

ایک رات استاد رب نواز کے گھر کا دروازہ آدھی رات کو بج اٹھا۔

استاد رب نواز اپنے گھر آگئے تھے بیوی بچوں نے دیکھا تو پہچان نہ پائے کہ یہ ہڈیوں کا ڈھانچہ جس کی آنکھوں میں گہرے سیاہ ہلکے پڑ چکے ہیں یہ کون ہے۔

''رب نواز یہ تم ہو؟'' ان کی بیوی نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے پریشان کن لہجے میں کہا

''نہیں شاید اب میں، میں نہیں رہا، حالات کے جھکڑ نے سب کچھ بدل دیا ہے استاد رب نواز اب ایک مجرم ہے''

''میرے بچو میرے گلے لگ جاؤ کہ میں تمہیں دیکھنے کو کتنا بے قرار تھا میں تم لوگوں سے ملنے آیا ہوں انہی گھڑیوں کو عمر بھر کی کمائی سمجھو اور کاش کہ وقت ٹھہر سکتا تو میں اسے روک لیتا لیکن ان حالات میں وقت جتنی جلدی گزرے اُتنا اچھا ہے میں تم سب سے ملنے آیا ہوں کہ میں اب خود کو پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہوں سو صبح میں جیل چلا جاؤں گا اب میں تھک چکا ہوں بھاگ بھاگ کر میں آرام کرنا چاہتا ہوں مکمل آرام کہ میں تھک چکا ہوں۔ میرے بچو اب تم سو جاؤ رات کافی بیت چکی ہے میں اب سونا چاہتا ہوں، کل شاید میں خود کو پولیس کے حوالے کردوں جاؤ میرے بچو اور دیکھو ہمیشہ قلم تھام کے رکھنا بندوق نہیں اٹھانا''

انہوں نے بیوی بچوں کو دوسرے کمرے میں بھیجا اور خود آرام کرنے کی غرض سے دروازہ بند کردیا۔

جانے وہ رات کا کونسا پہر تھا کہ گاؤں گولیوں کی آواز سے گونج اٹھا، دروازہ توڑا گیا تو اندر استاد رب نواز کی لاش پڑی تھی اور ہاتھ میں پستول تھا حالانکہ انہوں نے قلم اٹھایا تھا اور وہ کبھی بھی پستول نہیں اٹھا سکتے تھے لیکن دنیا بہت ظالم ہے یہ قلم اٹھانے والے ہاتھوں میں پستول تھما دیتی ہے۔

مکافات عمل

سخاوت حسین

جب ماں باپ بوڑھے ہوجاتے ہیں تو وہ اتنے بے کار کیوں ہوجاتے ہیں جب ان کی ہڈیاں کسی کام کی نہیں رہتی تو وہ بھی کسی کام کے نہیں رہتے۔

ہر دوسرے گھر کا فسانہ، ہر جوان بیٹے کی کہانی

وہ ماں کی قبر سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ستر سال کا وہ بے بس شخص جسے کل ہی بیٹوں نے ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ کتنی آرزوؤں سے اس نے اولاد کو پالا تھا۔ ساری زندگی محنت کی تھی۔ کتنی محنت سے گھر بنایا تھا۔ اولاد کی خاطر دن رات گدھوں کی طرح کام کیا تھا۔ لیکن آخر کار اسی اولاد نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے گھر سے نکال دیا۔

ابا، حد ہوتی ہے کسی بھی بات کی، رات بھر سوتے نہیں۔ کمروں کے دروازے کھٹکھٹاتے رہتے ہیں۔ ہماری نیندیں خراب کرتے ہیں۔ اوپر سے اس عمر میں سگریٹ، گھر کے اتنے اخراجات اور آپ جناب کے شوق دیکھیں۔ بس بھی کریں ابا۔

جب تک اس نے وصیت نہیں لکھی اور زمین مکان کا بٹوارا نہیں کیا اولاد بھی اس کی تابع فرماں رہی۔ کبھی وہ سوچتا تھا اسے کتنی تابع فرماں بہوئیں ملی ہیں۔ کتنی خدمت کرتی ہیں۔ دن رات ابا جی یہ کھالیں ابا جی وہ کھالیں کرتی رہتی ہیں۔ جیسے ہی وہ آفس سے لوٹتا سارے ہی مل کر اسے سلام کرتے۔ کوئی بیٹا پیر دباتا اور بہو چائے بنا کر پیش کرتی۔ تب وہ سوچا کرتا یہ محبتیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں نا جب ملتی ہیں تو اتنی ملتی ہیں کہ انہیں سنبھالنے کے لئے یہ دل چھوٹا پڑ جاتا ہے۔

سردیوں میں جیسے ہی وہ صبح اٹھتا بہو گرم پانی تیار کر کے رکھتی۔ وہ نہا کر واپس آتا تو سب ناشتے کی ٹیبل پر اس کا انتظار کرتے۔ اسے لگتا جیسے وہ سات سروں میں موجود سب سے قیمتی سر ہے۔ جیسے وہ پہاڑ سے نکلنے والا سب سے قیمتی پتھر۔ جس کی چمک کے لئے اس کے بچے اس کی ذات کا چکر لگاتے رہتے ہیں۔ وہ چمن میں موجود سب سے خوبصورت گلاب ہے۔ وہ محبت کی کائنات کا مہکتا پھول ہے۔ جس کی خوشبو کے لئے اس کی اولاد اور بہوئیں ترستی ہیں۔ کتنا خوش نصیب ہے نا وہ۔ روز گھر سے ڈھیر ساری محبتیں دل میں لے کر جاتا۔ ہر ایک کی دعائیں۔ ہر ایک کی چاہت کی صدائیں۔ اس کی خاطر فرش راہ بچھانا اور راستے کی دھول کو سب کا اپنی نظروں سے صاف کرانا۔ وہ کیا کیا بھول سکتا تھا۔

اس دن سارے اکٹھے تھے۔ ابا جی۔ آپ کی عمر کافی ہوگئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں آپ گھر میں آرام کریں۔ بیٹوں نے اس کے پیر دباتے ہوئے اتنی محبت سے کہا کہ وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔ ابا جی کاروبار ہم بھائی مل کر سنبھال لیں گے۔ لیکن ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے پیارے ابا جی یوں گرمی اور سردی میں روز دفتر کے چکر لگائیں۔ یہ عمر آپ کے آرام کی ہے۔ گھر بیٹھ کر کھانے کی ہے۔ ہمیں اپنی خدمت کا موقع دیں۔ وہ شروع میں نہیں مانا لیکن بہو اور

بیٹوں کی ضد کے آگے ہار مان لی اور کاروبار، زمین اور جائیداد برابر سب بیٹوں میں تقسیم کردی۔

کچھ عرصہ تو سب نے خوب آؤ بھگت کی۔ اس کی خوب خدمتیں کیں لیکن آہستہ آہستہ رنگ دکھانا شروع کردیا۔ اس دن بہو نے پہلی دفعہ اسے چائے دینے سے انکار کیا۔ اباجی کیا ہر وقت چائے پیتے رہتے ہو۔ بہت مہنگی ہوگئی ہے۔ ہمارے شوہر برداشت نہیں کرسکتے۔ گھر بھی چلانا ہے۔

اور کچھ دن بعد جب اس نے بہو سے کہا۔

''بہو مجھے ذرا گرم پانی تو دے دو۔''

''ابا کیا ضرورت ہے نہانے کی، ابھی تین دن پہلے ہی نہائے تھے۔ ایک تو آپ کے نخرے ختم ہی نہیں ہوتے۔ اس عمر میں اتنا تیار ہوکر کہاں جانا ہے آپ کو۔ حد ہے ویسے اباجی۔'' وہ بہتے آنسوؤں میں بس اسے دیکھتا رہتا۔

آخر کار بیٹے بھی اس سے تنگ آگئے۔ کچھ دن پہلے وہ شدید بیمار ہوا۔ پیٹ شدید خراب ہوا لیکن سب نے اسے ایک کمرے میں پھینک دیا۔ یہاں پہلی دفعہ اس نے رات بھر اپنی غلاظت کے ساتھ گزاری۔ یہاں تک کہ اگلے دن باہر سے لوگ آکر اسے صاف کرگئے۔ وہ اسی دن ہی مرگیا تھا۔ جس دن وہ اپنی غلاظت میں لت پت ساری رات کسی یتیم بچے کی طرح پڑا رہا تھا۔ اسے اب بھی یاد تھا کس طرح بیوی کے ساتھ ساری رات جاگ کر وہ بچوں کا خیال رکھتا تھا۔ مگر آج ساری رات ہی اس کو اسی کے بدبو میں غسل دیا گیا۔ اس کے بعد اسے باقاعدہ سب سے الگ کرکے دوسرے کمرے میں شفٹ کردیا گیا۔ جہاں صرف دو وقت کا کھانا دیا جاتا۔ لیکن رفتہ رفتہ کھانا بھی کم کردیا گیا۔ چائے بھی بند کردی گئی اور ایک مردہ لاش کی طرح اسے کمرے میں رکھ دیا گیا۔ جب ایک دن اس نے بیٹوں سے شکایت کی تو گھر میں کافی ہنگامہ ہوا۔ آخر کار سب نے مل کر طے کیا کہ اسے اولڈ ایج ہوم چھوڑ آیا جائے اور ایک دن اس کا ہاتھ پکڑ کر یہاں تک گھسیٹ کر اسے اولڈ ایج ہوم میں چھوڑا گیا۔

''ماں، سنو ماں۔'' وہ ماں کی قبر سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ کہتے ہیں دنیا میں ماں ہی وہ واحد ہستی ہے جو انسان کی بند ذات کے اندر بھی ہنستی ہے اور اسے ہنساتی ہے۔ وہ دکھوں کا گرم آنچل اوڑھ کر بچوں کو خزاں کی سرد ہواؤں سے بچاتی ہے۔ وہ کائنات کی ساری روشنی مستعار لے کر بچوں کے لئے ہمہ وقت چمکنے والا سورج بن جاتی ہے۔ وہ دریاؤں سا غرور لے کر ہر جگہ اولاد کا دفاع کرتی ہے۔ جب سے تم گئی ہو زندگی ہی چلی گئی ہے۔ میری حیات جیسے غریب کو دی جانے والی زکواۃ جیسی ہوگئی ہے۔ ماں میری بہوئیں مجھے بوجھ کہتی تھیں اور بوجھ کسی گدھے پر ہی لادا جاتا ہے۔ وہ کہتی تھیں ابا۔ یہ بستر، یہ بیڈ تمھارا گدھا ہے۔ یہ اولڈ ہوم تمہارا مقبرہ ہے۔ یہیں تم نے دفن ہونا ہے لہذا یہیں پڑے رہو۔ اماں جب میں اپنے گھر میں تھا تو ان

کے سسرالی آتے تھے۔ اس دن وہ مجھے کھانا دینا بھی بھول جاتے تھے۔ میری سانسیں بھوک کے تعاقب میں پھرتیں۔ میری رگیں روٹی کے ٹکڑوں پر پھڑکتی تھیں اور جب مجھے کچھ کھانے کو نہیں ملتا تھا تو میں کچن میں چھپ کر جاتا جہاں ان کی تلخ باتیں اور جملوں کے جام پیتا اور ذلیل ہو کر واپس آجاتا۔

ماں، سنا ہے مچھر خون چوستا ہے۔ لیکن بڑھاپا بزرگوں کی عزت، غیرت مان سب چوس لیتا ہے۔ عمر کے اس حصے میں سب کچھ ملتا ہے سوائے محبت اور اپنے بچوں سے کچھ میٹھے لفظوں اور تھوڑے سے وقت کے۔ اپنوں کی بے رخی سے تھپڑ تک کے سفر کو بڑھاپا کہتے ہیں۔ ماں، تم اپنے ہاتھوں سے مجھے نوالے کھلاتی تھیں اور اب زندگی نے نفرت کے نوالے کھلانے شروع کردئے ہیں۔ تم اپنے ہاتھوں سے مجھے پانی پلاتی تھی اور اب دکھوں نے حقارت کے گھونٹ میری ذات میں انڈیلنے شروع کردیے ہیں۔ جب انسان بوڑھا ہوجاتا ہے۔ تو وہ گھر کی سب سے بیکار شے بن جاتا ہے۔ جس کا وجود کسی اسٹور میں پڑی پرانی بیکار سی شے جیسی ہوجاتی ہے۔

جانتی ہو ماں میرا بیٹا ایک دن بہو سے کہہ رہا تھا۔ ابو مر کیوں نہیں جاتے۔ میں نے بس اتنا کہا تھا۔ مجھے انہیلر لا دو۔ انہیلر کے بغیر مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔ سانس لینے میں مسئلہ ہوتا ہے۔ تمھاری رات کٹتی ہے میری رات کانٹوں پر چلتی ہے بیٹا۔ اور میرا بیٹا کہتا ہے۔ ابو مر کیوں نہیں جاتے۔

وہ ماں کی قبر سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو تھے۔ سفید داڑھی دکھ کے پانی سے تر ہوچکی تھی۔ آسماں بھی اس کی غربت پر غمزدہ تھا۔ پرندے بھی اداسی کے نغمے گارہے تھے۔ محبتیں نفرتوں کی سرحد پر نظریں جھکائے کھڑی تھیں۔ درخت کے پتے انسانی دلوں کی ستم گیری پر ہواؤں کے دوش دکھ کے جھولے پر کبھی ادھر کبھی ادھر جھول رہے تھے۔

بوڑھا شخص ماں کی قبر پر کھردرے ہاتھوں سے غم کی داستاں رقم کررہا تھا۔ اس کی بھنویں تک سفید ہوچکی تھیں۔ وجود پر گوشت کے آثار کم نظر آرہے تھے۔

بوڑھا شخص، سنو، ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ کون ہو تم۔ وہ بڑبڑایا۔ میں تمھارا ضمیر ہوں۔ جانتے ہو مجھے۔ ہاں تمھیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ چلو میں تمھیں ماضی میں لینے آیا ہوں۔

مم میں نے کیا کیا ہے۔ وہ چلایا۔ چلو وہی دکھانے لے جارہا ہوں تمھیں کہ آخر تمھیں یہ سزا کیوں مل رہی ہے۔ وہ چپ چاپ اٹھا اور اس کے ہمراہ چل دیا۔

رات کا وقت تھا۔ کمرے سے ایک بوڑھی عورت مسلسل کھانس رہی تھی۔ اس کی نقاہت سے بھری کھانسی اور آنکھوں سے بہتے آنسو دکھ کی کہانی چیخ چیخ کر بتارہے تھے۔

ماں، وہ تبھی ماں کے کمرے میں آیا، آو بیٹا بوڑھی ماں کھڑی ہوگئی۔ میرے لال کیا ہوا۔ ٹھیک تو ہے نا تو۔ ماں میں نے فیصلہ کیا ہے تجھے اوپر کے کمرے میں شفٹ کرنے کا۔ دیکھ ماں تیری کھانسی اور بیماری کی وجہ سے میں اور زارا رات کو سو نہیں پاتے، بچے بھی شکایت کرتے ہیں۔ ماں، تو اوپر رہے گی تو بھی سکھی رہے گی اور ہم بھی۔

ماں کے چہرے پر دکھ بھری مسکراہٹ ابھری۔ بیٹا زندگی ایسا ہی کرتی ہے۔ جب ہڈیاں بے جان ہوجائیں تو جان والے بھی ہمیں بے جان کردیتے ہیں۔ کوئی بات نہیں میرے چندہ۔ ماں صدقے، کھانس کھانس کر ماں کے منہ سے جملے بھی نہیں نکل رہے تھے۔

روٹی کھاو ماں، اس نے تندور کی سخت روٹی ماں کے آگے کرتے ہوئے کہا۔ بب بیٹا، سنو میں یہ سخت روٹی نہیں کھا سکتی، چندہ برا نہیں مانو تو ماں کے لئے ڈبل روٹی منگو ادو۔ جب ماں اولاد کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر فرمائش کرنے لگ جائے کہ کہیں اسے برا تو نہیں لگ رہا خواہ اس کا جسم ٹوٹ جائے تو ایسی اولاد کو اپنے وجود پر لگی

گرہ کے بارے ضرور سوچنا چاہیے۔

یہ سننا تھا کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ماں سنگل ہڈی والے ڈبل روٹی نہیں کھاتے۔ روز ہی منگوا کر دے رہا ہوں نا۔ یہ کہہ کر شرمندہ ہی کرنا ہے مجھے۔ کیا تجھے نہیں دے رہا ڈبل روٹی۔ اور یہ کیا کرنے والی باتیں ہیں۔ ڈبل روٹی۔ روٹی۔ دودھ۔

ماں کرب سے ہنسی تو اسے ایسا لگا اس کا کلیجہ باہر نا آجائے۔ بیٹا اس عمر میں جب وجود سکڑ جائے تب روٹی ہی کرتا ہے بندہ۔ جس کا دکھ روٹی اس کا سکھ روٹی۔ ماں ہوں نا بہو کو کہوں تو برا منا جاتی ہے اسی لئے تجھے کہتی ہوں چندہ۔ بڑھاپا بڑا ہی ظالم ہوتا ہے۔ یہ ایسے آتا ہے جیسے سیلاب کا پانی پورے گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیتا ہے ویسے بڑھاپا بھی جسم کے سبھی خلیوں کو عزت، مان اور خودداری سمیت تباہ کر دیتا ہے۔ طاقت ختم کر دیتا ہے۔ بیٹا تو جوان ہے نا۔ تجھے لگتا ہوگا یہ بوڑھی ہڈیاں شوق سے کچھ مانگتی ہیں۔ لیکن بیٹا ان ہڈیوں میں کچھ مانگنے کا شوق ہی نہیں بچا۔

اس دن اس نے ماں کو تیسری منزل پر شفٹ کر دیا تھا۔ اس ماں کو جو وہیل چیر پر رہتی تھی۔ جو دکھ کا لباس پہنتی تھی۔ جو اس کی بے اعتنائی سہتی تھی۔ جو اولاد کی دو وقت کی محبت کے لئے ماری ماری پھرتی تھی۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا۔ ماں نے بس ایک ڈیمانڈ کی تھی۔ بیٹا پتہ نہیں زندگی کتنی رہی ہے۔ ہمارے ہاتھ سے زندگی ایسے ہی پھسلتی ہے۔ جیسے لیس دار چیز کے اوپر سے انسان۔ بیٹا ادھر زندگی ہوتی ہے ادھر موت۔ تو بس اپنے ابو کی ایک تصویر فریم میں لگا کر مجھے دے دے۔ میں انہی سے باتیں کر لیا کروں گی۔

ماں اوپر گئی تو اس کا خیال بھی ذہن سے گیا۔ وہ بھول گیا کہ اس کی کوئی ماں بھی ہوتی تھی۔ نواسوں کا دل کرتا تو کبھی کھانا دے آتے۔ ورنہ اس کی ماں اکثر بھوکی سوتی۔ بھوکی جاگتی۔

اس دن ماں بہت بیمار تھی۔ اسے بلایا تھا۔ ضد ہی پکڑ لی تھی۔ وہ جب ماں کے کمرے میں پہنچا تو ایک لمحے کے

لئے لرز گیا۔ پہلے ہاتھ کپکپاتے تھے اب پورا جسم کپکپاتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا ہڈیوں کا کوئی ڈھانچہ سامنے ہو۔

ماں یہ تم ہو۔ ماں نے نیم آنکھیں کھولیں۔ اور بس دکھ سے اتنا ہی کہا۔

نہیں بیٹا یہ تم ہو۔ وہ نہ سمجھا اور کہا۔

ماں جی آپ نے بلایا تھا مجھے۔

بیٹا یہ 'جی' فالتو لگانے کی ضرورت نہیں۔ جب تک ماں جی رہی ہے یہ جی لگا کر اس کے جی پر چھریاں مت چلاؤ۔ کتنی سانسیں رہ گئی ہیں معلوم نہیں۔ بس مجھے تھوڑا سا گھماؤ۔ کسی پارک میں لے جاؤ۔

آج وہ واقعی میں لرز گیا تھا۔ بلا چوں چرا وہ ماں کو قریبی پارک میں لے گیا۔ درخت اسی طرح لہلہا رہے تھے۔ پرندے زندگی کے گیت گا کر ماں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ شبنمی گھاس ماں کے آنسوؤں کا استعارہ لگ رہی تھی۔ پارک میں کھیلتے بچے، اٹھکیلیاں کرتے شرارتی سے بچے جن کے بچپن میں کتنی معصومیت چھپی ہوئی تھی۔

ماں کچھ تو بولو۔

بیٹا میں اب بولنے کی منزل سے آگے نکل چکی ہوں۔ میں اب محسوس کرتی ہوں۔ تم جوان ہو۔ تم بولتے ہو تو لگتا ہے زندگی بولتی ہے۔ میں بولتی ہوں تو بوڑھی ہڈیاں زنداں بان کی طرح تکلیف کا ڈنڈا لئے کھڑی ہو جاتی ہیں۔

اس دن ماں بس پارک میں گلابی، نیلے پیلے اور ہر رنگ کے پھولوں، تتلیوں، شبنمی گھاس، اور ٹھنڈی ہوا کو اپنے وجود میں اتارتی رہی اور خاموشی سے واپس آ گئی۔ آتے آتے بس اتنا کہا۔

بیٹا جا تجھے معاف کیا۔

بوڑھے شخص کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

سنو۔ پھر وہی آواز آئی۔ سنو اس رات کیا ہوا۔

کیا ہوا تھا بوڑھے شخص نے روتے جواب دیا تو وہی مانوس آواز پھر سنائی دی۔

تو سنو اس رات جو ہوا تمہیں بتاتا ہوں۔

ماں چپ چاپ کمرے میں آئی۔ شام تک آج وہ بیٹے کے ہمراہ تھی۔ آج اس نے کھانا بھی کھایا اور بیٹے نے کمرے میں چھوڑا۔ رات کے دس ہو چکے تھے۔ کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ باہر کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز تاریک رات کو مزید ہیبت ناک بناتی تھی۔ ماں نے کروٹ بدلی اور مرحوم شوہر کی تصویر کی طرف رخ کیا۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے۔

''شاکر، آج آپ کے بیٹے نے مجھے خوب سیر کروائی۔'' وہ ہنسی۔

''پچھلے دس برسوں میں پہلی دفعہ آج وہ مجھے بیٹا لگا۔ جانتے ہیں آپ وہ کہہ رہا تھا ماں تم اتنی کمزور کیوں ہوگئی ہو۔''

مائیں بچوں کے مقابلے میں کمزور ہی ہوتی ہیں۔ یہ تو بچے ہیں جو طاقتور ہو کر غرور اور بے حسی کی لاٹھی سے ماں کو زخمی کرتے رہتے ہیں۔ شاکر یہ کبھی سوچتے ہی نہیں کہ ماں اپنے سارے احساسات مار کر ان بچوں کو جنتی ہے۔ ساری خوشیوں کو گروی رکھ کر ان کے دامن میں خوشیاں بکھیرتی ہے۔

''جانتے ہیں نا، جب ہمارا بیٹا چھوٹا تھا تو میں کتنا آپ سے جھگڑتی تھی۔ آج یہ مجھ سے جھگڑتا ہے۔ جب یہ چھوٹا ہوتا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آج یہ میری آنکھوں میں روز آنسو بھر کر بچپن کے شوق پورے کرتا ہے۔ جب یہ بیمار ہوتا تھا میں پوری رات نہیں سوتی تھی۔ آج میں بیمار ہوتی ہوں اور پوری رات نہیں سوتی۔ تو یہ کہتا ہے اماں کیوں ہماری جان پر عذاب کی طرح نازل ہوگئی ہو نا خود سوتی ہو نا ہمیں سونے دیتی ہو۔

''آج بھی یہ میرا وہی چاند ہے جو بچپن میں اس کی کہانیوں میں ہوتا تھا۔ لیکن آج میری ذات اس کے لئے کہانی بنتی جا رہی ہے ایسی کہانی جس میں چندا بھی ہے۔ تارے بھی ہیں۔ لیکن ماں ایک ٹوٹے تارے کی طرح بس روز اس کے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ جس طرح زمیں سورج

کے گرد گھومتی ہے۔ میں بھی اپنے وجود سے محبتوں کو سمیٹ کر اس کی نفرت کی زمیں کے گرد گھومتی رہتی ہوں۔

''میں تو آپ کو بھی ٹوک دیتی تھی۔ جب اس نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی تھی اس دن کتنا آپ بے چین ہوئے تھے۔ کتنی جلی کٹی سنائی تھی اس نے آپ کو اور میں ہی جانتی ہوں جیسے جیسے آپ کی عمر آتی جارہی تھی۔ اس کا لہجہ بلند ہوتا جارہا تھا۔ آپ کہتے تھے نا جب اولاد کا لہجہ باپ کے لہجے سے بلند ہوجائے تو باپ کو اپنی نظریں جھکا لینی چاہئے ورنہ دنیا کے سامنے اس کی گردن جھک جائے گی۔ بوڑھے انسان کے پاس کچھ ہونا ہو ایک غیرت نامی چیز لازمی ہوتی ہے۔ اسی غیرت کے بل پر وہ پنجوں کے بل چلتا ہے۔ ہمارا بیٹا یہ بھول گیا تھا کس طرح آپ نے پتھر کاندھوں پر اٹھا کر ، زمینوں کو چیر کر، صبح سے شام تک وقت کی مسافت میں خود کو جلا کر اور اپنی آرزوں کو ضرورت کے قبرستان میں دفن کر کے اس کی ننھی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے تگ ودو کی تھی لیکن جب بڑا ہوا تو کہتا تھا آپ نے کیا ہی کیا تھا میرے لیے۔

اس دن جب آپ بچوں کی طرح روئے تھے میرے سامنے کہ اس نے بہو کے سامنے ہی آپ کو انتہائی سخت برے الفاظ سے نوازا تھا۔ اور کہا تھا۔ بڈھے تو مر کیوں نہیں جاتا۔ تو میرا وجود کرچی کرچی ہوگیا تھا۔ میرے لئے سب آپ ہی تھے۔ آپ کی عزت میری عزت تھی۔ یہ میں ہی جانتی ہوں آپ غیرت کا مینار تھے اس لئے اس دکھ کو جھیل نہیں سکے اور دل ہی دکھوں کے حوالے کر کے اس دنیا سے چلے گئے۔

لیکن ماں تو ماں ہوتی ہے۔ نا اس کے دکھ کم ہوتے ہیں نہ برداشت۔ دیکھیں میں دکھ کی صلیب پر روز چڑھتی۔ میں غم کی دہکتی آگ میں روز اترتی۔ میں بچوں کی نفرتوں میں روز طعنوں کے میک اپ سے بوڑھے وجود کو حرف تسلی کے پرفیوم سے معطر کرتی۔ میں نفرت کی آبشار میں دکھوں کے صابن سے وجود کو دھوتی تو تاسف اور غم میرے وجود میں مزید گھر کر لیتے۔ میرا بیٹا میری زندگی تھا۔ مگر وہ میرے وجود کو قطرہ قطرہ نچوڑ کر دکھ کے دریا میں پھینک آیا۔

جب ماں باپ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو وہ اتنے بے کار کیوں ہو جاتے ہیں۔ جب ان کی بوڑھی ہڈیاں کسی کام کی نہیں رہتیں تو وہ بھی سب کو کسی کام کے کیوں نہیں لگتے۔ ساری عمر دھوپ کے سمندر میں جوانی کو اولاد کی خاطر غرق کرنے کے بعد طعنے اور بڑھاپے میں اپنی حقارت ان کے حصے میں کیوں آتی ہے۔ کیوں ان کے لئے اپنا وجود ہی ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے۔ ساری زندگی محبت کے جھولے پر وقت اور ہر طوفان سے اولاد کو بچاتے بچاتے ہی ان کی بوڑھی ہڈیاں بے جان ہوتی ہیں نا۔

میرے لئے آج کی رات بہت اہم ہے۔ میں چاہتی ہوں اچھی یادوں کے ساتھ اس دنیا سے چلی جاؤں۔

ماں وہ چلاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو ایک بوڑھی ہڈیوں کو ایک بوڑھے شخص کی تصویر میں دکھوں کی جمع پونجی جمع کرواتے دیکھا۔ جس کی کھلی آنکھیں، دکھوں کی کھلی دنیا سے بہت دور جا چکی تھیں۔ اور چہرے پر موجود سکوں بتا رہا تھا کہ زندگی کس قدر بے سکون رہی تھی اس کے لئے۔

بوڑھے شخص کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پوری قبر اس کے آنسوؤں سے بھیگ چکی تھی۔

سنو اے شخص۔ جو انسان دوسرے کو دیتا ہے وہی اس کو پلٹتا ہے۔ تم ماضی کا آئینہ ہو اور مستقبل کی کہانی۔

بادل راستے سے ہٹ چکے تھے۔ آسماں پر ایک گدھ غور سے بوڑھے شخص کو دیکھ رہا تھا۔

❁

سفاک قاتل

خلیل جبار

نشہ انسان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت حتیٰ کہ رشتوں کی پہچان بھی چھین لیتا ہے دنیا میں بیشتر جرائم کی پشت پر نشے کی لت ہوتی ہے۔

کورٹ رپورٹر کی ڈائری کا ایک ورق، ایک قاتل کی روداد

میں جس علاقے سے تعلق رکھتا ہوں وہ علاقہ اتنا اچھا نہیں ہے اس علاقے میں زیادہ تر مزدور پیشہ لوگ رہتے ہیں۔ مزدور لوگ دن بھر محنت مشقت کا کام کر کے اس قدر تھک جاتے ہیں کہ شام گئے جب وہ لوگ گھروں کو لوٹتے ہیں ان کے جسم کا ایک ایک جوڑ دکھ رہا ہوتا ہے دوسرے دن انہیں پھر کام پر جانا ہوتا ہے اور کام پر جانے کے لیے ان کا تازہ دم ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس غرض سے وہ نشے کا سہارا لیتے ہیں۔ نشہ کرنے سے ان کی تھکن دور ہو جاتی ہے اور اگلے دن کام کرنے کو وہ تازہ دم ہو جاتے ہیں۔

ہمارے علاقے سے اکثر خاندان دوسرے اچھے علاقوں میں چلے گئے ہیں۔ وہ برسوں سے اپنے خاندان کے ساتھ اس علاقے میں رہ رہے تھے پھر اچانک اس علاقے سے نکل جانا معنی خیز بات ہے میں اس وقت چھوٹا تھا اس لیے بات سمجھ میں نہیں آتی تھی جیسے جیسے مجھے شعور آتا گیا مجھے اس کا جواب مل گیا ان کے خاندان میں کسی نہ کسی کو سرکاری محکمے میں افسر کی نوکری مل گئی تھی۔ اب انہیں وہ علاقہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اب انہیں اپنی آنے والی نسل کو سماجی برائیوں سے بچانے کو علاقے سے ہجرت کرنا پڑے گی۔ ورنہ ان کے خاندان کے بچے سماجی برائیوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ان کے کسی اچھے علاقے میں جانے سے ان کے بچوں پر اچھی سوسائٹی کا اچھا اثر پڑے گا اور ان میں آگے بڑھنے کی جستجو ہوگی اور وہ تعلیم کی طرف سنجیدگی سے توجہ دیں گے اور اگر وہ اسی علاقے میں رہے تو ان کے رشتے دار ان کی ترقی سے جیلس ہوں گے۔ کوئی بہت زیادہ حاسد ہوا تو ہمیں تنگ کرنے کو کالے جادو کا سہارا لیں گے اور طرح طرح سے تنگ کرنے کی کوشش کریں گے۔ بڑی سوسائٹی میں اس طرح کی چیزیں نہیں ہوتیں اور وہ ادھر ادھر دیکھنے کی بجائے اپنی ترقی پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ ترقی پر ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔

میرے والدین مجھے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے۔ میں جس علاقے میں رہ رہا تھا اس علاقے میں چھوٹے چھوٹے بچے اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چل رہے تھے یعنی وہ بھی بچپن سے نشے کے عادی ہو چکے تھے سگریٹ، گٹکا، پان پراگ اور دیگر نشہ آور چیزوں کا استعمال عام سی بات تھی۔ وہ نوعمری کی عمر میں پہنچنے تک چرس، ہیروئن، نشہ آور انجکشن کا استعمال کرنا ان کا معمول بن چکا ہوتا تھا۔ مجھے بھی ان کی دوستی میں رہتے ہوئے چرس پینے کی عادت پڑ گئی تھی ابتدا میں دوستوں نے پہلے مفت میں چرس پلائی پھر پیسوں کا تقاضہ کرنا شروع کر دیا تھا اب میں انہیں پیسے دے کر اپنا نشہ پورا کرتا تھا مجھے ان کی بے رخی پر بہت غصہ آتا تھا کہ کس قدر خود غرض دوست ہیں پہلے مفت اور اب پیسے مانگتے ہیں ان کی بھی مجبوری تھی چرس مفت نہیں آتی اب میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا میرے بدن کا ایک ایک جوڑ دکھنے لگتا تھا نشہ کرنا اب میری مجبوری بن گیا تھا۔ میرے والد کو جب میرے نشہ

کرنے کا پتہ چلا اس وقت پانی سر سے اوپر ہو چکا تھا' مار پیٹ اور تشدد سے اگر مسئلے آسانی سے حل ہونے لگ جائیں تو ہر آدمی اپنے بچوں کو سیدھی راہ پر لے آئے مجھ پر ابا نے بہت سختی کی اور مجھے نصیحتیں کرتے نہیں جھکتے تھے' ان کی مار پٹائی کا یہ اثر ہوا کہ میں نے نشہ کرنا نہیں چھوڑا بلکہ اب میں چھپ کر نشہ کرنے لگا تھا' میں پہلے گھر میں چھوٹی چھوٹی چوریاں نشے کرنے کو کرلیا کرتا تھا' امی جان کو خبر نہ ہوتی تھی لیکن وہ بھی اب ہوشیار ہوگئی تھیں۔ پیسے گن کر رکھتی تھیں' کچھ رقم کم ہونے پر میری طلبی ہو جاتی۔ پوچھ گچھ کی جاتی' میرے انکار پر ابا پٹائی شروع کر دیتے۔ مجبوراً مجھے ہامی بھرنی پڑتی کہ یہ چوری میں نے ہی کی ہے۔ آئے دن گھر میں پٹائی ہونے سے میں بے زار آ گیا تھا۔ اب مجھے نشہ کرنے کے لیے خود انتظام کرنا تھا۔ ہمارے محلے میں بچے نشہ کرنے کی غرض سے چوریاں کرتے تھے۔

چوریاں کرنے میں جیل جانے کا خطرہ بھی تھا' رشتے داروں میں الگ بدنامی ہوتی۔ اس لیے میں نے پپُو استاد کے پاس بیٹھنا شروع کر دیا' پپُو استاد کا نام پتا نہیں کیا تھا' وہ اپنے علاقے میں پپُو استاد کے نام سے مشہور تھا۔ وہ باربر تھا۔ میں اس سے بال کاٹنے کا کام سیکھ کر بال کاٹنے لگا تھا۔ ابا مجھے افسر بنانا چاہتے تھے اور میں نائی کا کام کرنے لگا تھا۔ پہلے میں اسکول سے آ کر یہ کام سیکھتا تھا' جب کام مکمل سیکھ گیا تو میں نے اسکول جانا ترک کر دیا۔ گھر سے میں دو کپیاں لے کر نکلتا اور اپنے علاقے سے دور ایک نائی کی دکان پر کام کرتا اور دوپہر میں گھر آ کر کھانا کھاتا اور پھر پپُو استاد کی دکان پر جا کر کام کرتا۔ میرے نائی کا پیشہ اختیار کرنے کا ابا اور امی کو بہت دکھ تھا۔ انہوں نے میری پٹائی بھی کی کہ میں کسی طرح اس پیشے سے باز آ جاؤں مگر میں کسی طرح اس پیشے سے باز نہ آیا۔ عمر کے ساتھ میں زیادہ نشہ

کرنے لگا تھا اور جتنا نشہ کرتا ہو اتنی ہی رقم بھی درکار ہوتی ہے‘ یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ ابا نے تھک ہار کر مجھے کہنا بند کر دیا اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا تھا اور ابا کی توجہ میرے چھوٹے بھائیوں کی طرف ہو گئی تھی۔ وہ باقاعدگی سے اسکول پڑھنے جا رہے تھے‘ اور ان کی پڑھائی پر توجہ بھی تھی۔

پیسے کا اپنا نشہ ہوتا ہے‘ کام کرنے سے میری جیب میں ہر وقت پیسہ رہتا تھا۔ دکان سے روز پیسے ملتے تھے جن میں کچھ پیسے بچا کر میں باقی رقم گھر پر دے دیا کرتا تھا۔ میرے چھپ کر نشہ کرنے سے کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ میں نشہ کرتا ہوں۔

فرحانہ میری پھوپھی زاد بہن تھی وہ مجھ سے پانچ چھ سال چھوٹی تھی۔ میری پھوپھی حمیدہ کا گھر دو تین گلیاں چھوڑ کر تھا۔ میرا اکثر ان کے گھر آنا جانا تھا۔ اس کا کوئی بڑا بھائی نہ تھا اس لیے مجھے ہی فرحانہ کی ضرورت کا سامان بازار سے لا کر دینا پڑتا تھا‘ کبھی اسے میں بازار لے جاتا‘ تا کہ اسے جو اپنی پسند کی چیزیں لینی ہیں خرید لے۔

فرحانہ نے بڑھتی عمر کے ساتھ خوب رنگ و روپ اور قد نکال لیا۔ میں جب اس کے ساتھ بازار جاتا تھا‘ نوجوان لڑکے میری طرف رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہوتے تھے‘ جیسے کہہ رہے ہوں۔

”کیا قسمت پائی ہے ایسی حسین دوشیزہ کسی‘ کسی کو ملتی ہے‘ میں انہیں کیسے بتاتا کہ یہ میری کزن ہے۔ لوگوں کا مجھے رشک بھری نگاہوں سے دیکھنا اچھا لگتا تھا یہ بھی حقیقت تھی کہ میں فرحانہ کو پسند کرنے لگا تھا‘ میں اکثر اسے چھیڑنے کو کہتا۔

”آج تو غضب ڈھا رہی ہو۔“

وہ دوسری لڑکیوں کی طرح خوش ہونے کے بجائے ڈانٹ دیتی۔

”تمہیں شرم آنی چاہیے۔“

”کس بات کی؟“ میں الٹا اس سے سوال کرتا۔

”اپنی بہن کو ایسے کہتے ہیں۔“ وہ کہتی۔

”تم میری کزن ہو‘

”کزن بہن نہیں ہوتی۔“ فرحانہ غصے سے آنکھیں نکالتی۔

”ہاں ہوتی ہیں مگر سب نہیں۔“ میں شرارتاً اس کی طرف مسکرا کے دیکھتا۔

”تم باز نہیں آؤ گے۔“

”میں باز کہاں ہوں انسان ہوں۔“ میں شوخی سے کہتا۔

”زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ میں ماموں سے تمہاری شکایت کر دوں گی۔“

”شکایت کر دو لیکن تم ماموں سے کیا کہو گی کیا کسی کے حسن کی تعریف کرنا جرم ہے؟“ میں کہتا۔

”حسن کی تعریف طریقے سے بھی ہو سکتی ہے بازاری جملے ادا کرنا اچھا نہیں ہوتا۔“ وہ کہتی۔

”اچھا غلطی ہو گئی اب ایسا نہیں ہو گا۔“ میں بات ختم کرنے کو کہتا۔

اور وہ ہنس دیتی۔

مجھے یہ خطرہ تھا کہ کہیں وہ میرے ساتھ بازار جانا اور اپنے لیے سامان منگوانا بند نہ کر دے۔ اسے بازار لے جانا مجھے اچھا لگتا تھا۔ میں اکثر اپنے دوستوں سے موٹر سائیکل مانگ کر لے آتا‘ اور فرحانہ کو اس پر بٹھا کر بازار لے جاتا تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے اکثر میں کبھی گاڑی کی رفتار بڑھا دیتا‘ کبھی اچانک بریک مار دیتا‘ کبھی ایسا کرتا اب موٹر سائیکل گری‘ یہ تمام حرکتیں میں اس لیے کرتا تھا کہ ایسا کرنے سے ایک لمحے کو فرحانہ گھبرا کر میری پیٹھ سے لپٹ جاتی تھی اس کے ایسا کرنے سے مجھے سکون ملتا تھا۔

”تم ڈھنگ سے گاڑی کیوں نہیں چلاتے۔“ وہ غصے سے کہتی۔

”اور کیسے چلاؤں اچانک سامنے سے کوئی گاڑی آ جائے تو ایسا کرنا پڑتا ہے۔“ میں وضاحت دیتا۔

”بس رہنے دو تم جان بوجھ کر مجھے ڈرانے کو ایسا کرتے ہو۔“ وہ کہتی۔

”مجھے ایسا کرنے سے کیا فائدہ ہو گا۔“ میں مصنوعی غصے کا اظہار کرتا۔

”اچھا غصہ چھوڑو اور موڈ اچھا کرو۔“

”وہ کیوں؟“

''وہ اس لیے کہ موڈ خراب ہونے سے ایکسیڈنٹ زیادہ ہوتے ہیں۔''

''کمال ہے ڈرائیور میں ہوں اور ایکسیڈنٹ کے بارے میں معلومات تمہیں زیادہ ہے۔'' میں اس کا مذاق اڑاتا۔

''میرا اس کے کزن ہونے کا بڑا فائدہ تھا۔ کوئی محلے والا اور رشتے دار ہمارے ساتھ گھومنے پھرنے پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔ میں اس کا بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس نے مجھے دل میں بھائی کا مقام دیا ہوا تھا لیکن میرے دل میں اس کا بہن نہیں صرف کزن کا درجہ تھا۔ اس لیے میں اس سے چھیڑ چھاڑ کرلیا کرتا تھا اور وہ غصہ کر کے رہ جاتی تھی۔

فرحانہ کو بیوٹی پارلر کے کورس کرنے کا شوق ہوا اور اس نے بیوٹی پارلر کا کورس کرلیا۔ اس کے کورس مکمل کرنے سے پھوپھی کی آمدنی میں اضافہ ہوگیا کیونکہ پھوپھا کی اتنی آمدنی نہیں تھی جس کی وجہ سے ان کا ہاتھ تنگ رہتا تھا' فرحانہ جو رقم لاتی تھی اس سے گھر کے خرچ میں پھوپھی کا ہاتھ کھلا ہوگیا تھا۔ گھر میں خوشحالی نظر آنے لگی تھی' گھر میں پردے اچھے آگئے تھے۔ استعمال کا سامان بھی اچھا ہوگیا تھا۔ فرحانہ بیوٹی پارلر میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ گھر میں اپنے طور پر دلہنوں کا میک اپ کرنے لگی تھی۔ اس سے فرحانہ کی آمدنی میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔

ان دنوں میرا ہاتھ تنگ ہوتا جارہا تھا' امی جان کی خواہش تھی کہ میں انہیں زیادہ پیسے دوں کم پیسوں میں ان کا گزارا کرنا مشکل ہوتا جارہا تھا اور مجھے جو رقم ملتی تھی وہ اتنی زیادہ نہیں تھی کہ انہیں دے دوں' میرا اپنا خرچہ تھا' نشہ بھی اس دور میں کرنا اتنا آسان نہ رہا تھا۔ ایسے میں' میں نے ہمت کر کے فرحانہ سے رقم ادھار مانگ لی۔ میں نے زندگی میں اس سے پہلی بار رقم مانگی تھی۔ اس لیے بغیر کچھ پوچھے رقم دے دی تھی۔ اس سے میرا رقم مانگنے کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب میں بہانے بہانے سے فرحانہ سے رقم بٹورنے لگا تھا۔ وہ مجھ پر اعتماد کرتی تھی' اس لیے رقم دے دیتی تھی۔ اس رقم سے میں خوب چرس کا نشہ کرنے لگا تھا۔ دو چار دفعہ ہوتا تو یہ چلتا رہتا یا میرے ادھار کی رقم لوٹانے پر وہ مجھے دوبارہ بھی رقم دے دیتی میں تو رقم اس سے نہ دینے کی بنیاد پر لے رہا تھا' وہ مجھے رقم دینے سے انکار کرتی رہتی تھی مگر میں بہانے ایسے گھڑ کر جاتا تھا اس کا دل پسیج جاتا اور پھوپھی زاد ہونے کے ناتے رقم دے دیتی تھی۔

ایک دن جب میں نے ادھار پیسوں کا کہا تو وہ پھٹ پڑی۔

''شکیل آخر تم ان دنوں ایسا کیا کررہے ہو جو تمہیں بار' بار پیسوں کی ضرورت پیش آرہی ہے تم کام بھی کررہے ہو پھر بھی تمہیں رقم کی ضرورت پیش آجاتی ہے' کہیں تم نے کوئی نشہ وغیرہ تو......'' اس نے کہنا چاہا۔

''میں کیوں نشہ کروں گا' کیا مجھے تم ایسا ویسا سمجھتی ہو۔'' میں نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

''اگر تم مجھے پیسے دینا نہیں چاہتی تو ایسے ہی منع کردو مجھ پر کیوں الزام لگارہی ہو۔''

''میں کیوں تم پر الزام لگاؤں گی میں صرف پوچھ رہی ہوں تم ایسے ناراض ہورہے ہو جیسے واقعی نشہ کرنے لگے ہو۔'' وہ بگڑتے ہوئے بولی۔

''تمہارا موڈ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ میں پھر بھی آجاؤں گا۔'' میں نے جانے کو قدم بڑھائے۔

''اچھا ٹھہرو یہ لو کچھ رقم ہے اس سے اپنی ضرورت پوری کرلینا۔'' اس نے کچھ رقم میری طرف بڑھائی۔

رقم دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ میں نے جلدی سے وہ رقم جیب میں ٹھونس لی۔

''میں تمہیں یہ رقم جلد لوٹادوں گا۔'' میں نے کہا۔

''اور اس سے پہلے جو تم نے رقم لی تھی وہ کب لوٹاؤ گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

اس وقت وہ مسکراتے ہوئے مجھے بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ فوراً سے اس کا منہ چوم لوں۔

''ادھار لوٹانا ہی پڑتا ہے میرے پاس جیسے ہی بندھی رقم آئی میں فوراً سے تمہیں لوٹادوں گا۔'' میں نے کہا۔

''کیا کوئی کمیٹی ڈالی ہوئی ہے۔'' فرحانہ نے پوچھا۔

''کمال ہے تمہیں کیسے کمیٹی کا معلوم ہوگیا۔'' میں نے اسے خوش کرنے کو کہہ دیا۔

حقیقت یہ تھی کہ میں کمیٹی کہاں سے ڈالتا میرے پاس نشہ کرنے کو پیسے نہیں تھے فرحانہ سے رقم بٹور کر ان دنوں نشہ

کررہا تھا۔

''تمہاری ہی بات سے پتا چلا ہے۔''

''میری کون سی بات؟''

''ابھی تم نے کہا تھا کہ بندھی رقم آنے پر لوٹا دوں گا' بندھی رقم انسان کے پاس کمیٹی کھلنے پر آتی ہے۔'' فرحانہ نے کہا۔

''واقعی تم ان دنوں بہت ذہین ہوگئی ہو' میں نے ابھی تک کسی کو کمیٹی کے بارے میں بتایا نہیں ہے اور تم سمجھ گئی ہو۔'' میں نے کہا۔

میری بات سے اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ کمیٹی کے نام سے اسے اپنی ادھار رقم ملنے کی امید ہوگئی تھی ورنہ وہ سمجھ رہی تھی کہ رقم پتا نہیں ملے گی بھی یا نہیں۔ کزن ہونے کے ناتے وہ خاموش تھی' اس نے پھوپھی جان کو بھی یہ بات بتائی نہیں تھی۔ فرحان نے رقم دیتے ہوئے مجھے کہا تھا کہ میں ادھار کی رقم خاموشی سے واپس کردوں گا کسی کو پتہ نہ چلے۔

کمیٹی کا سن کر فرحانہ کو تسلی ہوگئی تھی۔ میں نے دوچار بار اور پیسے مانگ لیے اور اس نے خوشی خوشی مجھے رقم دے دی۔ فرحانہ سے رقم ملنے پر میں اور زیادہ نخی ہوگیا تھا اس رقم سے خود بھی نشہ کرتا اور اپنے دوستوں کو بھی کراتا۔ میرے دوست حیران تھے کہ میرے ہاتھ کیا قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے جو میں کھلا خرچ کررہا ہوں۔ ان کے پوچھنے پر میں آنکھ مار کر کہتا کہ بس ایسی بات ہے تم آم کھانے سے غرض رکھو' پیڑ گننے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع نہ کرو۔''

میری اس بات پر دوست کھلکھلا کر ہنس دیتے' فری مال ملنے پر کون ناخوش ہوتا ہے۔ دن اچھے گزر رہے تھے۔ میں اور میرے دوست مفت میں خوب عیاشی کررہے تھے۔

ایک دن میں جب پھوپھی کے گھر گیا' ان کے گھر سوائے فرحانہ کے کوئی نہ تھا' وہ مجھے دیکھ کر چونکی اس سے قبل کہ میں فرحانہ سے ادھار رقم کا مطالبہ کرتا وہ بول پڑی۔

''قاسم تمہاری کمیٹی کب کھلے گی؟''

''کیوں؟'' میں چونکا۔

''تمہیں پتا ہے تم مجھ سے کتنی رقم لے چکے ہو۔'' اس نے کہا۔

''کتنی رقم لے چکا ہوں۔'' میں نے بے پروائی سے پوچھا۔

''پچیس ہزار چار سو روپے ہوچکے ہیں۔'' فرحانہ نے بتایا۔

''بس اتنی سی رقم ہوئی ہے۔'' میں نے ایسے کہا جیسے یہ رقم میرے لیے معمولی رقم ہے۔

''تمہارے لیے یہ رقم معمولی ہوسکتی ہے مگر میرے نزدیک تو یہ رقم بہت زیادہ ہے۔ میں تم سے اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ تمہیں یاد ہے نا تم مجھ سے کتنی رقم لے چکے ہو۔''

''تم جھوٹ کوئی بولوگی۔'' میں نے اسے مسکا لگایا۔

''میں تمہاری کمیٹی کے بارے میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ میں چاہ رہی ہوں کہ گھر میں بیوٹی پارلر کھول لوں اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ بیوٹی پارلر سے جو آمدنی ہوگی وہ سب رقم گھر میں رہے گی۔ مجھے بیوٹی پارلر سے بہت کم رقم ملتی ہے' حالانکہ مجھ سے کام زیادہ لیا جاتا ہے بیوٹی پارلر پر آنے والی کئی خواتین سے میری دوستیاں ہوگئی ہیں' وہ اس بات پر راضی ہیں کہ میرے گھر پر بیوٹی پارلر کھولنے پر میرے گھر پر آئیں گی۔''

''ارے کس چکر میں پڑگئی ہو سیدھا نوکری کرتی رہو۔'' میں نے کہا۔

''میری مرضی میں تو گھر میں بیوٹی پارلر کھولوں گی' تمہیں کیا تکلیف ہے۔'' فرحانہ کو غصہ آگیا۔

اسے غصہ میں آتا دیکھ کر میں مصلحتاً خاموش ہوگیا' کچھ دیر خاموش رہ کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ میری بات پر اسے شدید غصہ آگیا تھا۔

''فرحانہ تمہیں میری بات ناگوار گزری ہے۔'' میں نے کہا۔

''بات ہی ایسی ہے میں اپنے پیسوں سے بیوٹی پارلر کھولنا چاہ رہی ہوں اور تمہیں پتا نہیں کس بات کی تکلیف ہورہی ہے جو مجھے منع کررہے ہو۔''

''میں تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا تھا اگر تمہیں برا لگ گیا ہے تو آئندہ ایسی بات نہیں کروں گا۔''

''ہر انسان کوشش کرتا ہے کبھی ناکامی اور کبھی کامیابی ہوجاتی ہے' میرا کوئی بڑا بھائی نہیں ہے میں ابا کا سہارا بننا

چاہتی ہوں اس لیے میں نے بیوٹی پارلر کا کورس کیا اور اب گھر میں بیوٹی پارلر قائم کر کے زیادہ پیسہ کمانا چاہتی ہوں‘ تم یہ بتاؤ کہ مجھے ادھاری رقم کب دو گے۔‘‘

’’فوری طور پر رقم دینا میرے بس میں نہیں ہے تمہیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔‘‘

’’کتنا مہینہ‘ دو مہینے بتاؤ تا کہ میں کسی اور سے رقم اس وعدے پر لے کر اپنا کام کرالوں۔‘‘

’’تمہیں بہت جلدی ہے میرا مشورہ ہے کہ تم جلد بازی نہ کرو کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ جو خواتین تمہارے پاس آنے کا کہہ رہی ہیں وہ بیوٹی پارلر کھولنے پر نہ آئیں پتا چلے کہ تم نوکری سے بھی گئی اور کام بھی نہیں چلا۔ بیوٹی پارلر بنانے پر جمع پونجی بھی خرچ ہو گئی۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا ہے‘ پیسے مانگنے کی بات کی ہے تم صرف مجھے یہ بتاؤ کہ پیسے کب دے رہے ہو؟‘‘ وہ غصے سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

’میں اسے کیا جواب دیتا‘ جو رقم اس نے مجھے دی تھی وہ سب میں نے چرس پینے پلانے میں اڑا دی تھی‘ ان دنوں کام دھندا اتنا چل رہا تھا جو اسے کمیٹی ڈال کر دے دیتا۔ میرے پاس اتنی رقم ہونے پر مجھے کیا ضرورت تھی جو فرحانہ سے بھکاریوں کی طرح قرض مانگتا‘ میں محسوس کر رہا تھا کہ دن بدن فرحانہ کا رویہ میرے ساتھ تلخ ہوتا جا رہا تھا اور کیوں نہ ہوتا‘ اس نے مجھے قرض دیا تھا اور وہ اپنا قرض حاصل کرنے کو یہ رویہ مجھ سے روا رکھ سکتی تھی‘ میرے پاس اسے دینے کو تسلیاں ہی تھیں اور کچھ میرے پاس نہیں تھا۔

’’فرحانہ تم ایک دم جذباتی ہو جاتی ہو‘ مجھے تم سے زیادہ فکر ہے کہ تمہارے پیسے تمہیں لوٹا دوں‘ میں کمیٹی ڈالنے والے سے پہلے بات کرلوں پھر ہی بتا سکتا ہوں کہ کب پیسے ملیں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے چند دن میں انتظار کر لیتی ہوں لیکن مجھے جلدی بتا دینا کہ کب پیسے دو گے ورنہ میں ماموں کو بتا دوں گی۔‘‘ اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں مجھے دھمکی دے دی تھی۔

’’فرحانہ رقم تم سے میں نے لی ہے اور میں ہی تمہیں دوں گا‘ تم ماموں کو بیچ میں کیوں لا رہی ہو۔‘‘ میں نے کہا۔

’’ٹھیک ہے اگر تم مجھے رقم دے دیتے ہو تو مجھے ماموں کو بتانے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔‘‘

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ پڑوس سے پھوپھی جان آ گئیں اور ان سے کچھ دیر باتیں کر کے چلا آیا۔

اس بات کو ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ فرحانہ کی میرے موبائل پر کال آ گئی۔

’’فرحانہ خیریت ہے۔‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں خیریت ہی ہے۔‘‘

’’اس وقت تم بیوٹی پارلر پر ہوتی ہو پھر مجھے کیسے یاد کرلیا۔‘‘

’’میں اس وقت بیوٹی پارلر پر اکیلی بور ہو رہی ہوں اس لیے تمہیں بلا کر گپ شپ کرلوں۔‘‘

’’کیوں باقی سب لوگ کہاں ہیں؟‘‘

’’میڈم کے کسی عزیز کی کراچی میں شادی ہے وہ اس میں شرکت کرنے کے لیے گئی ہیں۔ بیوٹی پارلر پر کسی کا ہونا ضروری ہے اس لیے مجھے وہ چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔‘‘ فرحانہ نے کہا۔

’’ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو میں ابھی دوڑا دوڑا چلا آتا ہوں۔‘‘ میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

’’اتنی جلدی بھی نہیں ہے کہ دوڑے چلے آؤ‘ میرا مطلب ہے کہ تم آرام سے آ جاؤ۔‘‘ وہ بولی۔

’’میں نے ویسے ہی یہ بات کہہ دی بے فکر رہو میں آرام سے چہل قدمی کرتا ہوا آؤں گا‘‘ میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

فرحانہ کے یہ بات بتانے پر کہ وہ بیوٹی پارلر پر اکیلی ہے میرے بدن میں ایک خوشگوار سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ میں جلد سے جلد بیوٹی پارلر پہنچ جانا چاہتا تھا‘ اس بیوٹی پارلر میں اکیلے ملنے کی جتنی خوشی مجھے تھی اتنی کسی کو بھی نہیں ہو سکتی تھی میں اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا‘ میں جب بیوٹی پارلر پہنچا فرحانہ کسی خاتون سے بات کر رہی تھی اس خاتون کو دیکھ کر میری ساری خوشی گویا خاک میں مل گئی تھی۔ فرحانہ نے اس سے میرا تعارف کرایا‘ وہ خاتون فرحانہ کی دوست بن گئی تھی اور اس وقت ملنے کے لیے آئی

تھی۔ اس کا نام فاطمہ تھا' وہ کچھ دیر باتیں کر کے چلی گئی۔ اس کے جانے پر میں دروازہ بند کر آیا۔
فرحانہ کچھ دیر میرے کام کے متعلق باتیں کرتے ہوئے پھر اصل موضوع پر آ گئی۔
''شکیل تم نے پھر کمیٹی والے صاحب سے بات کی؟''
''کمیٹی والے سے بات......'' میں چونکا۔
اس نے بہانے سے مجھے بلایا تھا' اصل مقصد اس کا رقم کا تقاضہ کرنا ہی تھا۔
''ہاں بولو رک کیوں گئے؟'' اس نے پوچھا۔
''میں نے......ہاں بات کی ہے۔'' میں سنبھلتے ہوئے بولا۔
''کیا بولا ہے اس نے کب دے گا؟''
''اس نے مجھے بتایا ہے کہ دو تین ممبر اسے تنگ کر رہے ہیں وہ چاہ رہے ہیں انہیں پہلے کمیٹی کی رقم دی جائے لیکن کمیٹی والا بابو بھائی انہیں میرا مسئلہ سمجھا رہا ہے وہ تھوڑا سمجھ بھی رہے ہیں پیسہ ایسی چیز ہے جسے ہر شخص کو ضرورت ہوتی ہے ہر شخص کمیٹی ڈالتا اسی لیے ہے۔'' میں نے کہا۔
''ہاں کمیٹیاں ڈالی اسی لیے جاتی ہیں اپنی ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں ویسے پیسے گھر میں جمع نہیں ہوتے۔ اس بہانے ایک بندھی رقم ہاتھوں میں آ جاتی ہے۔ تم کمیٹی والے بابو بھائی پر پورا زور دینا کہ یہ کمیٹی وہ تمہیں دے دے تاکہ میں بیوٹی پارلر گھر میں کھول لوں۔''
''تم بے فکر رہو میں اپنی طرف سے پورا زور لگاؤں گا لیکن تم بھی دعا کرنا۔''
میں یقین ہی دلا سکتا تھا' رقم میرے پاس کہاں تھی یقین نہ دلانے پر میرے لیے بڑی پریشانی نازل ہو سکتی تھی پریشانیوں سے بچنے کی خاطر آسرا کراتے رہو کہ رقم ملنے والی ہے میری بات سے وہ خوش ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ مجھے بہت پیاری لگ رہی تھی' موقع بھی اچھا تھا۔ تنہائی بھی تھی پھر نہ جانے کب یہ موقع ملتا' میں نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھانے کا سوچ لیا تھا جب اس نے پینے کو چائے پیش کی' میں چائے پیتے ہوئے مخمور نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
''تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟'' فرحانہ نے کہا۔
''پھر کس طرح دیکھوں تم ہی بتا دو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے دیکھا۔
''جیسے پہلے دیکھتے رہے ہو۔'' وہ بولی۔
''پہلے اور بات تھی اب اور بات ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''اب مجھ میں ایسے کیا سرخاب کے پر نکل آئے ہیں۔''
''تم......تم اب ایک حسین دوشیزہ میں تبدیل ہو گئی ہو جب تم میرے ساتھ سڑک پر نکلتی ہو نا جانے کتنی نگاہیں تمہیں ہوس سے تک رہی ہوتی ہیں۔'' میں نے کہا۔
''تمہارا کہنے کا مقصد ہے میں اب نقاب میں نکلا کروں تاکہ کسی کی نظر نہ لگ سکے۔'' فرحانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
''ہاں تمہیں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔'' میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
اس نے اپنا ہاتھ پکڑنے پر چھڑانے کی کوشش نہیں کی اس سے میرا حوصلہ بڑھا' میں نے جو اس کی تعریف کی تھی یہ اس کا اثر تھا میں اس کے نزدیک ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ایسے جھانکنے لگا جیسے میرا کچھ گم ہو گیا ہے اور میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔
''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا آج کچھ زیادہ رومانٹک ہو رہے ہو۔'' فرحانہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔
''تمہیں دیکھ کر رومانٹک ہونے کو جی چاہتا ہے۔''
''کیا کسی سے محبت ہو گئی ہے۔''
''تمہارے ہوتے ہوئے میں کسی اور سے محبت کیسے کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''بہنوں سے سب ہی محبت کرتے ہیں اس میں تم نے کون سا کمال کر دیا ہے۔'' فرحانہ نے میرا مذاق اڑایا۔
''اس کی اس بات سے مجھے ایک لمحے کو ایک جھٹکا لگا۔
میں نے جیسے ہی اسے اپنی بانہوں میں لینا چاہا وہ میری بانہوں سے چکنی مچھلی کی طرح نکل گی۔
''یہ کیا حرکت ہے۔'' وہ غصے سے بولی۔
میں اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی جانب بڑھا' میں نے جیسے ہی اسے دوبارہ بانہوں میں

بھرنے کی کوشش کی اس نے میرے زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ تھپڑ لگنے سے مجھ پر جو رومانٹک ہونے کا بھوت سوار ہوگیا تھا وہ ایک دم سے غائب ہوگیا۔ تھپڑ زور سے لگا تھا۔ میرے چودہ طبق روشن ہوگئے تھے۔

''بدتمیز انسان سگے رشتوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ میں رشتہ داروں سے تمہاری تعریفیں کرتے نہیں تھکتی اور تم اس قدر گر جاؤ گے مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا تم اسی وقت یہاں سے دفعہ ہوجاؤ۔'' فرحانہ غصے سے گرجی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے مجھ پر جو اسے اعتماد تھا وہ ٹوٹ چکا تھا۔

''میں...... میں......''

''میں تم سے کچھ سننا نہیں چاہتی تم اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔ میں تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتی۔'' فرحانہ نے کہا۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں کس طرح بات بناؤں یہ بات گھر والوں اور خاندان والوں کو پتا چلے گی کہ میں نے فرحانہ پر دست درازی کرنے کی کوشش کی ہے تو میری رہی سہی عزت خاک میں مل جائے گی۔ وہ میری بات سننے کو تیار نہ تھی۔ اس لیے میں خاموشی سے چلا آیا۔ وہ غصے میں تھی اس لیے میری بہتری اسی میں تھی کہ خاموشی سے گھر چلا جاؤں۔ میں جب پلٹ رہا تھا تو میں نے اس کے منہ سے نکلتی سسکیوں کو صاف محسوس کیا تھا۔ وہ مجھے سگی بہنوں کی طرح چاہتی تھی اسے مجھ سے ایسی گری ہوئی حرکت کی بالکل بھی توقع نہ تھی۔ اس لیے میری اس حرکت پر بری طرح سے دل ٹوٹ گیا تھا۔

گھر آنے پر میں پوری رات سکون کی نیند نہ سوسکا۔ میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہورہا تھا کہ کہیں فرحانہ اس حرکت کا کسی کو بتانہ دے یہ بات خاندان میں پھیلنے کا مطلب تھا کہ میری عزت دوکوڑی کی رہ جاتی اور میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا' ایک دن گزرا' دو دن گزرا فرحانہ کی طرف سے خاموشی تھی۔ خاندان میں بھی کسی نے کچھ نہیں کہا اس کا مطلب تھا کہ اس نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی جبھی اتنی خاموشی تھی۔

ایک ہفتہ گزر جانے پر میں سمجھ گیا فرحانہ نے وہ بات

کسی کو نہیں بتائی ہے ویسے بھی میرے اکیلے کی بدنامی نہیں تھی زیادہ بدنامی فرحانہ کی ہوتی لوگ طرح طرح کی باتیں گھڑ کر پھیلا دیتے۔ اس نے یہ بات کسی کو نہ بتا کر بڑی سمجھداری کا ثبوت دیا تھا۔ ہم دونوں کی خاندان میں عزت رہ گئی تھی۔

فرحانہ سے رابطہ ٹوٹنے پر مزید پیسے ملنے کا آسرا ختم ہو گیا تھا۔ میرے دوست احباب بھی میرے پیسوں پر چرس پینے کی عیاشی کر رہے تھے وہ مجھ سے اب کترانے لگے تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ کہیں میں ان سے چرس کے لیے پیسے نہ مانگ لوں۔ میں بڑی پریشانی میں گھر گیا تھا۔ نشہ نہ کرنے سے میرا جسم ٹوٹنے لگا تھا' اس لیے گھر پر جو خرچے کے پیسے دیتا تھا' اس میں کمی سے امی جان شور کرتی تھیں کہ اتنے کم پیسے دے رہے ہو گھر کا خرچہ کیسے چلے گا' میں کام کا نہ ہونے کا بہانہ بنا کر وقتی طور پر اپنی جان چھڑا لیتا تھا لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں تھا۔ مسئلہ زیادہ پیسے گھر پر دینے سے ہی حل ہو سکتا تھا' فرحانہ وقتی طور پر خاموش تھی لیکن جیسے ہی اس کا غصہ کم ہو گا وہ مجھ سے پھر رقم کا مطالبہ کرے گی' ان پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کو میں نے زیادہ نشہ کرنا شروع کر دیا تھا' نشے سے وقتی طور پر مجھے سکون مل جاتا تھا۔

میں نشے سے وقتی طور پر پرسکون ہو جاتا لیکن قدرت میرے ساتھ کچھ اور ہی کھیل کھیلنا چاہ رہی تھی۔ ایک دن میرے موبائل پر فرحانہ کی کال آ گئی' میں موبائل پر اس کا نمبر دیکھ کر ایک لمحے کو چونکا' اس سے دوبارہ دوستی کرنے کا اس سے اچھا موقع نہیں مل سکتا تھا میں خود کو اس سے بات کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا' کہ کال بند ہو گئی۔ کال اینڈ ہونے پر دوبارہ کال آئی' میں نے کال اوکے کر دی۔ ''شکیل تم سے بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن کیا کروں مجبوراً تم سے بات کر رہی ہوں' تمہاری اس حرکت سے مجھے ذہنی طور پر بہت صدمہ پہنچا تھا میں پوری رات سو نہ سکی تھی۔'' وہ بولی۔

''تمہیں میری بات کا یقین نہیں آئے گا میری بھی رات یہی کیفیت رہی' جیسی تمہاری تھی۔ مجھ سے واقعی بہت بڑی غلطی ہوئی ہے مجھے اس بات کا بہت دکھ ہے۔''

''پھر تم نے اس کا اظہار کیوں نہیں کیا؟'' اس کا لہجہ کچھ نرم پڑ گیا۔

''حوصلہ نہیں ہو پا رہا تھا' تمہاری کال آنے پر کچھ حوصلہ ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔

''شکیل انسان کو مقدس رشتوں کا احترام کرنا چاہیے' انسان جب مقدس رشتوں کا احترام کھو دیتا ہے تو اس میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا ہے۔'' فرحانہ نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو۔'' وہ بے یقینی سے بولی۔

''ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں نے اسے بھرپور یقین دلایا۔

''ٹھیک ہے میں تمہیں معاف کر دیتی ہوں اور دیکھو آئندہ پھر ایسی غلطی نہ ہونے پائے۔'' فرحانہ نے کہا۔

''تم بے فکر رہو میں اس دن سے بہت بدل گیا ہوں۔''

''اتنے بھی نہ بدل جانا کہ پہچان میں نہ آ سکو۔''

''نہیں میں ذہنی طور پر بدلا ہوں جسمانی طور پر نہیں بدلا کہ پہچان نہ سکو۔'' میں نے زبردستی ہنستے ہوئے کہا۔

''شکیل میں نے تمہیں اس لیے کال کی تھی کہ تم یہ بتاؤ کہ میرے پیسے کب دو گے۔'' فرحانہ نے کہا۔

''جب میری کمیٹی کھلے گی۔'' میں نے کہا۔

''اور یہ کمیٹی کب کھلے گی؟''

''میری بابو بھائی سے بات ہوئی تھی اس نے یقین دلایا ہے کہ اس بار میری ہی کمیٹی کھلے گی۔'' میں نے اسے آسرا دلایا۔

میں نے کمیٹی ڈالی ہی کب تھی جو کھلتی۔ فرحانہ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کو اس طرح جھوٹ بولنا ضروری تھا۔ ورنہ معاملہ گڑبڑ ہو جاتا۔

''جو لوگ کمیٹی کے لیے ضد کر رہے تھے کیا وہ اب ضد نہیں کر رہے ہیں۔'' فرحانہ نے پوچھا۔

''ان کی خاموشی نیم رضامندی سمجھ لو۔'' میں نے کہا۔

''خدا کرے ایسا ہو جائے۔'' وہ خوش ہو گئی۔

فرحانہ سے بات چیت ہونے پر میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے پھوپھی کے گھر دوبارہ سے جانا شروع کردیا۔ پھوپھی جان نے اتنے دن نہ آنے کا شکوہ کیا میں نے کام کی زیادتی کا بہانہ گھڑ کرانہیں مطمئن کردیا۔

میرا پھوپھی کے گھر آنا جانا شروع ہوگیا تھا لیکن مجھے اس رات اپنی بے عزتی یاد تھی۔ مجھے اس واقعے کو بھول جانا چاہیے تھا مگر میرے ذہن سے وہ واقعہ چپک کر رہ گیا تھا۔ فرحانہ جب بھی میرے سامنے آتی مجھے شدت کے ساتھ اس پر غصہ آجاتا اور میرا خون کھول اٹھتا تھا لیکن میں صبر کا گھونٹ پی کر رہ جاتا، میں جلد بازی میں ایسا کام نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مستقبل میں میری عزت خاک میں مل جائے۔

ایک دن خالی پلاٹ پر زیر تعمیر پلازہ دیکھ کر ایک منصوبہ ذہن میں آگیا اس منصوبے پر عمل کرنے سے میں نا صرف انتقام لے لیتا بلکہ آئے دن پیسوں کی واپسی کے تقاضے سے بچ جاتا۔ میں نے اس شیطانی منصوبے کے ذہن میں آنے پر اپنے ذہن کو شاباش دی۔ اب مجھے اس منصوبے پر عمل کرنے کی غرض سے پلان تیار کرنا تھا تاکہ منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہوسکے۔

سردیاں اپنے عروج پر آگئی تھیں۔ رات میں تیز ہوائیں چلنے سے سردی میں زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔

آج سردی کی لہر میں اضافہ ہونے سے بازاروں میں مغرب ہوتے ہی سناٹا چھا گیا تھا لوگ اپنے کاموں سے فارغ ہوکر گھروں کا رخ کرنے پر مجبور ہوگئے تھے میں نے اس موسم سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا سوچ کر فرحانہ کو کال کی۔

''فرحانہ کیا کررہی ہو؟'' میں نے رابطہ ہونے پر پوچھا۔

''میں فارغ ہوں۔''

''کیا کوئی کام نہیں ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''اس سردی میں کون بدبخت گھر سے نکلتا ہے سب کو اپنے گھر جانے کی پڑی ہوئی ہے۔ ہمارے پاس کون آتا ہے۔''

''پھر تم کیا کررہی ہو تم گھر چلنے کی تیاری کرو۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔

روزے کے دس فائدے

اللہ تعالیٰ کا جلوہ نصیب ہوگا۔

روزہ دوزخ کی آگ سے ڈھال ہوگا۔

روزہ بخشش کا سبب ہوگا۔

روزے دار کو جنت کے دروازے ریان سے داخلہ ملے گا۔

روزہ قیامت کے دن شفاعت کرے گا۔

روزہ دار کو عرش کے نیچے کھانا ملے گا۔

قبر کے حساب سے نجات ملے گی۔

روزہ دار اللہ کی خاص جزا کا مستحق ہوگا۔

قیامت کے دن روزہ شفاعت کا ذریعہ بنے گا۔

روزہ بہشت کا ضامن ہوگا۔

عدیل تنویر......فیصل آباد

خوف خدا

ایک دفعہ شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ کسی جنگل سے گزر رہے تھے۔ اچانک انہیں ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ تلاش کرنے پر دیکھا کہ ایک چھوٹا بچہ سجدے کی حالت میں رو رہا ہے۔ تب آپؒ نے پوچھا تُو کون ہے؟ وہ بچہ بولا، تم کون ہو، میری عبادت میں خلل ڈالنے والے۔ آپؒ نے کوئی جواب نہ دیا اور پھر پوچھا، تیرا استاد کون ہے، جس نے تیری اتنی اچھی تربیت کی ہے؟ بچے نے جواب دیا، میری ماں ہے۔ وہ چولہے میں لکڑیاں جلا رہی تھی مگر جب میری ماں نے چھوٹی لکڑیاں لگائیں تو ان کو جلدی آگ لگ گئی جس کی وجہ سے بڑی لکڑیاں بھی جلنے لگیں جسے دیکھ کر میں نے سوچا کہ قیامت کے دن فرعون و نمرود جیسے بڑے بڑے گنہگاروں کو جہنم کی آگ ہم جیسے چھوٹوں سے لگائی جائے گی۔ بس تب سے میں خدائے بزرگ و برتر سے معافی مانگ رہا ہوں۔

علی رضا......میاں چنوں

ہاں میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔'' فرحانہ نے کہا۔
''میں اسکوٹر پر تمہیں لینے آرہا ہوں پھر تمہیں پہلے جمن شاہ کا سوپ پلاؤں گا پھر ایک سرپرائز دوں گا۔'' میں نے کہا۔
''سرپرائز کیا کمیٹی مل گئی ہے۔'' فرحانہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔
''اس سے بڑی خوشخبری ہے۔''
''ایسی کیا خوشخبری ہے بھئی۔'' فرحانہ نے پوچھا۔
''بس یہ خوشخبری تمہیں سوپ پینے کے بعد ہی ملے گی۔'' میں نے کہا۔
''ٹھیک ہے تمہارا سوپ پی لیتے ہیں۔ موسم بھی ایسا ہے سوپ پی لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔
''میں نے اپنے دوست کامران سے موٹر سائیکل لی اور فرحانہ کے بیوٹی پارلر چلا گیا۔ میرے مس کال دینے پر وہ باہر چلی آئی' میں اسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر جمن شاہ کے سوپ کارنر پر لے گیا۔ سوپ کارنر پر لوگ خاصی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ ہم بھی فیملی روم میں جا کر بیٹھ گئے۔ سوپ آنے پر میں نے فرحانہ کے سوپ کی پیالی میں چالاکی سے خواب آور گولی ڈال دی۔ اسے ذرا بھی خبر نہ ہوئی کہ میں نے کیا کر دیا ہے۔ سوپ پی کر ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ جب اس خالی پلاٹ کے زیر تعمیر پلاٹ پر گاڑی لے کر گیا فرحانہ چونکی۔
''شکیل یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟''
''میں نے تم سے سرپرائز دینے کی بات کی تھی۔''
''ہاں کی تھی۔''
''بس وہی سرپرائز دینے کو یہاں لایا ہوں۔ فرحانہ میں نے بڑی محنت ومشقت سے ایک فلیٹ بک کرایا تھا۔ اس فلیٹ کا تقریباً 80 فیصد کام ہو چکا ہے وہی دکھانے لایا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''اچھا تم نے فلیٹ خرید لیا ہے اور مجھے بتایا بھی نہیں۔''
''یہاں تمہیں لانے کا کیا مقصد ہے۔''
''تمہیں دن میں لانا چاہیے تھا اس وقت رات میں کیا نظر آئے گا۔'' فرحانہ نے کہا۔
''دن میں بھی آ جائیں گے مگر دن میں یہاں مزدور لوگ کام کرتے رہتے ہیں اس لیے اچھا نہیں لگتا گھر کے لوگوں کو یہاں لایا جائے۔'' میں نے بات بنائی۔
''مجھے نا جانے کیوں نیند آرہی ہے۔ آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ دل چاہ رہا ہے یہاں ہی سو جاؤں۔'' فرحانہ نے کہا۔
''ایسا غضب مت کرنا ورنہ پھوپھی جان پوری رات پریشان رہیں گی۔'' میں نے کہا۔
''گھر چلو میں گھر جانا چاہتی ہوں۔'' فرحانہ کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔
خواب آور گولیوں نے کام دکھا دیا تھا۔
''اب یہاں تک آ گئے ہیں تو ایک نظر فلیٹ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔'' میں نے کہا۔
''میں زیادہ دیر تک نہیں رکوں گی۔'' فرحانہ نے کہا۔
''ہمارا یہاں زیادہ دیر رکنے کا کام بھی نہیں ہے۔'' میں فرحانہ کو آگے لے کر بڑھا۔
پلازہ کا چوکیدار غائب ہو چکا تھا' اس کی واپسی دو گھنٹے سے پہلے نہیں ہونی تھی۔ اسے غائب رہنے کی قیمت میں دن میں ہی دے گیا تھا۔ اور طے یہی پایا تھا کہ میں جیسے ہی موٹر سائیکل لے کر پلاٹ پر آؤں گا وہ وہاں سے دو گھنٹے کہیں اور گزارنے چلا جائے گا۔
فرحانہ لڑکھڑاتے قدموں سے چل رہی تھی۔
''سمجھ میں نہیں آرہا کہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ مجھے نیند کیوں آرہی ہے۔''
''کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔''
''ایسا کرتے ہیں گھر چلو' میں پھر کبھی تمہارا یہ فلیٹ دیکھ لوں گی۔'' فرحانہ نے کہا۔
''فرحانہ کیسی بات کر رہی ہو میں کتنے خلوص ومحبت کیساتھ تمہیں اپنا فلیٹ دکھانے لایا ہوں اور تم ہو کہ ایسی بے رخی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔'' میں نے مصنوعی غصہ دکھایا۔
''شکیل میں سچ کہہ رہی ہوں میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ میں یہیں گر جاؤں اور تمہیں مجھے گھر لے جانے کو کسی اور کو بلانا پڑ جائے۔'' فرحانہ نے کہا۔
ہم باتیں کرتے ہوئے ایک خالی فلیٹ کے اندر تک

پہنچ چکے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے فرحانہ چکرا کر گری میں اسے اگر تھام نہ لیتا تو وہ گر پڑتی۔ خواب آور گولی کام دکھا چکی تھیں فرحانہ مکمل طور پر بے ہوش ہوچکی تھی۔ وہ اب میرے رحم و کرم پر تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اس دن مجھے اس نے کتنا ذلیل کیا تھا۔ مجھے میری ہی نظروں میں گرادیا تھا۔ یہ شکر ہوا کہ میری بے عزتی بیوٹی پارلر کی حد تک رہی اگر وہ کسی سے اس بات کا ذکر گھر پر کردیتی تو میری کتنی بدنامی خاندان میں ہوجاتی' اس کا تصور بھی ممکن نہ تھا' میں نے اپنی بے عزتی کا بھرپور طریقے سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ابھی تک میں اپنے منصوبے پر کامیاب رہا تھا' میں اس وقت بالکل وحشی بن گیا تھا' میں رشتوں ناتوں کو بالکل فراموش کرچکا تھا۔ میں فرحانہ کو اس وقت تک نوچتا رہا تھا جب تک میرا من اس کام سے بھر نہ گیا تھا' جب ہوش آیا تو میری عقل کام کرنے لگی تھی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ میں نے جذبات کی شدت میں آکر بہت غلط کام کردیا' اس دن میری عزت رہ گئی تھی لیکن آج میں نے ایسا کام کردیا تھا کہ فرحانہ کی زبان اب خاموش نہیں رہے گی اور وہ سب کو چیخ چیخ کر بتائے گی کہ میں نے رشتوں کے تقدس کو پامال کردیا ہے۔ میرا ذہن ایک عجیب کیفیت کا شکار ہوگیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں' میں جو چاہ رہا تھا وہ کرچکا تھا لیکن اس کا انجام کس قدر بھیانک ہوگا وہ میں نے نہیں سوچا تھا' اب عقل کام کررہی تھی' لیکن وقت گزر چکا تھا۔ سوائے پچھتاوے کے کچھ حاصل نہ تھا اور پھر اچانک میرے ذہن میں خیال آیا تھا وہ سوچ کر میں کانپ کررہ گیا' میں نے زندگی میں یہ نہ سوچا تھا کہ کسی انسان کی جان لوں گا' اب مجھے اپنی زندگی بچانے کو کسی اور کی نہیں اپنی پھوپھی زاد کی جان لینا تھی ورنہ میری عزت خاک میں مل جاتی اور میں نے ایک لمحہ کو کچھ سوچا اور میری یہی سمجھ میں آیا کہ جو کرنا ہے کرگزرو ورنہ پھر ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔ میرے پاس کچھ ایسا نہ تھا کہ جس سے اپنے منصوبے پر عمل کروں۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ ایسا بھی کرنا پڑے گا' اب یہی سمجھ میں آرہا تھا کہ فرحانہ کی موت ہی میری زندگی تھی۔ اچانک میری نظر اس کے دوپٹے پر پڑی' فوراً ہی میرے ذہن میں آیا کہ اس وقت یہ دوپٹہ ہی بہت اچھا رہے گا۔ میں نے اس کے گلے میں دوپٹہ ڈال کر فرحانہ کا کام تمام کردیا۔ میں اپنے کام سے مطمئن تھا اس لیے میں تیزی سے اس جگہ کو چھوڑ چکا تھا۔ چوکیدار مجھے جانتا نہیں تھا اس لیے پکڑے جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

میں نے ہر طرح سے اپنے کام کا جائزہ لے لیا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے پکڑا جاؤں۔ میں پھر بھی خوف زدہ تھا۔ میں نے زندگی میں قتل کرنے جیسا اقدام پہلی بار کیا تھا اس لیے خوف زدہ ہونا فطری بات تھی۔ میں کمرے میں جاکر لیٹ گیا مجھے ابھی بستر پر لیٹے ہوئے ایک گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ فرحانہ کی تلاش شروع ہوچکی تھی۔ مجھ سے بھی پوچھا گیا مگر میں نے فرحانہ سے ملاقات ہونے سے انکار کردیا تھا۔ تھانے میں فرحانہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی گئی تھی۔ میرے حق میں یہ بھی اچھا ہوا کہ فرحانہ نے بیوٹی پارلر میں میرے ساتھ جانے کا نہیں بتایا تھا' ورنہ میں پھنس جاتا۔

دوسرے روز پھوپھا جان کو تھانے سے فون آگیا کہ پولیس کو ایک لاش ملی ہے وہ آکر شناخت کرلیں کہ کہیں وہ فرحانہ کی لاش تو نہیں ہے۔ پھوپھا جان نے لاش دیکھ کر فرحانہ کو شناخت کرلیا' پولیس نے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش ان کے حوالے کردی۔

تدفین کے دن رونے دھونے کا زیادہ ڈرامہ میں نے رچایا تھا۔ ایسا میں نے اس لیے کیا کہ مجھ پر کسی قسم کا شک نہ کیا جائے اور لوگ یہی سمجھیں کہ میں فرحانہ کے ساتھ زیادہ گھومتا رہتا تھا' اس لیے مجھے زیادہ دکھ ہے۔

میرا یہ محض خیال تھا کہ اتنی بڑی واردات کرکے بچ جاؤں گا' ایسا ہرگز نہیں تھا۔ قاتل کتنا ہی چالاکی کا مظاہرہ کرے بالآخر وہ پکڑا جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ پولیس میرے رونے دھونے کے رچائے ڈھونگ کو نوٹ کررہی تھی۔ اس نے دوسرے دن مجھے تفتیش کی غرض سے بلالیا۔ وقوعہ والے روز مقتولہ فرحانہ اور میرے موبائل فون کی لوکیشن ایک ہی تھی۔ اس بنا پر مجھے حراست میں لے لیا۔ پولیس کے سامنے میرے پاس اس کے علاوہ

کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں یہ اقرار کرلوں کہ میں فرحانہ کو پسند کرتا تھا اور اس کے ساتھ دست درازی کرنے پر اس نے مجھے خوب ذلیل کیا تھا اور اس کا انتقام لینے اور پیسے کے بار بار تقاضے سے بچنے کی خاطر یہ اقدام اٹھایا اور اس سے زیادتی کے بعد گلا گھونٹ کر قتل کردیا اور لاش کو وہیں چھوڑ دیا تاکہ میں اس کے قتل کے الزام میں پکڑا نہ جاؤں۔

☆......☆......☆

آج سردی کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا جس سے کورٹ میں آئے ہوئے لوگ سردی سے بے حال ہو رہے تھے میں آج صبح جلدی ہی کورٹ آ گیا تھا۔ پیشی پر بے شمار قیدی آئے ہوئے تھے مگر ابھی تک خبر مجھے ایک بھی نہیں ملی تھی۔ ایسا اکثر ہمارے ساتھ ہوتا ہے جب جلدی کورٹ آ جائیں تو کورٹ میں خبریں نہیں ہوتیں اور کبھی کوئی ایسی زبردست خبر مل جاتی ہے کہ دل خوش ہو جاتا ہے کہ جلدی آنے کا فائدہ ہوگیا اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم بے دلی سے کورٹ آتے ہیں مگر ہمارے لیے ڈھیروں خبریں ہوتی ہیں۔ پیاس کا احساس ہونے پر میں ابھی کینٹین میں جا کر پانی پینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے پیچھے کسی کے آنے کا احساس ہوا۔ پلٹ کر دیکھنے پر مجھے استاد پیارے نظر آئے۔

''خلیل جبار ایسی شدید سردی میں مت گھوما کرو ورنہ بیمار پڑ جاؤ گے۔''

''سردی ضرور ہے مگر مجبوری ہے خبریں بھی لینا ضروری ہیں ورنہ شام کو آفس میں کیا جواب دیں گے۔''

''کہہ دینا آج سردی تھی اس لیے سردی سے خبریں سکڑ گئی ہیں۔ اس لیے آج کوئی خبر نہیں ہے☆''

''سردیاں ابھی چلیں گی روز یہ بہانہ نہیں چلے گا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔'' استاد پیارے مسکرائے۔

''آج کیا خبریں ہیں؟''

''خبریں...... آج ابھی تک ایک بھی خبر نہیں ملی ہے۔'' میں نے استاد پیارے کو اپنی خالی ڈائری دکھا دی۔

استاد پیارے کو شک ہی رہتا ہے کہ میں اس سے خبریں چھپا لیتا ہوں، اسی لیے میں اسے اپنی ڈائری دکھا دیتا ہوں کہ وہ شک میں نہ پڑے۔

''کمال ہے اتنے قیدی پیشی پر آئے ہوئے ہیں اور خبر ایک بھی نہیں بنی ہے۔'' استاد پیارے سوچ میں پڑ گئے۔

''اتنا پریشان نہ ہوں تمہیں پتا ہی ہے کہ لازمی نہیں ہوتا کہ ہر قیدی کو عدالت فیصلہ سنا دے۔''

''ہاں مقدمات عدالتوں میں سالوں چلتے رہتے ہیں، جب کہیں جا کر کسی مقدمے کا فیصلہ آتا ہے۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''میں کینٹین سے پانی پی آؤں پھر سول کورٹ کا چکر لگاتے ہیں۔ شاید کوئی اچھی خبر مل جائے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے تم پانی پی آؤ۔'' استاد پیارے نے کہا۔

پانی پی کر میں تیزی سے کینٹین سے باہر نکل آیا، ہم دونوں کا رخ سول کورٹ کی طرف تھا۔

''یہ صحافی بھائی کہاں جا رہے ہیں۔'' سرکاری وکیل عابد نے ہمیں دیکھ کر کہا۔

''خبر کی تلاش میں ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ارے بابا کبھی ہم غریبوں کے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔'' سرکاری وکیل عابد نے کہا۔

''آپ حکم کریں۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''حکم نہیں میں صحافی بھائیوں سے عرض کرسکتا ہوں۔ ایمان سے آپ لوگ بہت محنت کرتے ہو چاہے سردی ہو یا سخت گرمی ہو ایک کورٹ سے دوسری کورٹ میں خبروں کے لیے جاتے ہو۔'' سرکاری وکیل عابد نے کہا۔

''چنا چور گرم......'' ایک چنے والا کمرے میں داخل ہوا۔

اس چنے والے کو میں روز مختلف عدالتوں کے دفاتر اور احاطے میں چنے بیچتا ہوا دیکھتا تھا۔ وہ ہم دونوں کی پروا کیے بغیر ہلکی آواز میں گانا گانے لگا تھا۔

''ارے بابا تم اس چنے والے کے لیے کچھ کرو۔'' سرکاری وکیل نے کہا۔

''اس کے لیے کیا کریں۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ چنے والا بہت اچھا گلوکار ہے۔ ان دنوں بہت ٹی وی چینل آ گئے ہیں کسی ٹی وی چینل پر اسے چانس دلا دو

تا کہ اس کی چنے بیچنے سے جان چھوٹ جائے۔''
''ہم کوشش کریں گے۔'' میں نے کہا۔
''کوشش نہیں اسے چینل پر لگوا دو۔'' سرکاری وکیل عابد نے کہا۔
''لگتا ہے تم اس سے بے زار آ گئے ہو۔'' استاد پیارے نے کہا۔
''مجھے اس پر ترس آتا ہے اتنا اچھا گلوکار ہے اور چنے بیچ رہا ہے۔ یہ مجھے روزانہ آ کر گانے سناتا ہے' جب تک میں اس سے دس' بیس روپے کے چنے نہ لے لوں فلمی گانا سناتا رہتا ہے۔''
''ہم بھرپور کوشش کریں گے کہ اسے چینل پر چانس مل جائے تا کہ تمہارا جو روزانہ دس' بیس روپے کا نقصان چنے لے کر ہو رہا ہے وہ نہ ہو۔'' استاد پیارے نے چہکتے ہوئے کہا۔
''بابا چنے والے میں نے تمہارا کام کر دیا ہے یہ صحافی بھائی تمہیں ضرور ٹی وی چینل پر چانس دلا دیں گے۔'' سرکاری وکیل عابد نے کہا۔
چنے والے نے ہم دونوں کو ایسے حیرت سے دیکھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔
''تمہارے لیے اچھی خبر ہے' ایک نوجوان نائی نے جو اپنی کزن کو قتل کیا تھا اسے پولیس گرفتار کر کے ریمانڈ حاصل کرنے کورٹ لے کر آئی ہے میں تمہاری پولیس اور ملزم سے بات کراتا ہوں۔'' سرکاری وکیل عابد نے کہا۔
پولیس کے ملزم کے ریمانڈ پر سرکاری وکیل نے ہماری اس قاتل نوجوان سے ملاقات کرا دی۔ اس نوجوان کی زیادہ عمر نہ تھی' اسے دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ یہ قتل بھی کر سکتا ہے۔
''شکیل ہمیں تمہارے مقدمے کے متعلق مکمل معلومات ہے ہم صرف اس معلومات کے حوالے سے تصدیق کرنا چاہ رہے ہیں۔ اسی لیے جو پوچھ رہے ہیں اس کا ٹھیک سے جواب دے دو۔'' میں نے کہا۔
''تم نے اپنی کزن کا قتل کیوں کیا؟'' استاد پیارے نے پوچھا۔
''میں نے اپنی کزن فرحانہ سے قرض لیا ہوا تھا اور وہ مجھے پیسوں کا تقاضہ کر کے بار بار تنگ کر رہی تھی' اس لیے میں نے قتل کیا۔''
''تم کزن کو قتل کرنے کی بجائے پیسے بھی دے سکتے تھے پھر ایسا گھناؤنا جرم کیوں کیا؟'' میں نے پوچھا۔
''میں ایک نشئی ہوں' میرے پاس نشہ کرنے کو پیسے نہیں ہوتے پھر میں کس طرح فرحانہ کو پیسے دیتا۔'' شکیل نے کہا۔
''تمہیں قتل کرتے ہوئے ذرا بھی خدا کا خوف نہیں آیا۔'' استاد پیارے نے کہا۔
''میں انتقام کی آگ میں اتنا اندھا ہو گیا تھا کہ میری عقل کام نہیں کر رہی تھی' میں فرحانہ سے دست درازی کرنے کی کوشش کی تھی جس پر اس نے خوب مجھے ذلیل کیا تھا اور ساتھ میں وہ پیسوں کا تقاضہ بھی کر رہی تھی اس لیے میں نے انتقام لینے کا پروگرام بناتے ہوئے اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کر دیا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔'' شکیل نے کہا۔
''تمہارے پاس بتانے کو بچا ہی کیا ہے جو ہمیں بتاؤ گے' تم ایک سفاک قاتل ہو تم میں ذرا بھی شرم و غیرت ہوتی تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرتے۔'' استاد پیارے نے غصے سے کہا۔
میں حیرت سے استاد پیارے کو دیکھتا رہ گیا' اس وقت وہ بالکل تھانیدار لگ رہے تھے۔
ہمارے پاس ملزم کی خبر مکمل ہو چکی تھی اس لیے ہم نے نوٹ بک بند کر دی۔

سرفروش

تفسیر عباس بابر

حصہ اول

کالی بھیڑوں اور خونی بھیڑیوں کا ایکا ہو جائے تو امن مفقود ہو جاتا ہے۔ فرقہ واریت اور گروہ بندی عام ہو جاتی ہے، گھر کے چراغ ہی غداری پر تل جائیں تو سب کچھ جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔ تفسیر عباس بابر کا یہ ناول ''سرفروش'' ایسے ہی حالات پر مبنی ہے، وطن عزیز میں اسلام اور امن کے دشمنوں کی ریشہ دوانیاں، مکروہ و قبیح سازشیں، آئے دن بم بلاسٹ، خودکش حملے، ہر شہری احساس عدم تحفظ کا شکار ہے۔ ایسے غیر یقینی حالات میں بے یقینی اور خوف کا احساس فزوں تر ہونا جزو لازم ہے۔ مسجدیں، امام بارگاہیں، علمی مراکز، دشمن کی نظر کی زد میں ہیں۔ حتیٰ کہ اب دینی مدارس بھی محفوظ نہیں رہے۔ ایک خوف ہے جو اذہان و قلوب کے نہاں خانوں میں رچ بس گیا ہے۔ ہمارے دینی مراکز کو بدنام اور سادہ لوح عوام کو گمراہ و خوفزدہ کرنے میں غیر ملکی طاقتیں کس حد تک ملوث ہیں۔ زیر نظر ناول کا بنیادی خیال یہی ہے۔ ذہن منتشر اور دل خوفزدہ ہیں۔ آئے دن کوئی ایسا سانحہ گزر جاتا ہے کہ روح تک لرز جاتی ہے۔ حادثہ ایک دم نہیں ہوتا اس کے محرکات و وجوہات ہوتی ہیں، کئی دن اس کی پرورش ہوتی ہے، مقام فکر یہ ہے کہ ان حادثات کی پرورش میں ہمارے اپنے بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ موجودہ ملکی حالات کے تناظر میں یہ ناول بطور خاص پیش کیا جا رہا ہے۔ مختصر کہانیوں کے بعد نئے افق میں مصنف کا یہ پہلا طویل ناول ہے، اس سے پہلے ان کا ایک ناول ''سنگریزے'' کتابی شکل میں چھپ چکا ہے، کوئی بھی قلمکار ہو وہ قلم کی دھار سے دشمن کا سر قلم کر سکتا ہے۔ یہ ہر لکھنے والے پر فرض ہے کہ مٹی سے وفا کے تقاضوں کو ملحوظ نگاہ رکھے۔

شہر کے پوش ایریا میں یہ عظیم الشان دومنزلہ عمارت مظہر زمان کی امارت اور شان وشوکت کی مظہر تھی۔ جدید ترین اور خوب صورت نقشہ ڈنمارک سے اس کے ایک آرکیٹکٹ دوست نے ای میل کیا تھا۔ دورانِ تعمیر ہر پہلو کو مدنظر رکھا گیا۔ متعدد کمرے کوریڈور، بیسمنٹ اور عقبی دروازہ، کوریڈور کے سامنے ایک مختصر سا خوبصورت پارک بھی تھا۔ جس میں امریکن گھاس کی سبز چادر بچھی ہوئی تھی۔ بلند و بالا دیوار کے ساتھ مختلف انواع و اقسام کے پودے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کررہے تھے۔

مرکزی گیٹ پر دو مستعد گارڈز جدید اسلحے سے لیس ہمہ وقت تعینات رہتے تھے۔ گیٹ سے ملحق چھوٹے سے کمرے میں ہی ان کے رہنے اور سونے کا انتظام تھا۔ گیٹ کے سامنے گیراج میں دو نیو ماڈل گاڑیاں تھیں۔ بلیک کلر پراڈو اس کے اپنے استعمال میں تھی جبکہ کریم کلر ہنڈا سوک اس کی بیوی سونیا اور بیٹی فوزیہ کیلئے مختص تھی۔

مظہر زمان فائیو اسٹار ہوٹلز کی چین کا مالک تھا۔ ہر بڑے شہر میں اس کے ہوٹل تھے۔ اس کے علاوہ وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس بھی کرتا تھا۔ وہ پینتالیس سال کا ایک خوبرو دراز قامت اور قدرے سخت مزاج آدمی تھا۔ وہ زیادہ تر تھری پیس سوٹ ہی پہنتا تھا۔ کلین شیو اور سیاہ چشمہ اس کی شخصیت کو ممتاز کرتا۔ اس کی بیوی سونیا زمان اس سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ وہ کالج فیلو تھے وہیں دوستی ہوئی اور پھر پسندیدگی کے بعد شادی بھی ہوگئی۔ وہ ایک متوسط گھرانے سے تھی۔ اس کے والد ٹیچر تھے۔

ماں کچھ عرصہ پہلے ملکِ عدم کیلئے رختِ سفر باندھ چکی تھیں۔ ایک بھائی ارسلان تھا جو کہ کالج میں پڑھ رہا تھا اور ہوسٹل میں ہی رہ رہا تھا۔ اس کے تمام اخراجات سونیا برداشت کررہی تھی۔ وہ ایک خوبصورت اور بھرپور عورت تھی۔ شادی کے بعد وہ قدرے فربہ ہوگئی تھی۔ ایک بیٹی فوزیہ کے بعد کوئی اولاد نہ ہوسکی۔ انہوں نے اللہ کی اسی ایک رحمت پر شکر ادا کیا۔ وہ خود تو روز کسی نہ کسی پارٹی میں شامل ہوتی تھی، لیکن اپنی بیٹی کو اس نے کبھی ساتھ لے جانے کی کوشش یا اصرار نہیں کیا۔ وہ ایک مصروف ترین سماجی شخصیت تھی اور، فلاحِ انسانیت، نامی کسی تنظیم سے وابستہ تھی۔

مظہر زمان کے والد زمان خان کبھی سیاست کا اہم ستون تھے۔ وہ وزیر اعلیٰ کے مشیر بھی تھے اور ایم این اے کے عہدے پر فائز بھی تھے لیکن ایک دن یہ ستون حرکتِ قلب بند ہونے کے باعث زمین بوس ہوگیا۔ زمان خان کی موت کے بعد مظہر زمان کا دور پار کے رشتہ داروں کے علاوہ کوئی قریبی عزیز نہیں تھا۔ وہ بھی والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کی والدہ بچپن میں ہی چل بسی تھیں۔

اس نے سیاست کی بجائے ذاتی کاروبار کو ترجیح دی اور ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔ جس میں اس کے مرحوم والد کی بے اندازہ دولت نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ دونوں میاں بیوی گھر میں شاذونادر ہی دستیاب ہوتے تھے۔ البتہ نوکروں کی بھرمار تھی۔ اس وقت بھی وہ دونوں گھر میں موجود نہیں تھے۔

جواں سال فوزیہ اپنے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز ٹی وی پر کوئی فیشن شو دیکھ رہی تھی۔ وہ انیس کا ہندسہ عبور کرچکی تھی۔ دبلی پتلی دراز قامت باریک نقوش اور سرخ وسفید رنگت کی حامل وہ بلاشبہ ایک حسین ترین لڑکی تھی۔ وہ انگلینڈ سے اعلیٰ تعلیم کے بعد حال ہی میں لوٹی تھی اور فی الوقت اسے کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ قیصر سالہا سال سے اپنے ماں باپ کے ساتھ اسی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں رہ رہا تھا۔ اس کا باپ قادر حسین زمان خان کا ڈرائیور تھا۔ اس کی موت کے بعد مظہر زمان نے اسے مستقل اپنے ساتھ رکھ لیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر اور سیدھا سادہ سا ایمان دار آدمی تھا۔ اس کی بیوی ہاجرہ نے گزشتہ سال داعیٔ اجل کو لبیک کہا تھا۔ وہ ہیپاٹائیٹس سی کی مریضہ تھی۔ کافی سے زیادہ علاج کے بعد بھی موت ہی اس کا مقدر ٹھہری۔ قیصر کے ذمے کوٹھی کے چھوٹے موٹے کام تھے۔ سودا سلف بجلی اور ٹیلی فون کے بلز اور مہمانوں کی خاطر داری۔

وہ ایک خوبرو دراز قد اور صحت مند جسم کا حامل شریف اور سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ یہیں اس نے میٹرک تک بمشکل پڑھا۔ اس کا زیادہ تر رجحان نماز اور دینی کتب کے

مطالعہ کی طرف تھا۔بیش تر وقت وہ اپنے کوارٹر میں ہی گزارتا تھا۔یہ سردیوں کی ایک خوشگوار دوپہر تھی۔جب اس کے کوارٹر کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔وہ اکلوتی چارپائی سے فوراً اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ایک لمحے کیلئے وہ حیران سا رہ گیا۔اس کے سامنے فوزیہ کھڑی تھی۔وہ ریڈ شرٹ اور بلیک جینز میں تھی۔گھنے سنہرے بال اس کے شانوں پر جھول رہے تھے جن سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔وہ شاید ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔اس کے چہرے پر سنجیدگی اور قدرے سرد مہری تھی۔

''یہ سب کہاں مر گئے ہیں؟ اور تم بھی یہاں چھپے بیٹھے ہو۔'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔

''بی بی جی کوئی کام ہے؟'' وہ بدستور نگاہیں جھکائے آہستگی سے بولا۔

''تو اور کیا میں تمہیں دیکھنے آئی ہوں؟ میرے کمرے میں آؤ''

اس نے تیز لہجے میں کہا اور جلدی سے واپس پلٹ گئی۔

وہ دروازہ بند کر کے کچھ دیر بعد اس کے پیچھے جا رہا تھا۔

فوزیہ مزاج کی سخت مگر دل کی بہت اچھی تھی۔انگلینڈ کے ماحول نے بھی اس کے مزاج پر اثر نہیں کیا تھا۔اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ خود اسے بلانے آئی ہو۔وہ یہی سوچتا ہوا اس کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ہلکی سی دستک کے بعد آواز آئی۔

''اندر آ جاؤ''

وہ جھجکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

''گھر میں کوئی نوکر نہیں ہے''

وہ اپنے ٹچ سکرین سیل فون کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے بولی۔

''پتہ نہیں کہاں چلے جاتے ہیں۔یہ رمضو اور رانی تو موقع ڈھونڈتے ہیں۔آج ان کی تو کلاس لیتی ہوں''

وہ نگاہیں جھکائے اس کے سامنے کھڑا تھا۔وہ بیڈ پر نیم دراز اسے دیکھ رہی تھی۔

کمرہ جدید انداز میں ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔سنگل بیڈ کے ساتھ جدید ڈیزائن کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ان کے سامنے ٹیبل پر ٹوکری میں سیب اور انگور نظر آ رہے تھے۔ایک چھوٹی سی چھری بھی پڑی ہوئی تھی۔فرش پر بیش قیمت کارپٹ بچھا ہوا تھا۔کھڑکی اور دروازے کے آگے براؤن کلر کے خوبصورت پردے جھول رہے تھے۔کمرے میں ایک مخصوص سی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔سامنے دیوار پر بتیس انچ کی ایل ای ڈی آویزاں تھی۔جس پر ایک فیشن شو چل رہا تھا۔نیم عریاں لڑکیاں مختصر ڈریس میں گویا جسم کی نمائش کر رہی تھیں۔اس نے ایک لمحے کے لیے سکرین کی طرف دیکھا اور سٹپٹا کر نظریں جھکا لیں۔

''جی بی بی جی کیا کام تھا؟''

اس نے آہستگی سے پوچھا۔

''ہاں یہ ریموٹ کام نہیں کر رہا شاید سیل ختم ہو گئے ہیں۔چینل تبدیل نہیں ہو رہا، ذرا دیکھنا''

وہ ریموٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''و......و......وہ جی مجھے ان چیزوں کا پتہ نہیں ہے میں بازار سے نئے سیل لے آتا ہوں''

اس نے اچانک مڑتے ہوئے کہا۔

پرانی سی جینز اور شرٹ میں بھی وہ پرکشش لگ رہا تھا۔اسے حیرت ہو رہی تھی بی بی جی یہ کام اسے وہاں بھی کہہ سکتی تھیں۔کمرے میں بلانے کی کیا ضرورت تھی۔وہ سیدھا سادہ اور شریف طبع ضرور تھا لیکن کند ذہن نہیں تھا۔اس کی چھٹی حس اسے کسی خطرے کا سگنل دے رہی تھی۔

''رک جاؤ''

اس کی تحکم آمیز آواز سنائی دی۔

وہ بیڈ سے اٹھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ نگاہیں جھکائے اس کے عین سامنے کھڑا تھا۔

''کچھ پڑھ لکھ بھی لیتے ہو یا نرے الو ہی ہو؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں استفسار کیا۔

''جی دس جماعتیں پڑھی ہیں میں نے۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''اچھا کرسی پر بیٹھو تم سے بات کرنی ہے''

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

وہ تھوڑے سے تذبذب کے بعد اس کے سامنے بیٹھ

گیا۔
''تم تو یوں شرما رہے ہو جیسے میں تم پر عاشق ہو رہی ہوں۔''
اس نے استہزائیہ انداز میں اسے چھیڑا۔
''ب بی بی جی پلیز ایسی بات نہ کریں آپ مالکن ہیں۔''
''اچھا تو کیا لوگ مالکوں سے پیار نہیں کرتے؟''
وہ اس کی ٹانگ کھینچ رہی تھی۔
''مالکوں کی عزت کی جاتی ہے جی۔''
اس نے مقدور بھر جواب دیا۔
''اللہ کون ہے؟'' اس نے اچانک ایک عجیب سوال کر دیا۔
''اللہ۔۔۔اللہ ہے جی سب کا مالک'' وہ آہستگی سے بولا۔
''اللہ سب کا مالک ہے اور سب اس سے پیار کرتے ہیں''
وہ گویا دلیل پیش کر رہی تھی۔
''یعنی مالک سے پیار کرنا چاہیے اس کی ہر بات کو حکم سمجھنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔''
''جی میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور آپ کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں، کیونکہ آپ مالکن ہیں لیکن یہاں اللہ کی مثال دینا مناسب نہیں آپ حکم کریں کیا کام ہے؟''
ایک دم وہ سنجیدہ ہوگئی۔ وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
''اللہ کی مثال اس لیے دی ہے کہ یہ بھی اللہ کا معاملہ ہے۔'' وہ اپنے سیل فون کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔
''اور ہم اللہ کے بندے ہیں ہمیں اس سے محبت ہے اور جس سے محبت ہو اس کے قرب کی خواہش کی جاتی ہے اس سے ملنے کی کوشش کی جاتی ہے۔''
''جی پر ہم اللہ سے کیسے مل سکتے ہیں۔ میں نماز پڑھتا ہوں روزے کا پابند ہوں۔ غیر عورت کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا، لیکن اللہ سے ملنا تو۔۔۔''
''یہی تو تمہاری ادائیں اللہ کو پسند ہیں اس لیے تمہیں ایک نیک مقصد کیلئے چنا گیا ہے۔''

وہ اسے وزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئی کہہ رہی تھی۔ ''اس سے تم اللہ سے مل بھی سکتے ہو اس کا قرب بھی حاصل کر سکتے ہو اور جنت میں بھی جا سکتے ہو۔''
غیر ارادی طور پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔
''یہ کیسے ہو سکتا ہے اور آپ کو ان باتوں کا کیسے پتہ بی بی جی۔'' وہ تحیر آمیز لہجے میں بولا۔
''یہ باتیں تم آہستہ آہستہ سمجھ جاؤ گے''
وہ ٹیبل پر پڑا ہوا اپنا سیل فون اٹھاتے ہوئے بولی۔
''اللہ بھی اپنے بندے کا قرب چاہتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندے سے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے، لیکن اس کیلئے بندے کو قربانی دینا پڑتی ہے''
''بی بی جی قربانی تو امیر لوگ دیتے ہیں عیدالاضحیٰ پر، ہم غریب لوگ کیا قربانی دیں گے'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔
اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، اور بولی۔
''یہ قربانی تو وہ دیتا ہے جو استطاعت رکھتا ہے، لیکن جو قربانی اللہ اپنے خاص بندوں سے مانگتا ہے وہ اور قربانی ہے اور پھر اللہ اس بندے سے ملتا ہے اسے جیتے جی جنت دکھاتا ہے۔''
''اچھا بی بی جی میں وہ قربانی دوں تو کیا اللہ مجھے ملے گا؟''
اس کی آنکھیں پھیل رہی تھیں۔
''ہاں ناں۔'' وہ اسے قائل کر رہی تھی۔
''تم تیار ہو جاؤ میں تمہیں کسی سے ملواتی ہوں۔ باقی باتیں تمہیں وہ بتائیں گے۔ سادہ کپڑے پہن لو۔ کوئی شلوار قمیض اور میں تب تک نماز پڑھ لیتی ہوں۔''
''بی بی جی میں بھی پڑھ لیتا ہوں۔''
اس دوران ظہر کی اذان ادا ہو چکی تھی، وہ اک نیا جوش ولولہ اور تن میں سرشاری محسوس کر رہا تھا۔ اللہ کا قرب حاصل ہونے والا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کی قربانی کے لیے خود کو تیار محسوس کر رہا تھا۔ وہ نماز کے دوران بھی یہی سوچتا رہا۔
''اللہ معاف کرے خواہ مخواہ وہ بی بی کو غلط سمجھا وہ تو بہت نیک اور اچھی ہیں۔''

وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز تھی۔اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنے سیل فون سے ایک نمبر ڈائل کیا۔کال فوراً ریسیو کرلی گئی تھی۔

''السلام علیکم جناب میری گاڑی گھر پر نہیں ہے اپنی گاڑی بھیج دیں۔اللہ کے قرب کا ایک اور خواہش مند تیار ہے''

دوسری طرف سے کوئی بات سن کر وہ زیر لب مسکرائی اور کال منقطع کردی۔

اب اسے گاڑی کا انتظار تھا۔قیصرا پنے کوارٹر میں ایک ایمان افروز کیفیت کے ساتھ تیار ہورہا تھا۔

☆......☆......☆

ارشین دسویں کلاس میں دوسری دفعہ فیل ہوئی تو اس کی ماں نے اس کے خوب لتے لیے۔

''تم سے یہی امید تھی نالائق'' وہ سیخ پا ہوتے ہوئے بولی۔

''باپ سارادن محنت مزدوری کرتا ہے اور یہ نواب زادی دن رات فیس بک اور موبائل پر لگی رہتی ہے، ہونہہ۔۔۔کیا زمانہ آگیا ہے۔ایسی اولاد سے بندہ ایویں ای بھلا۔''

''اچھا اچھا ابا آجائے تو اسے سب کچھ بتادینا۔'' وہ تند لہجے میں بولی۔''سیل فون ہوتا کس لیے ہے؟ تو بھی تو دن میں تین تین گھنٹے کاشف سے بات کرتی ہے۔''

''نانہجار بدتمیز۔۔۔وہ میرا بیٹا ہے کوئی غیر تھوڑی ہے اور اب تو اس سے بات کرنے ہی کب دیتی ہے۔بے چارہ کب سے پردیس میں دھکے کھارہا ہے۔پر تو بتا تو سارادن کس سے بات کرتی ہے؟تمہارے فیل ہونے کی وجہ بھی یہی منحوس موبائل ہے۔''

''اماں تو تو پر کا کوا بنا کر اسے اڑا بھی دیتی ہے،اور میں اب مزید پڑھائی نہیں کروں گی۔میرا دماغ ہی نہیں کام کررہا'' وہ اب بھی سیل فون پر ٹائپنگ کررہی تھی۔

''اچھا ناں پڑھ،آج تیرا ابا آتا ہے تو کرتی ہوں بات تیری شادی کی،کب سے آپا رفیعہ رشتہ مانگ رہی ہے۔'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''واہ، تو تو ارشد سے میری شادی کرے گی۔'' وہ کٹیلے لہجے میں بولی۔''ہونہہ۔۔۔وہ نکما آوارہ۔۔شکل دیکھی ہے مجھے تو یرقان کا مریض لگتا ہے نشئی۔۔۔''

ماں کچن کی طرف بڑھتی ہوئی ایک دم رک گئی۔

''وہ میرا بھانجا ہے اور تمہارے لیے کوہ قاف سے شہزادہ تھوڑی آئے گا۔'' ایک دم وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔وہ ہنستی ہوئی دہری ہورہی تھی۔

''نہ یہ تو ہنس کیوں رہی ہے؟ بے شرم میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟''

''تو اور کیا اماں۔کوہ قاف سے شہزادے نہیں پریاں آتی ہیں اور میرے لئے شہزادہ ہی آئے گا دیکھ لینا''

اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''کیا کمی ہے مجھ میں؟''

''عقل کی کمی ہے تجھ میں اور خواب تو دیکھو شہزادی کے،ہونہہ''

ماں نے جلے کٹے لہجے میں کہا اور کچن میں داخل ہوگئی۔

یہ بحث ومباحثہ روز کے معمول میں شامل تھا۔کچن میں پیاز کاٹتے وقت وہ رورہی تھی۔ پیاز کی کڑواہٹ میں اس کے آنسو بھی شامل تھے۔شہر کے متوسط محلے تاج نگر میں یہ عسرت زدہ گھر محمد شریف کا تھا۔وہ اپنے نام کے مصداق شریف اور سیدھا سادہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔کبھی وہ خوش شکل اور صحت مند ہوا کرتا تھا،لیکن گردشِ ایام نے اس کے خدوخال بدل دیے تھے۔وہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا۔ڈاکٹروں نے اسے ٹی بی بتائی تھی لیکن علاج کی استطاعت نہیں تھی۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مرض بڑھتا گیا اور اس کی صحت اور زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوتے رہے۔اس کا جواں سال بیٹا کاشف بمشکل میٹرک تک ہی پڑھ پایا،اور پھر غلط صحبت کی بھینٹ چڑھ گیا۔وہ اندر ہی اندر کڑھتا رہتا،لیکن کچھ کرنے سے قاصر تھا۔بالآخر ایک دن اللہ نے اس کی سن لی۔محلے کے ایک دردمند انسان نے اس کے بیٹے کو دوبئی بھیجنے کی پیشکش کردی۔نتیجے میں اس کی بیوی زاہدہ کا دوتولے طلائی زیور اور کچھ جمع پونجی

تفریق ہوگئی۔گزشتہ ایک سال سے وہ دوبئی میں تھا،لیکن اس نے کوئی خاص اور تسلی بخش ردعمل نہیں دکھایا۔وہ ہر مہینے دس ہزار بھیجتا تھا۔محمد شریف ایک راج کے ساتھ کام کرتا تھا۔

ہمہ وقت اس کی نحیف ونزار ہڈیاں سراپا احتجاج رہتیں، لیکن کاشف کے بھیجے ہوئے دس ہزار سے زندگی کا پہیہ متحرک رکھنا ناممکن تھا۔پچھلے مہینے اس نے اپنی بہن ارشی کیلئے سستا ساٹچ سکرین سیل فون بھی بھیجا تھا تاکہ اپنی بہن اور امی ابا سے بات ہوتی رہے،لیکن ارشی کا سیل فون اتنا مصروف ہوتا کہ وہ کال کر کر کے تھک جاتا۔اب اس نے کال کرنا کم کردیا تھا۔زاہدہ بھی اندر ہی اندر برف کی طرح پگھلتی جارہی تھی۔بہ ظاہر اسے کوئی مرض نہیں تھا لیکن تنگیٔ حالات بیٹے کی جدائی ارشین کا رویہ اور محمد شریف کی گرتی ہوئی صحت نے اسے توڑ کے رکھ دیا تھا۔ارشی کے اطوار اچھے نہیں تھے۔

ایک ماں کی حیثیت سے وہ جانتی تھی کہ وہ کس ڈگر پر چل رہی ہے۔ہر وقت کالز چیٹ اور فیس بک،اس کی آنکھیں زیادہ تر سرخ اور متورم رہتیں۔یہ ساری ساری ساری رات جاگنے کا نتیجہ تھا۔وہ اٹھارہ سال کی ایک صحت منداور سفید رنگت کی حامل خوبرولڑکی تھی۔

نکلتا ہوا قد تنا ہوا جسم بڑی بڑی سیاہ آنکھیں گداز لب اور صراحی دار گردن اس کے حسن فسوں خیز کے اہم لوازمات تھے۔وہ زیادہ تر تنگ قمیض کے ساتھ چست پاجامہ پہنتی تھی۔دوپٹے سے تو جیسے اسے چڑ تھی۔دیکھنے والے اسے نظر بھر کے دیکھتے اور مبہوت رہ جاتے۔وہ اکثر اپنی گلی میں دکان پر بھی چلی جاتی،اگرچہ کہ زاہدہ کو یہ سب پسند نہیں تھا لیکن وہ سنتی کب تھی۔

اسی گلی میں ایک خوبرو نوجوان سے اس کا نین مٹکا ہوا تھا جو کہ ازاں بعد محبت میں بدل گیا تھا۔

نعمان اسی کے محلے میں رہتا تھا۔دسویں تک بمشکل پڑھنے کے بعد اس نے بھی اسکول کو خیر باد کہہ دیا اور اب آوارہ تھا۔ارشی دن رات اسی سے سیل فون پر مصروف رہتی تھی۔وہ محبت کی راہوں پر بہت آگے جاچکے تھے۔

اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔

دو کمروں پر مشتمل چھوٹا سا گھر محمد شریف کا کل اثاثہ تھا۔یہ بھی بھلے وقتوں میں اس نے بنالیا تھا۔اللہ نے سر چھپانے کی جگہ دیدی تھی۔پانچ مرلے میں دو کمرے ایک کچن اور ایک باتھ روم اس نے جان توڑ کوششوں کے بعد بنایا تھا۔

''آج شام پارک میں ملو''

وہ سیل فون کی اسکرین پر نعمان کا میسج پڑھتے ہوئے زیرلب مسکرانے لگی۔

''اوکے۔'' اس نے ریپلائی کیا اور چارپائی پر نیم دراز ہوگئی۔

وہ چشم خیال میں سپنوں کے تانے بانے بن رہی تھی۔نعمان کا اثرانگیز سراپا اس کی آنکھوں کے سامنے ابھر رہا تھا۔

وہ اس کا ہاتھ تھامے ایک پگڈنڈی پر بھاگ رہی تھی۔ پگڈنڈی کے آس پاس سرسوں کے پھول حد نگاہ تک نظر آرہے تھے۔یہ منظر اس نے کسی موی میں دیکھا تھا جو کہ اس کے پردہ چشم پر ثبت ہوکر رہ گیا تھا،لیکن اس تخیلاتی منظر کے اختتام پر وہ لرز سی جاتی۔پگڈنڈی کے اختتام پر سرسوں کے پھول اچانک اسے نوکدار کانٹے دکھائی دینے لگتے۔ہر نوک خار پر اسے خون نظر آتا۔اس نے سر کو جھٹکا اور شام کو نعمان سے ملاقات کے خیال سے سرشار ہونے لگی۔خدا خدا کرکے شام کا اندھیرا پھیلنے لگا۔وہ بھی محبوب سے ملن کی تیاری کرنے لگی۔

اس کے میسجز اور مسڈ کالز آرہی تھیں۔وہ سکرین پر انہیں دیکھتی اور زیرلب مسکرادیتی۔محبوب کو تڑپانے کا بھی اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ٹھیک دس منٹ بعد وہ اپنی ایک سہیلی سے ملنے کا کہہ کر گھر سے نکل پڑی۔شریف اور زاہدہ نے اسے محض گھورنے پر ہی اکتفا کیا۔

جوان اور منہ زور اولاد تختی کب برداشت کرتی ہے۔تاج نگر سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا پارک تھا۔جہاں سارا دن لوگوں کی چہل پہل رہتی۔شام کے بعد پارک میں داخلہ ممنوع تھا۔پانچ ایکڑ پر مشتمل یہ پارک لوگ مدتوں سے دیکھ رہے تھے۔اس کی کوئی چار دیواری نہیں تھی لیکن شام کے بعد اس طرف

کوئی نہیں جاتا تھا۔ایک چوکیدار احمد خان پرانی سی بندوق کے ساتھ ہمہ وقت وہاں آن ڈیوٹی ہوتا تھا۔پارک میں ہمہ قسم کے ان گنت درخت اور پودے تھے۔گراؤنڈ میں بیٹھنے کیلئے بینچ اور بچوں کیلئے جھولے بھی تھے۔ایک طرف کونے میں سرو کے درختوں کا گھنا جھنڈ تھا۔یہی جگہ ان کے ملنے کیلئے مختص تھی۔مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے نعمان وہاں پہنچ جاتا تھا۔اس کی چوکیدار سے اچھی خاصی سلام دعا تھی اور وہ سو دو سو روپے کے عوض اس ملاقات کی راہیں ہموار کردیا کرتا۔آج بھی مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے نعمان پہنچ گیا۔وہ پودوں کے جھنڈ میں ارشی کا بے تابی سے منتظر تھا۔آج وہ ایک حتمی فیصلہ کر کے آیا تھا۔یہی وجہ تھی کہ آج انتظار میں شدت تھی۔وہ بار بار اس کا نمبر ڈائل کررہا تھا اسے میسج کررہا تھا۔

چند لمحوں بعد نیم اندھیرے میں اسے ارشی کا ہیولا دکھائی دیا۔وہ دبے پاؤں سبک روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔پارک میں کہیں کہیں بلب روشن تھے، تاہم یہ روشنی ناکافی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اس کے روبرو پہنچ گئی۔دھڑکتے دل کے ساتھ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے قریب کررہا تھا۔وہ بھی قرب محبوب کیلئے تڑپ رہی تھی۔آج وہ میرون کلر کے قدرے اچھے لباس میں ملبوس تھی۔ایک بڑی سی سیاہ چادر سے اس نے جسم ڈھانپ رکھا تھا۔

پودوں کے جھنڈ میں پہنچتے ہی اس نے چادر اتار کر ایک طرف رکھ دی۔خلاف معمول وتوقع نعمان نے اسے دونوں کاندھوں سے پکڑ کر زمین پر بچھی ہوئی خودرو گھاس پر اپنے سامنے بٹھادیا۔وہ اسے فریفتہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا بات ہے نومی آج تمہاری گرم جوشی ماند پڑ رہی ہے؟''

وہ گویا شکوہ کناں لہجے میں اس کی طرف سرکتی ہوئی بولی۔

''ہاں ارشی آج میں تم سے ایک بات کہنے جارہا ہوں، کچھ مانگنے جارہا ہوں، انکار کروگی تو ہمارے راستے جدا ہوجائیں گے'' وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے آہستگی سے بولا۔''میں نے امی سے بات کی ہے، لیکن وہ میری ایک بھی سننے کو تیار نہیں ہیں۔وہ اپنی بھتیجی سے میری شادی ہر حال میں کرنا چاہتی ہیں۔''

وہ سنجیدہ ہوگئی۔اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑوایا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''نومی۔۔۔میرا سب کچھ تمہارا ہے۔میں نے کب کسی چیز سے انکار کیا ہے۔تم نہ بھی کہو تو میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔'' وہ نیم اندھیرے میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔''میں جانتی ہوں تمہارے امی ابو نہیں مانیں گے، کیونکہ اس سے تمہاری بہن کو طلاق ہوجائیگی، اور میں نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے ایسا ہو، لیکن میں تمہارے بغیر جی نہیں پاؤں گی۔میں مرجاؤں۔۔۔''

انتہائی تیزی سے اس نے اپنا ہاتھ اس کے گداز لبوں پر رکھ دیا۔''ایسا مت کہو ارشی۔اللہ نہ کرے کہ تمہیں کچھ ہو۔

میں اس کا حل سوچ کر آیا ہوں۔بس تمہاری رضامندی۔۔۔''

''تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے نومی'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے وارفتگی سے بولی۔''تم جو بھی کہو گے مجھے انکار نہیں ہوگا۔''

''ارشی میں نے اپنے ماں باپ اور گھر کو چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے'' وہ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''کیا تم میرا ساتھ دے سکتی ہو؟ کیا تم بھی یہ فیصلہ کرسکتی ہو؟ مجھے معلوم ہے کہ اس راستے میں مشکلات ہیں، مسائل ہیں لیکن، اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں۔تم میرے ساتھ چلو ہم اپنی نئی دنیا بسائیں گے لیکن میں محبت میں جبر کا قائل نہیں ہوں۔تم چاہو تو انکار بھی کرسکتی ہو۔'' وہ اسے پرامید نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

ایک دم وہ بجھ سی گئی۔اس کی آنکھوں میں جلتے ہوئے چراغ ماند پڑنے لگے۔اس کا دل بے ترتیب انداز میں زور زور سے دھڑک رہا تھا، لیکن انکار کی تاب نہیں تھی۔اس نے گویا رضامندی کے طور پر سر کو خم کردیا۔

''ہم کہاں جائیں گے نومی؟'' اس نے نظریں اٹھاتے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ہوئے لرزیدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''اگر ہم پکڑے گئے، کسی کو پتہ چل گیا تو۔۔۔۔۔؟''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا ارشی۔ میں ہوں ناں'' اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''میں تیار ہوں۔ کب جانا ہے؟''

''آج رات کیونکہ اس کے بعد موقع نہیں ملے گا۔''

وہ فورِ مسرت سے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

اور پھر وہ ٹوٹ کر ملے۔ خودرو گھاس کے ساتھ ایک غریب کی عزت بھی روندی جا رہی تھی۔ بپھرے ہوئے جذبات کی لہریں معمول پر آئیں تو انہیں واپسی کی فکر ہوئی۔ آج رات ان کی زندگی کی اہم رات تھی۔ ارشی بہت خوش تھی وہ اپنے محبوب کے ساتھ جا رہی تھی۔ جسے اس نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ بیس منٹ بعد وہ گھر میں پہنچ گئی۔ اس کے امی ابا کمرے میں دبکے سونے کی تیاری کر رہے تھے۔

''اتنی دیر کہاں تھیں تم؟'' زاہدہ نے اس کے کمرے میں گھستے ہی پوچھا۔ ''تمہیں شرم نہیں آتی کچھ بیمار باپ کا ہی خیال کر لے۔''

''اماں میں منزہ کے گھر تھی تم اس سے فون کر کے پوچھ بھی لو۔'' اس نے سیل فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ اسے غصیلی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ماں نے سیل فون پکڑ کر چارپائی پر پھینک دیا، اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''اللہ تیرے جیسی اولاد کسی کو نہ دے۔

''پتہ نہیں کب جان چھوٹے گی ہماری تم سے۔''

ماں کے یہ الفاظ جلتی پر تیل ثابت ہوئے۔

''آج رات ہی تمہاری جان چھوٹنے والی ہے اماں'' اس نے چارپائی پر پڑا ہوا سیل فون اٹھاتے ہوئے زیرِ لب کہا۔

ماں اپنے کمرے میں جا کر چارپائی پر لیٹی چھت کو گھورنے لگی۔ بیٹی اپنے کمرے میں جاگ رہی تھی۔ وہ آج رات اس دہلیز سے پار جا رہی تھی، جہاں سے اس کی ڈولی اٹھنی تھی۔ جہاں ماں باپ اور بھائی کی عزت اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی تھی۔

☆......☆......☆

فورسیٹر بلیک ہائی لکس شہر کے ایک پرہجوم مقام سے گزرتا ہوا برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ قیصر اور فوزیہ عقبی نشست پر براجمان تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سیاہ ریش صحت مند سرخ وسفید رنگت کا حامل آدمی نہایت مہارت سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بھی ایک اسی کے حلیے کا آدمی بیٹھا تسبیح کے دانے گھما رہا تھا۔

اس کے سر پر سفید جالی دار ٹوپی اور پیشانی پر محراب واضح نظر آ رہا تھا۔ مذکورہ دونوں آدمیوں نے سفید رنگ کے سادہ سے کرتے اور ان کے ساتھ پاجامے پہن رکھے تھے۔ سڑک پر گاڑیوں کا اژدھام تھا۔ گاڑی کا عقبی حصہ ڈالہ نما تھا۔ فوزیہ سرتاپا سیاہ چادر میں ملبوس تھی۔ اس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ قیصر بھی سادہ سی شلوار قمیص میں ملبوس اس کے ساتھ بیٹھا کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ اس کے رگ وپے میں عجیب سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ اک ایمان افروز جذبے سے اس کا رواں رواں سرشار ہو رہا تھا۔ وہ اللہ سے قرب کے راستے پر چل رہا تھا اور اس کی لیے وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا۔

کم وبیش نصف گھنٹے بعد وہ شہر کی حدود سے نکل رہے تھے۔ پختہ روسڑک کے اردگرد مضافات شروع ہو گئے تھے۔

کہیں کہیں اکا دکا عمارتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ مزید دس منٹ کی مسافت کے بعد گاڑی پختہ روسڑک سے قدرے نشیبی سڑک پر اتر گئی۔ تاحد نگاہ پتلی سی خستہ حال ناہموار سڑک نظر آ رہی تھی۔ اندازاً دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک پختہ عمارت نظر آنے لگی۔ اردگرد کھیت کھلیان اور مکئی کی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ مذکورہ عمارت کم وبیش پانچ ایکڑ پر مشتمل تھی۔ یہ ایک مدرسہ تھا۔ آہنی گیٹ کے اوپر ایک بڑا سا بورڈ آویزاں تھا جس پر جلی حروف میں ''راہبرِ انسانیت''

لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سفید شلوار قمیض اور سیاہ جیکٹ میں ملبوس ایک گندمی رنگت کا حامل دراز قامت آدمی اے کے سینتالیس پکڑے چوکس کھڑا تھا۔

ہارن کی آواز سنتے ہی گیٹ فوراً کھل گیا۔قطار در قطار ان گنت کمرے تھے۔ان کے آگے برآمدے میں صفیں بچھی ہوئی تھیں۔متعدد نوجوان اور بچے رحل پر قرآن مجید رکھے تلاوت میں مصروف تھے۔کچھ نوجوان اور بچے نوافل پڑھ رہے تھے، کیونکہ نماز کا وقت نہیں تھا۔کشادہ صحن میں بھی صفیں بچھی ہوئی تھیں۔ایک طرف قطار میں چند باتھ روم بھی نظر آرہے تھے۔مدرسے سے ملحق ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد بھی تھی۔جس کے بلند و بالا مینار کی سنہری نوک ڈھلتی ہوئی دھوپ میں چمک رہی تھی۔مینار کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر بھی تھا۔گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی گاڑی کو ایک طرف راہداری پر روک دیا گیا۔

فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا باریش آدمی دروازہ کھول کر نیچے اترا۔وہ دونوں بھی اس کی تقلید میں اتر گئے۔وہ انہیں خفیف سا اشارہ کرتا ہوا سامنے ایک کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔کمرے کے دروازے پر دو مسلح آدمی مستعد کھڑے تھے۔ملکی حالات کے پیشِ نظر سیکورٹی کے انتظامات سخت کر دیے گئے تھے۔دونوں کے ہاتھوں میں خطرناک رائفلیں تھیں۔

''السلام علیکم قدوس بھائی''

قریب پہنچتے ہی دونوں گن بردار بیک آواز بولے۔

''وعلیکم السلام کیسے ہو دوستو؟''

عبدالقدوس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے بھائی، آپ اندر تشریف لے جائیں، آپ ہی کا انتظار ہو رہا ہے۔''

ایک گن بردار نے مودب لہجے میں آہستگی سے کہا۔چند لمحوں بعد وہ قدوس کی قیادت میں کمرے میں داخل ہو گئے۔لکڑی کا دروازہ ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہی کھل گیا۔یہ قدرے کشادہ اور صاف ستھرا کمرہ تھا۔

فرش پر منقش چٹائی بچھی ہوئی تھی۔جس پر چند تکیے ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ایک تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے ایک صحت مند گندمی رنگت کا حامل باریش آدمی براجمان تھا۔اس کی داڑھی کافی لمبی تھی جبکہ سر کے بال مختصر اور مونچھیں ندارد تھیں۔ماتھے پر محراب سبز ٹوپی سے جھانک رہا تھا۔وہ سفید کرتے کے ساتھ پاجامے میں ملبوس تسبیح کے دانے گھماتا ہوا زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا۔وہ ان کے اندر داخل ہوتے ہی آہستگی سے اٹھ کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔اس کے قدرے موٹے سیاہی مائل ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ستواں ناک بڑی بڑی سرمے سے لبریز آنکھیں اور لمبا قد۔

''السلام علیکم جناب''

قدوس اور فوزیہ نے باادب لہجے میں دھیرے سے کہا۔

ان کی دیکھا دیکھی قیصر نے بھی السلام علیکم کہا۔

''وعلیکم السلام'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

اس نے گرمجوشی سے قدوس اور قیصر سے مصافحہ کیا۔

غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ فوزیہ کی طرف مصافحے کیلئے بڑھا اور اچانک رک گیا۔اس نے تولتی ہوئی نظروں سے قیصر کی طرف دیکھا، اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔تسبیح پر اس کی انگلیاں تیزی سے متحرک تھیں۔

وہ تینوں اس کے عین سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔

''یہ ہمارے راہنما اور پیشوا قبلہ عبدالرحیم حقی صاحب ہیں۔''

قدوس نے قیصر سے اس کا تعارف کروایا۔

حقی نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔زیر لب کچھ پڑھتا ہوا مسکرایا اور قیصر کو ایک طویل پھونک ماری وہ اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔اس نے جواباً مسکرانا چاہا لیکن کنفیوز سا ہو گیا۔

''جناب یہ آپ کا نیا مہمان ہے، قیصر علی''

فوزیہ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھیرے سے کہا۔''یہ اللہ سے قرب کا خواہشمند ہے، جنت کا طلبگار ہے۔''

''فوزیہ بی بی۔۔۔۔یہ ہمارا نہیں اللہ کا مہمان ہے۔''

حقی گمبھیر لہجے میں فوزیہ کے خدوخال کو دیکھتا ہوا مخاطب ہوا۔''یہ اللہ کا خاص بندہ ہے اور اس نے اسے خاص طور پر ہمارے پاس بھیجا ہے۔بیشک وہی صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دیتا ہے۔''

حقی کی اثر انگیز نگاہیں قیصر کے چہرے پر مرتکز تھیں۔

''سبحان اللہ'' قدوس نے آہستگی سے کہا اور قیصر کی طرف دیکھنے لگا۔

''جناب مجھے تو اس کے نصیب پر رشک آ رہا ہے کہ اللہ نے ڈائریکٹ اسے منتخب کیا ہے۔ پتہ نہیں میری باری کب آئیگی۔''

''ہر کام کیلئے وقت اور اللہ کا چنا ہوا بندہ مقرر ہوتا ہے قدوس۔'' حقی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''تم امید کو ٹوٹنے مت دو۔ مایوسی کفر کے زمرے میں آتی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ تمہیں بھی چن لیا گیا ہے پر ابھی تمہارا وقت مقرر نہیں ہوا۔''

''سبحان اللہ جناب۔'' وہ سرشار لہجے میں آنکھیں موند کر بولا۔ ''میں اس ایمان افروز ساعت کا منتظر رہوں گا۔''

''جناب کیا اللہ اپنے بندوں سے ملتا بھی ہے؟''

قیصر نے لرزتی ہوئی آواز میں بمشکل سوال کیا۔ ''اور کیا وہ نظر بھی آتا ہے میں نے تو پڑھا ہے اللہ کوئی جسم نہیں رکھتا تو پھر وہ نظر کیسے آتا ہے؟''

''قیصر میاں اللہ اپنی قدرت سے جسے چاہے نظر آتا ہے۔'' حقی نے روئے سخن اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''چاہے کا مطلب سمجھتے ہوناں۔۔۔؟ یعنی اللہ جسے چاہتا ہے پسند کرتا ہے اسے اپنا قرب عطا کرتا ہے۔ اسے خاص مقصد کیلئے چن لیتا ہے، اور اللہ نے تمہیں چن لیا ہے۔ زیادہ سوچو گے تو صراط مستقیم سے بھٹک کر گمراہ ہو جاؤ گے۔ اللہ ناراض ہو کر تم سے یہ موقع چھین لے گا۔''

''سبحان اللہ۔'' فوزیہ سرشار لہجے میں بولی۔ ''جناب یہ شک نہیں کر رہا یہ تو اللہ سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کی جنت دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے سیدھا راستہ دکھائیں تا کہ یہ اپنے مقصد کو پالے اور گمراہ نہ ہو۔''

''جی جناب میں یہی چاہتا ہوں'' وہ حقی کی طرف دیکھتے ہوئے ادب سے بولا۔

''میں کچھ بھی کر سکتا ہوں جناب، آپ بس یہ بتائیں کہ وہ راضی کیسے ہوتا ہے؟ وہ جنت کب دکھاتا ہے اپنا قرب کب اور کیسے عطا کرتا ہے؟''

''بھولے بشر، اللہ تم سے راضی ہے تو اس نے تمہیں یہاں بھیجا ہے۔ باقی جب تم اللہ کی مانگی ہوئی قربانی دو گے وہ تمہیں قرب بھی عطا کر دیگا۔''

''سبحان اللہ میں نے کب انکار کیا جناب''

وہ رقت آمیز لہجے میں بولا۔

اس دوران ایک لحیم شحیم آدمی نے اس کے سامنے شربت لا کر رکھ دیا اور فوراً غائب ہو گیا۔ صرف ایک گلاس دیکھ کر اسے تعجب ہوا لیکن اپنی کیفیت کے پیش نظر وہ خاموش رہا۔ ہلکے گلابی رنگ کا مشروب وہ آہستگی سے پینے لگا۔

اس کا ذائقہ قدرے تلخ اور کڑوا تھا، تاہم ایک ایک گھونٹ اس کے جسم میں عجیب سی توانائی اور لذت بھر رہا تھا۔ وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ اس کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھی۔ فوزیہ، قدوس اور حقی کے چہرے دھندلا رہے تھے، اور پھر اچانک وہ اک کیف و سرور کی وادی میں اتر گیا۔ اسی لمحے فوزیہ تیزی سے اٹھی۔ اسے دونوں کاندھوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ چند لمحوں بعد کمرے سے ملحق دروازہ قدوس نے کھول دیا۔ اس کے حواس مختل ہو رہے تھے۔ لیکن اسے لطف آ رہا تھا۔ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اسے آہستگی سے دھکیلتی ہوئی چھوٹے سے دروازے میں داخل ہوگئی۔ قدوس اور حقی ایک دوسرے کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا رہے تھے۔ ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ عقب سے بند ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت کمرہ تھا۔ فرش پر خوبصورت کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ وہ ہواؤں میں اڑتا ہوا کیف وانبساط کی وادی میں اتر رہا تھا۔ اس کے سامنے خوبصورت پریاں نیم برہنہ لباس میں کھڑی تھیں۔ اور پھر اچانک وہ اس کے قریب پہنچ گئیں۔ وہ اس کے جسم سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ مترنم قہقہے اس کی سماعتوں کو مسرور کر رہے تھے۔ اور پھر ایک خوبصورت پری نے اسے آغوش میں لے لیا۔ وہ اک پر کیف و سرور لمس سے آشنا ہو رہا تھا۔ کچھ لمحوں بعد اس کا ذہن تاریکی کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب گیا، لیکن اس تاریکی میں بھی روشنی تھی۔ ستارے جھلملا رہے تھے۔ خوشبوئیں اس کے دماغ کو معطر کر رہی تھیں۔ کئی پری پیکر اس کے سامنے رقصاں تھے، اور پھر اچانک اک

پرسکون خاموشی چھا گئی۔ آنکھوں کے سامنے ابھرتے ہوئے مناظر اوجھل ہو گئے۔

وہ سکون کی گہری نیند سو گیا۔

☆......☆......☆

رات گیارہ بجے کے عمل سے گزر رہی تھی۔ دن بھر کا تھکا ماندہ مزدور اپنے بوسیدہ بستر پر سویا ہوا تھا۔ نیند اپنی آغوش میں اسے ماں کی طرح لوریاں دے رہی تھی۔ سوچوں کی یلغار سے لڑتے لڑتے زاہدہ بھی آخر سو گئی۔ یہی نیند ان کی عزت و ناموس کی پیشانی پر ذلت و رسوائی کی مہر ثبت کرنے کا سامان کر رہی تھی۔ ارشی نے کوئی سامان ساتھ نہیں لیا اور تھا ہی کیا جو ساتھ لیتی۔ وہی لباس جو اس نے پہن رکھا تھا۔ اس نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ ناک بھوں چڑھائی اور سیل فون کی سکرین کو دیکھنے لگی۔ اسی لمحے میسج ٹیون سنائی دی اور اسکرین روشن ہو گئی۔

''گلی کی نکڑ پر پہنچ جاؤ دیر مت کرنا وقت بہت کم ہے اور یہ آخری موقع ہے۔''

نعمان کے ایس ایم ایس نے اس کے جسم میں پارہ سا بھر دیا۔ وہ ایک لمحے میں بستر سے نکلی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بیشک وہ ایسی تھی کہ کوئی اس کیلئے ماں باپ اور گھر بار تو کیا دنیا بھی چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے خود کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔ اپنے کمرے پر آخری نظر ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے بند دروازے کی کنڈی ہٹائی اور اس آہستگی سے کھول دیا۔ دروازہ ذرا سا چرچرایا۔ وہ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔ گویا وہ احتجاج کر رہا تھا اسے اس طرح جانے سے روک رہا تھا۔ دروازہ نہیں چرچرایا تھا ماں باپ اور بھائی کی عزت چیخ رہی تھی۔ یہ چیخ دراصل اس کے مردہ ضمیر کی کمزور سی آواز تھی۔ مجبور اور نحیف و ناتواں باپ کا واویلا تھا۔ مظلوم ممتا کی سسکیاں تھیں۔ جوان بھائی کی غیرت کا سراپا احتجاج تھا لیکن اس نے سب کچھ بے حسی کے طاق پر رکھ دیا۔ باپ کی دستار کو پیروں تلے روندتی ہوئی وہ مین دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک لمحاتی خیال سے اچانک وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس نے غیر ارادی طور پر ماں باپ کے کمرے کی طرف دیکھا اور بے ساختہ اس طرف قدم بڑھا دیے۔ اس کی ماں دروازہ کھلا رکھتی تھی اگرچہ کہ موسم سرما تھا لیکن سردی نے شدت اختیار نہیں کی تھی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا۔ ساتھ ساتھ پڑی ہوئی دو چارپائیوں پر اسے دو جنازے سے نظر آئے۔ یہ اس کے ماں باپ تھے جنہوں نے اسے منتوں مرادوں کے ساتھ اللہ سے لیا تھا۔ اسے صحنِ افلاس کا خزانہ سمجھ کر سنبھال سنبھال کر رکھا تھا۔ اس کے ناز اٹھائے تھے۔ اسے پروان چڑھایا تھا۔ آج وہ انہیں ذلت کے پاتال میں پھینک رہی تھی۔ کمرے میں بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ماں رضائی میں سر چھپائے گہری نیند سو رہی تھی۔ اسے دوسری چارپائی کے سرہانے پر اپنے باپ کا بے رونق سا چہرہ نظر آیا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، چہرے پر ان گنت سلوٹیں، سفید داڑھی، ایک لمحے کے لیے اس کے احساس نے کروٹ لی۔ اسی لمحے اس کا باپ متحرک ہوا۔ وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ اسے کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا تھا۔

اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے مسلسل کھانس رہا تھا۔ اس نے اپنا نحیف سا لرزتا ہوا ہاتھ چارپائیوں کے درمیان پڑے ہوئے چھوٹے سے اسٹول کی طرف بڑھایا۔ سلور کے جگ کے ساتھ ایک گلاس پڑا تھا۔ کھانسی کے جھٹکے سے اس کا ہاتھ گلاس سے ٹکرایا۔ دفعتاً گلاس نیچے جا گرا۔ وہ بمشکل اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زاہدہ بدستور گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ وہ جاگ بھی کیسے سکتی تھی۔ ارشی نے اس کی چائے میں نشہ آور سفوف ڈال دیا تھا۔ باپ کو وہ سفوف دینے کی اس نے ضرورت محسوس نہیں کی اگرچہ کہ نعمان نے تاکید کی تھی۔ وہ دروازے کی اوٹ سے باپ کے لرزیدہ وجود کو دیکھ رہی تھی۔ معاً اس کی نگاہ محمد شریف کے ہونٹوں پر پڑی۔ اسے خون کی سرخی واضح محسوس ہو رہی تھی۔ گویا وہ موت کی دہلیز پر پہنچ گیا تھا اور بیٹی باپ کے گھر کی دہلیز سے باہر جا رہی تھی۔ اس نے بمشکل اسٹول پر پڑا ہوا جگ اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔ دو گھونٹ پانی پی کر جگ واپس رکھ دیا۔ وہ قدرے سنبھل گیا۔ وہ بیٹی اسے بے حسی سے دیکھ رہی تھی جسے اس نے اپنے سینے پر سلا کر پروان چڑھایا تھا۔ جس کی ذرا سی تکلیف پردہ

تڑپ جاتا تھا۔ وہ سرہانے پر سر رکھے کسی غیر مرئی نکتے کو گھور رہا تھا۔

اس نے آگے بڑھنا چاہا لیکن کسی نادیدہ زنجیر نے اسے جکڑ لیا۔ اس کا سیل فون وائبریٹ کر رہا تھا۔ اپنے کمرے سے نکلتے وقت اس نے سیل فون سائی لنٹ پر لگا دیا تھا۔ سکرین پر نعمان کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے اپنے جاں بہ لب باپ کے چہرے پر آخری نظر ڈالی اور جلدی سے واپس پلٹ گئی۔ مختصر سا صحن عبور کر کے وہ بیرونی دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ کال مسلسل آ رہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کر لی۔

''بس نکل رہی ہوں۔''

اس نے سیل فون کان سے لگا کر سرگوشی کی اور کال منقطع کر دی۔ چند لمحوں بعد وہ باپ کی غیرت کی سرحد عبور کر چکی تھی۔ گلی میں ہو کا عالم تھا متعدد مکانوں کے سامنے بلب روشن تھے۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی سبک روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک درزی کی دکان کھلی ہوئی تھی لیکن وہ اپنے کام میں مگن تھا۔ وہ دکان کے سامنے سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ گلی کے اختتام پر نعمان ایک کار میں اس کا منتظر تھا۔ کچھ دیر بعد وہ گاڑی میں عقبی سیٹ پر اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک داڑھی والا ہٹا کٹا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ گاڑی کی رفتار بتدریج بڑھ رہی تھی۔ وہ ایک پختہ روڑک سے گزرتے ہوئے مین سڑک پر پہنچ گئے۔ نعمان اس کا ہاتھ پکڑ کر دھیرے دھیرے سہلا رہا تھا۔

اس کے بدن میں عجیب سی سنسنی سرایت کر رہی تھی۔ بلا ارادہ اس نے اپنا سر نعمان کی گود میں رکھ دیا۔ اس کی انگلیاں اس کے لب و رخسار پر متحرک تھیں۔ وہ خود کو ہواؤں میں محسوس کر رہی تھی۔ اس کا احساس ضمیر اور غیرت بے موت مر چکے تھے۔ گاڑی برق رفتاری سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ وہ بدستور اس کی گود میں سر رکھے آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ کم و بیش پونے گھنٹے بعد گاڑی ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور اسے ہوس ناک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک واضح محسوس ہو رہی تھی۔ سامنے ایک بڑی سی پختہ عمارت نظر آ رہی تھی۔ جس کی پیشانی پر چمکتے ہوئے بلب کی روشنی گاڑی میں داخل ہو رہی تھی۔

''شکریہ نفیس بھائی آپ واپس چلے جائیں۔'' نعمان دروازے کے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''انشاءاللہ پھر ملیں گے۔''

''اچھا جناب ٹھیک ہے۔ سرکار کو میرا سلام کہیے گا۔'' نفیس نے بھاری آواز میں کہا۔

چند لمحوں بعد گاڑی رخصت ہو گئی۔ نعمان نے اس کے ہاتھ سے سیل فون لے کر آف کر کے جیب میں رکھ لیا۔

وہ ایک بڑی سی عمارت کے مین گیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ اطراف میں مختلف فصلیں اور کھیت کھلیان دکھائی دے رہے تھے۔ آسمان پر تاروں کے جھرمٹ میں چاند چمک رہا تھا۔ سردی اچھی خاصی تھی تاہم قابلِ برداشت تھی۔

آہنی گیٹ کے اوپر بڑے سے بورڈ پر ''راہبرِ انسانیت'' لکھا ہوا تھا۔

''یہ ہم کہاں آ گئے ہیں نعمان؟'' اس نے آہستگی سے سرگوشی کی۔ ''یہ تو کوئی مدرسہ ہے۔''

''ہاں یہی محفوظ جگہ فی الوقت ملی ہے۔ یہاں میرے استاد رہتے ہیں۔ وہ عالمِ دین ہیں وہی ہمارا نکاح پڑھوائیں گے۔'' وہ مین گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے اسے بتا رہا تھا۔

ایک لحیم شحیم داڑھی والے آدمی نے گیٹ کا چھوٹا پٹ کھول دیا۔ وہ اسے کن اکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ نعمان کو دیکھ کر دھیرے سے مسکراتے ہوئے اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

کچھ دیر بعد وہ ایک کمرے میں عبدالرحیم حقی کے سامنے بیٹھے تھے۔ نعمان نے انتہائی عقیدت کے ساتھ اس سے مصافحہ کیا تھا۔ ارشی کے سلام کا جواب اس نے سر کی ہلکی سی جنبش سے دیا۔

''جناب یہ ارشی ہے اس سے متعلق میں آپ کو آگاہ کر چکا ہوں۔''

''ہمم'' وہ طویل ہنکارا بھرتے ہوئے اسے للچائی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"تم بالکل ٹھیک جگہ پر پہنچے ہو۔ یہاں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔"

اس نے رعونت زدہ لہجے میں کہا اور نعمان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر مخصوص انداز میں دبا دیا۔

"تم جاؤ عبدالقدوس سے مل لو۔"

"اچھا جناب۔"

وہ ایک دم اٹھتے ہوئے مودب لہجے میں بولا۔ ارشی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"ارشی تم یہیں بیٹھو میں قدوس بھائی سے مل کر آرہا ہوں۔" اس نے بے تاثر لہجے میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی تاہم وہ مطمئن تھی۔ کیونکہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ آئی تھی اور گویا اس کے استاد محترم حقی صاحب کے زیر سایہ تھی۔

"تم تھک گئی ہوگی ذرا لیٹ جاؤ"

وہ اسے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے آہستگی سے بولا۔ اس کی انگلیاں سیاہ تسبیح کے دانوں پر متحرک تھیں ۔سامنے چٹائی پر ایک گدا بچھا ہوا تھا۔ جس پر ایک سرہانہ اور کمبل بھی پڑا تھا۔

"نہیں جناب م۔۔۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

"تم ڈر رہی ہو۔ یہاں ڈرنا منع ہے" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگا۔

"اب تم ہماری امان میں ہو۔"

اس کے بھاری ہاتھ کا لمس اسے مضطرب کر رہا تھا۔ حقی کی بھید بھری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔

"عزیز اسے پانی پلاؤ۔"

وہ دروازے کی طرف منہ کر کے قدرے اونچی آواز میں بولا۔

"جی جناب"

دروازے کے عقب سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

چند لمحوں بعد ایک کلین شیو لمبا تڑنگا نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس نے بلیو شرٹ کے ساتھ بلیک جینز پہن رکھی تھی۔ گندمی رنگت کا حامل نوجوان اسے عجیب سا لگا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ مدرسے میں حقی صاحب جیسے جید عالم دین کے سامنے بھی وہ مغربی لباس میں گھوم رہا ہے۔ اس نے پانی کا ایک گلاس اس کے سامنے رکھ دیا۔

شیشے کے گلاس میں رنگدار پانی اور وہ بھی سردی میں، لیکن وہ کوئی سوال یا انکار نہ کر پائی۔

"پانی پیو اور اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔"

حقی نے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہیں تمہارے کمرے تک پہنچا دیا جائیگا۔ نعمان وہاں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

یہ سن کر وہ تیزی سے متحرک ہوئی۔ کڑوا کسیلا پانی اس نے ایک ہی سانس میں ختم کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتی اس کے حواس مختل ہونے لگے۔ اس کی رگ رگ میں ایک پر کیف سی لہر دوڑ رہی تھی۔ اچانک وہ بے خودی ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کپڑے اتار کر پھینک دے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ اسے للچائی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اچانک وہ شرافت کے لبادے سے باہر آگیا اور اس پر جھپٹ پڑا۔ محبت کے جھانسے میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی بے آبرو ہو رہی تھی۔

ادھر تاج نگر کے خستہ حال مکان میں ایک مجبور باپ نے دم توڑ دیا تھا۔ زاہدہ اب بھی ایک لاش کے ساتھ دوسری چارپائی پر بے حس و حرکت گہری نیند میں پڑی تھی۔ کچھ دیر بعد حقی کمرے سے جا چکا تھا۔ وہ کیف و سرور کے عالم میں چٹائی پر پڑی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس شیطانی عمل کی مووی کیمرے میں محفوظ ہو چکی ہے۔

☆......☆......☆

عبدالرحیم حقی اور دیگر اراکین سے مشاورت کے بعد اسے وہاں سے ٹریننگ سینٹر منتقل کیا جا رہا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ مکمل ان کا تابع بن گیا اور گویا ایک تنویمی عمل کے تحت ان کے ہر حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ اس کی نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ رگ رگ میں ایک عجیب سا پر کیف احساس رچ بس گیا تھا۔ اس کی سوچنے سمجھنے فیصلہ یا انکار کرنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ اب وہ بس ایک کٹھ پتلی تھا اور ان کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔

مخصوص کمرے میں طرح طرح دار نیم برہنہ حسیناؤں کا جھرمٹ، دلگداز لمس، دلفریب لہجے اور دلنشین چہرے

اس کی آنکھوں کے سامنے ابھر رہے تھے۔ وہ پر کیف لمحات اس کے ذہن کے نہاں خانے میں محفوظ ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ سب ایک مخصوص دوا کا شاخسانہ تھا۔ اس نشہ آور دوا کے زیر اثر حسیناؤں کی قربت نے اسے کٹھ پتلی بنا دیا تھا۔ برہنہ اجسام کالمس و مہک وہ ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔ ہوش آیا تو وہ اسی مختصر سے کمرے میں چٹائی پر نیم دراز تھا۔ فوزیہ وہاں موجود نہیں تھی۔ البتہ ایک طرح دار اور بھرپور جسم کی حامل انتہائی دلکش حسینہ اس کے سامنے بیٹھی اسے لگاوٹ سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے وہائٹ کلر امبریلا فراک کے ساتھ چوڑی دار تنگ پاجامہ پہن رکھا تھا۔ گھنے سیاہ بال سلیقے سے سنوارے ہوئے تھے۔ ہلکا سا میک اپ، بڑی بڑی آنکھوں میں سرمے کی دھار اور کلائیوں میں چنبیلی کے گجرے تھے۔ ایک بھینی بھینی سی خوشبو بند کمرے کے ماحول کو معطر کر رہی تھی۔ انرجی سیور کی دودھیا روشنی میں اس کا ملیح چہرہ دمک رہا تھا۔ اسے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ زیر لب مسکرائی اور اٹھ کر نزاکت سے چلتی ہوئی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے موتیوں کی طرح جھلملاتے ہوئے دانت ستاروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ خود کار انداز میں وہ اٹھ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی جھجک اور تذبذب مفقود ہو چکا تھا۔

''خود کو کہاں اور کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' اس نے کھنکتے ہوئے لہجے میں آہستگی سے پوچھا۔

''مجھے لگ رہا تھا میں جنت میں ہوں۔ میرے آس پاس حوریں اور پریاں تھیں۔ اب وہ کہاں ہیں؟'' اس نے بے تابی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''وہ جا چکی ہیں۔ میں ہوں ناں تمہارے پاس۔ کیا میں خوبصورت نہیں ہوں؟'' وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے دلربائی سے بولی۔

''تم بہت حسین ہو۔'' اس نے غیر ارادی طور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

''یہ تو جنت کی ایک جھلک ہے اور تم یہاں چند لمحوں کیلئے آئے ہو۔ کیا تم مستقل میرے پاس رہنا چاہو گے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مستفسرانہ انداز میں بولی۔ اس کی مخروطی انگلیاں اس کے جسم پر متحرک تھیں۔ وہ خود کو کسی پر کیف جزیرے میں محسوس کر رہا تھا۔ اچانک اس کا حلق سوکھنے لگا۔ کمرے کے سرد ماحول میں بھی اسے پسینہ آ رہا تھا۔

''پانی لیکر آؤ'' وہ اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے دروازے کی طرف منہ کر کے قدرے بلند آواز میں بولی۔

دوسرے ہی لمحے ایک انتہائی دلکش لڑکی شیشے کے ایک گلاس میں پانی لیکر اندر داخل ہوئی۔ وہ اس کے سامنے پانی رکھ کر فوراً باہر چلی گئی۔ بہ ظاہر یہ نیم گلابی رنگ کا سادہ سا مشروب تھا، لیکن ایک گھونٹ بھرتے ہی وہ پرسکون ہو گیا۔ اسکے سامنے بیٹھی پری اسے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ بلا ارادہ اس نے سارا پانی ختم کر دیا۔

''میں تمہارے پاس ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رہنا چاہتا ہوں۔'' اس نے بے تاب لہجے میں کہا اور اس کا مرمریں ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اس کے جسم کی بھول بھلیوں میں کھو گیا تھا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی لیکن، اسے مقررہ حد سے تجاوز نہیں کرنے دیا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، لیکن اس کے لیے تمہیں قربانی دینا پڑیگی'' وہ اس کی گرفت سے نکلتے ہوئے بولی۔

وہ وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی تڑپ اور طلب کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔

''میں نے کب انکار کیا ہے۔ میں ہر قربانی کیلئے تیار ہوں'' وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

دفعتاً وہ پیچھے ہٹی اور دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

''ٹھیک ہے، تم حقی صاحب سے بات کرو۔ میں اب جا رہی ہوں'' اس سے پہلے کہ وہ اسے روکتا۔ حسن بیکراں کا تاج محل اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ مضطرب وجود اور منتشر جذبات کے ساتھ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

دیوار گیر کلاک پر ساڑھے چار بج رہے تھے۔ گویا یہ طلسماتی رات قریب الاختتام تھی۔ کچھ دیر بعد اذان کی آواز گونجنے لگی۔ خلاف معمول آج وہ متحرک نہیں ہوا۔ نہ ہی وہ نماز کی طرف مائل ہوا۔ وہ بے حس سا ہو کر چٹائی

پر پڑا چھت کو گھورتا رہا۔ چند لمحوں بعد وہی پری نما لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''چلو تمہیں بلا رہے ہیں'' کچھ دیر بعد وہ مولانا حقی کے روبرو تھا۔ وہ اپنے مخصوص تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں وہی پری اور قدوس بیٹھے ہوئے تھے۔

''مبارک ہو تمہیں چن لیا گیا ہے۔'' حقی گویا اسے بشارت دے رہا تھا۔ ''لیکن اس کیلئے تمہیں کچھ عرصہ یہاں سے دور جانا ہوگا۔ کچھ سیکھنا ہوگا، اور ارشی تمہارے ساتھ جائے گی۔ اس نے اپنے دائیں طرف بیٹھی ہوئی پری نما لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم تیار ہو؟''

''جی جناب میں تیار ہوں'' وہ سر کو خم کرتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

اس دوران قدوس ایک ڈسپوزیبل سرنج میں سبز رنگ کا گاڑھا سا محلول بھر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے وہ محلول اس کے بازو کی نس میں انجکٹ کر دیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

''پریشان مت ہو۔ اس سے تمہارے اعصاب مضبوط رہیں گے۔ یہ اللہ کا راستہ ہے۔ اس راستے پر تمہیں کئی لوگ ملیں گے، جو تمہیں گمراہ کرنے کی کوشش کریں گے۔'' حقی اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''گمراہ ہو جاؤ گے تو یہ موقع کھو بیٹھو گے۔ اللہ تم سے ناراض ہو جائے گا۔''

''میں ہمیشہ آپ کا ساتھ دوں گا جناب۔''

اس نے مودب لہجے میں کہا۔ ''حتیٰ کہ میں اپنی جان دینے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔''

''یہ جان تو آنی جانی ہے اس کی پروا کس کو ہے'' ارشی فلسفیانہ لہجے میں بولی۔ ''یہ زندگی بھی اللہ ہی کی دی ہوئی ہے۔''

حقی نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''کیا ہی اچھا ہو کہ اسی کی راہ میں قربان ہو جائے۔''

''سبحان اللہ۔'' تینوں نے بیک آواز کہا۔ حقی زیر لب مسکرا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد نیم اندھیرے میں وہ مدرسے کا صحن عبور کر رہے تھے۔ قدوس انہیں گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہی باریش آدمی براجمان تھا، جو اسے اور فوزیہ کو قدوس کے ساتھ یہاں لایا تھا۔ مسجد کے برآمدے میں نماز فجر ادا ہو رہی تھی۔ سپیدہ سحر سے پہلے وہ شہر کی حدود سے بہت دور نکل چکے تھے۔ عقبی سیٹ پر ارشی کے ساتھ بیٹھا ہوا قیصر گویا ہواؤں کے دوش پر منزل کی جانب گامزن تھا۔ شہر سے سیکڑوں میل دور ''رہبر انسانیت'' کا تربیتی مرکز، ترویج انسانیت لمحہ بہ لمحہ قریب آرہا تھا۔ وہ بارہا کن انکھیوں سے ارشی کو دیکھتا۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ پلکیں جھپکائے بغیر کسی غیر مرئی نکتے کو دیکھ رہی تھی۔ بے ساختہ قیصر کو دیکھتے ہی اسے نعمان یاد آ گیا تھا۔ اس نے اسے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ ماں باپ کا گھر بھی چھوڑ دیا، لیکن وہ پلٹ کر نہیں آیا۔ ایک دن قدوس نے اسے بتایا کہ نعمان روڈ ایکسیڈنٹ میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ وہ بہت روئی تھی۔ حقی اور قدوس اگر نہ ہوتے تو وہ قرب جاں سے کب کی گزر گئی ہوتی۔ تب سے اب تک وہ یہیں تھی۔ اسے باقاعدہ ٹریننگ دی گئی۔ اسلحہ مارشل آرٹ اور ڈرائیونگ پر اسے عبور حاصل تھا۔ کچھ عرصہ تک اسے مخصوص ادویات کے زیر اثر رکھا گیا، لیکن آہستہ آہستہ اس نے اس ماحول کو قبول کر لیا، کیونکہ اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا، ان کے پاس اس کی غیر اخلاقی ویڈیو بھی تھی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی، جس نے اس کے پاؤں باندھ رکھے تھے۔ اس نے پلٹ کر اپنے ماں باپ کی خبر تک نہیں لی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا باپ اسی رات موت کی سرحد عبور کر گیا تھا، جس رات اس نے گھر کی دہلیز سے قدم باہر رکھا تھا۔ نعمان کا اب بھی وہی معمول تھا، وہ محبت کے جھانسے میں خوبصورت لڑکیوں کو ورغلا کر یہاں لاتا تھا اور یہ لوگ انہیں اپنے گھناؤنے مقاصد کیلئے استعمال کرتے تھے۔ نعمان کے گھر والوں نے

اسے گھر سے نکال دیا تھا۔اس کی ماں اور جواں سال بہن شب وروز تڑپ رہی تھیں، جبکہ باپ نے دل پر صبر کا پتھر رکھ لیا تھا۔پھر جب یہ خبر ملی کہ نعمان اب اس دنیا میں نہیں رہا۔اس نے انتقام اور انتظار کے دروازے بند کر دیے تھے۔اس کے غیاب کو نعمان سے منسوب کیا گیا تھا،لیکن یہ بات کوئی ثابت نہیں کر سکا تھا۔اس دوران کاشف بھی دوبئی سے لوٹ آیا۔وہ تاج نگر سے اپنا مکان اونے پونے بیچ کر کہیں اور منتقل ہو گئے۔گاڑی برق رفتاری سے سفر کی طنابیں کھینچ رہی تھی۔دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔سڑک کے اس پاس مختلف انواع واقسام کے بلند وبالا درخت نظر آرہے تھے۔قطار در قطار بسیں ٹرک اور کاریں اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں دواں تھے۔چالیس منٹ بعد پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔سنگلاخ پتھروں کے سینے چیر کر بل کھاتی ہوئی سڑکیں بنادی گئی تھیں۔گاڑی مین سڑک سے اچانک ایک پتھریلی سڑک پر اتر گئی۔مزید پانچ منٹ بعد ایک طویل وعریض بلڈنگ نظر آنے لگی۔پختہ چاردیواری پتھروں کو کاٹ کر بنائی گئی تھی۔لکڑی کے ایک بڑے سے گیٹ کے سامنے مسلح محافظ چاق وچوبند کھڑا تھا۔ان کے پہنچتے ہی گیٹ فوراً کھل دیا گیا۔یہ تربیتی کیمپ تھا۔اندرونی مناظر دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

☆......☆......☆

وہ بیہوش نہیں تھی،اس کا ذہن بھی اس کی دسترس میں نہیں تھا۔وہ بدستور اسی چٹائی پر پڑی ہوئی تھی۔اندر داخل ہونے والی ایک لڑکی نے لباس فطرت کو غلاف دے دیا۔چند لمحوں بعد وہی لڑکی اسے ایک کڑوا کسیلا سا مشروب پلا رہی تھی۔ایک ایک گھونٹ اس کے حواس کی طنابیں کھینچ رہا تھا۔اس کی طبیعت بحال ہو رہی تھی۔ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ مکمل طور پر سنبھل گئی۔اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔اس نے اپنے اوپر پڑے کمبل کو ہٹایا اور لرز کر رہ گئی۔اس کا وجود اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ ذلت کدے میں بری طرح پامال ہو چکی ہے۔اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کسی غلط جگہ پر پہنچ گئی ہے۔مدرسہ "راہبر انسانیت" کی آڑ میں کیا گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔وہ یہ نہیں جانتی تھی لیکن یہ اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ نام نہاد مسلمان کسی گھناؤنی سازش کا حصہ ہیں۔بے ساختہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔اسے اپنے بیمار باپ کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ماں کی اداس آنکھیں اس کے سینے میں پیوست ہو رہی تھیں۔کاشف کا چہرہ اسے اذیت وذلت کے احساس سے مسخ ہوتا نظر آرہا تھا۔کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ذلتوں کے پاتال میں گر چکی تھی۔اس کی ہچکیاں بندھ گئیں لیکن تیر ترکش سے نکل گیا تھا۔چڑیاں کھیت چگ کر اڑ گئی تھیں۔وہ اپنے مضمحل اور پامال وجود کو سنبھالتے ہوئے اٹھی اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔اس کا چہرہ اس کے آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔نعمان کا خیال اس کے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔

"اس نے ایسا کیوں کیا؟ میں تو اس سے محبت کرتی تھی،اور اسی نے میرے پندار ہستی کو ریزہ ریزہ کر دیا۔اس نے بھرائی ہوئی آواز میں خود کلامی کی۔میں نے تو تمام رشتے توڑ کر اس کے ساتھ محبت امید اور وفا کا رشتہ استوار کیا تھا۔"

اچانک دروازہ کھلا اور وہی لڑکی اندر داخل ہوئی۔وہ اسے بے تاثر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"نعمان کہاں ہے؟"

اس نے لرزتی ہوئی آواز میں موہوم سی امید کے ساتھ پوچھا۔

"تم اب بھی اس کا پوچھ رہی ہو؟"

لڑکی نے کٹیلے لہجے میں کہا۔"تمہیں نہیں پتہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے"

اور وہ ایکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"لیکن وہ ایسا کیوں کریگا؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔"میں تو تھی ہی اس کی"

"یہاں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔یہ دنیا اغراض ومفادات کا بازار ہے۔سب کچھ برائے فروخت ہے۔عزت محبت احساس رشتے ناتے۔" لڑکی نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

"لیکن حقی صاحب۔"

"وہ یہاں نہیں تھے اس لیے تمہارے ساتھ ایسا ہوا۔"

لڑکی فوراً اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''اور اب اسے بھول جاؤ وہ جا چکا ہے۔''

''نہیں میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میں اسے بے نقاب کر کے چھوڑوں گی۔'' وہ اوپر اٹھتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے یہ تمہارا حق ہے لیکن پہلے کچھ دیکھ لو۔'' وہ لڑکی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی اور باہر نکل گئی۔

چند لمحوں بعد وہ ایک کلین شیو لڑکے کے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھی۔ لڑکے کے ہاتھ میں لیپ ٹاپ تھا۔ اس نے اس کے سامنے لیپ ٹاپ رکھا، اور چند بٹن دبا کر ایک ویڈیو پلے کر دی۔

وہ سرتاپا لرز کر رہ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو گھور رہی تھی۔ وہ مکمل برہنہ چٹائی پر پڑی تھی اور نعمان اسے بھنبھوڑ رہا تھا۔ اسے نوچ کھسوٹ رہا تھا۔ اس کی عزت کو تار تار کر رہا تھا۔ اس نے ایک فلک شگاف چیخ کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں۔ لڑکا لیپ ٹاپ اٹھا کر چلا گیا تھا۔

''تمہارے پاس اب کوئی راستہ نہیں ہے ارشی۔'' لڑکی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''تم ایک ہی نہیں یہاں سیکڑوں لڑکیاں ہیں اور نعمان جیسے لڑکے محبت کا جھانسہ دے کر لڑکیوں کو ورغلا کر ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہ ویڈیو اگر انٹرنیٹ پر دیدی جائے تو سوچو کیا ہوگا؟ تمہارا بھائی باپ اور خاندان زندہ درگور ہو جائیں گے۔''

وہ پتھر کی مورت بنی یک ٹک اسے گھورتی رہی۔ اس کی قوتِ گویائی گویا سلب ہو چکی تھی۔

''اٹھو اور فریش ہو کر کپڑے بدل لو اب تم نے یہیں رہنا ہے۔'' وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

وہ اپنی لہولہو حسرتوں کے دریدہ دامن کو سمیٹتے ہوئے اٹھی اور اس لڑکی کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں اسے اس کے سائز کا لباس بھی مل گیا۔ وہ غسل کر کے بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ لڑکی ترحم آمیز نظروں اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ لڑکی حقی کی آلۂ کار تھی۔

وقت اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ گزرتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس نے حالات سے سمجھوتہ بھی کر لیا، لیکن لاشعوری طور پر اسے نعمان کا انتظار تھا۔ وہ اس سے ملنا چاہتی تھی۔ صرف ایک بار پوچھنا چاہتی تھی کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا یہ انتظار لاحاصل ٹھہرا۔ حقی کا رویہ اس کے ساتھ بہت مشفقانہ تھا، لیکن یہ بھی منافقت کا گھناؤنا کھیل تھا۔ اس نے حقی کو ہمدرد سمجھ کر اس پر اعتبار بھی کر لیا تھا اور اس کے اشاروں پر ناچ رہی تھی۔ ایک دن حقی کی زبانی معلوم ہوا کہ نعمان روڈ ایکسیڈنٹ میں مر چکا ہے۔ اسے قرار سا آ گیا۔ اس کا انتظار اس خبر کے ساتھ ہی دم توڑ گیا۔ کچھ دن بعد اسے قدوس کے ساتھ تربیتی کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ کئی مہینے تربیت حاصل کرتی رہی۔ اس نے ہمہ قسم کا خطرناک اسلحہ چلانا سیکھ لیا، لیکن ابھی تک وہ یہ نہیں سمجھ پائی تھی کہ یہ لوگ کون ہیں اور ان کے اتنے وسیع نیٹ ورک کا مقصد کیا ہے۔ پھر وہ ایک اہم رکن بن گئی۔ آئے دن لڑکیاں لائی جاتی تھیں۔

وہ انہیں مطمئن کرتی۔ انہیں تربیت دیتی۔ حقی کئی کئی دن ملک سے باہر رہتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں وہ اور قدوس ہی کرتا دھرتا تھے۔ یہاں رہ کر وہ مزید نکھر گئی تھی۔ اس کے حسن کی جولانیاں اور حشر سامانیاں عروج پر تھیں۔ اس نے اپنے بال بوائے کٹ کروالیے تھے۔ وہ ہر وقت سیاہ چشمہ لگائے رکھتی تھی۔ مختلف شہروں کے علاوہ اپنے شہر میں بھی جاتی، تاہم اسے پہچانے جانے کا خدشہ نہیں تھا۔

یہیں اس کی ملاقات فوزیہ سے بھی ہوئی۔ وہ دوسری ملاقات میں ہی اچھی دوست بن گئیں۔ اسے حیرت ہوئی جب اسے معلوم ہوا کہ فوزیہ کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا جو اس کے اور دیگر لڑکیوں کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے کئی بار اسے کریدا لیکن اس نے ہر بار خوبصورتی سے، پھر کبھی بتاؤں گی کہہ کر ٹال دیا۔ لاشعوری طور پر وہ اس کھوج میں تھی کہ اس مدرسے میں کیا ہوتا ہے۔ یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ یہ تو اسے معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکیاں نئے آنے والے لڑکوں کو برین واش کرنے کیلئے استعمال کی جاتی ہیں۔ انہیں حوریں اور پریاں بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ خاص مشروب نوجوانوں کے حواس کو معطل کر کے ایک پرسکون احساس دیتا تھا۔ ایک دن وہ شہر کے مین بازار میں شاپنگ کیلئے قدوس کے ساتھ گئی۔ ان کے پاس وہی ہائی لکس

فور سیٹر تھا۔ قدوس ابھی بازار میں ہی تھا جبکہ وہ اپنی مطلوبہ اشیا خرید کر اس سے پہلے واپس آ گئی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اچانک سامنے نظر پڑتے ہی وہ اچھل پڑی۔ زاہدہ اور کاشف رکشے سے اتر کر بازار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ کیسے بھول سکتی تھی اپنی ماں اور بھائی کو۔ ماں کافی سے زیادہ لاغر اور بوڑھی لگ رہی تھی۔ کاشف مزید نکھر کر ایک بھرپور نوجوان بن گیا تھا۔ سادہ سی بلیو کلر شلوار قمیص میں وہ ہینڈسم لگ رہا تھا۔ وہ ڈوبتی نبضوں کے ساتھ انہیں دیکھتی رہی۔

اس کی پلکوں پر نمی تیرنے لگی۔ وہ دونوں سست روی سے چلتے ہوئے اس کی گاڑی کے پاس سے گزر رہے تھے۔ اس نے غیر ارادی طور پر شیشہ نیچے کر دیا۔

اسی لمحے زاہدہ کی سرسری نظر اس پر پڑی۔ وہ ایک لمحے کو ٹھٹکی۔ اس کی بے رنگ سی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری۔

''اماں چلو بھی کیا ہوا رک کیوں گئیں؟''

کاشف کی آواز نے اس کے ضبط کے بند توڑ دیے۔ اس کی آنکھوں کے پیمانے چھلک پڑے۔ وہ ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ سست روی سے چلتے ہوئے قلب و لہو کے خالص رشتے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ کافی دیر اسی طرح بیٹھی رہی۔ قدوس ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ اس نے اپنی ماں اور بھائی کے پیچھے جانے کا ارادہ کیا۔ اسی لمحے اس کی بوڑھی ماں اس کے سامنے نمودار ہوئی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ ارشی نے خود کو بمشکل سنبھال لیا تھا اور الجھی ہوئی نگاہوں سے بوڑھی ماں کو دیکھنے لگی۔ وہ گاڑی کے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے آنٹی۔۔؟'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''آپ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں کوئی کام ہے یا ضرورت؟''

''ار۔۔۔ار۔۔۔۔ارشین'' زاہدہ بی بی نے کانپتی ہوئی آواز میں بمشکل کہا۔ ''مم۔۔۔ میں کیسے بھول سکتی ہوں۔''

''ارشین کون اور آپ کون ہیں؟'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ''آپ شاید بھول رہی ہیں۔''

''ماں کیسے بھول سکتی ہے بیٹی کی آواز کو اس کے لب ولہجے کو، اس کی شکل وصورت کو۔'' وہ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔ ارشی کا جگر کٹ رہا تھا، لیکن وہ مسلسل انکار کر رہی تھی۔

''پتہ نہیں تم کیا کہہ رہی ہو اگر کچھ پیسوں کی ضرورت ہے تو لے لو۔''

اس نے اپنے قیمتی پرس میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

اس نے اپنے نحیف کانپتے ہوئے ہاتھ میں وہ نوٹ پکڑ لیے۔ اس کا لرزتا ہوا ہاتھ ارشی کے ہاتھ کے ساتھ مس ہوا۔ اس نے تڑپ کر ہاتھ پیچھے کر لیا۔ ممتا کا نایاب لمس اس کی روح تک کو سرشار کر رہا تھا۔

''یہ ماں کی ممتا کی قیمت دے رہی ہو ارشی۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''اپنے باپ کو تم نے کیا قیمت دی؟ اس کی پدرانہ شفقت کی، ایک بے رنگ سی بے رحم سسکتی ہوئی موت۔''

''کیا؟'' بے ساختہ اس نے تڑپ کر کہا۔

یک بارگی اسے احساس ہوا کہ وہ ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھی ہے۔ ''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ کون ہیں آپ شاید آپ کا دماغ ٹھیک نہیں، جایئے۔''

اس نے چلا کر کہا۔ آنسو اس کی پلکوں کا دامن چھوڑ چکے تھے۔ باپ کی موت کی خبر نے اسے لرزا کے رکھ دیا، لیکن وہ آنسوؤں کی طرح گھر سے نکلی تھی۔ واپسی کا خیال بھی ناممکن تھا۔ اب اسے کون دل میں جگہ دیتا۔ کون اسے اپنی غیرت اور عزت تسلیم کرتا۔ اسی دوران قدوس آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

وہ زاہدہ کو الجھی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ زاہدہ نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نوٹ ارشی کی جھولی میں پھینکے اور روتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ وہ کاشف کو بازار میں چھوڑ کر بیٹی سے ملنے آئی تھی۔ ماں کیسے بھول سکتی ہے اپنی اولاد کو اولاد جیسی بھی ہو جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ ماں تو خوشبو سے پہچان لیتی ہے۔ زاہدہ نے بھی بیٹی کو پہچان لیا تھا۔ ارشی اسے واپس جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ بمشکل سڑک کراس کر رہی

تھی۔ دفعتاً وہ ایک تیز رفتار کار سے ٹکرائی، اچھل کر سڑک پر گری اور لہولہان ہو کر ساکت ہو گئی۔ مرنے کے بعد بھی اس کی کھلی ہوئی آنکھیں ارشی کی گاڑی پر مرکوز تھیں اور پھر وہ آنکھیں لوگوں کی بھیڑ میں اوجھل ہو گئیں۔ ارشی ایک دلخراش چیخ کیساتھ بیہوش ہو گئی۔

☆......☆......☆

ڈرائیور نے گاڑی آہستگی سے اندر داخل کر کے ایک طرف کھڑی کر دی۔ وہ ارشی کے ساتھ نیچے اتر کر تربیتی کیمپ کے اندرونی ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ اندر سے کیمپ بہت زیادہ وسیع وعریض اور کشادہ تھا۔ ایک طرف قطار در قطار کئی خیمے نظر آ رہے تھے۔ ان میں بعض خیمے بہت بڑے اور کشادہ تھے۔ متعدد نوجوان لڑکے لڑکیاں مختلف کاموں میں مصروف نظر آئے۔ کوئی ورزش کر رہا تھا۔ کوئی نشانہ بازی سیکھ رہا تھا۔ کچھ نوجوان دو بدو فائیٹ کر رہے تھے۔ یہ سب کام ماہر اساتذہ کی زیر نگرانی ہو رہے تھے۔ ایک طرف پتھریلی زمین پر صفیں بچھی ہوئی تھیں، یہ بظاہر ایک دینی درسگاہ تھی۔

متعدد تجیم باریش افراد بھی نظر آئے جو کہ یقیناً اساتذہ تھے۔ نوجوانوں نے سفید رنگ کی سادہ سی شلوار قمیصیں پہن رکھی تھیں۔ ارشی اسے ساتھ لے کر ایک خیمے کی طرف بڑھنے لگی۔ سرخ رنگ کی پیراشوٹ شیٹ سے تیار کیا گیا یہ خیمہ یہاں کے سربراہ بشیر سلفی کا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ اس کے روبرو بیٹھے تھے۔ انہیں لیکر آنے والا ڈرائیور واپسی کیلئے روانہ ہو گیا تھا۔ بشیر سلفی ایک صحت مند اور ہٹا کٹا آدمی تھا۔ اس کی عمر پچاس سے کم تھی۔ لمبی داڑھی اور شانوں تک جھولتی ہوئی سیاہ زلفوں میں چاندی کی تاریں اس کی ڈھلتی ہوئی عمر کی نشان دہی کر رہی تھیں۔ وہ سرخ وسفید رنگت کا حامل خاصا وجیہہ آدمی تھا۔

اس نے گرمجوشی کے ساتھ قیصر سے مصافحہ کیا، جبکہ ارشی کی طرف زیر لب مسکرا کر دیکھنے پر اکتفا کیا۔ خیمے میں پتھریلی زمین کو ہموار کر کے اس کے اوپر چٹائی بچھا دی گئی تھی۔ ایک طرف کونے میں دو بستر اور اس کے علاوہ ضرورت کا مختصر سا سامان رکھا ہوا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آ گئے۔ قہوے کی پیالیاں ان کے سامنے رکھی ہوئی تھیں۔

''نیا پرندہ۔۔۔ کچھ پرواز بھی جانتا ہے یا نہیں؟'' سلفی نے قدرے خوشگوار لہجے میں استفسار کیا۔ ''یا اس پر بھی تمہاری طرح بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی؟''

''جناب یہ نو وارد ہے، حقی صاحب نے اس کیلئے خصوصی تاکید کی ہے'' وہ مودب لہجے میں گویا ہوئی۔

''حقی صاحب کا حکم سر آنکھوں پر، ویسے بھی ہم یہاں بیٹھے کس لیے ہیں؟'' اس نے قہوے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو یہ سونا بہت جلد کندن بن جائیگا۔''

قیصر قہوہ پیتے ہوئے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ ابھی تک اسی انجکشن کے زیر اثر تھا۔ مذکورہ انجکشن چوبیس گھنٹے تک بندے کو اپنے زیر اثر رکھتا ہے اس دوران اسے جو کہا جائے وہ بے چون وچراں مان لیتا ہے۔ جو پوچھا جائے فوراً بتا دیتا ہے۔ مختصر سی نشست کے بعد انہیں ان کے خیمے میں کچھ دیر آرام کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ اور پھر اس کی تربیت کا مرحلہ شروع ہو گیا۔

تربیتی کیمپ میں اس کے شب وروز انتہائی مصروف اور مشکل ثابت ہو رہے تھے، لیکن اللہ کے قرب کی خواہش نے اس کے حوصلے کو متزلزل نہیں ہونے دیا۔

یہاں اسے وعظ ونصیحت کے ساتھ ساتھ اسلحے کی مکمل ٹریننگ مارشل آرٹ ڈرائیونگ اور بہت کچھ سکھایا جا رہا تھا۔ اس نے اے کے سینتالیس راکٹ لانچر کے ٹو اسنائپر گن دستی بم اور خود کش جیکٹ کا استعمال بھی سیکھ لیا تھا۔ وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ ارشی کے ساتھ ہر پل رہنا بھی اسے اچھا لگ رہا تھا۔

وہ ایک ہی خیمے میں رہ رہے تھے لیکن ارشی بلا کی تیز طرار اور تجربہ کار لڑکی تھی۔ وہ بھی اب پہلے والا سیدھا سادہ قیصر نہیں رہا تھا۔ یہاں اس کی سوچ کی گرہیں کھل رہی تھیں۔ ذہن کے بند دریچے وا ہو رہے تھے۔ اس کی جھجک اور سادہ پن ختم ہو گیا۔ یہاں انہیں پندرہواں روز تھا۔

وہ کئی کئی میل دوڑ رہا تھا۔ دل جمعی سے ورزش کر رہا تھا۔ انہماک وتوجہ سے اسلحے کا استعمال سیکھ رہا تھا۔ سلفی ایک ماہر استاد ثابت ہوا۔ یہ کمانڈو ٹریننگ تھی۔ اب وہ اکیلا ہی کئی مد مقابل آدمیوں کو ناکوں چنے

چھوا سکتا تھا۔مزید پندرہ دن بعد سلفی نے او کے کا سگنل دے دیا تھا۔

لیکن ارشی کے اصرار پر وہ وہاں مزید ایک مہینہ اور رکے۔اس دوران وہ ایک تربیت یافتہ مجاہد بن گیا۔

حیرت انگیز طور پر ارشی نے اسے مزید انجکشن نہیں دیا، تاہم وہ بدستور اس کا تابع اور گرویدہ تھا۔انہیں یہاں دو ماہ مکمل ہو گئے۔اگلی صبح ان کی روانگی تھی۔آج سردی بہت شدید تھی اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔وہ اپنے خیمے میں کمبلوں میں گھسے باتیں کر رہے تھے۔خیمے میں زیرو پاور بلب کی سرخ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔وہ عشا کی نماز پڑھ کر کھانا کھا چکے تھے۔ارشی اپنے بستر پر بیٹھی کسی گہری سوچ میں مستغرق نظر آرہی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''اس نے اٹھتے ہوئے استفسار کیا۔

''کچھ نہیں بس یہی کہ کل ہماری واپسی ہے''

''اس میں سوچنے والی کیا بات ہے میں تو بہت خوش ہوں اللہ سے قرب کا وقت نزدیک آرہا ہے''

اس نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

''کیا تم واقعی اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہو؟''اس نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔''یہ لوگ جو کہتے ہیں کیا ایسا ہی ہے؟''

''میں کچھ بھی نہیں سوچتا میں تو بس اللہ کا قرب چاہتا ہوں اور جنت دیکھنے کا خواہش مند ہوں''

''ہمم۔۔۔۔گویا تم ابھی تک الو کے الو ہی ہو''وہ یاسیت سے بولی۔''تمہیں پتہ ہے میں نے تمہیں انجکشن دینا کیوں بند کر دیا تھا؟''وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔''جبکہ سب کو پتہ ہے کہ تمہیں ہر چوبیس گھنٹے بعد انجکشن دیا جا رہا ہے۔''

''نہیں میں نے کبھی غور نہیں کیا البتہ مجھے یہیں کسی نے بتایا ہے کہ وہ انجکشن کس لیے ہوتا ہے۔''

''ہاں چلو اچھا یہ تمہیں پتہ چل گیا۔''وہ آہستگی سے بولی۔

''وہ انجکشن تمہیں تابع رکھنے کیلئے تھا،لیکن تم تو ویسے ہی تابع اور معمول ہو،میں چاہتی تھی کہ تم اپنے ذہن سے سوچو اور فیصلہ کرو کہ ہم کہاں اور کیوں ہیں۔''

''اچھا کہاں ہیں ہم؟''وہ سادگی سے بولا۔

''سب کو پتہ ہے کہ ہم اللہ کی راہ پر ہیں اور اس کی رضا کیلئے یہ سب کر رہے ہیں۔''

''تمہارا مطلب وہاں جو لڑکیوں کی عزتیں لٹتی ہیں۔بے ہودہ موویز بنتی ہیں۔انہیں بلیک میل کیا جاتا ہے۔نشہ آور مشروب پلا کر معمول بنایا جاتا ہے۔نیم برہنہ لڑکیوں کو حوریں اور پریاں بنا کر پیش کیا جاتا ہے،یہ اللہ کا راستہ ہے؟''اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔وہ اسے حیرت سے یک ٹک دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے تو کبھی ایسا نہیں سوچا۔''وہ الجھے ہوئے فکر انگیز لہجے میں آہستگی سے بولا۔''ارشی۔۔۔یہ سب کیا ہے۔۔۔کیوں ہے؟''

''تم نے اس لیے نہیں سوچا کہ تمہیں سوچنے نہیں دیا گیا۔تمہارے ذہن میں وہی باتیں بیٹھ گئی تھیں جو انہوں نے بتائی تھیں۔جو تمہاری مالکن فوزیہ نے کہا تھا،لیکن۔۔۔۔''

''لیکن کیا؟''وہ بے تابی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''سچ یہ ہے کہ یہ اللہ کے قرب کا نہیں یہ اللہ سے دوری کا راستہ ہے۔یہ اللہ کے نیک بندے نہیں ہیں۔یہ سب دہشت گرد ہیں۔دین اسلام اور امن کے دشمن،ملک میں انتشار پھیلا رہے ہیں ذہنوں میں زہر بھر رہے ہیں،اس سے آگے مجھے نہیں پتہ یہ کیا کرتے ہیں لیکن یہ بات کنفرم ہے کہ یہ غلط لوگ ہیں۔''

ایک دم وہ چونک سا گیا۔وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔اس کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔

''یعنی۔۔۔۔یعنی ہم ان کے مہرے ہیں؟''وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔''تم نے صحیح کہا مسجدوں اور دینی درسگاہوں میں تو ایسا نہیں ہوتا۔''

''ہاں اب تم اپنے ذہن سے سوچو ہمیں ان کا تابع بن کر رہنا ہے۔ان کی جڑوں تک پہنچنا ہے۔میں کیپٹن ارباز شیر خان کو جانتی ہوں۔موقع اور ثبوت ملتے ہی ہمیں اس گروہ کا نیٹ ورک تباہ کرنا ہے۔''وہ اس کا ہاتھ گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہہ رہی تھی''ہاں،یہ اللہ کے قرب کا راستہ ہے۔اس سے ملنے کی سبیل ہے۔''

وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ارشی نے اسے اپنی کہانی بھی سنادی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ مستقبل کا لائحہ عمل تیار کر چکے تھے۔ علی الصبح انہیں یہاں سے نکلنا تھا۔ رات دبے پاؤں گزر رہی تھی۔

اچانک ان کے خیمے کا پردہ متحرک ہوا۔

ہاتھ میں جدید پسٹل تھامے بشیر سلفی ان کے سامنے کھڑا انہیں قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔

''خبردار حرکت نہ کرنا میں نے تمہاری ساری باتیں سن لی ہیں۔'' وہ غرا کر بولا۔

''موسم کی خرابی کی وجہ سے حقی صاحب سے بات نہیں ہو پا رہی ورنہ انہیں ابھی تمہارا کچا چھٹا بتا دیتا۔ اب تم ہماری حراست میں ہو۔ صبح تک تمہاری لاشیں بھی نہیں ملیں گی۔''

وہ اکیلا ہی ان کے خیمے میں گھس آیا تھا۔ خطرناک پستول موت اگلنے کیلئے اس کے ہاتھ میں بیتاب تھا۔

اچانک تیز ہوا سے خیمے کا پردہ متحرک ہوا، سلفی نے ایک لمحے کے لئے ادھر دیکھا اور یہی ایک لمحہ ارشی کو درکار تھا۔ وہ ایک دم اوپر اچھلی اور تیزی سے اس کے پستول والے ہاتھ کی کلائی پر گھونسہ مارا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں گر گیا۔ اسی دوران قیصر نے پستول نکال کر اس پر تان لیا تھا۔

''خبردار سلفی۔۔۔اب اگر تم نے حرکت کی تو وہ تمہاری آخری حرکت ہوگی۔ میں بے دریغ گولی چلا دوں گا۔''

وہ سفاک لہجے میں غرایا۔ ''تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ کچھ بھی کر لو تم بچ نہیں پاؤ گے۔''

''ہمیں چھوڑو اور اپنی خیر مناؤ۔'' اس نے سفاک لہجے میں سرگوشی کی اور ایک دم پستول کا دستہ زور سے اس کی کنپٹی پر مارا۔ وہ تحیر زدہ آنکھوں کے ساتھ تیورا کر نیچے گرا اور بے سدھ ہو گیا۔ اس دوران ارشی نے اپنے بیگ سے چھوٹی سی شیشی برآمد کی۔ جس میں گہرے کلر کا گاڑھا سیال نظر آ رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے سرگوشی کی۔

''یہ انتہائی سریع الاثر زہر ہے۔ اس کے ایک ہی قطرے سے انسان کا جسم گل سڑ کر ہڈیوں سے جدا ہو جاتا ہے۔'' وہ اسے آہستگی سے بتانے لگی۔

''دیکھنے والے یہی سمجھتے ہیں کہ کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہے، ویسے بھی ان پہاڑی علاقوں میں بہت زہریلے سانپ پائے جاتے ہیں۔''

''تمہیں یہ کہاں سے ملا؟''

''یہ بھی کسی نے دیا تھا۔ تم اسے اس کے خیمے میں پہنچاؤ۔ اس کا وہیں مرنا بہتر رہے گا۔''

اس نے شیشی کو آہستگی سے ہلاتے ہوئے سرگوشی کی۔

کچھ دیر بعد وہ اسے کاندھے پر اٹھا کر اس کے خیمے میں پہنچ گیا۔ ارشی نے اس کا منہ کھول کر اس میں زہر کا ایک قطرہ ٹپکا دیا۔ وہ انتہائی خاموشی کے ساتھ بیہوشی کے عالم میں موت کی نیند سو گیا۔ چند ہی لمحوں بعد اس کا جسم گلنا شروع ہو گیا۔ وہ اس کے خیمے سے نکل کر اپنے خیمے میں آ گئے۔ رات اضطراب کے عالم میں محو سفر تھی۔ جیسے تیسے رات گزر گئی۔ اذان فجر سے پہلے ان کی گاڑی پہنچ گئی۔ تربیتی کیمپ سے ''راہبر انسانیت'' کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ مدرسۂ راہبر انسانیت، جہاں انسانیت کا گزر تک نہیں تھا۔ جہاں بھیڑ کی کھال میں خطرناک بھیڑیے ان کے منتظر تھے۔

☆......☆......☆

کون تھا جو ملک میں بڑھتی ہوئی دہشت گری، قتل و غارت گری اور خون ریزی سے پریشان نہیں تھا۔ ہر خاص و عام شہری احساسِ عدم تحفظ کا شکار تھا۔ آئے دن بم بلاسٹ خودکش حملے ٹارگٹ کلنگ اور ایسے واقعات سے جنم لینے والے فرقہ وارانہ فسادات و سیاسی مسائل دن بہ دن بڑھ رہے تھے۔

پرہجوم مقامات مساجد اور امام بارگاہوں پر خودکش حملے، بچوں کے اسکول میں دہشت گردوں کی خونی کارروائی، بسوں میں مسافروں پر اندھا دھند فائرنگ، ٹارگٹ کلنگ، اغوا برائے تاوان، گھر سے نکلتے ہوئے واپسی کا امکان صفر کے برابر تھا، کیا پتہ کہاں بم بلاسٹ ہو جائے۔ کب کوئی خودکش حملہ آور ہجوم میں گھس آئے۔ کہاں کوئی اندھا دھند فائرنگ کی بھینٹ چڑھ جائے۔ کس کی لاش کو بوری میں بند کر کے کسی بازار کی نکڑ یا چوراہے پر پھینک دیا جائے۔ ایسے نامساعد خونی حالات میں احساسِ عدم تحفظ کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے؟ ارباب اقتدار محض ایک رٹا رٹایا جملہ بول

کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔۔ "مذمت "لیکن مذمت سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ملک دشمن عناصر مذمت کا لفظ سن کر قہقہہ لگاتے ہیں، اور نئی کارروائی کے تانے بانے بننے بیٹھ جاتے ہیں۔قانونی اداروں کی حتی المقدور کوششوں کے باوجود دشمن کوئی نہ کوئی ایسا وار کر جاتا ہے، کہ روح تک لرز کر رہ جاتی ہے۔قابل صد افسوس اور مقام فکر یہ ہے کہ پاکستان میں غیر ملکی دشمن عناصر کا نیٹ ورک بہت مضبوط اور وسیع و عریض ہے۔اس میں گھر کے بھیدیوں کا عمل دخل اور تعاون بہت زیادہ ہے۔اس گھر کو گھر کے چراغ ہی آگ لگا رہے ہیں۔

"احمد مارکیٹ میں خودکش حملہ"

"حملہ آور برق رفتاری سے بھاگتا ہوا ہجوم میں گھس گیا۔پانچ سیکنڈ بعد ایک ساعت شکن دھماکا۔حملہ آور کے ساتھ متعدد شہریوں کے چیتھڑے اڑ گئے۔"

نیوز چینل پر اس روح فرسا خبر نے کیپٹن ارباز شیر خان کو لرزا کے رکھ دیا۔شام سے کچھ دیر پہلے وہ اپنے آفس میں چائے پی رہا تھا، جب یہ خبر اس کے اعصاب پر بجلی بن کر گری۔

"حملے میں میں مرنے والوں کی تعداد چھیاسٹھ بتائی جا رہی ہے، جن میں چھ بچے اور گیارہ خواتین بھی شامل ہیں۔پولیس اور آرمی کی اسپیشل فورس بم ڈسپوزل ٹیم کے ساتھ جائے وقوعہ پر پہنچ چکی ہے۔"

ٹی وی اینکر افسردہ لہجے میں بتا رہی تھی۔

"مشکوک افراد کو گرفتار کیا جا رہا ہے"

کیپٹن ارباز شیر خان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

ملکی حالات کے پیش نظر حال ہی میں حکام بالا کی ہدایت پر "محافظ" کے نام سے ایک خفیہ ادارہ تشکیل دیا گیا تھا۔ جس کیے لیے آرمی کے تربیت یافتہ اسپیشل فورس کے جوان منتخب کیے گئے۔انہیں شہر سے قدرے دور ایک غیر آباد مقام پر ایک کوٹھی دی گئی تھی۔وہ سول کپڑوں میں مختلف مقامات پر شب و روز تعینات رہتے تھے۔اس کے تمام اختیارات کیپٹن ارباز شیر خان کو دیے گئے تھے۔وہ کسی بھی وقت کوئی بھی اہم فیصلہ کر سکتا تھا۔ان کے پاس جدید ترین اسلحہ۔برق رفتار مضبوط گاڑیاں اور دیگر تمام سہولیات موجود تھیں۔کوٹھی کے ایک کمرے کو آفس کی شکل دیدی گئی۔جس میں ٹیلی فون انٹرنیٹ اور ٹی وی کی سہولیات بھی دستیاب تھیں۔

کیپٹن ارباز ایک جواں سال اور نڈر آفیسر تھا۔اسے وطن اور وطن کے لوگوں سے از حد محبت تھی۔وہ ٹیررسٹ آپریشن میں بھی کئی مہینے دشمن سے برسرِ پیکار رہا تھا۔اب حکام بالا کے اسپیشل آرڈر پر اس نے یہ محاذ سنبھال لیا۔اس کے پاس بارہ سرفروش سپاہیوں کا دستہ تھا۔

وطن سے محبت اس کے خون میں شامل تھی۔اس کے والد آرمی میں میجر تھے جو 71ء کی جنگ میں وطن پر قربان ہو گئے۔دنیا میں اس کا اپنی ماں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ماں اور وطن سے محبت ہی اس کا کل اثاثہ اور مقصدِ حیات تھی۔وہ وجیہہ وشکیل اور خوش مزاج واقع ہوا تھا۔خودکش حملے میں مرنے والوں کی تعداد بتدریج بڑھ رہی تھی۔احمد مارکیٹ اس کے آفس سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھی۔وہ سادہ لباس میں اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہوا۔

شام کا اندھیرا سیاہی کی چادر تان رہا تھا۔ان کی پرائیویٹ گاڑی سبک روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔کچھ دیر بعد وہ جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔

چاروں طرف پولیس اور آرمی کے جوان نظر آ رہے تھے۔کچھ فاصلے پر لوگوں کا ہجوم، اور مرنے والوں کے اعزا و اقرباء کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔متعدد لوگ چیختے چلاتے اپنے عزیزوں کی لاشوں سے لپٹے ہوئے تھے۔یہ ایک پرہجوم مارکیٹ تھی۔شام کے وقت شاپنگ کرنے والوں کا رش بڑھ جاتا۔یہی وجہ ہے کہ حملہ آور نے اسے ٹارگٹ بنایا۔سڑک پر جابجا خون کے چھینٹے اور گوشت کے لوتھڑے نظر آ رہے تھے۔بکھرے ہوئے انسانی اعضا، اور آہ و بکا، اک قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔سب آنکھیں اشکبار ہونے لگیں۔اسے بھی اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"السلام علیکم "ایک بھاری آواز نے اسے چونکا دیا۔اس نے آواز کا تعاقب کیا۔اس کے سامنے انسپکٹر پاشا کھڑا تھا۔

وہ کیپٹن ارباز کو ذاتی طور پر بھی جانتا تھا تاہم وہ اس

کے خفیہ مشن سے لاعلم تھا۔
"وعلیکم السلام کیا حال ہیں پاشا؟" اس نے افسردہ لہجے میں استفسار کیا۔ "کچھ پیش رفت ہوئی؟ کوئی سراغ۔۔۔"
"نہیں سر دھماکا خیز مواد بہت زیادہ تھا۔ حملہ آور کے ٹکڑے ناقابل شناخت ہیں۔"
پاشا تفصیل بتانے لگا۔ وہ جائے وقوعہ سے کچھ فاصلے پر موجود تھے۔ کیپٹن ارباز اس سے آگے نہیں جاسکتا تھا کیونکہ وہ سادہ لباس میں خفیہ مشن پر تھا۔
"یہ ایک مہینے میں تیسرا حملہ ہے اور ہم کچھ بھی نہیں کر پارہے۔" ارباز نے تاسف سے کہا۔
"سر دشمن اچانک حملہ آور ہوتا ہے۔ پشت پر وار کرتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی سراغ ثبوت اور نشان نہیں چھوڑتا۔" پاشا سنجیدگی سے بولا۔ "ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جاتے ہیں۔ اس حملہ آور کے بھی چیتھڑے اڑ گئے ہیں۔ وہ چیتھڑوں میں تبدیل ہو کر مرنے والوں کے گوشت کے ٹکڑوں میں شامل ہو گیا ہے۔"
"یہ سلسلہ تب تک چلتا رہے گا جب تک ہم دشمن کو منہ توڑ جواب نہیں دیں گے۔" وہ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔ مشکوک افراد میں سے کوئی کام کا بندہ ہے؟"
"نہیں سر مجھے تو سب بے ضرر لگ رہے ہیں۔ یہ تو بس فارمیلٹی ہے سر، ان سے پوچھ تاچھ کے بعد انہیں چھوڑ دوں گا۔"
اسی دوران ایک اہلکار ان کے پاس پہنچا۔
"سر بم ڈسپوزل ٹیم کا کہنا ہے کہ حملہ آور مرد نہیں ،عورت تھا۔" اس نے پاشا کو آگاہ کیا۔
"کچھ ایسے ہی شواہد ملے ہیں جہاں دھماکا ہوا ہے۔ وہاں سے ایک عورت کا سر ملا ہے۔ اس کا چہرہ اڑ گیا ہے البتہ بال محفوظ ہیں۔"
وہ گہرا سانس لے کر کیپٹن کی طرف دیکھنے لگا۔ جائے وقوعہ سے لاشوں کے ٹکڑے اٹھائے جارہے تھے۔
قطار در قطار ایمبولینسز اور ریسکیو والوں کی گاڑیاں، بکھری ہوئی لاشیں، خون کا سیلاب اور لوگوں کی چیخ و پکار نے اسے لرزا کے رکھ دیا۔ وہ پاشا سے مصافحہ کرکے نمناک نگاہوں کے ساتھ اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک اپنے پرسنل سیل فون کی رنگ ٹیون نے اسے چونکا دیا۔ اس نے جیب سے سیل فون نکالا۔ اسکرین پر فوزیہ کا نام جگمگا رہا تھا۔ فوزیہ سے کچھ ماہ پہلے ایک تقریب میں اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اس کے باپ مظہر زمان کو نام کی حد تک جانتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تعارف میں دقت نہیں ہوئی۔ ان کا تعلق محض دوستی کی حد تک محدود تھا۔
"میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں ارباز۔" کال ریسیو ہوتے ہی اس نے بلاتمہید کہا۔ "بہت اہم بات کرنی ہے۔"
"دیکھیں فوزیہ ابھی حالات بہت مخدوش ہیں اور آپ نے سن ہی لیا ہوگا کہ۔۔۔"
وہ اسے موجودہ صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔
"جی میں نے بھی اسی حوالے سے بات کرنی ہے" وہ اس کی بات کاٹ کر آہستگی سے بولی۔ "پلیز جلدی بتائیں میں کہاں آؤں؟"
"اوکے میں تمہیں کچھ دیر بعد بتاتا ہوں۔" اس نے تشویش زدہ لہجے میں کہا اور کال منقطع کردی۔
فوزیہ موجودہ صورت حال کے تناظر میں کیا کہنا چاہتی ہے۔ کیا وہ کچھ جانتی ہے؟ عین ممکن ہے اس کے پاس کوئی سراغ ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسے کال کررہا تھا۔

☆......☆......☆

سیون اسٹار ہوٹل کے ساؤنڈ پروف کمرے میں ایک بڑی سی گول میز کے اردگرد چھ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جن میں چار کرسیوں پر ملک کے معزز اور معتبر ترین افراد براجمان تھے۔ میز پر منرل واٹر کی بوتلیں شیشے کے نفیس گلاس، اور ان کے سیل فونز رکھے ہوئے تھے۔ کرسی صدارت پانچویں فرد کی منتظر تھی۔ جو کہ ظاہری بات ہے سربراہ تھا، اور اسی نے ہنگامی حالات میں میٹنگ طلب کی تھی۔ ان چاروں افراد کا شمار ملک کے طاقتور اور معتبر افراد میں کیا جاتا تھا۔ جن میں مظہر زمان کے علاوہ ایک کرسی پر وزیراعلیٰ کے مشیر اور موجودہ ایم این اے ہاشم لنگڑیال، تیسری کرسی پر مولانا عبدالرحیم حقی

اوراس کیساتھ مولوی عبدالقدوس براجمان تھے۔یہ دونوں صاحبان مدرسہ رہبرِ انسانیت کے مہتمم اور معلم تھے۔سماجی حلقوں میں ان کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا تھا۔یہ بہت بڑے عالمِ دین اور اسکالر تھے۔ان کی بات کو حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ان کے تعلقات بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں پولیس افسران اور کاروباری شخصیات سے بہت گہرے تھے۔مذکورہ افراد مدرسے کے فنڈ میں ماہانہ لاکھوں روپے بطور عطیہ پیش کرتے،جو کہ کل ملا کر کروڑوں کا ہندسہ عبور کر جاتا تھا۔اربابِ اختیار کے خصوصی تعاون وتوجہ کی بدولت حقی کے دونوں مدرسے،رہبرِ انسانیت اور تربیتی کیمپ حساس اور خفیہ اداروں تک سے محفوظ تھے۔وہ شرافت کے لبادے میں شر کی نمائندگی کررہے تھے۔پاکستان میں رہ کر پاکستان ہی کی جڑوں کو کاٹ رہے تھے۔اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کررہے تھے۔بم بلاسٹ خودکش حملے اور فرقہ وارانہ فسادات انہی کے مرہونِ منت تھے۔

ہاشم لنگڑیال بغور حقی کو دیکھ رہا تھا۔اس وقت وہ حقی کے روپ میں نہیں تھا۔اس وقت اسرائیلی تنظیم موساد کا خطرناک ترین ٹیررسٹ جیک وارمر اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ہلکی گندمی رنگت ،تازہ کلین شیو،سر کے مختصر سے بال آنکھوں پر نفیس چشمہ لگائے تھری پیس سوٹ میں ملبوس وہ انتہائی معزز اور معتبر بزنس مین لگ رہا تھا۔اس کے ساتھ مولوی عبدالقدوس،بدنام زمانہ انڈین ایجنسی را، کا تربیت یافتہ ایجنٹ ارجن ورما بھی تھری پیس سوٹ میں ملبوس کرسی پر براجمان تھا۔تازہ کلین شیو سر کے گھنے اور سیاہ بال آنکھوں میں سانپ جیسی چمک،وہ غیر ملکی سگار کے گہرے کش لے رہا تھا۔مظہر زمان عرصہ طویل سے بہ امر مجبوری ان کا معاون اور گروہ کا حصہ تھا۔ان کے پاس مظہر زمان کی بیوی سونیا زمان کی غیر اخلاقی ویڈیو محفوظ تھی،جو کہ انہوں نے ایک رات اس کے گھر میں گھس کر گن پوائنٹ پر بنائی تھی۔یہی وجہ تھی کہ فوزیہ بھی ان کا ساتھ دینے پر مجبور تھی۔مظہر زمان نے اسے تمام حالات سے آگاہ کردیا تھا۔تب سے اب تک وہ جیک وارمر کے گروہ کے ساتھ کام کررہی تھی،البتہ مظہر زمان کی شرط کے مطابق اس کے ساتھ کوئی غیر اخلاقی یا جنسی زیادتی نہیں کی گئی۔وہ موقعہ کی تلاش میں تھی اور دشمن کے درمیان رہ کر اپنے مقصد کی تکمیل کے منصوبے بنا رہی تھی۔

ہاشم لنگڑیال ایک کرپٹ اور ہوس پرست آدمی تھا۔پینتالیس کی عمر کے باوجود وہ صحت مند اور چاق وچوبند تھا۔وہ دولت اور خوبصورت لڑکیوں کا رسیا تھا اور اسرائیلی تنظیم کے شیطان صفت افراد اس کی ضروریات پوری کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے تھے۔دیوار گیر کلاک پر دس بجکر پچپن منٹ ہوئے تھے۔بگ باس نے میٹنگ کیلئے ٹھیک گیارہ بجے کا وقت دیا تھا۔

ڈین نیلسن،عرصہ طویل سے ایک پادری کے روپ میں پاکستان میں قیام پذیر تھا۔عیسائی اسے قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے اور اسے اپنا مسیحا مانتے تھے۔

ٹھیک دس بج کر انچاس منٹ پر کمرے کا خودکار دروازہ متحرک ہوا۔طویل قامت ڈین نیلسن ایک اپسرا کے ساتھ اندر داخل ہوا۔خودکار دروازہ فوراً بند ہوگیا۔اس نے سفید شرٹ کے ساتھ بلیک پینٹ اور ویس کوٹ پہن رکھا تھا۔اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔سر کے بال لمبے کلین شیو،لمبی ناک اور باریک ہونٹ اس کی سفاک طبیعت کی عکاسی کررہے تھے۔اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی چمک بہت خطرناک تھی۔

پہلی نظر میں سانپ کا گماں ہوتا تھا۔اس کے ساتھ مختصر سے لباس میں ایک انتہائی دلکش گداز اور بھرپور جسم کی حامل سفید فام لڑکی تھی۔

اس نے تنگ سی سیاہ جینز کے ساتھ باریک سی ریڈ کلر شرٹ پہن رکھی تھی۔گریبان کی کشادگی ترغیب گناہ دے رہی تھی۔بڑی بڑی نیلی آنکھیں،لمبی صراحی دار گردن،موتیوں کی طرح جھلملاتے دانت ،گلاب کی پتیوں جیسے نیم گلابی ہونٹ،دائیں رخسار پر دلوں کو زیر وزبر کرتا ہوا ڈمپل،قیامت کا اعلان کررہا تھا۔وہ چاروں انہیں دیکھتے ہی ایک دم کھڑے ہوکر تعظیمی انداز میں جھک گئے۔

چند لمحوں بعد زیر لب مسکراتے ہوئے ڈین نیلسن نے کرسی صدارت سنبھال لی۔اس کے ساتھ والی کرسی پر مذکورہ قیامت براجمان ہو چکی تھی۔

''کیسے ہیں آپ لوگ۔'' اس نے ان چاروں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ چاروں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہاشم لنگڑیال نے غیر ارادی طور پر ایک دو مرتبہ اس لڑکی کو دیکھا۔

''یہ ہماری نئی دوست کیتھی برنارڈ ہے۔'' وہ اس کا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔ ''کل ہی امریکا سے یہاں پہنچی ہے۔ اسے سیاحت اور پاکستان کے تاریخی مقامات پر لکھنے کا شوق چرایا ہے، لیکن اصل میں یہ امریکہ سرکار کی سفیر اور خفیہ ایجنٹ ہے۔ باقی باتیں وقت آنے پر آپ کو پتہ چل جائیں گی۔'' لمحاتی توقف کے بعد وہ حقی کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ مخاطب ہوا۔

''جیک... او پروائے خوش نہیں ہیں تمہیں جو ٹارگٹ دیے گئے تھے ان میں سے صرف تین مکمل ہوئے ہیں۔ جبکہ تمہیں یہاں کئی سال ہو چلے ہیں۔ تم ذاتی عیاشیاں کم کرو اور اگر یہ ذمہ داری مشکل ہے تو بتادو۔ تم سے بہتر یہ کام سرانجام دینے کیلئے اور بھی لوگ موجود ہیں۔''

''سر میں سمجھتا ہوں کہ میں نے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کی لیکن سر۔۔۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ ''ہمارا نیٹ ورک بہت مضبوط ہے۔ دراصل جب سے آرمی ان ایکشن ہوئی ہے کچھ مسائل بڑھ گئے ہیں۔ ہمیں محتاط رہ کر کام کرنا پڑ رہا ہے۔''

''اور ارجن۔'' وہ اپنی باریک آنکھیں ارجن عرف قدوس پر مرکوز کرتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

''تمہاری ایجنسی ہم سے ماہانہ کروڑوں ڈالر وصول رہی ہے اور تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟ تم تو سچ میں ہی مولوی بن گئے ہو۔''

''دس۔۔ سر ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بمشکل بولا۔

''اپنی پروگریس اور اچیومنٹس کی ڈیٹیل بتاؤ'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''کہ تم نے کون سا مشن ہنڈرڈ پرسنٹ کمپلیٹ کیا ہے۔''

''سر دراصل پاکستان کے حالات۔''

''پاکستان کے کوئی حالات نہیں ہوتے۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر غرایا۔ ''حالات وہ ہیں جو ہم پیدا کرتے ہیں۔ چھوٹے موٹے بم دھماکے اور خودکش حملے ہمارا مقصد یا مشن نہیں ہیں اور کل والے خودکش حملے میں تم نے لڑکی کو استعمال کیا؟ وہ پکڑی جاتی تو سب کچھ اگل دیتی۔''

''وو، وہ سر وہ اس کی اپنی مرضی اور خواہش تھی۔ وہ بہت بیتاب ہو رہی تھی اور وہ ہماری تربیت یافتہ۔''

''شٹ اپ۔'' وہ زور سے دھاڑا۔ ''اس طرح نیٹ ورک نہیں چلتے۔ ذمہ داری سے کام کرو یا واپس انڈیا چلے جاؤ۔''

''وہاٹ......؟'' کیتھی پہلی بار مخاطب ہوئی۔ ''تم لوگ ورکرز کی مرضی سے کام کرتے ہو؟'' ایسے تو کام نہیں ہوتے۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اگلا مہینہ محرم کا ہے۔ پاکستان میں فرقہ واریت کی جنگ چھیڑ دو'' وہ سگار سلگاتے ہوئے سفاک لہجے میں بولا۔

''جی سر اس کا پلان تیار ہو چکا ہے'' جیک نے گرمجوشی سے کہا۔ ''محرم کی شروعات میں ایک جید اور معتبر عالم کو مارا جائیگا، اور اس کے ٹھیک دو روز بعد مخالف جماعت کے عالم کو ٹارگٹ کیا جائیگا۔ دونوں فرقے آپس میں بھڑ جائیں گے۔''

''ویری گڈ، یہ پلاننگ بیسٹ ہے۔'' بگ باس پہلی دفعہ مسکرایا۔

''پاکستان کے ہر علاقے سے معتبر لوگوں کو خریدو اور انہیں استعمال کرو۔ سیاسی اور مذہبی پارٹیوں کے اختلاف نے پاکستان کو کمزور کر دیا ہے۔ بس گرم لوہے پر طریقے سے چوٹ لگاؤ۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

''میں جانتی ہوں پاکستان کے کرتا دھرتاؤں کو'' کیتھی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت جلد بک جاتے ہیں، کیونکہ ان کے مفادات بہت زیادہ ہیں، انہیں عوام سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''

ہاشم لنگڑیال پہلی دفعہ زیر لب مسکرایا تھا۔

''اور ہاشم'' بگ باس اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم لوگ تعاون نہیں کر رہے ہے۔ بس تجوریاں بھر رہے ہو۔''

''سر ہمارا تعاون ہر وقت ان کے ساتھ ہے۔آپ حقی اور قدوس سے پوچھ سکتے ہیں۔ان کے دونوں مدرسوں کی طرف کبھی پولیس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔''

''اوکے لیکن اب بڑی کارروائی کی ضرورت ہے''وہ سفاک لہجے میں بولا۔''میں ایک دو دن میں نیوز چینل پر لاشوں کا ڈھیر دیکھنا چاہتا ہوں اور وہ سماجی کارکن امجد عالم چٹھہ بہت پھدک رہا ہے۔بڑے بڑے بیان دے رہا ہے۔مدرسوں پر انگلیاں اٹھا رہا ہے۔کل شہر کے چوک میں اس کا جلسہ ہے۔وہ مجھے کل کے بعد زندہ نظر نہیں آنا چاہئے۔دونوں حریف پارٹیاں آپس میں بھڑ جائیں گی اور ارجن، یہ کام تم کرو گے،تمہارے ساتھ مس کیتھی ہو گی۔''اس نے قدوس کی طرف دیکھا تو وہ مودب لہجے میں بولا۔

''اوکے سر۔۔۔ہو جائے گا''

''مظہر زمان، تمہارا اس میٹنگ میں کوئی کام نہیں تھا''

وہ اس کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے بولا۔

''لیکن تمہاری بیٹی پر پرزے نکال رہی ہے۔کل خودکش حملے کے فوراً بعد اس نے کیپٹن ارباز کو کال کی ہے۔تمہیں آخری وارننگ دی جارہی ہے۔اسے سمجھاؤ ورنہ کچھ دن بعد تمہاری بیوی کی ویڈیو انٹرنیٹ پر پوری دنیا دیکھے گی۔''

وہ ایک دم لرز گیا۔اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔اس نے پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس کی۔

حقی اور قدوس آنکھیں پھاڑے اسے گھور رہے تھے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے سر''اس نے تھوک نگل کر بمشکل کہا۔''سر پلیز مجھے ایک موقع دے دیں۔''

''ہم موقع نہیں وارننگ دیتے ہیں۔دوسری کال اس کی آخری کال ثابت ہو گی،دیٹس آل''

اس نے اچانک کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں بعد یہ میٹنگ برخاست ہو چکی تھی۔وہ سب اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

مظہر زمان لرزتی انگلیوں سے فوزیہ کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

ارشی اور قیصر واپس مدرسہ رہبر انسانیت میں پہنچ گئے۔فی الوقت قدوس اور حقی سے ان کی ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔وہ واپس آتے ہی اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے۔رت جگے اور سفر کی تھکاوٹ نے انہیں فوراً نیند کے سپرد کر دیا۔تربیتی کیمپ میں بشیر سلفی کی موت نے ہلچل مچادی تھی۔سب یہی سمجھ رہے تھے کہ اسے کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہے۔اس کی تکفین و تدفین کے بعد اس کی جگہ نیا آدمی پہنچ گیا تھا۔مدرسے کے وہی معمولات تھے۔ان کی عدم موجودگی میں کافی س زیادہ نئی لڑکیوں کا اضافہ ہو گیا۔سیکیورٹی پہلے کی نسبت سخت کر دی گئی۔مزید تین ہٹے کٹے آدمی اے کے سینتالیس پکڑے مختلف جگہوں پر تعینات نظر آرہے تھے۔مسجد کا حصہ مدرسے سے ہٹ کر تھا جس کا نظم و نسق مولوی غلام رسول سنبھالتے تھے۔

وہ صحیح معنوں میں اللہ کے نیک بندے تھے۔مدرسے کی خفیہ سرگرمیوں سے انہیں آگاہی نہیں تھی البتہ مولانا حقی اور قدوس کا نماز کی پابندی نہ کرنا انہیں کھٹکتا تھا،لیکن چونکہ وہ ان کے ماتحت تھے اس لیے مہر بہ لب تھے۔مدرسے کی عمارت میں دیگر سرگرمیاں انتہائی خفیہ طریقے سے جاری تھیں۔خوبصورت لڑکیاں بھی رات کے اندھیرے میں وہاں پہنچائی جاتی تھیں اور پھر نہ جانے وہ کہاں غائب ہو جاتیں۔یہ راز ابھی تک آشکار نہیں ہو پایا تھا۔ارشی اور قیصر دو گھنٹے کی نیند لے کر تازہ دم ہوئے۔ہلکے پھلکے ناشتے کی بعد وہ اپنے کمرے میں چٹائی پر نیم دراز تھا۔جبکہ ارشی حقی کے کمرے سے ملحق مخصوص کمرے میں پر کیے روپ میں کسی کے بھی ہوش اڑانے کیلئے تیار بیٹھی تھی۔

کچھ دیر بعد حقی اور قدوس کی واپسی ہو گئی۔قدوس مدرسے کی روزمرہ مصروفیات میں الجھ گیا،جبکہ حقی اپنے کمرے میں چٹائی پر تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا گہری سوچ میں مستغرق تھا۔بگ باس ڈین نیلسن کو پل پل کی خبر تھی۔اور ایسا ہونا ناممکن یا حیرت کا باعث نہیں تھا۔تنظیم کا نیٹ ورک ایسا ہی ہوتا ہے۔فوزیہ کی کیپٹن ارباز کو کال کی حقی کو پہلے سے خبر تھی کیونکہ وہ اسی کے کہنے پر ہی اسے شیشے میں اتار رہی تھی۔تاہم وہ بگ باس کے سامنے یہ نہیں کہہ پایا تھا۔مظہر زمان سے فون پر فوزیہ کی گفتگو کی

ریکارڈنگ بگ باس تک پہنچ گئی۔
پہلی ہی بیل کے بعد کال ریسیو کرلی گئی تھی۔
''یس پاپا''
وہ مہذب لہجے میں بولی۔
''خیریت؟ آپ نے خلاف معمول کال کی''
''خیریت ہی تو نہیں بیٹا'' وہ تشویش زدہ لہجے میں بولا۔
''تم نے کیپٹن ارباز کو کال کی تھی۔اس کی ریکارڈنگ بگ باس تک پہنچ گئی ہے''
''اوہ پاپا اس میں ٹینشن والی کیابات ہے''وہ پراعتماد لہجے میں بولی۔''حقی صاحب نے خود ہی تو میرے ذمے لگایا تھا کہ کیپٹن کو شیشے میں اتارنا ہے۔پتہ نہیں یہ بھول کیوں جاتے ہیں۔ہروقت شراب ٹھنسیں گے تو۔۔۔خیراٹس اوکے پاپا''
مظہر زمان مطمئن ہوگیا۔اس نے زیرلب مسکراتے ہوئے کال منقطع کی۔وہ تو شکر ہے کہ وہ ارباز کے بلانے کے باوجود اسے ملنے نہیں گئی۔بہرحال اب محتاط ہوکر اس سے ملنا تھا۔
حقی اپنے کمرے میں ام الخبائث کے گھونٹ بھر رہا تھا۔بگ باس کی وارننگ نے اسے پریشان کردیا تھا۔ایک دودن میں وہ بہت بڑی خونی کارروائی کا مطالبہ کررہے تھے لیکن ابھی حالات سازگار نہیں تھے۔ابھی کل ہی تو انہوں نے خودکش حملہ کیا تھا۔حملے میں مرنے والوں کی تعداد بتدریج بڑھ رہی تھی۔آرمی کے جوان پولیس اہلکار اور خفیہ ادارے متحرک تھے۔ایسے میں کہیں بم بلاسٹ بہت خطرے کا باعث تھا،لیکن کیتھی برنارڈ نے اوپر سے بھیجا گیا پیغام واضح لفظوں میں دے دیا تھا،کہ اب پھر کسی عظیم سانحے کی ضرورت ہے،اور کل گیارہ بجے سماجی وسیاسی راہنما امجد عالم چٹھہ کو بھی ہرحال میں ختم کرنا تھا۔اس کی ذمہ داری قدوس یعنی ارجن نے لی تھی۔وہ ایک مشاق نشانے باز اور سفاک ترین قاتل تھا۔اس کی کیتوسنا پرگن کئی سیاسی راہنماؤں اعلیٰ عہدیداروں اور علماؤں کے خون سے پیاس بجھا چکی تھی۔اچانک اس کے کمرے سے ملحق دروازہ کھلا اور ارشی اندرداخل ہوئی۔وہ مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ ایک دم اٹھا۔وہ سرتاپا سفید لباس میں قیامت لگ رہی تھی۔اس نے اسے بانہوں کے حلقے میں لے لیا۔
''واہ بھئی تم تو تربیتی کیمپ میں رہ کراور بھی نکھر گئی ہو''وہ اسے مخمور نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔
وہ اس کی بانہوں میں کسمسا رہی تھی۔اس کے منہ سے شراب کی بو اور جسم سے اک سڑاندسی اٹھ رہی تھی۔
''کیابات ہے آج طبیعت میں ناگواری کیوں ہے۔۔۔؟''
وہ اسے کلائی سے پکڑتا ہوا بولا۔
''کچھ نہیں حقی صاحب،طبیعت میں ناگورای نہیں،طبیعت خراب ہے"وہ آہستگی سے بولی۔
''طبیعت ابھی ٹھیک کردیتے ہیں جناب''
وہ دست درازی میں اضافہ کرتے ہوئے حریص لہجے میں بولا۔وہ مجبور تھی۔انکار کی جرات نہ کرسکی۔حقی کے اندر کا درندہ بیدار ہوگیا۔اس سے پہلے کہ وہ اسے نوچتا کھسوٹتا۔کتے کی طرح بھنبھوڑتا۔اچانک ہلکی سی دستک کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔فوزیہ اور قدوس ایک خوبرو نوجوان کے ساتھ اندرداخل ہوئے۔ارشی ان سے پہلے کمرے سے متصل مخصوص کمرے میں جاچکی تھی۔
''کیجئے جناب ایک اور اللہ کے قرب کا خواہش مند حاضر ہے۔''وہ حقی کی مخمور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔
''سبحان اللہ''وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔تسبیح پر اس کی انگلیوں کی حرکت تیز ہوگئی۔"بیشک وہ اپنے پیاروں اور خاص بندوں کو یہ توفیق دیتا ہے۔''اس نے نرم ولطیف لہجے میں کہا۔
چندلمحوں بعد ایک خوبرو لڑکی نے نووارد کے سامنے شیشے کے گلاس میں مخصوص مشروب رکھ دیا۔
وہ بیتابی سے شربت پی رہا تھا۔ایک ایک گھونٹ اس کے حواس مختل کررہا تھا لیکن اسے لطف آرہا تھا۔یہ سب اسے اچھا لگ رہا تھا۔اس کے رگ وپے میں راحت انگیز سنسنی دوڑ رہی تھی،جوآج سے دوماہ پہلے قیصر نے محسوس کی تھی۔حقی کے خفیف اشارے پر اسے مخصوص کمرے میں دھکیل کر عقب سے دروازہ بند کردیا گیا۔وہ گویا ہواؤں کے دوش پر اڑتا ہوا لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے میں

داخل ہوا۔اس کی رگ رگ میں اک پر کیف سی آگ دوڑ رہی تھی۔اس کی بوجھل پلکیں اپنے سامنے کھڑی ہوئی پری پر مرکوز تھیں ۔سفید امبریلا فراک ،چوڑی دار پاجامہ، کتابی خدوخال۔وہ اس کے حسن کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔پری نما لڑکی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔وہ سرتاپا لرزنے لگی۔اس کے گداز لب پھڑ پھڑا رہے تھے۔وہ ارشی تھی اوراس کے سامنے اس کا بھائی کاشف کھڑا تھا۔وہ نشہ آور دوا کی پر کیف اذیت میں مبتلا تھا۔اس کے بھرے ہوئے جذبات کو تسکین کی ضرورت تھی، یہ کیسا امتحان تھا، یہ کیسی اذیت بیکراں تھی۔وہ شرم وندامت کے تحت الثریٰ میں گر رہی تھی۔

وہ مخمور آنکھوں اور سلگتے بدن کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ایک دم اس نے دلخراش چیخ ماری اور نیچے گر کر بے سدھ ہوگئی۔برق رفتاری سے دروازہ کھلا۔

فوزیہ اور دو حسین ودلگداز نیم برہنہ لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔انہوں نے ایک نظر ارشی کے بے سدھ وجود کو دیکھا،اوراپنی کارروائی میں مصروف ہوگئیں۔پینٹ شرٹ میں ملبوس وہی نوجوان ویڈیو کیمرے کے ساتھ دروازے میں نمودار ہو چکا تھا۔فوزیہ اس کے ساتھ کھڑی یہ شرمناک تماشہ دیکھ رہی تھی۔دونوں لڑکیاں اسے آغوش میں لیے بیٹھی تھیں۔وہ کیف وسرور اور دلگداز لمس کی لذتوں سے سرشار ہو رہا تھا۔

چند لمحوں بعد یہ انسانیت سوز مناظر کیمرے میں محفوظ ہوگئے۔کیمرہ مین کے ساتھ فوزیہ بھی جا چکی تھی۔برہنہ لڑکیاں بھی کاشف کے بے حس وحرکت وجود کو دیکھتی ہوئی کمرے سے چلی گئیں۔عجیب منظر تھا ایک ذلت کدے میں دو بہن بھائی بے سدھ پڑے تھے۔وہ دھیرے دھیرے ہوش میں آ رہی تھی۔چند لمحوں بعد کسمسا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔وہ اسے اپنے سامنے چٹائی پر پڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔اچانک وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اوراس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔وہ بھی اس کے روبرو کھڑی خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ایک دم اس کا بایاں ہاتھ متحرک ہوا اور زوردار تھپڑ ارشی کے گال پر پڑا۔وہ دبی دبی چیخ کے ساتھ نیچے گر گئی۔اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔وہ آہستگی سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔وہ ہچکیاں باندھ کر رو رہی تھی۔اس نے اپنا سر اس کے پیروں پر رکھ دیا۔

’’مم مجھے معاف کر دو بھائی‘‘ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔’’میں نے بہت سزا بھگت لی ہے میں اب بھی سزا بھگت رہی ہوں‘‘

’’مت کہو مجھے اپنی ناپاک اور گندی زبان سے بھائی۔‘‘وہ آہستگی سے پھنکار کر بولا۔

’’منحوس۔۔۔تم نے امی اور ابا کی جان لے لی۔میری عزت اور غیرت مٹی میں ملا دی‘‘

وہ اس کے پاؤں پر سر رکھے روتی رہی۔اس کے آنسو کاشف کے پیروں کو تر کر رہے تھے۔ایک دم اس کے سینے میں درد کے احساس نے کروٹ بدلی۔اگرچہ کہ وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔اس کی آنکھوں سے پانی چھلک پڑا۔دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ ارشی کے سر پر رکھ دیا۔

اس نے اچانک اپنی متورم آنکھوں سے اپنے بھائی کو دیکھا۔بھائی کے آنسو اس کے دل میں چھید کر رہے تھے۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اوراس کے سینے سے جا لگی۔

وہ اسے بانہوں میں بھینچ رہا تھا۔کس قدر تحفظ محبت اور شفقت کا پاکیزہ احساس تھا اس لمس میں، دونوں پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے،گویا ماں باپ کی موت کا ایک دوسرے کو پرسہ دے رہے تھے۔اجڑے گھر کی ویرانیوں پر ماتم کناں تھے۔نیلامی ناموس وغیرت پر اشکبار تھے۔وہ اپنے ہاتھوں سے اس کی آنکھیں صاف کرتا ہوا،اسے چٹائی پر بٹھا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا، وہ محویت اور دیوانگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

’’بس اب چپ ہو جاؤ ارشین‘‘ وہ خلیق لہجے میں آہستگی سے بولا۔

’’جو ہوا وہ گزر گیا اب آگے کا سوچنا ہے۔مجھے سب پتہ چل گیا ہے۔‘‘

’’تمہیں یہاں کون لایا ہے بھائی؟اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔’’میں یہاں لایا نہیں گیا بلکہ خود آیا ہوں‘‘اس نے دھیرے سے سرگوشی کی۔’’تمہاری

دوست فوزیہ کے تعاون سے،اس نے مجھے سب کچھ بتادیا ہے۔یہ دولڑکیاں بھی اس کی ہمراز تھیں۔مجھے جو شربت پلایا گیا تھا اس میں مخصوص دوا کی مقدار بہت کم تھی کیونکہ شیطانوں کو مطمئن کرنے کیلئے یہ شیطانی کھیل ضروری تھا۔فوزیہ نے کہا تھا کہ میں پانچ منٹ میں اس کے اثر سے نکل آؤں گا اور شاید ایسا ہی ہوا ہے۔''

''تُف فوزیہ کو تم کیسے جانتے ہو؟''

''میں اسے نہیں جانتا،وہ خود مجھے ڈھونڈ کر میرے پاس پہنچی تھی۔اس کا کہنا ہے کہ اسے تم نے بتایا تھا میرے بارے میں'' وہ آہستگی سے بولا۔

''ہاں میں نے اسے ایک دن بتایا تو تھا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ وہ تمہیں ڈھونڈ لے گی اور تم مان جاؤ گے۔''

''اس نے مجھے اور بھی بہت کچھ بتایا ہے''

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے بولا۔''نعمان زندہ ہے میں اب تک اسے مار چکا ہوتا۔اگر فوزیہ منع نہ کرتی میں اب اسے وہی موت مار رہا ہوں جو موت اس نے میرے ماں باپ کو دی ہے۔''

وہ لرز کر رہ گئی نعمان زندہ تھا اور اسے معلوم تک نہیں تھا۔حقی نے غلط بیانی کی تھی۔

''کیسی موت مارو گے تم اسے۔''اس نے سوال کیا۔

''اگر یہ لوگ مجھے یہاں رکھ لیتے ہیں تو چند روز میں تمہیں پتہ چل جائے گا۔''

وہ بہت دیر تک ڈھیروں باتیں کرتے رہے۔کتنے دکھوں کے خزانے مضمر تھے ان کے سینے میں۔بھائی نے بہن کو معاف کردیا،کیونکہ ان سب کو وطن اور قوم کے دشمنوں کیخلاف سینہ سپر ہونا تھا،اور اس کیلئے اتفاق کی ضرورت تھی۔تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔فوزیہ دولڑکیوں کے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھی۔اس کے پیچھے قیصر کو دیکھ کر ارشی چونک اٹھی۔

☆......☆......☆

وحید پلازہ، صبح دس بجے کھل کر رات گیارہ بجے بند ہوتا تھا۔یہ موبائل مارکیٹ تھی۔یہاں ہول سیل پر سیل فونز فروخت کیے جاتے تھے تاہم ایک سیل فون کے خریدار کو بھی خصوصی ڈسکاؤنٹ دیا جاتا۔قطار در قطار متعدد دکانوں پر کسٹمرز کا بہت زیادہ رش رہتا تھا۔پانچویں فلور پر القمر موبائلز بہت بڑی اور کشادہ دکان تھی۔شیشے کے کاؤنٹر میں سیکڑوں سیکنڈ ہینڈز موبائلز کے علاوہ دیوار پر شیشے کی الماریوں میں ہمہ قسم کمپنیز کے سیل فونز انتہائی قرینے سے جڑے ہوئے تھے۔کاؤنٹر کے سامنے ریوالونگ چیئر پر دکان کا مالک قمر شاہ لیپ ٹاپ پر نظریں جمائے تیزی سے انگلیاں چلا رہا تھا۔اس کے دو ملازم لڑکے کسٹمرز کو ڈیل کررہے تھے۔سڑک کی جانب دکان کی کھڑکی کے شیشے سے سڑک کے پار جناح پارک نظر آرہا تھا۔مذکورہ پارک جہاں پرٹی کے ایم این اے سبطین حیدر نے خصوصی طور پر قائد اعظم محمد علی جناح کے نام پر بنوا کر اس کا نام ''جناح پارک'' رکھ دیا تھا۔دس ایکڑ کے وسیع وعریض رقبے پر یہ پارک شہر کی پہچان بن گیا تھا۔اہل شہر کے علاوہ گردونواح کے لوگ بھی یہاں سیر کرنے اور اس کی خوبصورتی سے سرشار ہونے آتے تھے۔پارک میں ہر قسم کے پودے پھول اور درخت لگائے گئے۔زمین پر امریکن گھاس کو ترتیب کے ساتھ کاٹ کر برابر کردیا گیا تھا۔بیٹھنے کیلئے بینچ بچوں کیلئے جھولے اور لوگوں کی سہولت کیلئے ٹک شاپ بھی تھی۔مرکزی گیٹ پر دو آدمی تعینات تھے۔ان کے پاس گنز تھیں لیکن جہان پور ایک پرامن شہر تھا۔یہاں آج تک کوئی قابلِ ذکر واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔

پارک میں آنے جانے والوں پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ہمہ وقت لوگوں کا جم غفیر رہتا،لیکن آج تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔بسوں اور ٹرالیوں پر مختلف شہروں اور دیہاتوں سے لوگ جوق در جوق آرہے تھے۔پارک کے وسط میں اونچا سا اسٹیج تیار کرکے ساؤنڈ سسٹم لگایا جا رہا تھا۔ساڑھے دس بجے کا وقت تھا۔تحریک دفاع وطن کے راہنما امجد عالم ٹھیک گیارہ بجے عوام سے بھرپور خطاب کرنے والے تھے۔گزشتہ الیکشن میں وہ بلا مقابلہ ایم این اے منتخب ہوئے تھے۔ان کے حریف شہباز قریشی ان کے مقابلے میں اپنی سیٹ سے دستبردار ہوگئے،ان کا موقف تھا کہ پاکستان اور پاکستانی عوام کو ایسے نڈر بے باک اور بے داغ ماضی کے تعلیم یافتہ اور پرجوش رہنما کی اشد ضرورت ہے۔امجد عالم پینتیس

کے لگ بھگ ایک خوبرو اور خوش مزاج نوجوان تھے۔وہ جہان پور کے ایک نواحی گاؤں کوٹ شاہ مراد کے زمین دار محمد عالم چٹھہ کے ہونہار فرزند ارجمند تھے۔عوام کا دردان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ان کا انداز خطابت دلوں کو گرما کے رکھ دیتا۔وہ دہشت گردی لوٹ مار کرپشن اور مہنگائی کے ازحد مخالف تھے۔

انہیں چند ایک مدرسوں سے متعلق مشکوک سرگرمیوں کی رپورٹ ملی تھی لیکن ثبوت وشواہد کی عدم دستیابی کے باعث وہ کچھ کرنے سے قاصر تھے،تاہم انہوں نے خود کو اس مقصد کی تکمیل کیلئے وقف کر دیا تھا۔اسی سلسلے میں آج اس عظیم الشان جلسے کا انعقاد کیا گیا۔مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے وہ پنڈال میں پہنچ گئے اور لوگوں کے مسائل سن رہے تھے۔اسی لمحے وحید پلازہ کی بلند وبالا بلڈنگ کے پانچویں فلور پر القمر موبائل سنٹر میں ایک خوش اندام خوبرو حسینہ داخل ہوئی۔کاؤنٹر پر دو کسٹمر کھڑے تھے۔دکان والے لڑکے انہیں سیل فونز دکھا رہے تھے۔اچانک اک بھینی بھینی خوشبو دکان میں پھیل گئی۔لڑکی انتہائی پرکشش اور سحر انگیز شخصیت کی حامل تھی،اس نے بلیک جینز کے ساتھ بلیو کلر ہاف بازو شرٹ پہن رکھی تھی۔بکھرے ہوئے سیاہ گھنے بال اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ سرخ ہونٹ اور متناسب جسم دیکھنے والوں کو مبہوت کر رہا تھا۔وہ کاؤنٹر کے پاس کھڑی سیل فونز دیکھ رہی تھی۔چھوٹا سا سیاہ بریف کیس اس نے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

''جی میم فرمایئے ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟''

قمر شاہ نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے شائستہ لہجے میں استفسار کیا۔

وہ ایک قبول صورت اور صحت مند نوجوان تھا۔وہ اسے دیکھ کر دلکش انداز میں زیر لب مسکرائی اور مترنم لہجے میں بولی۔''مجھے آئی فون چاہیے''

''کون سا ماڈل میم؟''اس نے دوبارہ پوچھا۔

وہ عقابی نظروں سے شیشے کی کھڑکی سے پار دیکھ رہی تھی۔ہزاروں لوگوں کا ہجوم جمع ہو چکا تھا۔لوگ پرجوش انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔سامنے اسٹیج واضح نظر آ رہا تھا۔فی الوقت کوئی اور آدمی اسٹیج پر عوام سے مخاطب تھا۔

''یہاں کیا کوئی۔۔۔؟''اس نے سوالیہ لہجے میں کھڑکی کے پار اشارہ کیا۔

''یس میم۔۔۔یہ امجد عالم صاحب کا جلسہ ہے۔آج وہ عوام سے خطاب کر رہے ہیں۔''

وہ تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگی۔اسٹیج کی لوکیشن اور سیٹنگ ان کی مرضی کے عین مطابق تھی۔

یہ کیتھی برنارڈ تھی۔ایک خطرناک تربیت یافتہ ایجنٹ۔آج پلان کے مطابق ان کا ٹارگٹ امجد عالم چٹھہ تھا۔

''اچھا چھوڑیں، آئی فون نیو ماڈل دکھائیں۔''اس نے قمر شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں بعد شیشے کا دروازہ متحرک ہوا۔سادہ سے کپڑوں میں ملبوس ایک گندمی رنگت کا حامل ہٹا کٹا آدمی اندر داخل ہوا۔کیتھی نے اسے سرسری سی نگاہ سے دیکھا اور خفیف سا اشارہ کر کے قمر شاہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اس نے سیل فون کا ڈبہ کاؤنٹر پر رکھا اور مخصوص نمبر ملا کر بریف کیس کھولنے لگی۔دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں خطرناک جدید پستول نظر آ رہا تھا۔

اس دوران نیا آنے والا کسٹمر جو کہ قدوس تھا اس نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔اس سے قبل وہ شٹر ڈاؤن کر چکا تھا۔

''تم تینوں اگر زیادہ دیر تک جینا چاہتے ہو تو آرام سے دوسری طرف منہ کر کے بیٹھ جاؤ۔''وہ سفاک لہجے میں پھنکار کر بولی۔

قمر شاہ اور اس کے ملازمین کے رنگ ہلدی کی طرح ہو رہے تھے۔موت کا خوف ان کے چہروں پر رقص کر رہا تھا۔

''آ۔۔۔آ آپ کو جو کچھ چاہیے لے جائیں پر ہمیں۔۔۔۔''

''ہم ڈاکو نہیں ہیں قمر شاہ۔''قدوس نے سرد لہجے میں کہا۔

وہ اپنے چہرے پر ماسک چڑھاتے ہوئے بولا۔کیتھی

اس سے پہلے ہی ماسک چڑھا چکی تھی۔

"گیارہ بج چکے ہیں ہم زیادہ سے زیادہ گیارہ۔۔۔ پانچ پر یہاں سے نکل جائیں گے۔تمہیں پانچ منٹ کیلئے عارضی طور پر مرنا ہوگا۔"

اس نے کہا اور جیب سے ایک لمبی سی بوتل نکال کر اس کا رخ ان تینوں کی طرف کر کے بٹن دبا دیا۔ایک مخصوص خوشبو ان کے نتھنوں سے ٹکرائی، دوسرے ہی لمحے وہ تینوں تیورا کر گرے اور بے سدھ ہو گئے۔

وہ تیزی سے حرکت میں آ گیا۔وہ بریف کیس سے "کیٹو" سنائپر گن نکال کر اسے فٹ کر رہا تھا۔ٹھیک تیس سیکنڈ بعد سنائپر گن تیار تھی۔

کیتھی کھڑکی کی طرف متوجہ تھی۔لوگوں کا ہجوم پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔پولیس فورس کے جوان مختلف جگہوں پر تعینات تھے۔امجد عالم چھٹے اسٹیج پر پہنچ گیا تھا اور عوام سے خطاب کر رہا تھا۔

"ہمیں ضرورت ہے امن کی بھائی چارے کی"

اس کی گمبھیر آواز ساؤنڈ سسٹم کی بدولت چار سو گونج رہی تھی۔"جب تک ہم ایک نہیں ہوں گے، ہمارے ملک سے دہشت گردی ختم نہیں ہوگی۔ مجھے کچھ انفارمیشن ملی ہے لیکن ابھی میں ثبوت وشواہد ڈھونڈ رہا ہوں۔ انشا اللہ وہ دن دور نہیں جب ہمارا ملک دہشت گردوں سے پاک ہو جائے گا۔ملک کا بچہ بچہ محفوظ ہوگا۔۔۔"

قدوس نے سنائپر گن کی نال کھڑکی کے فریم پر رکھ دی۔اس کی ایک آنکھ بند اور دوسری دوربین پر تھی۔وہ انتہائی مہارت سے زوم کر کے اسے فوکس کر رہا تھا۔

اس کا نشانہ امجد عالم کا دل تھا۔وہ دل جس میں سارے جہاں کا درد سمایا ہوا تھا۔

"کیا پتہ ہمارے درمیان ہمارے آس پاس ہمارے پڑوس میں کوئی دہشت گرد ہو۔کوئی وطن دشمن ہو۔آپ سب آنکھیں کھلی رکھیں۔"

قدوس ٹرائیگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا رہا تھا۔محض ایک لمحے کا کھیل باقی تھا۔کیتھی کی سفاک نگاہیں سنائپر گن پر جمی ہوئی تھیں۔قمر شاہ اور اس کے ملازمین بدستور بیہوش پڑے تھے۔کھڑکی سے اسٹیج کا فاصلہ نصف کلو میٹر سے بھی کم تھا، یہ ٹارگٹ آسان ثابت ہو رہا تھا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔میں وطن کا بے لوث سپاہی ہوں۔اس کے لئے میری جان بھی حاضر۔۔۔۔"

وہ پر جوش انداز میں بول رہا تھا۔"یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں،کوئی پروا نہیں۔"

اسی لمحے قدوس نے ٹرائیگر دبا دیا۔ایک زوردار دھماکے کی گونج پیدا ہوئی۔چاروں طرف گردش کرتی ہوئی امجد عالم کی آواز ایک دم خاموش ہو گئی۔اس کی سفید قمیض پر سفید واسکٹ خون میں تر ہو رہی تھی۔گولی سیدھی اس کے دل میں جا گھسی۔وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف پشت کے بل نیچے جا گرا۔اچانک عوام میں بھگدڑ سی مچ گئی۔یہ موت کی بھگدڑ تھی۔لوگ ایک دوسرے کے نیچے آ کر کچلے جا رہے تھے۔بچے عورتیں مرد۔۔۔اندھا دھند بھاگ رہے تھے۔زخمی ہو رہے تھے،مر رہے تھے۔قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا۔

قدوس اور کیتھی دکان میں ٹائم بم لگا کر نکل گئے۔دیگر دکان مالکان اور کسٹمرز افراتفری میں بھاگ رہے تھے۔وہ دونوں بھی اسی بھیڑ میں شامل ہو کر لفٹ سے نیچے اتر رہے تھے۔

پارک میں موت کا کھیل جاری تھا۔امجد عالم کے ساتھ متعدد لوگ مارے گئے۔ بچے مرد اور عورتیں کچلے گئے، کچلے جا رہے تھے۔کوئی جائے امان نہیں تھی۔فورس کے جوان متحرک تھے لیکن یہ موت کا کھیل روکنا ان کے بس میں نہیں تھا اور قیامتِ صغریٰ کا اختتام ابھی کہاں ہوا تھا۔ابھی تو شروعات تھی۔اچانک ایک خوش شکل نوجوان اللہ اکبر کہہ کر مشتعل ہجوم میں گھس گیا۔دوسرے ہی لمحے ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔کئی بے گناہ اور معصوم لوگ وحشیانہ موت اور بربریت کی بھینٹ چڑھ گئے۔خودکش حملہ آور سمیت ان گنت لوگوں کے چیتھڑے اڑ گئے۔آہ وبکا چیخ وپکار پولیس موبائلز اور ایمبولینسز کے سائرن کی آوازیں دلوں کو دہلا رہی تھیں۔ٹھیک پانچ منٹ بعد وحید پلازہ کے پانچویں فلور پر ایک اور فلک شگاف دھماکا ہوا۔قمر شاہ کے ساتھیوں سمیت ان گنت لوگ موت

کی بھینٹ چڑھ گئے۔ متعدد دکانیں ملبے کا ڈھیر بن گئیں۔ ملبے تلے زندہ لوگ مر رہے تھے۔ کیتھی اور قدوس منتشر اور خوفزدہ ہجوم میں شامل ہو کر نکلنے میں کامیاب رہے۔ کم وبیش آدھے گھنٹے بعد بپھری ہوئی موت نے لوگوں کو ستانے کا موقع دیا۔ میڈیا پولیس اور آرمی پہنچ گئی۔ متعدد بچے عورتیں اور مرد بھگدڑ میں کچلے گئے تھے۔ ہر طرف بکھری ہوئی لاشیں خون آلودہ اعضاء وطن دشمنوں نے ہر گھر میں صفِ ماتم بچھادی تھی۔ نیوز چینلز لائیو دکھا رہے تھے۔

''سانحہ جناح پارک تاریخ انسانیت کا بھیانک ترین واقعہ۔ 70 افراد موت کی نیند سو گئے۔ مرنے والوں میں سیاسی رہنما امجد عالم چٹھہ بھی شامل ہیں۔'' ٹی وی اینکرز بھرائی ہوئی آوازوں میں بتا رہی تھیں۔ اپنے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز ڈین نیلسن کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

گل کا نام سنتے ہی یقین کی حد تک گماں ہونے لگتا ہے کہ یقیناً اس نے کہیں گل کھلایا ہوگا۔ گل کے تعارف کیلئے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ نعمان کی چھوٹی بہن تھی۔ شہر میں گورنمنٹ ڈگری کالج میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ شکل وصورت اللہ نے اچھی دی، لیکن سیرت وکردار میں اپنے بدقماش بھائی سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ وہ نعمان کیلئے لڑکیاں تلاش کرتی تھی۔ ان کے سیل نمبرز لیتی تھی، اس کی وجہ سے ان گنت لڑکیاں نعمان اور حقی کی ہوس کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ نعمان اور گل سے ان کی بڑی بہن رابعہ البتہ ایک شریف مہذب اور باکردار لڑکی تھی۔ ایک سال پہلے اپنی پسند کی شادی کے بندھن میں بندھ کر وہ پیا کے دیس سدھار چکی تھی۔ اس شادی کے بدلے پیا، یعنی اس کے شوہر مقصود کی بہن کا رشتہ نعمان کے ساتھ طے ہوا، لیکن وہ آوارہ اور بدکردار ثابت ہو رہا تھا۔ محلے والے اسے ایک آنکھ دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔

ارشی کے غیاب کے سلسلے میں بھی وہ خاصا بدنام ہوا اور پھر گاؤں کی ایک دو لڑکیوں سے بدتمیزی کرنے پر اہل محلہ اس کے ابا کے پاس پہنچ گئے۔ وہ شرم کے مارے زمین میں گڑھے جا رہے تھے، لہٰذا نعمان کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اس کے والد ایک شریف اور سلجھے ہوئے آدمی تھے۔ چند ایکڑ اراضی کے علاوہ ان کا کوئی چھوٹا سا بزنس بھی تھا۔ اس کی ماں دل کی مریضہ تھی اور دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ بیٹے کی نافرمانی اور پھر جدائی نے اسے توڑ کے رکھ دیا، اوپر سے گل کے لچھن بھی اچھے نہیں تھے۔ مائیں سب جان جاتی ہیں۔ وہ بھی جان گئی کہ گل کا چال چلن اور کردار مشکوک ہے۔ گل ایک دلکش اور خوبرو لڑکی تھی، لیکن اس کا کردار اس کی خوبصورتی کو مسخ کر رہا تھا۔ وہ رات رات بھر سیل فون پر چیٹ اور کالز کرتی۔ مسلسل رت جگوں سے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑھ گئے۔ وہ پہلے کی نسبت دبلی ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے کالج جانا بھی کم کر دیا تھا۔ دن رات اپنے کمرے میں گھس کر کئی لڑکوں سے چیٹ کالز اور بیہودہ گفتگو نے اس کی صحت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس رات بھی وہ اپنے بستر میں گھسی کسی سے چیٹ کر رہی تھی، جب اچانک ایک اجنبی نمبر اسکرین پر جگمگانے لگا۔

چونکہ فطرتاً وہ ایک بے باک لڑکی تھی۔ اس نے فوراً کال ریسیو کرلی۔

''ہیلو۔۔۔ السلام علیکم''

دوسری طرف سے شائستہ ومہذب لہجے میں ایک دلکش مردانہ آواز سنائی دی۔

''جی وعلیکم السلام۔۔۔ کون؟'' اس نے اپنے مخصوص شوخ لہجے میں پوچھا۔

''جی میں کاشف بات کر رہا ہوں جہان یورسٹی سے۔''

وہ بدستور مہذب لہجے میں بولا۔

''نعمان سے بات ہو سکتی ہے؟ دراصل اس کا سیل نمبر آف جا رہا ہے۔ آپ شاید اس کی سسٹر ہیں۔''

وہ اس سحر انگیز آواز اور دلکش لب ولہجے سے متاثر ہو چکی تھی۔

''جی وہ تو گھر پر نہیں ہوتے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اب وہ کوئی بات سوچ رہی تھی کہ بات آگے بڑھائی جاسکے۔

''اچھا جی تھینکس، اللہ حافظ۔'' کاشف نے الوداعی لہجے میں کہا، تاہم اس نے کال منقطع نہیں کی۔

''ارے ارے آپ تو بہت کنجوس ہیں۔ دو چار باتیں کر کے ہی کال بند کر رہے ہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''جی تو اور اب میں آپ سے کیا بات کروں؟'' وہ دل میں مسکراتا ہوا دھیرے سے بولا۔ اس نے بڑی مشکل سے گل کا نمبر حاصل کیا تھا۔ اس کی توقع کے مطابق وہ اس سے فری ہو رہی تھی۔ گویا اپنی بہن ارشی اور کئی معصوم لڑکیوں کے انتقام کی طرف اس نے پہلا قدم اٹھا دیا تھا۔

''آپ کیا کرتے ہیں؟'' اس نے شوخ لہجے میں استفسار کیا۔

''میں۔۔۔ میں کمال کرتا ہوں۔'' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ہائیں۔۔۔ کمال۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔ آپ کیا کمال کرتے ہیں؟''

وہ تحیرزدہ لہجے میں بولی۔

''بقول غالب، بیٹھ کر پہلوئے یار میں غالب، جو کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں۔'' اس نے شاعرانہ انداز میں مصرعہ سنایا۔ وہ ہنسنے لگی۔

''آپ تو واقعی کمال کرتے ہیں، وہ بولی لیکن ایسا کیسے ممکن ہے؟ بندہ یار کے پہلو میں بیٹھا ہو اور کچھ نہ کرے؟''

''اب آپ یہ ہی دیکھ لیجئے، میں آپ کے بستر میں گھسا بیٹھا ہوں۔ آپ کے کانوں پر لب رکھ کر باتیں کر رہا ہوں۔ آپ کے کمرے میں آپ کے اور میرے سوا کوئی نہیں لیکن میں کچھ بھی نہیں کر پا رہا، ہے ناں کمال؟''

اس نے کہا تو وہ پھر ہنستے ہوئے دہری ہونے لگی۔ اس کے قہقہے کمرے میں گونج رہے تھے۔ اس سے ملحق کمرے میں اس کی ماں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اس کا دل درد سے پھٹ رہا تھا۔ اولاد کے دکھ زندہ درگور کر دیتے ہیں۔ اس کا باپ آنکھیں پھاڑے چھت کو گھور رہا تھا۔ رات کے گیارہ بجے بھی اس کی بیٹی گل۔۔۔ گل کھلا رہی تھی۔

''بہت دلچسپ آدمی ہیں آپ۔'' وہ بمشکل ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ ''ہے تو واقعی کمال لیکن وہ کیا ہے کہ ہوا کو لکھنا جو آ گیا ہے۔ یہ ہوائی باتیں ہیں۔ سگنلز کے رابطے ہیں۔ فون پر آپ کچھ نہیں کر سکتے، لیکن اگر آپ میرے پاس ہوتے تو بھی کیا یہی کمال کرتے؟ کہ کچھ بھی نہ کرتے؟''

''یہ تو آپ کی عنایت پر منحصر ہے۔'' وہ محبت سے لبریز لہجے میں بولا ''کہ آپ کب اپنے پہلو میں بیٹھنے کا موقع دیں۔ میں نے آپ کو مدتوں سے دیکھ رکھا ہے۔ آپ تو سیدھی دل میں اتر جاتی ہیں۔ کیا حسن ہے۔ کیا دلکشی ہے۔ کیا تازگی ہے۔''

وہ زہر میں بجھے ہوئے تیر پھینک رہا تھا اور وہ اندر ہی اندر مرتی جا رہی تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ شمارے میں)

فضل چپراسی

عارف شیخ

ہر باپ اپنی بیٹی کو خوش و خرم زندگی گزارتے دیکھنا چاہتا ہے،
اس کا بھی یہی نظریہ تھا کہ اس کا داماد سرکاری ملازمت میں ہو اور
پھر اس نے اپنے داماد کو سرکاری ملازمت بھی دلادی لیکن......

ایک دلچسپ کہانی جسے پڑھ کر آپ مسکرائے بنا نہیں رہ پائیں گے

وہ سرکاری طور پر اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا تھا۔ اس کی سفید داڑھی اور سر کے بال کمزور جسم تھکی ماندی آنکھیں یہ بتا رہی تھیں کہ اب اسے ریٹائر ہو جانا چاہیے۔

اس کا نام محمد رمضان تھا جب وہ اس سرکاری محکمے میں آیا تو اس کی عمر صرف چوبیس برس تھی۔ آج اس نے اپنی عمر کے چھتیس برس اس محکمے کو دے کر اپنی ذمے داری پوری کردی تھی۔ آج اس کا اس سرکاری ادارے میں آخری دن تھا۔ کل سے ریٹائر سرکاری چپراسی ہونے والا تھا۔

وہ روزانہ کی طرح اپنی ذمے داری جس میں صفائی سب سے زیادہ ضروری تھی پوری کر کے پہلے فلور پر چیئر مین صاحب سے ملنے کے ارادے سے اوپر آیا تھا۔ اسے کئی بار مختلف چیئر مینوں کی خدمت کا موقع ملا تھا۔

موجودہ چیئر مین کے پاس اس وقت جو چپراسی تھا وہ اس کے سامنے ہی بھرتی ہو کر آیا تھا۔ چیئر مین کے چپراسی نے رمضان بابا کو دیکھا تو جلدی سے پاس آگیا اور بولا۔

''کوئی کام تھا تو مجھے بلالیا ہوتا۔ تم کو سیڑھی چڑھنا پڑی۔''

''کام ایسا تھا کہ میرا آنا ضروری تھا۔'' رمضان بابا نے کہا۔

''کیا چیئر مین صاحب سے ملنا ہے۔'' چپراسی شرافت سمجھ کر بولا۔

''ہاں کچھ بات بھی کرنا تھی اور الوداعی ملاقات بھی کرلوں گا۔''

''تم ایک منٹ رکو۔ میں دیکھتا ہوں صاحب کوئی ضروری کام تو نہیں کر رہے۔'' اس نے رمضان بابا کو کرسی دی اور خود اندر چلا گیا۔ وہ کوئی تین منٹ بعد باہر آیا تھا اور اس نے بتایا کہ وہ چیئر مین صاحب سے مل سکتے ہیں۔

رمضان بابا اندر داخل ہوئے تو کوئی پچاس برس کی عمر میں صحت مند گورے رنگ کا شخص عینک کے پیچھے سے بابا رمضان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی نہیں تھے۔ چیئر مین کی اجازت حاصل کر کے وہ سامنے موجود کرسی پر بیٹھ گئے۔

''آپ خیریت سے ہیں۔'' چیئر مین جس کا نام بھی اخلاق تھا اس نے اخلاق سے پوچھا۔

''سب کی دعا سے بالکل خیریت سے ہوں۔''

''بتایئے کیسے آنا ہوا؟''

''آپ کے علم میں ہوگا کہ آج میں ریٹائر ہو رہا ہوں۔'' وہ بولے۔

''ہاں مجھے ابھی شرافت نے بتایا۔''

''آپ سے الوداعی ملاقات بھی کرنا تھی اور ایک ذاتی نوعیت کا بہت اہم کام بھی تھا۔'' بابا رمضان نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات آگے بڑھائی۔

''ہاں آپ بتایئے آپ کو کیا کام ہے میرے لیے ممکن ہوا تو میں ضرور کروں گا۔''

''ویسے تو میں پڑھا لکھا نہیں ہوں لیکن سنا ہے کہ

سرکاری ملازم ریٹائر ہوتا ہے تو اس کے بیٹے کو اس کی جگہ ملازمت دی جاتی ہے۔''

''تو اپنے بیٹے کو بھرتی کروانا ہے۔'' چیئر مین نے پوچھا۔''اس کے کاغذات لائے ہیں۔''

''نہیں جناب میرا تو کوئی بیٹا ہی نہیں ہے۔'' بابا رمضان نے کہا۔

''تو پھر کسے لگوانا ہے؟'' چیئر مین حیرت سے بولا۔

''وہ اصل میں مجھے اپنے داماد کو ملازمت دلوانی تھی۔'' رمضان نے مدعا بیان کر دیا تھا۔

''اپنی بیٹی کے شوہر کو ملازمت دلوانا چاہتے ہو۔''

''شادی ابھی ہوئی نہیں ہے' وہ ہونے والا داماد ہے۔'' بابا نے تفصیل بیان کی۔''شادی میں دیر بھی جاب نہ ہونے کی وجہ سے ہو رہی ہے۔''

''ابھی کیا کرتا ہے تمہارا داماد۔''

''وہ جناب عالی ٹھیلا لگاتا ہے فروٹ کا۔ اگر آپ کی عنایت ہو جائے تو اسے چپراسی رکھ لیں۔ میری ایک ہی بیٹی ہے' اس کی زندگی اچھی گزر جائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ تم نیچے ڈائریکٹر ایڈمن سے ملاقات کرلو۔ میں اسے ہدایت جاری کر دیتا ہوں۔'' چیئر مین نے بابا رمضان کا مسئلہ ہی حل کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

بابا رمضان ڈائریکٹر ایڈمن محمد حمزہ سے آ کر ملے تو انہوں نے مختصراً بات کی۔

''مجھے چیئر مین صاحب کی ہدایت آ گئی ہے۔'' وہ بولے۔''تم میری سیکرٹری کے پاس اپنے داماد کا نام لکھوا دو اور کل صبح اسے بھجوا دو۔ میں اس کا اپائنمنٹ لیٹر اسے دے دوں گا۔''

بابا رمضان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ کام اتنا آسان ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ڈائریکٹر ایڈمن کے سیکرٹری کو اپنے داماد کا نام لکھوایا اور خود اپنے محکمے کے لوگوں سے آخری ملاقات کرنے نکل کھڑے ہوئے۔

☆......☆......☆

بابا رمضان کی الوداعی ملاقاتوں کا یہ سلسلہ کوئی شام تک چلتا رہا۔ جب وہ گھر کے لیے روانہ ہونے لگے تو انہوں نے طے کیا کہ گھر جانے سے پہلے وہ اپنے داماد سے مل کر اسے صبح دفتر آنے کا سمجھا کر گھر جائیں گے۔

چنانچہ وہ اس طرف چل دیئے جہاں ان کا ہونے والا داماد ٹھیلا لگاتا تھا۔ ٹھیلوں کی قطار میں وہ اپنے داماد کے ٹھیلے پر پہنچے تو ٹھیلا موجود تھا لیکن ان کا داماد فضل کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ انہوں نے اس کے برابر میں موجود ٹھیلے والے سے پوچھا کہ فضل کہاں ہے تو اس نے بتایا کہ کسی کام سے گیا ہے تھوڑی دیر میں آئے گا۔ اس کا ٹھیلا بھی وہی دیکھ رہا تھا۔

بابا رمضان نے کچھ وقت انتظار کرنے کے بعد برابر کے ٹھیلے والے سے اپنا اور فضل کا تعارف کراتے ہوئے اس سے درخواست کی کہ وہ فضل کو صبح سرکاری دفتر اپنے شناختی کارڈ کے ساتھ جانے کا پیغام دے دے گا۔ اس نے وعدہ کرلیا تو بابا رمضان بھی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا

کیونکہ اب اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی دونوں فکر کر رہے ہوں گے۔

☆......☆......☆

بابا رمضان گھر میں داخل ہوا تو اپنی بیوی کو اپنا منتظر پایا۔ جس نے سامنا ہوتے ہی سوال کر دیا۔

''آج دیر کر دی۔''

''نیک بخت آج آخری دن دیر ہوئی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کل سے تو گھر پر ہی ہوں۔''

''ہاں اب تو تم ریٹائر ہو گئے۔'' بیوی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر پوچھا۔ ''تم نے فضل کے لیے بات کی۔''

بابا رمضان نے دیکھا کہ بیٹی پانی کا گلاس لے آئی تھی شاید وہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ بابا نے اس کے لیے کچھ اچھا کیا ہے۔

''میں بات ہی نہیں کی کل اسے بھرتی کا لیٹر مل جائے گا۔''

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' بیوی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''یہ کام تم نے بہت اچھا کر دیا۔ ہماری ایک ہی بیٹی ہے اب اس کے شوہر کی سرکاری نوکری ہوگی کم از کم تکی بندھی تنخواہ تو گھر آئے گی۔''

''بس اب جلدی سے شادی بھی کر دیتا ہوں۔''

''تمہارے ریٹائرمنٹ کے حساب کتاب میں کتنے دن لگیں گے۔''

''دو مہینے تک لگ جائیں گے۔''

''بس تو پھر چند روز میں ہی تاریخ طے کرتی ہوں۔'' بیوی نے کہا۔ ''تمہارے پیسے آئیں تو بیٹی کی شادی کی ذمے داری سے بھی فراغت ہو جائے۔''

''بھئی اب کھانا کھلا دو۔'' بابا رمضان نے بیٹی کو آواز لگائی اور اندر کمرے میں چلے گئے۔

☆......☆......☆

وہ صبح وقت پر سرکاری دفتر پہنچ گیا تھا۔ سیکرٹری کے آتے ہی وہ لپک کر پاس آیا۔ سلام کے بعد اس نے آمد کا مقصد بتایا۔

''اچھا...... اچھا بابا رمضان نے بھیجا ہے۔'' سیکرٹری نے کہا۔ ''شناختی کارڈ کی کاپی اور اصل دونوں دے دو۔''

اس شخص نے مطلوبہ چیزیں سیکرٹری کے حوالے کر دیں۔ سیکرٹری نے اسے باہر بیٹھنے کا کہتے ہوئے کہا۔

''میں لیٹر کے ساتھ فائل تیار کرتا ہوں' اتنی دیر میں چیئرمین صاحب بھی آ جائیں گے تو فائل پر آرڈر کروا لیتے ہیں۔''

''جی بہتر۔'' فضل نے جواب دیا اور کمرے سے باہر موجود کرسی پر بیٹھ گیا۔

ایک گھنٹے بعد اسے معلوم ہوا کہ چیئرمین صاحب آ گئے ہیں اور فائل ان کو بھجوا دی گئی ہے۔ تھوڑی دیر میں فائل آ گئی تھی۔ سیکرٹری نے فضل کو اندر بلایا۔

''تمہارا اپائنمنٹ آرڈر تیار ہو رہا ہے۔ اب تم کو ڈائریکٹر ایڈمن سے ملنا ہے۔''

فضل جو کہ ایک سیدھا سادہ انسان تھا۔ وہ تو ہدایت پر فرمانبرداری سے عمل کر رہا تھا۔ مزید آدھے گھنٹے بعد وہ ڈائریکٹر ایڈمن کے سامنے کھڑا تھا۔

''تمہارا پورا نام فضل دین ہے۔'' ڈائریکٹر ایڈمن مبارک علی فائل کے ساتھ اصل شناختی کارڈ کو بھی دیکھ رہے تھے۔ ''ولد سبحان الدین''

''جی جناب عالی۔'' فضل الدین نے صرف اتنا کہا۔

''یہ لو بھئی میں نے آرڈر کر دیے ہیں۔'' مبارک علی نے دستخط کے بعد فائل بند کر دی۔ ''بابا رمضان نے بڑی خدمت کی ہے' یہ نوکری ان کے بیٹے کو ملنی چاہیے تھی لیکن چلو بیٹا نہ سہی داماد ہی سہی مل گئی' داماد بھی تو بیٹے جیسا ہی ہوتا ہے۔''

''صاحب میں بھی انہیں اپنے والد ہی کی طرح مانتا ہوں۔'' فضل الدین نے جواب دیا۔

''یونہی ان کی دعائیں لیتے رہنا۔'' ڈائریکٹر نے سیکرٹری کو طلب کر کے فائل ان کے حوالے کر دی تھی۔

وہ سیکرٹری کے ہمراہ واپس باہر آ گیا تھا۔ ''اب کیا کرنا ہوگا۔'' فضل الدین نے پوچھا۔

''میں تمہیں ملازمت میں بھرتی کا آرڈر ریلیز کراتا ہوں' تم جوائننگ دے دینا۔''

''وہ بھی آپ ہی تیار کر لو۔ میں تو پڑھا لکھا نہیں

ہوں۔ دستخط کر دوں گا۔"

"جلدی نہیں ہے جوائن کرنے کی مہلت سات روز ہوتی ہے۔"

"نہیں صاحب میں تو آج ہی جوائن کرلوں گا۔" وہ بولا۔ "میں اس خوشی کے لیے سات دن تک انتظار نہیں کرسکتا۔"

"چلو تمہاری مرضی۔" سیکرٹری نے کہا اور جوائننگ لیٹر تیار کراکے فضل الدین کی پوسٹنگ بھی بابا رمضان کی جگہ پر کردی تھی۔

فضل الدین نے اسی روز اپنی حاضری پر سائن کرکے ڈیوٹی بھی دے ڈالی۔

☆......☆......☆

بابا رمضان کی صبح ذرا دیر سے ہوئی تھی۔ اس لیے کہ اسے آفس جانے کی جلدی نہیں تھی۔ اس روز وہ شام تک گھر پر ہی رہا۔ ہاں شام کے وقت وہ اپنے داماد فضل سے ملنے پہنچ گیا تھا۔ فضل اپنے ٹھیلے پر موجود تھا۔

رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد رمضان بابا نے پوچھا۔ "کیا دفتر گئے تھے۔"

یہ سوال فضل کے لیے حیران کن تھا۔ "کیا مجھے دفتر جانا تھا؟"

بابا رمضان کو وہ شخص دکھائی نہیں دیا جس کا ٹھیلا اس روز فضل کے ٹھیلے کے برابر میں تھا۔

"میں نے پیغام دیا تھا۔"

"لیکن مجھے تو کوئی پیغام نہیں ملا۔" فضل نے حیرت سے کہا۔

بابا رمضان نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر سوچا اتنا واویلا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ فضل کا پڑوسی بھول گیا ہوگا اور فضل تک پیغام نہیں پہنچا۔ اس نے اپنے داماد کو صبح اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن ٹھیک وقت پر وہ دونوں سرکاری دفتر جا پہنچے تھے۔ سیکرٹری نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بابا رمضان کو خوش آمدید کہا تھا۔

"یہی میرا داماد فضل ہے۔" بابا رمضان نے ساتھ

لائے شخص سے سیکرٹری کا تعارف کرایا۔

سیکریٹری کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''بابا رمضان کیا تم مذاق کررہے ہو۔ اگر ایسا کررہے ہو تو یہ درست نہیں ہے۔ میرا آپ کے ساتھ احترام کا رشتہ ضرور ہے لیکن میں اس دفتر میں آپ کا افسر رہا ہوں۔''

''نہیں ......نہیں میں بھلا آپ سے مذاق کیوں کروں گا۔'' بابا رمضان نے کہا۔ ''میں تو صرف تعارف کرارہا ہوں کہ میں نے اپنے جس داماد کی ملازمت کی بات کی تھی وہ یہ ہے۔'' بابا رمضان نے کل نہ آنے کی وجہ فضل کو پیغام کا نہ ملنا ٹھہرایا۔

''یہ فضل ہے......'' اب کی باری تھی سیکریٹری کی حیرت میں ڈوبنے کی۔ ''لیکن ہم نے تو کل تمہارے داماد کو ملازمت دے دی ہے۔''

''جناب عالی میرا داماد تو یہ ہے۔'' بابا رمضان نے بتایا۔ ''میں نے اس کے لیے بات کی تھی۔''

''تو پھر وہ کون تھا جو کل آیا اور ہم نے اسے بھرتی کا سرکاری لیٹر دے دیا۔'' سیکرٹری نے کہا۔

''جناب وہ کوئی دھوکے باز ہوگا۔'' بابا رمضان کی آواز بہت غصے میں تھی۔

''لیکن اس نے خود کو تمہارا ہونے والا داماد بتایا اور اپنا نام فضل بھی بتایا۔''

''جناب وہ فضل نہیں کوئی اور ہوگا اور اس نے دھوکے سے خود کو بھرتی کروالیا۔''

''دھوکا نہیں ہوسکتا اس کے پاس فضل کے نام کا اصل شناختی کارڈ تھا۔'' سیکرٹری نے بتایا۔

''جناب وہ کہاں گیا......'' بابا رمضان کو اس فراڈیے کی تلاش تھی۔

''وہ اسی بلڈنگ میں جاب پر ہے باہر جاکر دیکھیں شاید تم پہچان لو۔'' سیکرٹری کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی بابا رمضان اور اس کے پیچھے فضل کمرے سے نکل چکے تھے۔

☆......☆......☆

بابا رمضان کو تھوڑی دیر میں وہ شخص مل گیا تھا جو ان کے ہونے والے داماد کی جگہ اس سرکاری ملازمت پر دھوکے سے قابض ہوچکا تھا۔ وہ وہی تھا جس کا ٹھیلا ان کے داماد کے ٹھیلے کے برابر میں تھا اور جسے بابا رمضان نے اپنے داماد کو پیغام دینے کا کہا تھا۔

بابا رمضان غصے سے اس کو منہ میں جو کچھ آیا سناتے چلے گئے۔ بابا کے داماد نے اس کا گریبان تک تھام لیا لیکن وہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتا رہا۔ دفتر کے کافی لوگ اس ہنگامہ آرائی پر وہاں جمع ہوگئے تھے۔ معاملہ اس بات پر ختم ہوا کہ دفتر کی کمیٹی سارے معاملے کا جائزہ لے کر فیصلہ سنائے گی۔

بابا رمضان اور ان کے ہونے والے داماد کو اب گھر لوٹ جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

سرکاری محکمے نے انکوائری شروع کی تو ملازمت حاصل کرنے والے شخص نے کہا۔ ''مجھے کچھ نہیں معلوم میں نے آکر ملازمت کے لیے درخواست دی اور مجھے اس دفتر نے بھرتی کرلیا گیا۔''

کمیٹی کے سربراہ نے فیصلہ سنایا ''اب کچھ ہو نہیں سکتا۔ اس لیے کہ ایک شخص سرکاری ملازمت حاصل کرچکا ہے اور اگر ہم اسے ملازمت سے برطرف کرتے ہیں تو اوپر منسٹری میں ہماری انکوائری ہوسکتی ہے پھر ہمارے پاس مضبوط وجہ بھی نہیں ہے۔''

''لیکن اس نے فراڈ کیا ہے۔'' میٹنگ میں موجود ایک افسر بولا۔

''کیا فراڈ کیا ہے۔'' کمیٹی کا سربراہ نے کہا۔ ''ہم نے خود ملازمت دی ہے اور اگر پوری کہانی لکھتے ہیں تو پھر ہم اعلیٰ عہدوں پر موجود نااہل تصور کیے جائیں گے۔''

''تو کیا اس معاملے کو ختم کردیں۔'' کمیٹی کا تیسرا شخص بولا۔

''میرا فیصلہ یہ ہے کہ جو بھرتی ہوگیا سو ہوگیا' اب اس معاملے کو طول دینے کا مطلب ہے کہ معاملہ کورٹ بھی جاسکتا ہے۔'' سب نے فیصلے کی حمایت کردی تھی۔

☆......☆......☆

بابا رمضان اور اس کی بیوی خاموش بیٹھے تھے۔ بیوی کی آنکھیں بتارہی تھیں کہ وہ رو بھی چکی ہے۔

''تو کیا اب کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔'' بیوی کی آواز نے

گہرے سکوت میں شگاف ڈالا۔

''کچھ نہیں ہوسکتا' ایک مرتبہ سرکاری ملازمت مل جائے اور نکالنے کی وجہ ٹھوس نہ ہوتو وہ ریٹائر ہوکر یا مر کر نکلتا ہے۔''

''لیکن تم فضل کا نام لکھوا کر آئے تھے' انہوں نے اسے کیوں رکھا۔'' بیوی نے کہا۔ ''کہیں تمہارے دفتر والے تو فراڈ نہیں کررہے۔''

''ارے نیک بخت! اب تو اسے قسمت کا لکھا سمجھ کہ اس کمینے کا نام بھی فضل ہی تھا۔'' بابا رمضان نے انکشاف کیا۔

''کیا.....وہ بھی فضل ہے۔'' اس بار بیوی چونکی تھی۔

''ہاں اسی کا فائدہ لیا ہے اس نے۔ ہمارے داماد کا نام محمد فضل ہے وہ فضل الدین ہے۔''

''پھر تو تم نے بھی غلطی کی ہے۔'' بیوی بولی۔ ''تم کو پورا نام بلکہ ولدیت بھی لکھوانی چاہیے تھی۔''

''اگر مجھے اتنی دور تک کا علم ہوتا تو کیا میں چپراسی ریٹائر ہوتا۔ لوگوں کو ان کے مستقبل کی آگاہی دے رہا ہوتا۔''

''لیکن میں نے بھی فیصلہ کرلیا ہے میں اپنی بیٹی کی شادی اس ٹھیلے والے سے نہیں کروں گی۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' بابا رمضان نے کہا۔ ''اب یہ شادی کیسے ہوگی؟ تین چار سو روپے روز کمانے والا' شادی کا فیصلہ بدلنا پڑے گا۔''

دونوں میاں بیوی نے یہ مشترکہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اپنے داماد محمد فضل سے اب شادی کے سلسلے میں معذرت کرلیں گے اور اپنی لڑکی کے لیے کوئی اور رشتہ تلاش کریں گے۔

☆......☆......☆

بابا رمضان نے سب سے پہلے تو اپنے ہونے والے داماد محمد فضل سے معذرت کرتے ہوئے شادی کے رشتے کو ختم کردیا......اور اس کے بعد وہ اپنی پینشن اور اس رقم کے حصول پر لگ گئے جو انہیں سرکاری محکمے سے ملنی تھی۔

اس کے لیے وہ ہر دوسرے تیسرے دن دفتر آ جا رہے تھے۔ دو ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ اس دوران سرکاری چپراسی فضل الدین اور ان کے درمیان نفرت ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ اس کی بڑی وجہ فضل الدین ہی تھا جس نے معافی کے ساتھ دفتر میں اس کا خیال رکھا۔

بابا رمضان نے بھی مقدر کا فیصلہ سمجھ کر خود کو راضی کرلیا تھا اور فضل الدین کو معاف بھی کردیا تھا۔

☆......☆......☆

سات برس کا عرصہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا تھا کہ ایک رات اچانک بابا رمضان کی طبیعت خراب ہوگئی ان کی بیوی نے اوپر کی منزل میں رہائش پزیر بیٹی اور داماد کو مدد کے لیے بلایا...... چند منٹوں میں وہ لوگ بابا رمضان کو اسپتال لے آئے تھے۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ صرف گیس کی پرابلم تھی لہٰذا دو گھنٹے بعد وہ سب گھر لوٹ آئے تھے۔

بابا رمضان بہت خوش وخرم زندگی کے ساتھ اس بات پر یقین کرچکا تھا کہ قدرت کو جو منظور ہوتا وہ اچھے کے لیے ہوتا شاید انسان ناقص عقل ہے اس لیے سمجھ نہیں پاتا ہے۔

برسوں پہلے ایک روز فضل الدین نے بابا رمضان کو یہ درخواست کی تھی کہ وہ اسے اپنا داماد بنالے۔ بابا رمضان نے بیوی سے مشورے کے بعد بات مان لی اور آج اس شادی کو چھ برس سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے ریٹائرمنٹ کے پیسے سے گھر کے اوپر کی منزل تعمیر ہوئی اور بیٹی داماد اوپر ہی منتقل ہوگئے اور اب تو ان کے دو بچے تھے جو پورا دن نیچے ہی رہتے تھے سارے گھر میں رونق لگی رہتی تھی۔

ہاں بابا رمضان کو کبھی کبھی بازار میں محمد فضل مل جاتا تھا وہ آج بھی فروٹ کا ٹھیلا لگاتا ہے۔ شادی اس نے بھی کرلی ہے لیکن بابا رمضان اسے یہی سمجھاتے ہیں کہ وہ اسے قدرت کا فیصلہ سمجھے۔

پتی ورتا

معاویہ عنبر وٹو

عورت کو شاعر' کومل' پھول کی کلی اور قدرت کا نرم و نازک تحفہ قرار دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شعبہ نہیں' اللہ تعالیٰ نے اس کے وجود' اس کے اوصاف اور خیالات میں نرمی رکھی ہے لیکن یہی عورت اگر ضد پر آ جائے تو اس کی نرم دلی چٹانوں سے زیادہ سختی میں بدل جاتی ہے۔

ایک وفا کی پتلی کی داستان' تاریخ ایک احمق راجا نے اسے اپنے شوہر سے جدا کر دیا تھا۔

نئے افق قارئین کے لیے تاریخ کے جھرکوں سے ایک دلچسپ سچی داستان

دیوالی کے مقدس تہوار کی رونق عروج پر تھی۔ گجرات کی سلطنت کا صدر مقام انیلواڑہ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا' تمام شہر میں اس قدر چہل پہل تھی جیسے ہر گھر میں مسرتوں کی بارات اتر آئی ہو۔ شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی عمارت اور ہر مکان کی اینٹ اینٹ پر شمعیں اور چراغ روشن ہونے شروع ہو گئے تھے' پورا شہر خیرہ کن جگمگاہٹ کا روپ دھارے ہوئے تھا' یہ تہوار صرف انیلواڑہ میں ہی نہیں بلکہ پوری سلطنت میں اس قدر جوش اور جذبے کے ساتھ منایا جاتا تھا کہ ہفتوں ہر جانب جشن کا سماں رہتا تھا' اس کی وجہ یہ تھی کہ گجرات کے راجہ کرن دیو باگھیلا کی رنگین مزاجی کو یہ تہوار دیگر تمام تہواروں سے زیادہ پسند تھا۔ دسہرہ اور دیوالی کے رنگ و نور کے پیچھے تو وہ جیسے دیوانہ ہو جاتا تھا' دسہرہ کے دن خود رنگ ہاتھ میں لے کر بھاگ کھیلتا تھا اور دیوار کی روشنیوں کے ساتھ تو اس کا جذبہ مسرت اپنی انتہا تک پہنچ جایا کرتا تھا' وہ عقل و ہوش اور تمام شاہی آداب کو بالائے طاق رکھ کر اس جشن میں شرک ہو جاتا تھا اور محل میں تمام رات ناچ رنگ کا طوفان بدتمیزی بپا کیے رکھتا تھا۔

مملکت کا راجہ راگ رنگ سے بھرپور تقریبات کا دلدادہ ہو تو عوام بھی اسی رو میں بہہ جاتے ہیں' خاص طور پر جب کہ یہ جشن مذہبی تہواروں کے مقدس نام سے برپا کیے جائیں' چنانچہ دسہرہ دیوالی کے تہوار راجہ کرن دیو کے زمانے میں مملکت گجرات کے وہ جشن تھے جن کی نظیر کسی اور ہندو ریاست میں شاید نہ مل سکے' یوں لگتا تھا جیسے راجہ تمام سال ان تہوار کی تیاری میں مصروف رہتا ہے' تہوار کا موقع آتا ہے تو اپنے دل کی ساری امنگیں پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے بعد پھر ان تہواروں کی تیاری میں مصروف ہو جاتا ہے جیسے راجہ کرن کو ان تہواروں کی تیاری کرنے اور ان تہواروں کو انتہائی شاندار طریقہ پر منانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے یہی وجہ تھی کہ ان تہواروں کے موقع پر قریباً ایک ماہ تک شاہی محل میں رات دن رنگ و نور کی بارش ہوا کرتی تھی۔ جشن مسرت کا سماں چھایا رہتا تھا کھیل تماشوں اور ناچ رنگ راجہ اپنے درباریوں' امراء اور خاندان کے افراد سمیت ہر قسم کی مسرت جھولیوں میں سمیٹ لینے کی ہوس میں دنیا و مافیہا کو فراموش کر بیٹھتا تھا۔

مگر اس دفعہ یوالی کا تہوار قدرے مختلف ثابت ہوا۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس کی سلطنت میں ہر کام صرف اسی کی مرضی کے مطابق نہیں ہوسکتا' اسے پتا چلا کہ اس کے محل میں موجود ہونے کے باوجود کوئی شخص اپنی مرضی کا خود بھی مالک ہوسکتا ہے' پہلا موقع تھا کہ اسے اس قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑا تھا اور یہ صورتحال اسے آگ بگولہ کردینے کے لیے کافی تھی۔ ہوا یہ کہ دیوالی کا تہوار اپنی تمام دیوانہ کن رونق لیے ہوئے تھا' دارالحکومت کہکشاں کی طرح جگمگا رہا تھا اور شاہی محل کی زیبائش وآرائش اور چراغاں کا تو جواب ہی نہیں تھا اس چراغاں کو ایک نظر دیکھ لینے کے لیے تو لوگ دور دور سے اس روز انیلواڑہ پہنچا کرتے تھے۔ ابھی رات زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی اور ابتدائی رسوم انجام پارہی تھیں' ان رسوم کے بعد ہی اس جشن کا آغاز ہونا تھا جسے بڑی آسانی سے طوفان بدتمیزی قرار دیا جاتا ہے' اور جورات بھر جاری رہتا تھا' رانی کنولا دیوی ان رسومات کی انجام دہی کی نگرانی کررہی تھی کہ اتنے میں راجہ کے محل کے اندر آنے کی صدا بلند ہوئی۔

دربار کی رسوم سے فراغت کے بعد راجہ محل کے اندر آرہا تھا' اس کے لیے محل کے صحن میں وسیع مسند پہلے سے تیار تھی' راجہ وہاں آکر بیٹھ گیا تو امراء واکابر کی بیویوں نے جڑاؤ طشتریاں راجہ کے سامنے باری باری پیش کرنی شروع کیں۔ راجہ ہر بار طشتری پیش کرنے والی کے چہرے پر ایک نظر ڈالتا اور اس کے بدلے چند طلائی سکے طشتری میں رکھتا' وہ تین عورتوں کے بعد ایک نوجوان عورت بڑی تمکنت اور وقار کے ساتھ ایک سنہری طشتری لیے آگے بڑھی' راجہ نے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تو دیکھتا رہ گیا' کشیدہ قامت' بھرا بھرا جسم جو تنگ چولی میں پھٹا پڑتا تھا' شفاف رنگ جسے سرخ ساڑھی نے شعلہ خو بنادیا تھا۔

پیشانی کی بندی اور مانگ کے سیندور نے حسن کی کاٹ کو ناقابل برداشت حد تک تیز کر دیا تھا۔ راجہ کرن دیو نے اسے سر سے پاؤں تک دوبارہ دیکھا اور اسے یوں لگا جیسے وہ جگمگاتا محل' اس کے چاروں جانب بکھرا رنگ و نور محل کی وسعت میں پھیلا پر رونق جشن' سب کچھ ماند پڑ گیا ہے اور اگر حسن ہے تو صرف اس چہرے پر اور جمال ہے تو اس سراپا میں جو اس کے سامنے موجود تھا' اس حسن کے سامنے تو دیوالی کا چراغاں بھی شرما کر رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو راجہ کرن مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اس قدر خوب صورتی بھی کسی انسان کو مل سکتی ہے۔ وہ اپنی رنگین مزاجی اور حسن پرستی کے لیے مشہور تھا' مگر اس بلا کی خوب صورتی اور اس غضب کے حسن سے اس کا سامنا پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ سنہری طشتری اس کے سامنے تھی اور پیش کرنے والی کی آنکھیں حیا کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ راجہ نے حسب معمول طشتری سے ایک ذرہ چکھ کر چند روپہلی سکے اس میں رکھنے کی بجائے وہ طشتری اس کے ہاتھوں سے لے کر اپنے پاس رکھ لی۔ یہ بات کی علامت تھی کہ راجہ اس عورت کو خاص عنایت کا حقدار قرار دے رہا ہے اور اسے ایک طرف ٹھہر کر اس رسم کے ختم ہونے کا انتظار کرنا تھا تاکہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد راجہ اپنی مرضی کے مطابق اسے دھن دولت اور مرتبہ و منصب سے سرفراز کر سکے۔ راجہ کے دل میں اشتیاق کی ایسی لو بھڑک اٹھی تھی کہ اس نے بڑی بے دلی کے ساتھ اس رسم کو اختتام تک پہنچایا مگر اس کی مایوسی کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہ عورت حسب قاعدہ اس کی عنایات خاص کے انتظار میں موجود نہیں تھی' اس رسم کا انتظام کرنے والی محل کی منتظمہ خاص پاربتی نے اسے بتایا۔

''وہ کہتی تھی کہ مجھ سے نہیں انتظار کیا جاتا' گداگروں کی طرح بیٹھ کر۔''

راجہ کو سخت تعجب ہوا۔

''گداگروں کی طرح؟ ہوں..... مگر وہ ہے کون؟ ہم اسے پہچان نہیں سکے؟''

''آپ کے وزیر مادھو کی بیوی ہے۔'' پاربتی نے بتایا۔

''اچھا مادھو کی بیوی ہے۔ اس کی شادی چند دن پہلے ہوئی ہے۔ اسی لیے ہم نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔'' راجہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''مگر وزیر کی بیوی بن جانے کے بعد تو اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ اپنی مرضی کی مالک خود نہیں رہی۔''

''میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مہاراج۔'' پاربتی نے کہا۔

''مگر وہ کہتی تھی کہ اپنی مرضی کو کسی صورت کسی اور کے تابع کرنے کے لیے تیار نہیں ہے' اس کا کہنا ہے کہ اپنی مرضی کی وہ ہمیشہ خود ہی مالک رہی ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی رہے گا۔''

راجہ یہ سن کر غصہ سے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ ایسی بات سے اسے تمام عمر میں پہلی مرتبہ واسطہ پڑا تھا اور یہ مجال کس کی ہو سکتی تھی کہ راجہ کے سامنے اس قدر خود مختاری کا دعویٰ کرے۔ اس نے لال پیلا ہوتے پوچھا۔

''نام کیا ہے ان کماری جی کا؟''

''کامنی۔'' پاربتی نے مختصر سا جواب دیا۔

''ہوں.....ں.....ں.....'' اور راجہ غصے میں بل کھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

یہ معمولی سا واقعہ راجہ کے سینے کا زخم اور دل کا درد بن کر اسے ہر لحہ کی بے قراری بخش گیا۔ کامنی کا بے مثل حسن و جمال ایک جانب اسے دیوانہ بنائے ہوئے تھا اور ہر لمحہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھرتی رہتی تھی تو دوسری جانب اس نوجوان عورت کے ہاتھوں اپنی ہتک ہو جانے کا خیال اسے انگاروں پر لوٹاتا تھا۔ بڑی سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد بھی وہ بار بار صرف ایک نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس عورت کا حصول اس کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے مگر یہ کام راجہ کے لیے بھی کچھ آسان نہیں تھا۔ کامنی کوئی معمولی عورت نہیں تھی' وہ اس کے وزیر مادھو کی بیوی تھی' اور مادھو کے ہاتھ میں مملکت کا سارا نظام تھا۔ وہ خود بھی وزیر نہیں تھا بلکہ اس کا بھائی کیشو بھی وزارت کے عہدے پر فائز تھا۔ یہ دونوں بھائی ناگر قوم کے راجپوت تھے اور اپنی قابلیت اور حسن تدبر کے باعث بہت شان و شوکت اور جاہ و حشمت کے مالک تھے اور مملکت میں راجہ خود ان کا محتاج تھا' اس لیے راجہ کی اس نئی خواہش کا پورا ہونا ناممکن نہیں تو سخت دشوار تھا مگر

مشکل یہ آپڑی تھی کہ اس خواہش کو پورا کیے بغیر راجہ کو کسی کل چین نہیں پڑتا تھا' راجہ نے اس مشکل میں بھی حسب عادت پاربتی کا سہارا ڈھونڈا۔ پاربتی نہ صرف یہ کہ کسی زمانے میں راجہ کی منظور نظر رہ چکی تھی بلکہ ان دنوں راجہ کے رنگین رازوں کی امین بھی تھی۔ اسی لیے اسے محل کی منتظمہ خاص ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ ساتھ ہی راجہ اپنی ذاتی مشکلات میں ہمیشہ اس سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ چنانچہ سلطنت کے کاموں میں بھی اس کا بڑا عمل دخل ہوگیا تھا۔ پاربتی نے راجہ کی رام کہانی سنتے کہا۔

''مہاراج یہ بھی کوئی مشکل کام ہے' راجہ کے لیے بھی کبھی کوئی کام مشکل ہوسکتا ہے؟''

راجہ یہ سن کر خوش بھی ہوا اور حیران بھی' مسرت آمیز تعجب سے بولا۔

''تم کہتی ہو یہ کام اس قدر آسان ہے اور ہمیں زندگی میں پہلی مرتبہ مشکل کا احساس ہورہا ہے۔''

''آپ اس دیس کے مہاراج ہیں سرکار۔'' پاربتی چہکتی ہوئی بولی۔

''اور راجہ کو دیس کی ہر چیز پر پورا اختیار ہوتا ہے' اس لیے اسے کسی مشکل کا بھی احساس نہیں ہونا چاہیے۔''

''مگر کچھ پتہ چلے ہماری یہ خواہش کیونکر پوری ہوسکتی ہے۔''

پاربتی نے پانسہ پھینکا۔

''بڑی آسانی کے ساتھ مہاراج' بس اتنا کیجیے کہ مادھو اور کیشو کسی کام سے دیس سے باہر بھیج دیجیے' پھر کامنی کو آپ کے چرنوں میں ڈالنا میرا کام ہے۔''

راجہ کی آنکھیں چمک اٹھیں' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''تمہارا جواب نہیں پاربتی' اسی لیے تو ہم ہر کام میں تم سے مشورہ لیتے ہیں' تمہاری ترکیب لاجواب ہے مگر ان دونوں بھائیوں کو بھیجا کیسے جائے دیس سے باہر؟''

''مہاراج کی آگیا ہو تو یہ بھی بتا سکتی ہوں۔'' پاربتی نے فوراً کہا۔ اس کا ذہن ساری اسکیم پہلے ہی سوچ چکا تھا۔

''مہاراج ایک سفارت دیول گڑھ بھیجنے والے ہیں نا۔''

''ہاں...... ہاں...... سفارت تو جانے والی ہے۔''
راجہ نے ہامی بھرلی۔
''سفارت بڑی اہم ہے اس لیے کیشو کو وہاں بھیج دیجیے۔''
''ٹھیک ہے اور مادھو؟''
''مہاراج کی فوج کو اچھے گھوڑوں کی ضرورت ہے ناں؟'' پاربتی نے بلاتامل کہا۔
''عرب تاجروں نے کچھ عرصہ سے گجرات میں گھوڑے دینے بند کردیئے ہیں اور ہماری فوج کے پاس گھوڑوں کی کمی پڑگئی ہے۔''
''ہاں بات تو ایسی ہی ہے۔''
راجہ نے اس طرح کہا جیسے ایک معمول' عامل کے سامنے بولتا ہے۔
''سنا ہے کشمیر میں عربی گھوڑے بڑی تعداد میں آئے ہیں' وہاں سے ہم انہیں خرید سکتے ہیں اور مادھو سے بہتر اس کام کے لیے اور کوئی شخص نہیں۔'' راجہ نے خوش ہوکر ہنستے ہوئے کہا۔
''تم بہت ذہین ہو پاربتی مگر مادھو اور کیشو دونوں کو باہر بھیج کر سلطنت کا کام کیسے چلے گا؟''
''مہاراج کے زیر سایہ ایک سے ایک قابل آدمی ہے ان دونوں کا کام تو یہ ست پال اکیلا ہی سنبھال سکتا ہے۔'' پاربتی نے مطلب کی بات کی اور اپنے چہیتے کا نام لے ہی دیا' اسی کی خاطر تو اس نے یہ ساری اسکیم تیار کی تھی مگر ساتھ ہی بے تعلقی سے کہا۔
''اور کوئی بھی نہ ہو تو مہاراج کا دم بھگوان سلامت رکھے' یہ وزیر بھلا از خود کس قابل ہوتے ہیں مہاراج کی ہدایت اور رہنمائی ان سے ہر کام کراتی ہے اور مہاراج یہ کام کسی بھی شخص سے لے سکتے ہیں۔''
بات فوراً راجہ کی سمجھ میں آگئی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
''ٹھیک ہے' ایسا ہی ہوگا مگر کامنی!''
پاربتی نے چٹکی بجاتے کہا۔
''بس اتنی دیر لگے گی اور وہ آپ کے قدموں میں۔''
اگلا ہفتہ گجرات کی مملکت میں زبردست تبدیلیوں کا تھا' دکن کی ہندو سلطنت دیوگڑھ کے لیے ایک مضبوط سفارتی وفد روانہ ہوگیا اس وفد کا سربراہ راجہ کرن دیو کے وزیر کو بنایا گیا' یہ سفارت دہلی کی مسلمان سلطنت کے خلاف ہندو ریاستوں کو متحد کرنے کے سلسلے میں بھیجی گئی تھی' کیشو کی سربراہی میں' اور مملکت کے بڑے وزیر مادھو کو کشمیر بھیجا گیا تھا تاکہ وہاں سے اچھی نسل کے گھوڑے جس قدر مل سکیں خرید لائے کیونکہ گجرات کی فوج کو گھوڑوں کی سخت ضرورت ہے' ان دونوں وزیروں کی غیر موجودگی کے دوران راجہ نے اپنے ایک درباری ست پال کو وزیر کا عہدہ دے کر امور مملکت کا نگران مقرر کردیا' ان تبدیلیوں کے پس پردہ جو تبدیلی واقع ہوئی' وہ یہ تھی کہ پاربتی کے دل کی مراد برآئی' اس کا چہیتا ست پال وزیر بن گیا جو اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا تھا' چنانچہ اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا' مملکت کے ہر معاملے میں اسے اس قدر دخل ہوگیا تھا گویا تمام سیاہ وسفید کی وہی مالک تھی' یہاں تک کہ محل کے اندر بھی وہ رانی کنولا دیوی سے خود کو بلند مرتبہ خیال کرنے لگی تھی۔ مملکت گجرات پر اب گویا صرف اس کا راج تھا' یہ تو سب کچھ ہوچکا مگر کامنی اس قدر سخت ہڈی ثابت ہوئی جس کا پاربتی کو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اسے راہ پر لانے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا لالچ اور خوشامد سے لے کر دھمکی اور رعب تک' مگر وہ کسی طرح قابو میں نہ آئی۔ راجہ کی بے چینی اور بے قراری ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔
پاربتی کو خدشہ ہوا کہ راجہ کی بے کلی کہیں بنا بنایا کھیل ہی نہ بگاڑ دے' چنانچہ اپنے تمام حربوں کی ناکامی کے بعد اس نے ست پال کے ذریعے حکومت واقتدار کا آخری حربہ استعمال کیا اور کامنی کو زبردستی اٹھوا کر محل میں منگالیا۔ اس کے بعد کا کام ذرا آسان تھا' ایسی بے شمار تدابیر تھیں کہ دو دن میں ہی کامنی کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ بادل نخواستہ راجہ کے بستر کی زینت بن گئی۔ ابھی وہ دل بھر کر کامنی سے لطف اندوز بھی نہ ہو پایا تھا کہ کیشو واپس انہلواڑہ پہنچ گیا' اسے جب معلوم ہوا کہ راجہ نے اس کی بھابی پر زبردستی قبضہ کرلیا ہے تو اس نے فوراً ایک معتمد شخص کو کشمیر کی جانب روانہ کیا تاکہ مادھو کو اس صورت حال کی

اطلاع دے اور خود دربار میں جانے کی بجائے اپنا گروہ اکٹھا کر کے اس بے عزتی کا بدلہ چکانے کی تیاری کرنے لگا' راجہ کے لیے یہ صورت حال کافی پریشان کن تھی' مگر پاربتی کے ہوتے اسے کسی پریشانی کی ہرگز ضرورت نہیں تھی' اس نے انتہائی مطمئن انداز اور پرسکون لہجہ' میں راجہ کو تسلی دی۔

''مہاراج کو فکر کرنے یا پریشان ہونے کی بھلا کیا ضرورت ہے' جب کہ آپ کے بے شمار جاں نثار ہر صورت حال سے نمٹنے کے لیے موجود ہیں۔''

راجہ نے فکر مند لہجے میں کہا۔

''میں اور کسی وجہ سے پریشان نہیں صرف اس بدنامی سے خوف آتا ہے کہ سارے ملک میں بات پھیل جائے گی' لوگوں کو پتہ چلے گا کہ کیشو ہمارا مخالف کیوں ہو گیا ہے اس طرح تو ہمارے نام پر بٹہ لگ جائے گا۔''

''بدنامی یا نام کو بٹہ لگنے کا تو سوال ہی نہیں مہاراج۔''

پاربتی نے اپنے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بھگوان نے آپ کو اس دیس کی ہر چیز کا مالک بنایا ہے' کاملی بھی آپ کی مملکت میں شامل ہے' آپ نے کسی غیر کے گھر ڈاکہ تو نہیں ڈالا کہ بدنامی ہوتی پھرے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' راجہ بدستور متفکر تھا۔

''مگر کیشو نے جو یہ جھگڑا کھڑا کر دیا ہے۔''

''اس کی آپ پروا نہ فرمائیں ست پال نے سارا انتظام کر لیا ہے اس سے ایک دو دن کے اندر نمٹ لیا جائے گا۔''

''مگر اس کے بعد مادھو کیسے خاموش رہے گا۔ وہ بھی تو واپس آنے والا ہوگا۔''

''آپ چنتا نہ کیجیے مہاراج' وہ ہے کس کھیت کی مولی جو ہمارے لیے پریشانی پیدا کر سکے گا۔''

''مگر ہم یہ بھی تو نہیں چاہتے کہ ان دونوں بھائیوں کو ختم کر دیا جائے انہوں نے ہماری بہت خدمت کی ہے اور دیس کے انتظام کو بڑی خوبی سے سنبھالا ہے۔''

''آپ بہت بھولے ہیں مہاراج' اب وہ آپ کے خادم نہیں بلکہ دیس کے باغی ہیں' کیشو سرکاری احکام ماننے سے انکاری اور مقابلہ پر آمادہ ہے' مادھو بھی یہی کچھ کرے گا' اب ان کا زندہ رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' پاربتی نے سمجھایا۔

ان بھائیوں کے زندہ رہنے میں راجہ کو کوئی خطرہ ہو یا نہ ہو مگر پاربتی کو ضرور خطرہ تھا کہ ان کی موجودگی ست پال کی وزارت کو باقی نہیں رہنے دے گی اور ست پال کی وزارت نہ رہی تو پاربتی کا وہ اختیار و اقتدار بھی ختم ہو جائے گا جو اب اسے حاصل ہو گیا تھا۔ راجہ اب دونوں کے شکنجے میں اس طرح آ چکا تھا کہ چوں و چرا بھی نہیں کر سکتا تھا' اس لیے اس سے اور کچھ بن نہ پڑا تو بے دلی کے ساتھ کہا۔

''اچھا' جو تمہاری مرضی۔''

اور خاموش ہو گیا۔

دوسرے ہی دن کیشو کی گرفتاری کے احکام جاری ہو گئے' مگر اس نے بہادری کی موت مرنا پسند کرتے ہوئے اپنی مختصر سی جماعت کے ساتھ حکومت کی بے پناہ طاقت سے ٹکر لے ڈالی۔ ایک معمولی سی جھڑپ ہوئی اور کیشو مردانگی کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا' ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد مادھو کی گردن ناپنے کے انتظام کر لیے گئے' کشمیر سے واپسی پر گجرات کی سرحد میں داخل ہوتے ہی اسے قتل کر دیا جانا تھا کہ کسی کو کانوں کان بھی پتا نہ چل سکے کہ اس کا کیا حشر ہوا ہے' ان انتظامات کی تکمیل کے بعد پاربتی اور ست پال اس طرح مطمئن اور خوش تھے جیسے دنیا کی تمام طاقتوں کو انہوں نے زیر کر لیا ہے اور اب کسی کو بھی ان کے اختیار و اقتدار پر اعتراض کرنے کی جرأت نہ ہو سکے گی' ادھر دہلی میں ان دنوں علاؤالدین خلجی کی حکومت اپنی شان وشوکت اور دبدبہ کے لحاظ سے عروج پر تھی۔ قطب مینار کے شمال مشرق میں تین میل کے فاصلے پر شہر نو آباد ہو چکا تھا' جسے علاؤالدین خلجی کا دارالسلطنت ہونے کا شرف حاصل تھا' یہ نیا شہر اس قدر خوبصورتی کے ساتھ آباد کیا گیا تھا کہ لوگ دور دور سے اسے ایک نظر دیکھنے آیا کرتے تھے۔ اس شہر کے قلب میں قصر ہزار ستون کی پر شکوہ اور عظیم عمارت تھی جو بادشاہ وقت کی رہائش گاہ تھی۔ اس قصر ہزار ستون میں دربار عام منعقد ہوتا تھا اور فریادیوں کی شکایتیں بادشاہ کے حضور پیش ہوا کرتی تھیں اور مملکت کے بارے میں مشورے اور فیصلے ہوا کرتے تھے

اور ضروری احکامات جاری کیے جاتے تھے۔ ایک دن بادشاہ دربار عام منعقد کیے ہوئے تھا سائل ایک ایک کر کے اس کے سامنے پیش ہو کر فیصلے ہو رہے تھے کہ حاجب نے مودبانہ عرض کی۔

''جہاں پناہ...... وزیر اعظم گجرات مادھو قدم بوسی کی اجازت کا طلب گار ہے۔''

بادشاہ سخت حیران ہوا اور حاجب کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''مادھو وزیر اعظم گجرات؟ اور یہاں؟''

''جہاں پناہ وہ کشمیر سے سوداگر کے بھیس میں یہاں پہنچا ہے اور اپنے راجہ کے ظلم کے خلاف فریاد لے کر حضور کے پاس آیا ہے۔''

بادشاہ کی حیرانی ابھی رفع نہیں ہوئی تھی' اس نے ذرا تامل کے بعد کہا۔

''اسے بڑی عزت اور احترام کے ساتھ شاہی مہمان خانہ میں ٹھہراؤ اور کسی وقت تخلیہ میں ہمارے پاس لاؤ' معلوم ہوتا ہے وہ کسی اہم مقصد کے لیے یہاں تک پہنچا ہے۔''

دو دن کے بعد مادھو کو علاؤ الدین خلجی کے حضور باریابی حاصل ہو گئی تو وہ رو رو کر فریاد کناں ہوا۔

''جہاں پناہ' میں حضور کی خدمت میں اپنے راجہ کے خلاف فریاد لے کر اس امید پر حاضر ہوا ہوں کہ اسے رد نہیں کیا جائے گا۔''

بادشاہ نے اس کی آہ و زاری کا اثر نہ لیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اچھی طرح معلوم ہو گا کہ سلطنت دہلی کے گجرات کے راجہ کے ساتھ تعلقات ٹھیک نہیں ہیں۔''

مادھو نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

''جہاں پناہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔''

''تم اس راجہ کے وزیر اعظم ہو' تمہاری بات ہمارے لیے کس حد تک قابل قبول ہو سکتی ہے؟''

''اس کا وزیر اعظم تھا ضرور...... لیکن اب نہیں ہوں' جہاں پناہ اپنے ذرائع سے میرے اس بیان کی تصدیق فرما سکتے ہیں کہ راجہ نے دیس سے میری غیر حاضری کے دوران میری بیوی پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے' میرے بھائی کیشو کو قتل کرا دیا ہے اور میرے خاندان کے لوگوں اور عزیز و اقارب پر بے پناہ مظالم توڑے جا رہے ہیں۔''

بادشاہ نے اب بھی کوئی اثر نہ لیتے ہوئے کہا۔

''مظالم تو وہاں مسلمانوں پر بھی ایک عرصہ سے توڑے جا رہے ہیں' راجہ سے ہمارے تعلقات کی خرابی کی وجہ بھی یہی رہی ہے۔ ان مظالم کی شکایات ہمارے پاس اکثر پہنچتی رہی ہیں مگر چند باتیں اب تک ہمیں گجرات پر فوج کشی سے مانع رہیں۔''

''جہاں پناہ' راجہ کرن دیو ہرگز اس قابل نہیں کہ کسی دیس کی حکومت کا اہل گردانا جائے اس نے گجرات کو برباد کر کے رکھ دیا ہے اور رعایا کا ناک میں دم ہے' آپ اگر گجرات کو فتح کرنے کا ارادہ فرمائیں تو وہاں کے لوگ حضور کو اپنا نجات دہندہ تصور کریں گے۔''

بادشاہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''ان تمام باتوں کا علم ہے' بلکہ ہم اس سے بھی بہت زیادہ جانتے ہیں' مگر چند رکاوٹیں ہیں جن کے دور ہونے سے قبل گجرات پر فوج کشی ہمارے لیے مصلحت کے خلاف ہے۔''

مادھو نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔

''جہاں پناہ! گستاخی معاف' ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے اگر میری خدمات کچھ کام آ سکیں تو بندہ دل و جان سے حاضر ہے۔''

''تمہاری خدمات کی بھی ہمیں ضرورت پڑے گی اور وقت آنے پر ہم ان سے فائدہ اٹھائیں گے' سب سے پہلے ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اس دفعہ گجرات کو فتح کرنے کے بعد اسے سلطنت دہلی کے ماتحت کس طرح رکھا جائے' وہاں مسلمانوں پر مظالم ہونے کی نوبت صرف اس لیے آئی کہ مسلمان بادشاہ اسے فتح کر لینے کے باوجود وہاں کی حکومت پھر کسی نہ کسی راجہ کے سپرد کرتے رہے' محمود غزنوی کے حملہ سومنات سے لے کر اب تک چار مرتبہ مسلمانوں نے گجرات کو فتح کیا' مگر حکومت پھر بھی وہاں کے راجوں کے ہاتھ میں رہی اور وہ ہمیشہ سرکش ہو کر مسلمانوں کے لیے مصیبت بنتے رہے ہیں۔''

''جہاں پناہ! گستاخی معاف تمام ہندو راجے تو ایک

طرح کے نہیں ہیں۔"

"ہاں...... ہمیں تسلیم ہے کہ چارواڑہ اور سولنکی خاندان کے راجہ نے اپنی مسلمان آبادی کے لیے احکام اور عمال تک مسلمان مقرر کر دیے تھے، اسی لیے ان سے کسی مسلمان بادشاہ کو کوئی شکایت نہیں ہوئی مگر موجودہ حکمران باگھیلا خاندان کے قریباً تمام راجہ اس معاملے میں سخت متعصب ثابت ہوئے ہیں، اس لیے اب غالباً انہیں مزید موقع نہیں دیا جاسکتا کہ گجرات کی حکومت ان کے قبضہ میں رہے۔"

"جہاں پناہ! آپ نے بالکل درست فرمایا۔" مادھو نے تائید کی۔

"مگر ہمیں ایک اور مشکل درپیش ہے، دہلی کی فوجوں کو گجرات تک پہنچنے کے لیے مالوہ اور آبو کی ریاستوں سے گزرنا پڑتا ہے، وہاں کے ہندو حکمرانوں سے ہماری کوئی لڑائی نہیں ہے ہم انہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ بھی ہماری راہ میں مزاحم نہ ہوں، انہوں نے ایسا کیا تو ہمیں ان سے بھی نپٹنا پڑے گا اور گجرات کی مہم ادھوری رہ جائے گی۔"

مادھو بڑا خوش ہوا کہ اسے کارگزاری دکھانے کا موقع مل گیا ہے، فوراً بول اٹھا۔

"جہاں پناہ! ان دونوں راجوں کو ہموار کرنا میری ذمہ داری ہے، یہ کام آپ پورے اعتماد کے ساتھ مجھ پر چھوڑ سکتے ہیں۔"

بادشاہ نے گفتگو ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

"بہتر ہے ہم تمہیں اس کام کرنے پر مقرر کرتے ہیں اس سلسلے میں تم ملک نصرت خان سے مل لینا، وہ تمام ضروریات تمہیں مہیا کردیں گے۔" مادھو بادشاہ سے رخصت ہو کر باہر نکلا ہی تھا کہ دوسرے دروازے سے ملک نصرت خان وزیر مملکت اور الماس بیگ الغ خان سپہ سالار داخل ہو کر آداب بجالائے، بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمام گفتگو تم سب لوگ سن چکے ہو۔"

"جی جہاں پناہ۔" دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"اب اس شخص کی باتوں کی سچائی معلوم کرنا نصرت خان کی ذمہ داری ہے اور الغ بیگ کے ذمہ یہ کام ہے کہ گجرات پر حملہ کے لیے فوج کی تیاری کا آغاز کردے تاکہ وقت آنے پر بلاتاخیر یہ کام انجام دیا جاسکے۔"

"بہت بہتر جہاں پناہ۔"

دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔

نصرت خان کی تحقیق سے پتا چل گیا کہ مادھو واقعی راجہ کرن کے ہاتھوں اپنی عزت و آبرو لٹا کر خلجی دربار میں پہنچا تھا اور اس کی باتوں میں کوئی چال یا دھوکا شامل نہ تھا، الغ بیگ نے چار ماہ کی تیاریوں کے بعد پندرہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج اس مہم کے لیے تیار کرلی، اس فوج میں ہندوستانیوں کے علاوہ سندھیوں کی بھی بڑی تعداد شامل تھی اور تین ہزار نومسلم تاتاری مغل بھی تھے جو اپنے کمانڈر محمد شاہ، قمر بیگ، قتلغ بیگ کی سربراہی میں اس مہم میں حصہ لے رہے تھے۔ مادھو کی کوششوں اور اثر ورسوخ نے مالوہ اور آبو کے ہندو راجوں کو اس حد تک ہموار کرلیا تھا کہ انہوں نے خاموشی کے ساتھ اس مسلمان لشکر کو اپنے علاقوں سے گزرنے کی اجازت دے دی۔ اس طرح اس مہم کی تیاری مکمل ہوگئی اب اس راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔ بادشاہ کو جب اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے فرمان جاری کیا۔

"اس مہم کا امیر ہم اپنے برادر خورد سپہ سالار لشکر الماس بیگ الغ خان کو مقرر کرتے ہیں۔ نصرت خان وزیر مملکت اس کے نائب کی حیثیت سے ساتھ رہیں گے ہمارے برادر نسبتی الپ خان کو ہم گجرات کا پہلا ناظم مقرر کرتے ہیں، گجرات کی فتح کے فوراً بعد اس کا نظم و نسق سنبھال لیں گے اور شاہی افواج دارالخلافہ واپس آجائے گی مادھو کو ہم اس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ناظم گجرات کا وزیر مقرر کرتے ہیں۔"

اس فرمان کے اجراء کے بعد بڑی خاموشی اور رازداری کے ساتھ یہ مہم گجرات کے لیے روانہ ہوگئی، الغ خان چاہتا تھا کہ اس طرح گجرات پہنچ جائے کہ راجا کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے، وہ اچانک اس کے سر پر پہنچ کر حملہ آور ہو اور پلک جھپکتے میں گجرات پر فتح کا جھنڈا اگاڑ دے، مگر کیشو کی سرکشی اور مادھو کے فرار کے بعد ناممکن تھا کہ ست پال جیسا آدمی بے خبر ہو کر بیٹھ جائے، اسے بھی

اپنے ذرائع سے پل پل کی خبر مل رہی تھی اور ان خبروں کی روشنی میں وہ بھی اپنی جگہ پوری تیاری میں مصروف تھا' چنانچہ مالوہ اور آبو کے علاقوں سے گزرنے کے بعد مسلمان افواج گجرات کی سرحد میں بظاہر خاموشی کے ساتھ داخل ہوئی تو سلطنت گجرات کے پہلے ہی اہم مقام اساول میں گجرات کا لشکر جرار ان کی مزاحمت کے لیے موجود تھا۔

گجرات کی فوج میں تیس ہزار گھڑ سوار' اسی ہزار پیدل اور تیس جنگی ہاتھی تھے' مقابلہ میں صرف پندرہ ہزار فوج تھی' اس لیے ست پال کو یقین تھا کہ اس کا بال بیکا نہیں ہوسکتا' اس نے راجہ کرن کو جنگ کی صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''مہاراج یہ دہلی کا بادشاہ مجھے کچھ عقل سے عاری لگتا ہے یا پھر مادھو کی باتوں نے اس کی عقل ماردی ہے' اپنی پندرہ ہزار فوج خواہ مخواہ ملیامیٹ کرانے کے لیے یہاں آ پہنچا ہے۔''

راجہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''صرف پندرہ ہزار فوج ہے' اور ہماری فوج کی تعداد تو ایک لاکھ سے زائد ہے نا؟''

''جی مہاراج؟'' ست پال نے اعتماد سے کہا۔ ''ہماری فوج ایک لاکھ دس ہزار ہے اور ہمارے پاس تیس جنگی ہاتھی بھی موجود ہیں جبکہ مسلمانوں کے پاس ایک بھی ہاتھی نہیں ہے۔''

راجہ اور بھی خوش ہوگیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ فوج کو تو ہمارے ہاتھی ہی کچل ڈالیں گے۔''

''مہاراج' آپ کا سنگھاسن سلامت رہے' دیکھیے کہ ان کا حشر کتنا عبرتناک ہوتا ہے' انہیں ہم وہ مزہ چکھائیں گے کہ دوبارہ گجرات کا کبھی رخ نہ کرسکیں۔''

''جس دن تم فتح کی خبر لے کر ہمارے پاس آؤ گے ہم تمہارا منہ موتیوں سے بھردیں گے۔'' ست پال نے آداب بجالا کر کہا۔

''مہاراج! آشا ہے کہ وہ دن زیادہ دور نہیں ہوگا۔''

انہلواڑہ میں ست پال اور دیگر ارکان حکومت اپنی فتح کے تیقن کے ساتھ صلاح' مشوروں اور انتظامات میں مصروف تھے ادھر اساول میں گجرات کی فوج کے منصب داروں نے بھی کچھ ایسا ہی خیال کرتے ہوئے دہلی کی فوج کو کمر کھولنے کی بھی اجازت نہ دی اور ایک دم حملہ کردیا' مگر انہیں جلد ہی معلوم ہوگیا کہ یہ فوج تعداد میں بیشک بہت کم تھی لیکن بلامقصد ہی اتنا طویل فاصلہ طے کرکے وہاں تک نہیں پہنچ گئی تھی' اس کا ایک ایک سپاہی کچھ کرنے اور کرگزرنے کا عزم لیے ہوئے تھا' اس لیے وہ تر نوالہ نہیں بن سکتے تھے۔ چنانچہ جس طرح الغ خان کا خاموشی کے ساتھ گجرات پہنچ کر اچانک قبضہ کرلینے کا منصوبہ بے بنیاد ثابت ہوا تھا اسی طرح گجرات کی فوج کا یہ خیال باطل ہوگیا کہ دہلی کی فوج ان کے سامنے قدم ہی نہیں جماسکتی' ایک دوسرے کی طاقت اور ہمت کا اچھی طرح اندازہ ہوجانے کے بعد باقاعدہ جھڑپوں اور کبھی کبھی بڑے حملوں کا آغاز ہوگیا۔ طرفین نے خوب ڈٹ کر مردانگی کے جوہر دکھانے شروع کردیئے۔ دونوں جانب کے بہادروں نے وہ داد شجاعت دی کہ کسی فریق کا پلہ بھاری نہ ہوسکا۔ معرکے ہوتے رہے میدان کارزار گرم ہوتا رہا' تلواریں چمکتی رہیں' گرم و سرخ خون بہہ کر مٹی میں جذب ہوتا رہا مگر فیصلہ کسی کے حق میں نہ ہوسکا' دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے' مگر اس رزم گاہ کی حالت جوں کی توں رہی' دلیروں کے قدم اپنی جگہ جمے فیصلے کی گھڑی کے منتظر رہے' مگر فیصلہ کی گھڑی جانے کیوں آہی نہیں چکتی تھی۔ ایک دن صبح صبح پاربتی نے راجا کی خلوت گاہ پر دستک دی' راجہ کامنی کی بغل میں منہ دیے دنیا ومافیہا سے غافل پڑا تھا' کامنی آنکھیں کھولے ایک جانب ٹکٹکی لگائے یوں گھور رہی تھی جیسے کسی گم شدہ شے کی تلاش میں ہو' اس کی بوجھل اور سرخ آنکھیں بتارہی تھیں کہ ساری رات نہیں سوئی ہے' وہ اب تک خود کو اس زندگی کا عادی نہیں کرپائی تھی' اتنے عرصہ تک راجہ کے ساتھ اس محل میں رہنے اور اس کی خواب گاہ کی کھمبہ دار بننے کے باوجود وہ راجہ کو اپنے لیے قبول نہیں کرسکی تھی' اس نے آہستہ سے اٹھ کر باہر جھانکا اور پاربتی کو سامنے پاکر اور زیادہ مکدر ہوگئی۔ پاربتی سے وہ سخت نفرت کرتی تھی اور اپنی تباہی کا ذمہ دار اسے ہی گردانتی تھی مگر اس وقت وہ سلطنت کے سیاہ وسفید کی مالک

تھی اس لیے اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی' چنانچہ کامنی چپ چاپ دروازہ کھول کر آہستہ سے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور پاربتی اندر پہنچ کر راجہ کو جگانے لگی۔

''مہاراج...... مہاراج...... اٹھیے...... میدان جنگ سے ایک اچھی خبر آئی ہے۔''

راجہ نے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے کہا۔''میدان جنگ......''

اس کے بعد فوراً ہی سنبھل کر بولا۔

''اچھا...... کیا خبر ہے...... کیا اچھی خبر ہے۔'' پاربتی نے لہکتے ہوئے کہا۔

''مہاراج' بہت بڑی خبر ہے' ست پال محل کے دروازے پر حاضر ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اپنی زبان سے یہ خبر مہاراج کو سنائے۔''

راجہ نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

''اچھا کہو ہم آتے ہیں۔''

ساتھ کے کمرے میں کامنی یہ سوچتے ہوئے داخل ہوئی تھی کہ صبح صبح یہ منحوس شکل دیکھی ہے تو جانے دن میں کیا آفت آنے والی ہے اور جب اس نے سنا کہ میدان جنگ سے کوئی اچھی خبر آئی ہے تو اسے یقین ہوگیا کہ آج کا دن اس کے لیے یقیناً نحس ثابت ہوگا۔ ظاہر ہے کہ پاربتی کے لیے جو خبر اچھی ہوسکتی تھی وہ اس کے لیے لازماً بری ہوگی' دراصل وہ دل سے یہ چاہتی تھی کہ گجرات کی فوجوں کو شکست ہو اور دہلی کی فوجیں کامیاب ہوجائیں تاکہ وہ کسی صورت اس زندگی سے نجات حاصل کرسکے' جو اسے ایک لمحہ کے لیے پسند نہیں تھی وہ اس کے لیے غلامی اور ذلت کی زندگی تھی اور جس دن سے اس نے سنا تھا کہ دہلی کی فوجوں کے ساتھ مادھو بھی موجود ہے' اس دن سے تو وہ مسلمان فوج کے لیے باقاعدہ دعائیں کیا کرتی تھی' اسے اپنی آزادی اور رہائی کی صرف یہی صورت نظر آتی تھی بلکہ اب تو اس کی زندگی اسی امید پر قائم تھی' چنانچہ وہ یہ سن کر بہت غمگین ہوگئی کہ راجہ کے لیے میدان جنگ سے کوئی خوش خبری آئی تھی' اس خوش خبری کا مطلب اس کے لیے بالکل برعکس تھا۔

ادھر راجہ محل سے نکلا تو ست پال نے دور ہی سے آداب بجا لا کر کہا۔

''جے ہو مہاراج کی! میں ایک بہت بڑی خبر لے کر آیا ہوں۔''

راجہ صبح سویرے جگا دینے پر خوش نہیں تھا' اس لیے اس نے زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے بولا۔

''کہو کیا خبر ہے؟''

ست پال نے راجہ کا شوق مہمیز کرنے کی خاطر فوراً خبر نہیں سنائی اور بولا۔

''مہاراج بہت بڑی خبر ہے' بس یوں سمجھ لیجیے کہ ہماری فتح کا آغاز ہے بلکہ ہوگیا اور دہلی کی فوجیں اب بہت جلد ملیامیٹ ہونے والی ہیں۔''

راجہ نے الجھتے ہوئے کہا۔''مگر بتاؤ کہ کیا خبر ہے؟''

''مہاراج' مادھو میدان جنگ میں مارا گیا ہے۔''

''مارا گیا......'' راجہ نے غیر شعوری طور پر اطمینان کا سانس لیتے کہا۔

''جی مہاراج اور اس کی لاش بھی ہمارے قبضے میں ہے۔''

اب راجہ واقعی خوش تھا چہکتا ہوا بولا۔

''واقعی تم بہت بڑی خوشخبری لائے ہو ست پال ہم تمہیں انعام دیں گے۔ ہمارا اصل دشمن وہی تھا' وہ نرک پہنچ گیا تو اب دہلی کی فوج مزید نہیں ڈٹ سکے گی۔''

ست پال نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''مہاراج' میں نے تو پہلے ہی عرض کیا تھا کہ دیش کے سارے بھید اس کے پاس ہیں اور اسی کی وجہ سے دہلی کی فوجیں اب تک مقابلہ کرتی رہی ہیں اب آپ دیکھیں گے کہ ان کی کیا گت بنتی ہے۔''

ذرا توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

''مگر مہاراج! مادھو کی لاش کا کیا کیا جائے' اسے انہلواڑہ منگوایا جائے یا نہیں۔''

راجہ کو فوراً ایک خیال آیا' اس نے کہا۔

''ہاں ہاں...... اسے یہاں منگوایا جائے' اس کا کریا کرم یہیں ہونا چاہیے۔''

اس کا خیال تھا کہ مادھو کے کریا کرم کے بعد کامنی

اوراس کے درمیان اجنبیت کی جو دیوار ہے وہ ہٹ جائے گی اور کامنی پوری طرح اس کی ہو جائے گی' دوسرے یہ کہ مادھو کا کریا کرم سرکاری طور پرانجام دے کر وہ کامنی پر یہ اثر ڈال سکے گا کہ مادھو کی دشمنی کے باوجود وہ اس کی عزت کرتا رہا ہے۔

یہ خبر ایسی نہ تھی کہ کامنی تک نہ پہنچتی' سارے درباریوں اور محل والوں کو بلکہ سارے شہر کو پتا چل گیا کہ مادھو بہت بہادری کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا ہے اور اس کی لاش کریا کرم کے لیے انیلواڑہ لائی جارہی ہے' کامنی کے کانوں نے یہ خبر سنی تو اس کے دل پر ایک گھونسا لگا' اس کی زندگی کی آخری موہوم سی امید کا دیا بھی بجھ گیا۔ اب اس کے لیے چاروں جانب گھور اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سب کچھ لٹ چکا تھا' زندگی کے ساتھ ایک معمولی سا رشتہ باقی تھا وہ بھی آج ٹوٹ گیا' اس کا جی چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے' اپنے بال نوچے' اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے' اپنا سینہ کوٹ لے زور زور سے بین کرے مگر کس قدر مجبور تھی وہ کہ وہ اپنی زندگی اجڑ جانے پر اپنی دنیا لٹ جانے پر دو آنسو بھی کھل کر نہیں بہا سکتی تھی' وہ گم صم بیٹھی اپنے خیالوں میں غرق رہی اور پھر رات تک اسے پتا نہیں چلا کہ اس کے آس پاس کیا ہوتا رہا ہے' البتہ رات کو راجہ خواب گاہ میں پہنچا تو کامنی کو غیر معمولی طور پر ملتفت پایا۔ راجہ بڑا خوش ہوا کہ یہ انہونی بھی ہوئی۔ اس نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

''کامنی رانی' آج تو بڑی مہربان نظر آتی ہو' یہ ہمارے بھاگ کس طرح جاگ پڑے؟''

کامنی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''مہاراج' میں نے ہمیشہ یہ عرض کیا ہے کہ جب تک میں کسی اور کی پتنی ہوں' خوشی سے اپنے آپ کو مہاراج کے سپرد نہیں کر سکتی۔''

''مگر ہمیں افسوس ہے کہ مادھو اب اس جگ میں نہیں۔''

''اسی لیے تو اب آزادی سے مہاراج کے لیے سب کچھ کر سکتی ہوں۔''

''ہم اس بات سے بہت خوش ہوئے' تمہیں معلوم ہو کہ مادھو کا کریا کرم' ہم سرکاری طور پر پورے اعزاز کے ساتھ انجام دیں گے' اس نے ہم سے دشمنی کی مگر اس کے دشمن نہیں ہم۔''

کامنی نے گویا خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''مہاراج میری بھی ایک درخواست ہے۔''

''کہو کہو تم ہمیں حکم دے سکتی ہو کامنی۔''

''میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ یہ کریا کرم میں اپنے ہاتھ سے انجام دوں اور صرف اس کام کی انجام دہی تک آپ مجھے اپنی خواب گاہ تک آنے کے لیے مجبور نہ کریں گے۔ اس کے بعد میں ہر طرح سے آپ کے حکم کی پابند ہوں۔''

راجہ نے کچھ دیر تامل کیا۔ وہ اپنی کامیابی پر بڑا خوش تھا' اسے لگتا تھا جیسے کامنی کو اس نے ازسرنو حاصل کرلیا ہے' خوشی کے سرور میں ہی اس نے کہا۔

''ہمیں دونوں باتیں منظور ہیں' کہو اب خوش ہو۔''

کامنی نے فوراً جھک کر اس کے چرن چھوئے اور اس کے بعد نپے تلے قدم اٹھاتی دوسرے کمرے میں چلی گئی وہاں پہنچتے ہی سیلاب کا بند ٹوٹ گیا۔ اپنی چیخوں پر قابو پانے کی کوشش میں اس کی جان پر بن گئی اور ساری رات اس کے آنسو اور ہچکیاں کسی طرح بند نہ ہو سکے۔

مادھو کی لاش انیلواڑہ پہنچ گئی' پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ اس کے کریا کرم کا اہتمام کیا گیا' شمشان پہنچا...... کامنی بھی اسی طرح ننگے پاؤں اس کے ساتھ تھی' تمام شہر کو معلوم ہو چکا تھا کہ کامنی خود کو چتا آگ لگائے گی' اس لیے شہر اور مخلوق کے ساتھ ساتھ مادھو کے عزیز اقربا بھی شمشان پہنچ گئے تھے۔ اگرچہ کیشو کی سرکشی کے بعد سے وہ حکومت کے معتوب تھے' ارتھی کو چتا میں رکھ دیا گیا' برہمنوں نے اپنے منتر پڑھ لیے اور ساری رسوم مکمل ہو گئیں تو کامنی پر اعتماد قدموں کے ساتھ ایک جلتی مشعل ہاتھ میں لیے آگے بڑھی' سفید ساڑی میں اس کا بے مثال حسن یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی اپسرا دنیا کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے ہاتھ میں مشعل لیے آسمان سے اتری ہے۔ چتا کے قریب پہنچ کر اس نے اپنی مشعل سے گھی میں صندل کی لکڑیوں کو آگ لگائی تو برہمنوں کے منتروں کی

جانب پھر جاپ بلند ہوئی' چتا میں آگ پھیلی کامنی اپنی جگہ کھڑی رہی پیچھے نہیں ہٹی۔ شعلے پھیلے' آگ بھڑک اٹھی' کامنی اپنی جگہ سے پھر بھی نہیں ہلی تو راجہ کرن بے چین ہوگیا' اس نے پکار کر کہا۔

''کامنی رانی...... پیچھے ہٹ جاؤ۔''

اب آگ خوب بھڑک چکی تھی اور شعلے اوپر اٹھ رہے تھے' کامنی نے پیچھے مڑ کر ایک قہر بھری نظر راجہ پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''مہاراج جس بستی کا راجہ اپنی رعایا کی عزت لوٹنے لگے وہ پاپ کی بستی قائم نہیں رہتی' میں اس پاپ کی بستی سے جا رہی ہوں' لیکن یاد رکھیے کہ آپ کا انجام بڑا ہولناک ہوگا۔''

یہ کہا اور اس نے چتا کے اندر چھلانگ لگا کر خود کو بھڑکتے شعلوں کے سپرد کر دیا۔ راجہ گم صم کھڑا دیکھتا رہ گیا اور وہ پتی ورتا کی مثال قائم کر گئی۔

ادھر میدان جنگ کا عجیب عالم تھا۔

سولہ مہینے گزر گئے اور کسی کروٹ فیصلہ ہونے میں نہیں آ رہا تھا' معرکے پر معرکہ پڑ رہا تھا' پے در پے حملے ہو رہے تھے' چالیں اور تدبیریں سوچی جا رہی تھیں' مگر سب کچھ بے نتیجہ تھا' بات پھر جہاں کی تہاں تھی دونوں فریق اپنی اپنی جگہ پڑ ڈالے ہوئے تھے۔ الغ خان کو اب رسد کی بھی مشکلات پیش آنے لگی تھیں' کیونکہ وہ دہلی سے کافی فاصلہ پر تھا' اور یہ خیال بھی نہیں تھا کہ جنگ اس قدر طول پکڑ جائے گی۔ آخر ایک دن اس نے اپنی فوج کے افسروں اور جوانوں کو جمع کر کے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

''میرے ساتھیوں! آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ جنگ اکتا دینے کی حد تک طویل ہو چکی ہے' ہم اپنے گھروں سے بہت فاصلہ پر ہیں اور کامیابی کے بغیر ہم نے واپس نہیں ہونا سیکھا' ہم اپنا مقصد حاصل نہ کر سکے تو ہمیں اپنے بھائیوں کے خون سے شرمندہ ہونا پڑے گا' جو گزشتہ ایک سال چار ماہ کے دوران قربانیاں دے کر اپنے رب سے جا ملے ہیں' ہمیں رسد کی کمی کی مشکلات کا سامنا ہے۔ دہلی بہت دور ہے اور ہمارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے' ہماری زندگی اور عزت کا صرف ایک راستہ ہے کہ اس مقصد میں کامیابی سے ہم کنار ہوں جس کے لیے ہم اتنی مدت سے اپنے گھروں سے دور میدان کارزار میں مقیم ہیں' آپ یہ تہیہ کر کے میرا ساتھ دیجیے کہ اب حملہ میں یا تو کامیابی ہمارے قدم چومے گی یا شہادت نصیب ہوگی' تیسرا کوئی راستہ ہمارے لیے نہیں ہے۔ اگر کوئی اور راستہ نکل بھی آیا تو یاد رکھیے عزت کا راستہ نہیں ہوگا۔ اور ذلت کی زندگی سے عزت کا راستہ نہیں ہوگا اور ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہر حال بہتر ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کی حمایت اور نصرت کا طلبگار ہوں۔'' اس کے بعد اس نے اپنی فوج کو جھنجھوڑ کے ایسا زبردست حملہ کیا کہ گجرات کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پھر تو آن کی آن میں مسلمان گجرات پر آندھی کی طرح چھا گئے' گجراتیوں کو اپنی فتح کا اس قدر یقین تھا کہ انہوں نے دوسری دفاعی لائن کی جانب قطعاً توجہ نہیں دی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ایک دفعہ غالب آ گئے تو آن کی آن میں سارا گجرات ان کے قبضے میں تھا۔ راجہ کو انیلواڑہ سے اس حالت میں بھاگنا پڑا کہ محل سے کوئی چیز بھی ساتھ نہیں لے جا سکا۔ یہاں تک کہ اپنی چہیتی رانی کنولا دیوی کو بھی وہیں چھوڑ گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک دو جگہ قدم جمانے کی کوشش کی مگر الغ خان نے اس کا موقع نہ دیا اور اسے دکن میں جا کر دیوگڑھ کے راجہ کے پاس پناہ لینا پڑی۔

راجہ کرن نہ صرف بگھیلا خاندان کا آخری راجہ تھا بلکہ گجرات کا آخری ہندو راجہ تھا۔ اس کے بعد گجرات اپنی آزاد حیثیت کھو کر ہمیشہ کے لیے سلطنت دہلی کے ماتحت آ گیا۔ اس راجہ کی رنگین مزاجی اور حماقت مابی کے باعث ہندو تاریخ میں اسے ''احمق راجہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

❁

وفاگزیدہ

ریاض بٹ

بھرے میلے سے ایک شادہ شدہ خاتون کے اغواء سے شروع ہونے والی کہانی' جس کا ہر پل پولیس کو نئی سمت لے کر جارہا ہے۔

انسپکٹر خالد کی ڈائری کا ایک ورق

انسان نے اپنی انا' لالچ' طمع' اور اپنے جیسے انسانوں پر حکمرانی کرنے کے لیے بڑی ترقی کی ہے پتھر کا دور چھوڑ دیں' اس کے بعد انسان نے اپنے آپ کو ناقابل تسخیر بنانے کے لیے نت نئے ہتھیار بنائے ہیں' تلوار' ڈھال نیزہ سے لے کر آج کل ایٹم بم' ہائیڈروجن بم تک پہنچ گیا ہے' رہی بات ہلاکت خیز ہتھیاروں کی تو بات ہی نہ کریں' آپ بھی قارئین سوچ رہے ہوں گے کہ میں آج کس طرف نکل کھڑا ہوا ہوں' شاید کسی جنگ کی کہانی سناؤں گا' ایسی کوئی بات نہیں ہے' سیانے کہتے ہیں جس کا کام اسی کو ساجے' میں تفتیشی کہانی ہی سناؤں گا' خاطر جمع رکھیں۔

یہ سب لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ آج کل دہشت گردی کی جو لہر چل پڑی ہے اس سے اطمینان رخصت ہو چکا ہے' اب اول تو میلے ٹھیلے ہوتے ہی نہیں ہیں اور اگر ہوتے بھی ہیں تو لوگ کھلے دل سے شریک نہیں ہوتے عجیب سا خوف دلوں میں گھر کر گیا ہے۔

خیر میں آپ کو پرسکون دور میں لیے چلتا ہوں' گاؤں صابر آباد میں میلہ لگا ہوا تھا...... طرح طرح کی دکانیں بجی ہوئی تھیں' کھیل تماشے ہو رہے تھے' ایک جگہ سرکس بھی لگی ہوئی تھی' یہاں سب سے زیادہ رش موت کے کنویں پر تھا۔

میں اور سپاہی شہباز بھی یہاں گھوم رہے تھے۔

لیکن......!

ہمارا دھیان ان دلچسپیوں کی طرف نہیں تھا' ہم ایک خاص مقصد کے لیے گھوم رہے تھے' ورنہ ہم پولیس والوں کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے کہ اس طرح میلوں ٹھیلوں میں گھوم سکیں۔

تو...... قارئین قصہ کچھ یوں ہے کہ چند دن پہلے جب میں اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا تو مجھے دروازے میں سپاہی شہباز کی صورت نظر آئی...... اور ساتھ ہی اس کی آواز بھی اس طرح میری سماعت سے ٹکرائی جیسے ٹی وی کی اسکرین پر' صورت اور آواز آنکھوں اور کانوں تک پہنچتی ہے۔

''سر...... میں اندر آسکتا ہوں۔''

''آجاؤ' بھئی ابھی تک چائے تو آئی نہیں...... تم ہی آجاؤ۔''

وہ اندر داخل ہو کر بولا۔ ''سر...... میں نے آفس بوائے کو کہہ دیا تھا' بس لے کے آتا ہی ہوگا۔''

''جب چائے آئے گی تو اس کے ساتھ بھی دو دو ہاتھ کرلیں گے' پہلے تمہاری سن لیتے ہیں۔'' میں اس وقت خوشگوار موڈ میں تھا۔ اس لیے سپاہی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''سر...... ایک عورت اور جوان آئے ہیں' اور کہتے ہیں 'آپ کو ہی اپنا مسئلہ بتائیں گے۔''

''ٹھیک ہے بھئی بھیج دو...... میں نے میز پر بکھرے کاغذات کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ میرے سامنے تھے۔

عورت کی عمر بیالیس سال ہوگی' جبکہ جوان کی عمر

کا اندازہ میں نے بائیس سال کے اریب قریب لگایا۔
دونوں ماں بیٹا تھے۔
ماں کا نام رضوانہ بیگم اور بیٹے کا نام مدثر معلوم ہوا۔
''ہاں بی بی اب بتاؤ' تمہیں کونسا مسئلہ تھانے تک لے آیا ہے۔''
''تھانیدار صاحب میری بہو گم ہوگئی ہے۔''
''گم ہوگئی ہے' کیا مطلب؟'' میں نے حیران نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''دراصل' میری بہو...... اپنی سہیلی کے ساتھ میلہ دیکھنے گئی تھی' وہاں سے ہی گم ہوگئی ہے۔''
''اوہ...... آپ نے اسے سہیلی کے ساتھ بھیج دیا' آپ میں سے کوئی اس کے ساتھ کیوں نہیں گیا؟ میں نے باری باری دونوں ماں بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''میں کام میں پھنسا ہوا تھا' آج کل رات کو دیر سے اگر آرہا ہوں' میلہ ختم ہونے میں چار دن رہ گئے ہیں اور میری ڈیوٹی ابھی اگلا پورا ہفتہ رات دس بجے تک ہے۔'' مدثر نے جواب دیا۔
''اور...... آپ خاتون...... کیوں ساتھ نہیں گئیں......؟'' میں نے رضوانہ بیگم کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔
''تھانیدار صاحب لگتا ہے آپ ہمیں ہی مشتبہ سمجھ رہے ہیں۔''
''بی بی آپ لوگ تشریف لے جاسکتے ہیں۔ اپنی بہو کو خود ہی ڈھونڈیے۔'' مجھے غصہ آگیا۔

''اوہ...... امی...... آپ کی جلد غصے میں آنے والی عادت نہیں گئی' آپ تھانیدار صاحب کو جو کچھ پوچھیں اس کا صحیح جواب دیں خدارا۔'' بیٹے نے ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
میں نے ان چند لمحوں میں ہی اندازہ لگالیا تھا کہ عورت ضدی خودسر اور بے وقوف ہے اور اگلے کی بات سمجھے بغیر ہی بول پڑتی ہے' عورت جب دوبارہ بولی تو میں نے دیکھا کہ رسی جل گئی ہے لیکن بل نہیں گیا۔
''تھانیدار صاحب ہم پہلے ہی پریشان ہیں اوپر سے آپ' خیر آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ میرے بیٹے نے اپنی بیوی کو سر چڑھا رکھا ہے' وہ میرے ساتھ کہیں جانے کی روادار نہیں ہے اور پھر میرے بیٹے نے ہی اسے سہیلی کے ساتھ جانے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔'' اس نے اپنے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا۔
مدثر نے کچھ بولنے کے لیے لب کھولے...... مگر چپ ہی رہا۔ شاید وہ تماشہ نہیں بننا چاہتا تھا۔
''خیر...... خاتون...... مجھے لگتا تو یہی ہے کہ وہ آپ کے رویے کی وجہ سے خود ہی ادھر ادھر ہوگئی ہے۔''
''میں نے اسے کونسا سولی پر لٹکایا ہوا تھا۔''
میں نے اسے آگے نہیں بولنے دیا...... اور خشک لہجے میں بولا۔ ''آپ ذرا خاموش رہیں۔''
پھر اس کے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''آپ کے خیال میں آپ کی بیوی کہاں جاسکتی ہے؟''

''تھانیدار صاحب مجھے تو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اسے شاید کسی نے اغوا کرلیا ہے۔'' مدثر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
''اس شک کی وجہ؟''
''فی الحال کوئی وجہ...... میری سمجھ میں نہیں آ رہی' بس آپ اسے میرے دل کی آواز سمجھ لیں۔''
''شاید آپ نے اپنے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے شادی کی تھی۔'' میں نے ایک خیال کے تحت اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
''آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے' ثوبیہ سے میری محبت کی شادی ہے۔''
''خیر میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ ایک دن انتظار کرلیں اور اپنی سسرال میں جا کر پتہ کرلیں۔''
دراصل یہاں مجھے حالات کچھ اور نظر آ رہے تھے...... اور مجھے زیادہ نہیں تھوڑا شبہ تھا کہ وہ خود ہی ادھر ادھر ہوگئی ہے۔ مجھے رضوانہ بیگم اس کی وجہ نظر آ رہی تھی...... ورنہ آپ نے اکثر میری کہانیوں میں پڑھا ہوگا کہ جب لواحقین دو تین دن بعد گمشدگی کی رپورٹ درج کروانے آتے تھے تو میں ناراض ہوتا تھا لیکن پھر...... مجھے اسی دن گمشدگی کی رپورٹ درج کرنی پڑی کیونکہ مدثر نے ایک ایسی بات بتائی تھی جو اس واقعے کو کسی اور طرف ہی لے گئی۔
کبھی کبھی ہمارے اندازے بھی غلط ہو جاتے تھے۔ خیر اس بات کا ذکر آگے آئے گا۔
اسی شام کو میں نے سپاہی شہباز کو ساتھ لیا...... اور مدثر کے گھر پہنچ گیا۔
یہ ایک دو منزلہ عمارت تھی اور کافی پرانی لگتی تھی' گزرے وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس کے رنگ وروپ میں نمایاں تبدیلی کردی تھی۔
خیر ہم عمارت کا معائنہ کرنے تو آئے نہیں تھے...... ہم تو اس سہیلی سے ملاقات کرنے آئے تھے جس کے ساتھ ثوبیہ میلہ دیکھنے گئی تھی۔
اس وقت ہم سادہ کپڑوں میں تھے' سپاہی کو میں نے باہر بٹھا دیا تھا۔
جب سہیلی میرے سامنے آئی تو میں نے بغور اس کا جائزہ لیا' یہ دھان پان سی بیس بائیس سالہ لڑکی تھی' رنگ سانولہ اور چہرہ پرکشش تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی لگتی تھی۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کی غرض سے کہا۔
''تم گھبراؤ نہیں' چونکہ تمہاری سہیلی گم ہوگئی ہے اس لیے تمہیں بلایا گیا ہے۔'' ''سب سے پہلے تم اپنا نام بتاؤ۔''
''میرا نام فرحانہ ہے۔'' اس کے لب ہلے۔
''اچھا...... تو یہ تمہاری بہت پیاری سہیلی تھی۔''
''آپ تھی کا صیغہ کیوں استعمال کر رہے ہیں' خدانخواستہ میری سہیلی صرف گم ہوئی ہے' کہیں......؟''
''میں نے تھی کا صیغہ اس لیے استعمال کیا تھا کہ میں یہ جان سکوں تمہیں اپنی سہیلی سے کتنا پیار ہے'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
''تھانیدار صاحب' ابھی تک کوئی ایسا پیمانہ ایجاد نہیں ہوا جو محبت کی گہرائی ناپ سکے......'' لڑکی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔
''ٹھیک ہے تم ذہین بھی ہو...... اب یہ بتاؤ' تمہاری سہیلی گم کیسے ہوئی؟''
''ہم چوڑیوں کی دکان پر کھڑی تھیں کہ ایک نوجوان ہمارے پاس آیا اور بولا۔
''ثوبیہ' آپ ہی ہیں۔'' اس نے ثوبیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''جی...... میرا نام ہی ثوبیہ ہے۔''
''آپ کے خاوند کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔''
''کہاں...... کدھر......؟'' ثوبیہ پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔
''ادھر...... جی ٹی روڈ پر...... آپ زیادہ نہ سوچیں بس میرے ساتھ چلیں۔''
''ہوں......'' میں نے ہنکارا ابھرا۔
''اس کے بعد ظاہر ہے ثوبیہ اس جوان کے ساتھ چلی گئی ہوگی۔''
''بالکل جناب...... میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے' پھر میلہ کس نے دیکھنا تھا' میں بھاگم بھاگ گھر آ گئی...... میرا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔''

''آپ کو تو اپنی سہیلی کے گھر جانا چاہیے تھا۔'' میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس تھانیدار صاحب اس وقت میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہوگئی تھیں۔''

میں نے سوچا..... اسی طرح ثوبیہ کا ذہن بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے محروم ہوگیا ہوگا۔ کیونکہ بقول فرحانہ کے جوان ان کے لیے اجنبی تھا..... اس نے ایک نفسیاتی وار کیا تھا..... جس کے خطا جانے کا امکان بہت کم تھا..... جب ذہن کام کرنا چھوڑ دے تو جو کچھ ہو جائے کم ہے' بہر حال جو کچھ ہونا تھا' وہ ہو چکا تھا..... لیکن ایک بات ثابت ہوگئی تھی کہ یہ سب اس کی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوا تھا۔

وہ اجنبی جوان کون تھا.....؟ یہ تو سیدھا سادا اغوا کا کیس تھا لیکن مقصد.....؟

اب یہ بات بھی آپ کو بتا دوں کہ میں نے اسی لیے رپورٹ درج کرلی تھی' کیونکہ مدثر کی ماں جب ثوبیہ کا پتہ کرنے فرحانہ کے گھر گئی تھی تو اسے صورت حال کا پتہ چلا تھا۔

اس طرح افراتفری میں مدثر کو بلایا گیا تھا اور ماں بیٹا میرے پاس آگئے تھے۔

کل کا دن ہم نے ادھر اُدھر سے سن گن لینے کی کوشش کی تھی' اور آج میلے میں پھر رہے تھے۔

حالانکہ یہ سانپ گزر جانے کے بعد لکیر پیٹنے والی بات تھی لیکن..... ہم کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔

میلے میں چوڑیوں کے کافی اسٹال تھے..... میں نے باتوں باتوں میں چوڑیوں کی دکان یا اسٹال کی لوکیشن فرحانہ سے معلوم کرلی تھی سپاہی شہباز نے ایک چوڑی فروش سے پوچھا۔

''کل دو خواتین نے ادھر سے چوڑیاں خریدی تھیں' وہ جلدی میں اپنا چوڑیوں والا پیکٹ یہیں بھول گئی تھیں۔''

دکاندار پہلے ہی ہماری وردیوں سے مرعوب نظر آرہا تھا' جب اس نے یہ بات سنی تو تو نہایت ادب سے بولا۔

''جناب یہاں تو ہم نے کوئی پیکٹ نہیں دیکھا' ویسے بھی رش میں اتنا دھیان کسے رہتا ہے؟''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو' لیکن اصل میں ہم ایک جیب کترے کی تلاش میں ہیں' ہمیں شکایت ملی ہے کہ اس جیب کترے نے کئی لوگوں کی جیبیں کاٹ لی ہیں۔''

میں نے مصلحت آمیز جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

اور اس کے ساتھ ہی اس جوان کا حلیہ بھی اسے بتا دیا..... جو ثوبیہ کو جھوٹ کے پھندے میں پھنسا کر لے گیا تھا۔

دکان دار نے چند لمحے بھویں سکیڑ کر سوچا پھر بولا۔

''جناب میری نظر سے تو ایسا کوئی جوان نہیں گزرا۔''

''خیر..... ہم اس کی جان چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

ہم نے دیکھا کہ ایک نوعمر لڑکا میلے میں چل پھر کر بانسریاں بیچ رہا تھا۔

سپاہی نے اسے روکا..... تو وہ خوفزدہ نظر آنے لگا۔

میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھائی..... تم اتنے خوفزدہ کیوں ہو رہے ہو.....؟ کیا تم نے کوئی جرم کیا ہے؟'' میں نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں جناب..... میں تو لکڑی میں جان ڈال کر' میرا مطلب ہے سوراخ ڈال کر یہ بانسریاں بناتا ہوں اور رزق حلال کمانے کی کوشش کرتا ہوں۔' اس بار اس نے ذرا مضبوط لہجے میں کہا۔

''بہت خوب..... مجھے ایسے لوگ بہت پسند ہیں۔'' میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

پھر میں نے اسے جوان کا حلیہ بتاتے ہوئے کہا۔

''ذرا اپنے ذہن پر زور دے کر بتاؤ کہ ایسے حلیے والے جوان کو تم نے پرسوں دیکھا تھا۔''

''دیکھا تو تھا..... ایک لڑکی کے ساتھ ادھر سڑک کی طرف جا رہا تھا۔''

''اوہ.....'' میں نے مضطرب لہجے میں استفسار کیا۔

''آگے وہ کدھر گئے ہیں؟''

''جناب..... سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت بانسری خریدنے والا ایک گاہک آگیا تھا میں اس کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ وہ جوان اور لڑکی مجھے خاص طور پر اس لیے یاد رہ

گئے کہ.....لڑکی حد سے زیادہ حواس باختہ اور پریشان لگ رہی تھی' اور بار بار یہ لفظ دہرا رہی تھی' کہ بھائی ذرا تیز چلو' خدا میرے مدثر کی حفاظت کرے۔''

میں نے اس نوعمر لڑکے کا شانہ تھپتھپایا' اور ہم آگے بڑھ گئے۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ جوان نے ثوبیہ کو نفسیاتی وار کر کے گویا پسپا ثرم کر لیا تھا۔

سڑک کی طرف جانے کا فائدہ کوئی نہیں تھا' اس لیے ہم تھانے میں واپس آ گئے۔

یہاں مدثر میرا منتظر تھا۔

اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے میں نے اسے برآمدے میں بیٹھا دیکھ لیا تھا' جب میں نے اس کی طرف دیکھا تھا تو اس نے مجھے سلام علیکم کہا تھا۔ بہرحال اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے میں اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔

چہرے سے مضطرب لگتا تھا' میں نے اپنی سیٹ سنبھالتے ہوئے اسے بلا لیا۔

اس نے میرے اشارے پر میرے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھتے ہی کہا۔

''تھانیدار صاحب' ثوبیہ کا کچھ پتہ چلا؟'' اس کے انگ انگ سے اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔

''دیکھو..... مدثر جب باتیں چھپائی جائیں گی تو کیسے کوئی پیش رفت ہو سکے گی۔''

اس نے ایک بار میری طرف دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔

میں نے اس کی طرف سے توجہ ہٹالی اور کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کچھ دیر کے بعد اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''تھانیدار صاحب' بات شک والی ہے' اس لیے میں کہتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کر رہا ہوں۔''

''اس طرح کام نہیں چلے گا..... جو کچھ تمہارے دل میں ہے بتا دو۔''

''مجھے ثاقب چغتائی پر شک ہے۔''

''یہ کون ذات شریف ہیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب' ثاقب چغتائی تصویریں بناتا ہے' پچھلے ماہ آرٹ گیلری میں جو تصویروں کی نمائش ہوئی تھی اس میں ثاقب چغتائی کی تصویر ادا اس لمحے نے دوسرا انعام حاصل کیا تھا۔''

''اچھا تم مصور ثاقب چغتائی کی بات کر رہے ہو۔''

''بالکل جناب۔ پچھلے ماہ میں اور ثوبیہ بھی نمائش دیکھنے گئے تھے..... وہیں ثاقب چغتائی نے ثوبیہ کو دیکھ لیا تھا۔''

''پھر اس میں شک والی کون سی بات ہے۔'' میں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''دراصل تھانیدار صاحب اس نے میری بیوی سے کہا تھا کہ وہ کسی دن اس کے نگار خانے میں آ جائے وہ اسے سامنے بٹھا کر اس کی تصویر بنانا چاہتا ہے۔ اس نے یہ بکواس بھی کی تھی کہ..... چند لمحوں کے لیے اس نے خاموشی اختیار کی' اس دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ اس نے دانت پیسے ہیں۔

''پھر.....'' جب وہ بولا تو اس کی آواز میں غصہ نمایاں تھا۔ ''اس نے کہا تھا..... میری بیوی سے..... کہ آپ کی مسکراہٹ مجھے مونالیزا کی مسکراہٹ سے بھی زیادہ دلنشین لگتی ہے' لوگ مونالیزا کی مسکراہٹ کو بھول جائیں گے' اور مجھے امید ہے کہ میری بنائی ہوئی تصویر اگلی نمائش میں اول انعام حاصل کر لے گی۔''

یقین کریں تھانیدار صاحب' مجھے غصہ تو بہت آیا تھا میرا جی چاہا تھا کہ اس کو دو چار تھپڑ جڑ دوں' لیکن میں نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے وہاں سے نکل آنا ہی مناسب سمجھا۔

''چلو آپ نے اچھا کیا..... ویسے آپ کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ بعد میں بھی ثاقب چغتائی نے آپ کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔''

''بالکل ٹھیک تھانیدار صاحب' یہی بات تو شک پیدا کرنے والی ہے' نمائش کے ایک ہفتے بعد دفتر کے پتہ پر مجھے ایک خط ملا..... جس میں لکھا تھا۔

''مدثر صاحب..... میری نیت میں فتور نہیں ہے' میں

آپ کی بیگم کی صرف تصویر بنانا چاہتا ہوں' مسکراہٹ کی وجہ سے' جب تصویر بنے گی تو اسے کوئی بھی آپ کی بیگم کی حیثیت سے پہچان نہیں سکے گا' آپ اپنی بیگم کو بھیج دیں ورنہ......؟"

"آپ نے اپنی بیگم کو نہیں بھیجا ہوگا......اور اب آپ کا شک یہ ہے کہ اس نے آپ کی بیگم کو اغوا کروالیا ہے' تاکہ اطمینان سے تصویر بنا سکے۔"

"تھانیدار صاحب' ان حالات میں کیا میرا شک نہیں بنتا؟" مدثر نے گیند گویا میرے کورٹ میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"چلو...... دیکھتے ہیں کہ مداری کے جھولے سے کیا برآمد ہوتا ہے؟"

قارئین میں دراصل مدثر کے گھریلو حالات معلوم کرنا چاہتا تھا' یہ درمیان میں ایک اور بات نکل آئی تھی...... جو آگے چل کر ہمیں منزل تک پہنچا سکتی تھی اور راستہ بھٹکا بھی سکتی تھی۔

اس کے بعد میں نے مدثر سے اس کے گھریلو حالات معلوم کیے تھے' اور یہ بھی اپنی تھانیدارانہ استادی سے اگلوالیا تھا کہ اس کی شادی کیسے اور کن حالات میں ہوئی تھی۔

اس بات کا ذکر تو آچکا ہے' کہ مدثر نے محبت کی شادی کی تھی۔

مدثر کو رخصت کر کے میں فارغ ہوا ہی تھا' کہ اے ایس آئی ابرار میرے کمرے میں داخل ہوا۔

"السلام علیکم سر۔"

"وعلیکم السلام۔ کہو بھئی ابرار' بھائی کی شادی ٹھیک ٹھاک ہوگئی۔"

یہاں یہ بات بتانا مناسب ہے کہ ابرار اپنے چھوٹے بھائی اسرار کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے اپنے گاؤں گیا تھا۔

"سر...... اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اور آپ کی دعاؤں سے سب کچھ احسن اور اچھے طریقے سے ہوگیا...... بس آپ کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔"

"بھئی...... میری مصروفیات تم سے ڈھکی چھپی نہیں......ایسے موقعوں پر میں دل مسوس کر رہ جاتا ہوں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"سر...... میں آپ کا بوجھ کم کرنے کے لیے آگیا ہوں' کہیے تازہ حالات کیا ہیں؟" ابرار نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

میں نے تازہ کیس اس کے سامنے رکھ دیا۔

"سر......کیس تو دلچسپ ہونے کے ساتھ پراسرار بھی ہے۔ ویسے کیا آپ بھی ثاقب چغتائی سے ملے ہیں؟"

"نہیں......نہیں۔"

"آپ کے یہاں اس تھانے میں آنے سے پہلے وہ تھانے میں آیا تھا۔"

"اچھا......میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کس لیے؟"

"اس کی ایک تصویر گم ہوگئی تھی' اس کی رپورٹ کروانے آیا تھا۔"

"پھر؟"

"میں نے ہی تفتیش کی تھی...... اس نے اپنی ملازمہ پری بیگم پر شک کا اظہار کیا تھا......لیکن تفتیش نے یہ بات ثابت کی تھی کہ پری بیگم بے گناہ تھی...... اس کے ڈرائیور نے ہمارے کچھ رنگا رنگ کھانے کھانے کے بعد یہ انکشاف کیا تھا کہ تصویر ثاقب نے خود غائب کی تھی دراصل وہ پری بیگم کو اپنی نفسانی خواہش کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے ثاقب کو کھری کھری سنانے کے بعد اس کی ملازمت پر لعنت بھیج دی تھی۔"

"اوہ......تو ثاقب چغتائی اس فطرت کا آدمی ہے۔"

"سر...... یہ پکا خبیث ہے۔ عورتوں کا رسیا۔"

"تمہارے خیال میں ثوبیہ والے معاملے میں یہ ملوث ہوسکتا ہے۔"

میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

"ویسے تو اللہ کی اللہ ہی جانے......لیکن امکان تو ہے سر۔"

"تم نے کافی معلومات ثاقب چغتائی کے متعلق حاصل کرلی تھیں' اب بھی تم ہی اسے ٹٹولو......پھر میں نے اس کو اس جوان کا حلیہ نوٹ کروادیا تھا جو ثوبیہ کو ورغلا کر

لے گیا تھا۔

ابرار کے جانے کے بعد میں نے میز پر بکھرے کاغذات کو سمیٹنا شروع کر دیا۔

میں نے اور سپاہی شہباز نے میلے میں کچھ پیٹ پوجا کر لی تھی اب چائے کی طلب ہو رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد میں چائے پیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ چائے بھی کیا چیز ہے؟ جسم کی تھکاوٹ کافی حد تک دور کر دیتی ہے۔ اور اپنی کسی کہانی میں' میں یہ بات لکھ چکا ہوں کہ چائے کو ہمارے خون کا حصہ بنانے میں لپٹن والوں کا بڑا ہاتھ ہے' میں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ شروع شروع میں لپٹن والے بنی ہوئی چائے مفت لوگوں کو پلاتے تھے۔

چائے پینے کے بعد میں نے سپاہی عظمت کو بلا لیا۔

''یس سر......'' وہ اٹینشن آ کر کھڑا ہو گیا۔

''مجھے دلنواز کے متعلق معلومات درکار ہیں۔''

''سر......وہی دلنواز ناجو ٹوبیہ کا بھائی ہے۔''

''بالکل وہی دلنواز۔''

''سر......اس خاندان کے متعلق تھوڑی بہت معلومات تو مجھے ہیں۔''

''اچھا تو جلدی سے بتاؤ نہ......'' میں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر......دلنواز کا چھوٹا بھائی' دل پذیر اس وقت جیل میں ہے' اس نے ایک بندے کو لین دین کے جھگڑے میں قتل کر دیا تھا' جبکہ سب سے چھوٹے میاں دوبئی میں ہوتے ہیں۔''

''سب سے چھوٹے میاں کی عمر کیا ہو گی؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''تقریباً پچیس سال۔''

''اس خاندان کے متعلق باقی تفصیلات کا ذکر آگے آئے گا۔ اس وقت صرف اتنا بتا دیتا ہوں کہ دلنواز کی عمر تقریباً چھتیس سال' دل پذیر کی اٹھائیس سال تھی۔

عمروں کا' خاص کر دل نواز کی عمر کا تذکرہ یہاں اس لیے ضروری ہے کہ اس کیس کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔

ابھی میں دل نواز کو بلانے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خود ہی آ گیا۔

میں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ قبول صورت تھا' ہاتھ بڑے بڑے تھے' اور ان پر دو بڑے بڑے کالے مسے تھے۔

اس کے چہرے سے خباثت ٹپکتی تھی۔

میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس طرح اکڑ کر بیٹھا جیسے میں اس کا ملازم ہوں۔

ایسے بندوں کے دماغ کے کیڑے جھاڑنے مجھے خوب آتے تھے۔

''فرمائیں' جناب کیسے آنا ہوا......'' میں نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

''جناب......آپ کے ہوتے ہوئے یہ کیسی اندھیر نگری ہے۔ میری بہن اغوا ہو گئی ہے اور......''

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ اغوا ہوئی ہے' میں نے اسے آزمانے کے لیے کہا۔

''آپ کے علم میں یہ بات آ چکی ہو گی کہ ایک جوان اسے جھوٹ بول کر لے گیا تھا۔ اس سے اور کیا مطلب حاصل کیا جا سکتا ہے اور آپ نے ثاقب چغتائی کو کھلی چھٹی دی ہوئی ہے۔''

''تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے کہ تمہاری بہن کو غائب کرنے میں اس کا ہاتھ ہے۔''

''ثبوت تو فی الحال کوئی نہیں ہے' لیکن حالات وواقعات اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔''

''جب یہ اشارے ثبوت میں بدل جائیں گے' تو میں ثاقب چغتائی پر ہاتھ ڈال دوں گا......فی الحال تم یہ بتاؤ کہ اتنے دن تم کہاں تھے' تمہیں تو رپورٹ درج کروانے والوں کے ساتھ آنا چاہیے تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں دراصل لاہور چلا گیا تھا۔ میرے بھائی کا کیس لاہور کی ایک عدالت میں زیر سماعت ہے۔''

''تم لوگوں نے اپنے محلے میں دہشت پھیلائی ہوئی ہے' تمہاری شکایتیں مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں۔'' میں نے مصلحت آمیز جھوٹ کے تیر سے اسے گھائل کرنے کی

کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کون بندہ ہے جناب' ذرا اسے سامنے تو لائیں۔ میرے بھائی سے اتفاقاً قتل ہوگیا تھا.....لوگ خود ہی ہم سے دور بھاگتے ہیں' تو ہم کیا کریں.....؟''

''خیر.....تم جیسے ریت کے رستموں کو نکیل ڈالنا مجھے خوب آتا ہے۔ تم ذرا یہ بتاؤ' کہ لاہور کے کونسے وکیل کے پاس تمہارے بھائی کا کیس ہے۔''

''یہ تو.....آپ مجھ پر ہی شک کر رہے ہیں' دیکھیں یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔''

مجھے غصہ آ گیا..... اور میں نے سپاہی شہباز کو بلا کر دلنواز کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

اسے ذرا اپنی نگرانی میں رکھو' یہ مجھے تھانیداری سکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''تھانیدار صاحب.....میرا ایسا کوئی مقصد نہیں ہے۔ آپ ہی مجھ پر شک کر رہے ہیں حالانکہ بہن کی وجہ سے میں پہلے ہی پریشان ہوں۔'' وہ واقعی ریت کا رستم ثابت ہوا تھا.....جو میرے ایک ہی وار سے ڈھے گیا تھا۔

میں صرف اسے اس کی اوقات یاد دلانا چاہتا تھا۔ میں نے سپاہی کو جانے کا اشارہ کیا۔ اور دلنواز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے ساری باتوں کا علم ہو چکا ہے۔ کہیں ثوبیہ کی ساس نے ہی تو اسے غائب نہیں کر دیا۔''

'میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا.....بغیر ثبوت کے میں یہ الزام نہیں لگا سکتا۔''

''تم اب آئے ہو راہ پر.....ثاقب چغتائی کے خلاف تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟ میں نے ایک بار پھر پہلے والا سوال دہرایا۔

اس نے سر جھکا لیا.....بولا کچھ نہیں۔

بہرحال اس کو میں نے رخصت کر دیا۔

قارئین آپ یہ نہ سمجھیں کہ مجھے ثاقب چغتائی پر بالکل شک نہیں تھا' اے ایس آئی ابرار کو میں نے اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔ بہرحال ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

اگلی صبح تھانے میں آنے کے تھوڑی دیر بعد مجھے بتایا گیا کہ ڈسٹرکٹ اسپتال کے ڈاکٹر عثمان مجھے بلا رہے ہیں' ان کے پاس خودکشی کا ایک کیس آیا ہے۔

میں نے جلدی جلدی تیاری کی..... اور محرر کو ساتھ لے کر اسپتال پہنچ گیا۔

ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک مریض آیا ہے اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگ بتاتے ہیں کہ اس نے زہر کھا لیا ہے۔ ویسے میں نے اس کا معدہ صاف کر دیا ہے' اس کے بچنے کے ففٹی پرسنٹ چانس ہیں۔ میں نے سوچا کہ آپ اس کا بیان لے لیں تو بہتر ہے۔''

''آپ نے بہت اچھا کیا' عثمان صاحب۔''

اس کے بعد ڈاکٹر عثمان باہر چلا گیا۔ اور میں نے مریض کے چہرے کی طرف دیکھا' وہاں مجھے زیست موت سے نبرد آزما نظر آئی۔

ہم نے بڑی مشکل سے اس کا بیان لکھا..... وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ تقریباً بیس منٹ میں اس کا بیان مکمل ہوا۔

اس کا نام نازش علی تھا..... اس کا بیان ہمارے لیے حیران کن بھی تھا اور سنسنی خیز بھی..... اور انسان کی مجبوریوں کی داستان بھی۔ انسان خطا کا پتلا ہے اور اس کی خطا سے فائدہ اٹھانے والے انسان ہی ہیں۔

تھانے واپس پہنچ کر میں نے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اور سپاہی عظمت کو بھیجا کہ وہ ثاقب چغتائی کو لے آئے' اب اس سے دو دو باتیں کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

لیکن..... دو گھنٹے بعد دونوں نے آ کر بتایا کہ چغتائی نہیں ملا..... یہ تو مجھے نازش علی کے بیان کے بعد ہی لگ رہا تھا کہ ثاقب چغتائی نے غائب ہو جانا ہے۔

لیکن میں اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ زمین کی ساتویں تہہ سے بھی اسے ڈھونڈ نکالنا تھا۔

یہ اسی شام کی بات ہے کہ مدثر میرے پاس آیا۔

وہ چہرے سے حد درجہ پریشان اور مضطرب لگ رہا تھا۔ اس نے میرے استفسار پر ایک رقعہ خاموشی سے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے رقعے کی تحریر پڑھی' لکھا تھا۔

''ویسے تو ہمیں پتہ ہے کہ آپ کافی سمجھدار ہیں لیکن

دیکھتے ہیں کہ آپ اس معاملے میں کتنی سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہم آپ سے نہ زیور کا مطالبہ کریں گے اور نہ روپے کا' بلکہ صرف یہ چاہیں گے کہ آپ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں۔

آپ کی بیوی ہمارے پاس ہے' اگر آپ نے طلاق نہ دی تو بھی آپ کی بیوی نہیں ملے گی' اس کی لاش ملے گی...... آپ طلاق نامہ تیار کروالیں' ہم کسی نہ کسی طرح آپ سے طلاق نامہ لے لیں گے۔ نیچے نہ کسی کا نام تھا اور نہ دستخط وغیرہ۔

میں نے رقعہ میز پر رکھ کر اس کے اوپر پیپر ویٹ رکھ دیا۔ اور مدثر کی طرف دیکھنے لگا۔

''تھانیدار صاحب ...... میں مر جاؤں گا' لیکن ثوبیہ کو طلاق نہیں دوں گا' اس کا کیا قصور ہے؟ یہ تو وہی بات ہوئی کرے کوئی بھرے کوئی۔

اس مسئلے میں' میں اس سے بحث نہیں کر سکتا تھا...... کیونکہ مسئلہ ہی ایسا تھا' دونوں پارٹیاں اپنی اپنی جگہ حق بجانب تھیں۔

آپ ذرا صبر سے کام لیں' ہر بات واضح ہو جائے گی۔

''تھانیدار صاحب اب میں کیا کروں' آگے جاتا ہوں تو کھائی ہے اور پیچھے کنواں' نہ میں بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ اسے کوئی نقصان پہنچے۔''

میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ ایک جعلی طلاق نامہ تیار کروائیں' اور انتظار کریں کہ وہ کس طرح آپ سے رابطہ کرتے ہیں۔''

''میں مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق یہ سب کر دوں گا' لیکن میری ایک درخواست ہے آپ سے۔''

''کیا چاہتے ہیں آپ؟''

''میں کل جعلی طلاق نامہ تیار کروانے جاؤں گا' آپ سفید کپڑوں میں ایک اہلکار میرے ساتھ کر دیں۔''

''آپ بالکل فکر نہ کریں دو ایسے خفیہ اہلکار آپ کے ساتھ ہوں گے جن کو پولیس اہلکاروں کی حیثیت سے کوئی نہیں پہچان سکے گا۔''

''ٹھیک ہے' تھانیدار صاحب میں تاحیات آپ کا ممنون و مشکور رہوں گا۔''

اس کو گئے ہوئے ابھی ایک گھنٹہ پورا بھی نہیں گزرا تھا کہ اے ایس آئی ابرار میرے کمرے میں داخل ہوا' اور دعا سلام کے بعد بولا۔

''سر...... آپ کو پتہ چل چکا ہوگا کہ ثاقب چغتائی اپنے گھر میں نہیں ہے۔''

یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ نازش علی کے متعلق اے ایس آئی کو سب کچھ پتہ تھا۔

''تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے' میں نے نازش علی کا بیان لینے کے بعد ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اور سپاہی عظمت کو بھیجا تھا' کہ وہ ثاقب چغتائی کو لے آئیں لیکن......''

''سر...... میں نے اسے باقاعدہ نگرانی میں رکھا ہوا تھا' مجھے علم ہو گیا ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟''

''بہت خوب...... یہ تم نے بہت زبردست کام کیا ہے۔'' میں نے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔

''شکریہ...... سر...... پھر اب کیا ارادہ ہے' اسے چھاپ لیا جائے۔''

''ابھی نہیں اسے نگرانی میں رکھو...... وہ نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔''

''پھر......'' میں نے اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔

''سر آپ کو یہ شک ہے کہ ثوبیہ کے اغوا میں ثاقب کا ہاتھ ہے۔''

''دیکھو ابرار' طلاق والے معاملے نے مسئلے کو ذرا الجھا دیا ہے لیکن امکان تو بہرحال ہے...... نہ...... ہمیں تصویر کے دونوں رخ دیکھنے ہیں۔''

''ویسے سر...... ایک بات ہے ثاقب چغتائی کی جو تصویر ہمارے سامنے آئی ہے وہ تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔'' اے ایس آئی نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

''انسان کی فطرت عجیب ہے ابرار...... کبھی کبھی وہ ایسے کام کر گزرتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے' بہرحال حقیقت 'حقیقت ہوتی ہے۔''

ابرار مجھے یہ یقین دلا کر گیا کہ ثاقب چغتائی کو کڑی نگرانی میں رکھے گا۔''

اگلے دن ہمارے تھانے کی حوالات دو بندوں سے آباد ہوگئی۔ ان کے ساتھ مدثر اور وہ دو پولیس اہلکار بھی آئے تھے جن کو مدثر کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا تھا' وہ بظاہر راہگیروں کی حیثیت سے ان کے ساتھ آئے تھے۔

مدثر نے میری توقع سے بڑھ کر بات کی تھی۔ جب یہ پانچوں بندے میرے دفتر میں آئے تو مدثر بولا تھا۔

''تھانے دار صاحب یہ دو بندے مجھے لوٹنا چاہتے تھے' اگر یہ دو بندے بروقت پہنچ کر انہیں قابو نہ کرتے تو......؟'' مدثر نے دونوں اہلکاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اور سپاہی عظمت کو بلا کر دونوں مجرموں کو ان کے حوالے کیا۔ اور مدثر سے کہا کہ وہ فی الحال گھر چلا جائے۔

اور ساتھ ہی دونوں اہلکاروں کو بھی جانے کا اشارہ کیا۔ ہیڈ کانسٹیبل اکبر خان اور سپاہی عظمت کو سمجھا دیا تھا کہ مہمانوں کی ذرا ہلکی قسم کی خاطر تواضع کرنی ہے۔

ایک گھنٹے بعد سپاہی عظمت نے آ کر بتایا سر مال تیار ہے۔

''ٹھیک ہے انہیں لے کر آؤ......ان کی تو چیں بول گئی تھی۔ کیونکہ آتے ہی دونوں نے سب کچھ اگل دیا۔

ان کو دوبارہ حوالات میں بھیج کر میں نے ہیڈ کانسٹیبل کی قیادت میں تین سپاہی بھیج کر اصل مجرموں کو گرفتار کروالیا' ان میں ایک تو وہی تھا جو میلے سے ثوبیہ کو جھوٹ بول کر لے گیا تھا دو اور جرائم پیشہ تھے۔

قارئین جس کی ایما پر یہ سب کچھ کیا گیا تھا' اس کی طرف ہمارا دھیان نہیں گیا تھا۔

ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے' کہ اس کھیل کے پیچھے وہ ہوگی' لیجیے' قارئین تعارف کروائے دیتا ہوں۔ یہ مدثر کی بہن نسرین تھی۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ......

مدثر اپنے دوست کی شادی میں شرکت کر کے بذریعہ ٹرین واپس آرہا تھا کہ اس کی ٹرین کے ڈبے میں ہی ثوبیہ سے ملاقات ہوگئی' یہ ملاقات بھی ڈرامائی حالات میں ہوئی' ایک اسٹیشن پر ٹرین رکی تو مدثر سگریٹ لینے نیچے اتر گیا' اس

ایسا بھی ہوتا ہے

نوفل بن ماحق رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ نجران کی مسجد میں' میں نے ایک نوجوان کو دیکھا جو بڑا لمبا چوڑا' خوب صورت اور مضبوط بدن والا تھا۔ میں حیرت سے اس کے جمال کو دیکھنے لگا۔

اس نے مجھے حیران دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے آپ کے حسن و جمال پر تعجب ہو رہا ہے۔''

اس نے جواب دیا۔ ''تجھے ہی کیا' اللہ کو بھی تعجب ہو رہا ہے۔'' (نعوذ باللہ)

نوفل رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ کفریہ کلمہ کہتے ہی اس کا قد چھوٹا ہونے لگا' اس کا رنگ و روپ بگڑ گیا یہاں تک کہ اس کا قد صرف ایک بالشت رہ گیا' لوگ حیران رہ گئے' آخر اس کا ایک رشتے دار اسے اپنی جیب میں ڈال کر لے گیا۔

(ماخوذ از تفسیر ابن کثیر۔ جلد: ۴)

مرسلہ: شہر روز......کراچی

عجیب دُعا

حجاج بن یوسف، خلفائے بنو اُمیہ کا انتہائی ظالم گورنر تھا۔ اُس نے ایک لاکھ انسانوں کو اپنی تلوار سے قتل کیا اور جو لوگ اُس کے حکم سے قتل کیے گئے اُنھیں تو کوئی گن ہی نہیں سکا۔ مگر یہی حجاج بن یوسف جب سرطان کی بیماری میں مرنے لگا تو اس کی زبان پر یہ دُعا تھی۔ ''اے اللہ تیرے بندے، بندیاں میرے بارے میں کہتے ہیں کہ تو مجھے معاف نہیں کرے گا مگر مجھے تجھ سے اُمید ہے کہ تو مجھے معاف فرمادے گا۔ مجھے معاف فرمادے۔''

جب حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے حجاج کی اس دُعا کا ذکر کیا تو آپ رحمتہ اللہ علیہ نے تعجب سے فرمایا۔

''کیا واقعی حجاج نے یہ دُعا مانگی تھی؟''

لوگوں نے کہا، جی ہاں، اس نے یہ دُعا مانگی تھی تو آپ (رحمتہ اللہ علیہ) نے فرمایا۔

''ہوسکتا ہے اللہ اس کو بخش دے۔''

(بکھرے موتی جلد: ۲۔ صفحہ: ۶۲)

مرسلہ: سید اعجاز علی......حیدر آباد

کے سگریٹ ختم ہوگئے تھے' چلتے وقت اس کا دھیان ہی اس طرف نہیں گیا تھا' اتفاقات اسی کو کہتے ہیں' جس بات یا واقعے نے ہونا ہوتا ہے' اس کا سبب خود بخود پہلے ہی سی بن جاتا ہے۔

ابھی مدثر سگریٹ لے رہا تھا' کہ ٹرین نے رینگنا شروع کردیا اور مدثر کے پہنچتے تک ٹرین نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کردیا' مدثر کے سامنے جو ڈبہ تھا' وہ بڑی مشکل سے اس میں ہی گھس گیا' اس ڈبے میں ثوبیہ اپنی امی کے ساتھ سفر کررہی تھی۔ ڈبے میں ایک جوڑا اور تھا' سب خواب غفلت کے مزے لے رہے تھے' صرف ثوبیہ جاگ رہی تھی۔

''آپ کدھر جارہے ہیں؟'' ثوبیہ نے پوچھا۔

مدثر نے شہر کا نام بتایا.....تو ثوبیہ بولی۔

''عجیب اتفاق ہے..... ہم بھی اسی شہر میں رہتے ہیں۔''

پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا' جب ٹرین اگلے اسٹیشن پر رکی تو مدثر اپنے ڈبے میں چلا گیا' کیونکہ وہاں اس کا سامان پڑا ہوا تھا' ویسے بھی اسے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ وہیں براجمان ہوجاتا۔

ویسے بات چیت کے دوران دونوں نے ایک دوسرے کے ایڈریس معلوم کرلیے تھے۔

مدثر نے بات چیت کے دوران جب یہ بتایا تھا کہ وہ کہانیاں لکھتا ہے تو ثوبیہ نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اس کی کہانیاں شوق سے پڑھتی ہے اور اس سے ملنے کی تمنائی تھی۔

مدثر کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی' اس نے ذہن میں ایک آئیڈیل بنایا ہوا تھا' اس نے جب ثوبیہ کو دیکھا تو اس کے ذہن میں یہ شعر آ گیا۔

مدتوں پہلے کہ جب تجھ سے تعارف بھی نہ تھا
تیری تصویر پر بنائے تھے خیالات میرے

قصہ مختصر' جب شہر کے پارک میں دوچار ملاقاتیں ہوئیں تو دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا۔

ادھر مدثر کی امی مدثر سے کئی بار کہہ چکی تھیں کہ وہ اب شادی کرلے لیکن ہر بار وہ یہی کہتا تھا انتظار کریں' اور......

اس کی امی کئی بار جل کر یہ کہہ چکی تھیں کہ شاید وہ کسی آئیڈیل کی تلاش میں ہی ساری زندگی گزار دے گا۔

وہ ہنس کر ٹال دیتا تھا۔

ثوبیہ سے ملاقات کے بعد اس نے ایک دن اپنی امی سے کہا۔

''امی..... اب آپ تیاری کریں اور ساتھ ہی ثوبیہ کے حدود اربع سے ان کو آگاہ کردیا۔

''تو تمہیں آخر کوئی لڑکی پسند آ ہی گئی لیکن مدثر ذرا یہ تو سوچو کہ اگر انہوں نے رشتہ نہ دیا تو.....؟''

''امی..... آپ اللہ کا نام لے کر جائیں تو سہی' ثوبیہ کا ووٹ بھی میرے حق میں ہے۔''

''اچھا.....تو اندر اندر کھچڑی پک چکی ہے۔''

بہر حال..... اگلے دن اس کی امی اپنی بہن' بھابی اور اپنی بیٹی نسرین کو لے کر رشتہ مانگنے چلی گئی۔

انہوں نے کہا کہ ہم لڑکا دیکھنے آئیں گے..... سب مراحل طے ہونے کے بعد گاڑی ایک بات پر آ کر رک گئی۔

ثوبیہ کے گھر والوں نے یہ شرط رکھی کہ اگر وہ اپنی بیٹی نسرین کا رشتہ دلنواز کو دے دیں تو ہم اپنی بیٹی کا رشتہ مدثر کو دے دیں گے۔

یہ عجیب و غریب شرط سن کر مدثر کے گھر والوں پر سکتہ طاری ہوگیا۔ کہاں بیس بائیس سالہ خوبرو نسرین اور کہاں پینتیس سالہ بمشکل قبول صورت دلنواز.....

شرط بڑی کڑی تھی' آزمائش سخت تھی۔

آخر بہن نے بھائی کی حالت دیکھ کر قربانی دے دی۔

اور اس طرح وٹے سٹے کی شادی ہوگئی۔

اب باقی باتیں نسرین کی زبانی سنیے۔

''تھانیدار صاحب مجھے اپنے بھائی مدثر سے بڑا پیار ہے..... میں نے ان کی حالت دیکھتے ہوئے (کیونکہ ان کی حالت تو مجنوں جیسی ہوگئی تھی' اگر ان کی شادی ثوبیہ سے نہ ہوئی تو پتہ نہیں کیا ہوجاتا۔) میں نے قربانی دے دی' تاکہ میرا بھائی خوش رہے' میں نے اپنی محبت کو بھی قربان کردیا..... جمیل کو محبت کا واسطہ دے کر راضی کرلیا کہ وہ میرے راستے سے ہٹ جائے' یہ کام کتنا مشکل ہے یہ وہی

محسوس کرسکتا ہی جس کے من میں آگ لگی ہو......

لیکن...... یہاں پہنچ کرنسرین کے آنسو نکل آئے' اس وقت وہ مجھے اندر باہر سے ٹوٹی پھوٹی لگی۔

جب وہ رو دھو کر اپنے دل کا غبار نکال چکی تو' اس کی آواز جذباتی ہوگئی۔

''تھانیدار صاحب...... پہلی رات ہی مجھے اپنے شوہر کے متعلق پتہ چل گیا' وہ سہاگ رات کو شراب پی کر آیا...... اور چند اوٹ پٹانگ باتیں کر کے ایک طرف گر گیا۔

میری جو حالت ہوئی اس کا ادراک وہی کرسکتا ہے جو ان حالات سے گزر چکا ہو۔

بعد میں مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ تو ماں باپ کا بگڑا ہوا شہزادہ ہے' سارے بھائی بگڑے ہوئے ہیں' اس لیے دلنواز کی اتنی عمر ہونے کے باوجود اس کو کوئی رشتہ دینے کو تیار نہیں تھا۔

میں نے اس کے باوجود نباہ کرنے کی پوری کوشش کی' لیکن جہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو' وہاں نقار خانے میں طوطی کی بولی سنتا کون ہے' میں نے اپنے گھر والوں سے کبھی کوئی بات نہیں کی' اپنے دکھ ان کو نہیں بتائے' میں اس بات پہ خوش تھی کہ میرا بھائی خوش ہے اور خوش و خرم ازدواجی زندگی گزار رہا ہے' میں اس کی خوشیوں کو زہر آلودہ نہیں کرنا چاہتی تھی' لیکن ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے' میں نے پورا سال اذیت میں گزار دیا' اب اس نے مجھے زدو کوب کرنا شروع کردیا اور کہنے لگا تھا تم بانجھ ہو' ہمیں اولاد چاہیے' میں نے ایک دن غصے میں کہہ دیا کہ تم اپنا ٹیسٹ کرواؤ' پھر تو قیامت ہی آگئی' اس نے مجھے اتنا مارا کہ میں بے ہوش ہوگئی' اور جب مجھے ہوش آیا تو سب گھر والے بھیگی بلی بنے ہوئے تھے' میں تو غصے میں پاگل ہوگئی تھی میں نے انہیں بے نقط سنادیں اور اپنے گھر آگئی۔

اور یہاں آ کر پہلی بار میں نے سب کچھ بتادیا۔

سب غصے میں آگئے' اور کہہ دیا اب تم نے وہاں نہیں جانا...... ہم دیکھیں گے کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

اس وقت میں خاموش ہوگئی' ویسے میرا دل تو یہ کرتا تھا کہ میں اپنے شوہر کو قتل کر کے پھانسی پر چڑھ جاؤں' میری قربانی رائیگاں گئی تھی۔

اس طرح ایک ماہ گزر گیا...... وہاں سے کوئی نہیں آیا...... بلکہ طلاق آگئی۔

یہ تو وہی بات ہوگئی کہ الٹا چور......! اس نے میری طرف دیکھا......اور کوتوال کا لفظ نگل لیا۔

گھر والوں نے اور میں نے بھائی سے کہا کہ وہ بھی ثوبیہ کو طلاق دے دے۔

لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

میں تو انتقام کی آگ میں جل جل کر راکھ ہوئی جارہی تھی۔ میں نے جمیل سے مل کر یہ منصوبہ بنایا...... اب انصاف کی تکڑی (ترازو) آپ کے ہاتھ میں ہے' آپ جو فیصلہ کرنا چاہیں کرسکتے ہیں۔

قارئین اپنا فیصلہ سنانے سے پہلے میں ایک بات کی وضاحت کردوں کہ جمیل جو اس وقت ہمارے قبضے میں تھا اور جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ وہی ثوبیہ کو میلے سے لے گیا تھا' یہ سارا منصوبہ نسرین کے کہنے پر اس نے بنایا تھا' دو اور جرائم پیشہ اس ڈرامے میں شامل تھے' ثوبیہ کو انہوں نے دور افتادہ مکان میں رکھا ہوا تھا' جس کو ہم نے برآمد کرلیا۔

میں نے سب مجرموں کے خلاف چالان تیار کر کے عدالت میں بھیج دیا۔ جو کچھ بھی تھا انہوں نے قانون کو ہاتھ میں لیا تھا...... اور ایک جوان عورت کو حبس بے جا میں رکھا تھا...... نسرین کو چھوڑنے سے قانون کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تھے' بے شک وہ وفا گزیدہ تھی' قارئین یہ کہانی تو یہاں ختم ہوگئی اس کیس کے سلسلے میں ثاقب چغتائی کا نام بھی آیا ہے' اغوا کی اس ڈرامے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

لیکن......!

اس کے ساتھ بھی جرم کی ایک کہانی وابستہ تھی' اس کے متعلق سنسنی خیز انکشافات کے لیے اگلی کہانی کا انتظار کیجیے۔

کب تک

غلام یاسین نوناری

چناروں کا دیس وادی جنت نظیر کشمیر جل رہا ہے ہر روز سیکڑوں کشمیری دوشیزائیں آزادی کی چاہ میں ہندو درندگی کا شکار ہو رہی ہیں ہزاروں نوجوان آزادی کے نعرہ پر قربان ہو رہے ہیں شہید ہونے والی ہر لڑکی اور نوجوان کی آنکھوں میں ایک ہی سوال ہوتا ہے، یہ ظلم کب تک؟

قارئین افق کیلئے بطور خاص

''چچا جان ابھی تو مریم کافی چھوٹی ہے پھر یہ شادی میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تیمور عبداللہ کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ فضا میں ایک جامد خاموشی رچی ہوئی تھی۔ یہ مقبوضہ کشمیر کی ایک کچی سڑک تھی۔ جس پر اس وقت صرف ان دو نفوس کے علاوہ دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ دس سال پہلے جب ہم کشمیر آئے تھے، مریم دو پونیاں کیے سارے گھر میں گھومتی تھی۔ بے تکلف میری گود میں بھی چڑھ جاتی تھی۔ اب اسی معصوم سی بچی کے ساتھ میرا نکاح کافی مضحکہ خیز لگتا ہے۔'' پچیس سالہ تیمور کے خیالات پریٹیکل تھے۔ وہ کسی اپنی ہم عمر کو بیوی بنانا چاہتا تھا مگر یہاں چودہ پندرہ سالہ وہ لڑکی جسے اس نے خود گود میں کھلایا تھا۔ وہ اس کے پلے باندھی جا رہی تھی۔ اس لیے وہ پاکستان سے بھی خاصا ناراض ہو کر آیا تھا۔ تیمور تم پاکستان میں رہتے ہو جہاں آزادی کا جھولا جھولتے تم آج گھبرو جوان ہو گئے۔ مریم ابھی پندرہ برس کی ہے میں چاہتا ہوں کہ تم اسے اپنے نکاح میں لا کر پاکستان لے جاؤ، جہاں میری تتلیوں جیسی بچی پرسکون زندگی جیے۔ جہاں اسے رات کو سوتے وقت ایک تیز دھار چھری اپنے سرہانے رکھ کر نہ سونا پڑے کہ نجانے کب بھارتی فوجی اس گھر کی بدقسمتی بن کر آ جائیں۔ تمہیں پتا ہے تیمور، یہ فوجی، جس گھر میں گھستے ہیں وہاں سب سے زیادہ نقصان کس کا ہوتا ہے؟ ہمارے کشمیر میں سب سے زیادہ خطرہ عورتوں کو لاحق رہتا ہے۔ فوجی جاتے جاتے ان کے والدین کے سر شرم سے جھکا جاتے ہیں۔ کچھ شرمندگی کے مارے اپنی جان لے لیتی ہیں، یہ ہے ہمارا کشمیر اس لیے میں نہیں چاہتا کہ کسی دن میری مریم کی باری آئے۔'' عبداللہ کی آواز آنسو سے بھرا گئی۔ تیمور نے پتلون کی جیب سے بوڑھے عبداللہ کو رومال نکال کر دیا۔ وہ رومال سے آنسو صاف کرنے لگا۔

''ویسے یار دیپک یہ مسلوں کی لڑکیاں ہوتی پٹاخہ ہیں۔ سیدھی دل میں جالگتی ہیں۔'' دیپک ایک موٹی توند والا شخص تھا۔ البتہ شرما خاصا اسمارٹ

اور ینگ تھا۔

''شرما یہ لڑکی تو ویسے بھی ان چھوئی لگتی ہے۔ کرلیں نا ہاتھ صاف۔'' دیپک نے بے غیرتی سے ایک آنکھ میچ کر کہا۔ ان کی فحش باتیں سن کر کچن میں کھڑی مریم کا دل سینے میں یوں دھڑکنے لگا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔

دھی رانی ہم مقبوضہ کشمیر کے باسی ہیں۔ جب تک کشمیر پاکستان نہیں بن جاتا تب تک ہمیں ان سے بچ کر رہنا ہے۔ اگر زندگی کے کسی موڑ پر بے بسی محسوس کرنے لگو تو کلمہ پڑھ کر خودکشی کرلینا اللہ معاف کردے گا۔'' بابا کی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

''یار کہاں رہ گئی...... دیکھو کہیں اور تو کوئی دروازہ نہیں ہے۔'' دیپل نے شرما سے کہا۔ وہ شرما کا سنیئر تھا اس لیے رعب جھاڑ رہا تھا۔

''دیکھتا ہوں، مجھے بھی موقع دینا یہ نہ ہو اتنے میں کوئی آجائے۔'' شرما بولتا کچن کی طرف آگیا۔ چائے بنانے میں اتنی دیر بلبل، بس کرو اب ہمیں چائے کی طلب نہیں رہی۔'' وہ دروازے سے ہٹ گیا۔ ان سفید کپڑوں میں تو حور لگ رہی ہو۔'' شرما نے ایک غلط نگاہ اس کے سفید براق فراک پر ڈالی۔ وہ کیبنٹ کی طرف رخ کیے کھڑی تھی۔

''اے لڑکی سیدھی طرح باہر چل ورنہ زبردستی کرنا بھی جانتا ہوں۔'' مریم مڑی تو وہ بھی مڑ گیا۔ اس نے مریم کے لال ہاتھ نہیں دیکھے تھے جن سے لہو ابل رہا تھا۔

☆☆☆

عبداللہ کے گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ عبداللہ لوگوں کی بھیڑ ہٹاتا ہوا گھر میں داخل ہوگیا۔ اس کی چھٹی حس نے ہجوم دیکھتے ہی خطرے کا سائرن بجانا شروع کردیا تھا۔ جس کی اب تصدیق ہوگئی۔ صحن کے بیچوں بیچ مریم سیدھی گری ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر حنا کی مہک کی بجائے لہو کی بساند تھی۔ وہ دلہن بننے والی خاک نشین ہونے والی تھی۔ اس کی دونوں کلائیوں کی نسیں کٹی ہوئی تھیں۔ سر پر نماز کے اسٹائل میں دوپٹہ سلامت تھا۔ اس کا زرد خون سے خالی چہرہ پرسکون تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کا نور چھایا ہوا تھا۔ وہ کوئی معصوم فرشتہ لگ رہی تھی۔ مریم جسے دلہن بنانے کے خواب عبداللہ نے دیکھے تھے۔ اس وقت لہو رنگ کپڑوں، ہاتھوں پر سجی لہو کی مہندی اسے ایک دلہن کی مانند بنا رہی تھی۔ عبداللہ پلٹ کر ہجوم سے مخاطب ہوا۔

''یہ کیسے ہوا؟'' اس کی آواز سے ہجوم کی ہلکی ہلکی سرگوشیاں رک گئیں۔

''بھارتی فوجی آئے تھے۔ مریم نے نسیں کاٹ کر اپنی جان دے دی۔ وہ ناکام لوٹ گئے۔'' ایک باریش شخص نے آگے بڑھ کر عبداللہ کو حالات سے واقفیت دی۔

''میرے دوستوں میری بہنوں ماؤں' آج میری ایک مریم کشمیر پر قربان ہوئی ہے۔ مجھے کوئی افسوس نہیں ہے اللہ کی امانت تھی' اس نے لے لی۔ اگر میری اور بھی دس بیٹیاں ہوتیں تو میں انہیں ذلت کی زندگی جینے کے بجائے عزت کی موت مرنے کی نصیحت کرتا۔ آج میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ اس جنگ میں میرا ساتھ دیں' ہم بھارتیوں کو شکست دے سکتے ہیں' وہ عورتوں کی وجہ سے ہمیں کمزور سمجھتے ہیں' ہماری عورتیں اگر ہمارا ساتھ دیں تو وہ ان کی عزتیں اتار کر ہمیں کمزور نہیں کرسکتے' مریم کشمیر کی بیٹی تھی۔ کشمیر کی عزت بچانا اس کا فرض تھا۔ کشمیر کی عورت کی عزت لٹ جائے تو سمجھو کشمیر بے عزت ہوگیا۔ ہماری عورتیں آج کے بعد جب بھی بے بسی محسوس کریں جان دے دیں عزت نہ دیں۔'' عبداللہ ایک تقریر کر کے مسجد کی طرف بڑھ گیا۔ وہ امام مسجد تھا' تدفین ہوگئی۔ وہ رات عبداللہ کے گھر میں سناٹے لیے ہوئے اتری تھی۔ عبداللہ کو ایک جامد چپ لگ گئی تھی۔ وہ چپ چاپ ایک چارپائی پر پڑا تاروں میں نجانے کیا ڈھونڈ رہا تھا' رات کے نجانے کس پہر تیمور کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ چارپائی پر اٹھ بیٹھا...... دوسرے کمرے سے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آوازیں رہی تھیں۔ وہ دبے پاؤں اٹھا اور دوسرے کمرے کے دروازے کے اندر آ گیا۔

نائٹ بلب کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ عبداللہ ایک چارپائی پر ایک فریم سینے سے لگائے ہچکیوں سے دھیما دھیما رو رہا تھا۔ تیمور اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عبداللہ نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''تیمور وہ صرف کشمیر کی بیٹی تو نہیں تھی وہ میری بھی بیٹی تھی' اسے آج تک میں نے گود میں کھلایا تھا۔ اس کے ساتھ بہن بھائی کی طرح کھیلا تھا۔ اس کو ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔'' عبداللہ کی سفید داڑھی آنسوؤں سے گیلی ہوگئی تھی۔ تیمور نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ عبداللہ اس کی کشادہ بانہوں میں بچوں کی طرح منہ چھپا کر رو دیا تھا۔

''تیمور اللہ میری بیٹی کو معاف کردے گا نا؟'' عبداللہ کے لہجے میں آس تھی۔ تیمور نے ماموں کو بانہوں میں بھینچ لیا۔

''ماموں اگر آپ جیسا محبت کرنے والا صابر باپ اگر ہر بیٹی کا ہو تو اللہ ساری خطائیں معاف کردے گا۔'' تیمور سوچ کر رہ گیا۔ عبداللہ تیمور کی بانہوں کی پناہ میں رو رہا تھا' وہاں سے نجانے کتنی دور فوجی بوٹوں کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ اب وہ پھر کسی عبداللہ کا گھر اجاڑنے جا رہے تھے۔ اب پھر کسی عبداللہ کی گود اجڑنے والی تھی۔

کب تک دلہن بننے والیاں مریم عزت کے نام پر اپنی جان لیتی رہیں گی' کشمیر کب پاکستان بنے گا......؟ کب تک عبداللہ اپنی گود خالی کرتے رہیں گے......؟؟

●

ادھوری عورت

اسلم آزاد

زندگی کے کئی روپ ہوتے ہیں ان میں سے ہر روپ دوسرے سے بالکل جدا ہوتا ہے۔ بعض روپ ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی رنگ کوئی سایہ نہیں ہوتا وہ بس روپ ہی ہوتا ہے۔ معاشرے کا ایک ایسا روپ' جسے دیکھ کر آپ بھی نظر پھیر کر گزر جانا پسند کریں گے۔

قارئین افق کیلئے بطور خاص

پیار' محبت' دوستی' خلوص' وفا' رشتے' ناتے' ذات پات' خاندان' رسمیں' رواج' آرزوئیں' تمنائیں' خوشیاں' محبتیں مسرتیں' عید یہ سب کیا ہیں......؟ ان سے تو میرا دور تک کوئی رشتہ ناتہ نہیں نہ میں ان سب سے واقف ہوں' نہ مجھے کسی نے ان کی تعلیم دی' نہ تربیت' نہ پرورش کی بس میری زندگی میں تو ایک گھپ اندھیرا ہے۔ درد ہی درد ہے' غم ہی غم ہیں' فکر ہی فکر ہے' پریشانی ہی پریشانی ہے' رسوائی ہی رسوائی ہے' تماشہ ہی تماشہ ہے' لوگوں کی نظر میں تو ایک کھلونا بن کر رہ گئی ہوں اگر کوئی اپنے ننھے منے معصوم سے بچے کے لیے کوئی کھلونا خرید کر لاتا ہے تو اس کھلونے کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے' احترام ہوتا ہے' آخر میں بھی تو اس دنیا کی مخلوق ہوں' اور میرا بھی تو کچھ حق ہے' لوگ تو کتوں بلیوں کو اپنی گود اور بستر پر سلاتے ہیں ان کو اپنے ہاتھوں سے کھلاتے ہیں پلاتے نہلاتے ہیں' کیا میں ان جانوروں سے بھی کم تر ہوں......؟ کہ مجھے حقارت اور نفرت سے دیکھا جاتا ہے' شاید یہ میرے نصیب کا لکھا ہے' یا میرے والد کی ناشکری' نافرمانی کی سزا کہ میں ان کی عزت' آبرو راج ہو کر بھی ان کی عزت آبرو اور بیٹی نہ بن سکی اور نہ میرے لیے اس سارے جہاں میں کوئی پاکیزہ رشتہ ماں باپ' بہن' بھائی' دادا' دادی' نانا' نانی' پھوپی خالہ کا رہا ہے میں تو ان کے لیے جیتے جی ہی مرگئی ہوں اور ایک زندہ لاش بن کر در در کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہوں اے کاش کہ میری اس برباد زندگی کا سفر آج ہی تمام ہو تو میرے دل اور روح کو کچھ چین سا آجائے کہ جس کا میرے ماں باپ بہن بھائیوں کو کچھ علم نہیں کچھ غم نہیں اور وہ اپنی دنیا میں بہت خوش اور مسرور ہیں اور آج اس خوشیوں محبتوں' چاہتوں اور عید کے دن سب نے نئے کپڑے پہنے ہیں' اپنے ہاتھوں پہ مہندی لگائی ہے' گوری گوری کلائیوں میں رنگ برنگی چوڑیاں پہنی ہیں منگنی کے رشتے کی انگوٹھی پہنی ہے مگر میرے لیے تو یہ سب ایک ڈراؤنا خواب ہیں' شادی کے سرخ جوڑے کے لیے سوچ بھی نہیں سکتی ہوں اور نہ مجھ جیسی بدنصیبوں کے لیے سرخ عروسی جوڑا ہوتا ہے اور نہ بابل کے گھر سے ڈولی اٹھتی ہے اور نہ ہی جنازہ......؟

ہائے میری پھوٹی ہوئی قسمت کہ آج ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں محبتیں ہی محبتیں ہیں مگر میں ان سب خوشیوں' محبتوں' مسرتوں سے محروم ایک زندہ لاش بن کر کب تک اس ٹوٹے ہوئے فٹ پاتھ پر بیٹھی سوچوں کا حصار لیے آہیں بھرتی رہوں گی......؟ کب تک ایک روٹی کے ٹکڑے کے لیے لوگوں کے آگے اپنا ہاتھ پھیلاتی رہوں گی......؟

کچھ دیر پہلے دو نوجوان میرے قریب سے گزرے جو بہت

نیک اور شریف سے لگ رہے تھے' مگر مجھے اکیلا پا کر ان کی نیت خراب ہوگئی اور مجھے بری نگاہوں سے بے حیائی' بے شرمی کی دعوت دیتے ہوئے ۱۰۰' ۱۰۰ روپے کے نئے نوٹ میرے دامن میں پھینک کر گئے ہیں' مگر میں تو عزت اور شرافت سے پانچ روپے کی خیرات اور ایک خشک روٹی کے لیے ترس رہی ہوں مگر یہ کسی امیر زادے چوہدری کی بگڑی ہوئی اولاد میرا درد میرا دکھ کیا جانے......؟ یہ تو اپنی بہو بیٹی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی کسی دوسرے کی عزت پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ذرا بھر بھی شرم محسوس نہیں کرتے کہ جس طرح میرا باپ کوئی بڑا خان صاحب' چوہدری یا امیر زادہ تھا اور اپنی دولت جائیداد جوانی اور حسن کے نشے میں بہت مغرور اور نازاں تھا' اور اس کی نظر میں اپنی بیوی کی کوئی قدر اور عزت نہ تھی شاید اور وہ اسے اپنے پاؤں کی جوتی سمجھتا ہوگا' اور جب بھی اس کے گھر میں بیٹی رحمت کی ولادت ہوتی ہوگی تو وہ دن اس کے لیے قیامت کا ہوتا ہوگا' اور اس بیچاری پر اس کی ساس سسر اور شوہر برس پڑتے ہوں گے' کہ پانچ بیٹیاں پیدا کی ہیں' اور اگر اس مرتبہ تم نے بیٹا نہ دیا تو طلاق دے کر گھر سے باہر نکال دیں گے وہ تڑپ کر رہ گئی ہوگی اور آگے کچھ بھی نہ کہہ سکی ہوگی' کہ آپ لوگ تو مجھے بلاقصور ڈانٹ رہے ہیں کہ کیا بیٹا پیدا کرنا میرے بس کی بات ہے......؟ جو مجھے طلاق کی دھمکیاں دے رہے ہیں' مجھے تو بس ان آوارہ بدچلن عورتوں کے لیے ایک نوکرانی بنا کر رکھا ہے کہ جن کے ساتھ میرے شوہر کے ناجائز تعلقات ہیں اور اس کے لیے تو ایسی بے حیا بے شرم عورتوں کی کمی نہیں مگر مجھ جیسی باحیا باشرم' باوفا عورت کے لیے ایک مرد ایک شریک حیات ایک پیار ہی کافی ہے' جو چاہے شرابی ہو' موالی ہو' جواگر راشی' چور ڈاکو' زانی عیاش' اور بدمعاش ہو' بس اس کے لیے وہی کل

کائنات ہوتا ہے' اور اس کے دل کی یہی تمنا اور آرزو ہوتی ہے کہ وہ کہ جس گھر میں بیاہ کر آئی ہے' اب جنازہ بھی اس گھر سے نکلے اور میری ماں کا بھی یہی خواب' یہی آرزو' یہی تمنا تھی کہ اس بار جو بچہ اس کے پیٹ میں ہے وہ بیٹا ہی ہوگا' اور اس کے آنے سے اس کی زہر بھری زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں آجائیں گی' بس اسی آس امید کے سہارے وہ جی رہی تھی' تو وہ وقت بھی قریب آیا اور اسے اسپتال لے جایا گیا' اس کی ساس' نند' خالہ اور بہن اس کے ساتھ تھیں اس کا شوہر پریشان حال میں اس کے کمرے میں آتا مگر پھر مایوس ہوکر لوٹ جاتا پھر جب ولادت کا وقت قریب ہوا ہوگا تو اس پہ نزع کا عالم طاری ہوگیا ہوگا لمحہ بھر کے لیے زمین آسماں ایک ہوگئے ہوں گے تو پھر اس کے کانوں میں مجھ بدنصیب کے رونے کی آواز پہنچی ہوگی' دائی اور اس کی ساس نے مجھے الٹ پلٹ کر جب غور سے دیکھا ہوگا' تو بس دیکھتی رہ گئی ہوں گی اور میری ماں کے منہ میں کلیجہ آ گیا ہوگا......؟ عین اسی وقت میرا باپ' میرا خون دوڑتا ہوا آیا ہوگا' تو اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی ہوگی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا ہوگا......

میں بستر پہ پڑی تڑپ رہی تھی' اور چیخ رہی تھی' مگر ان سب کے تو جیسے ہوش اڑ گئے تھے کہ جب دائی نے انہیں بتایا ہوگا کہ میں ان کے گھر کی عزت' آبرو لاج بن کر بھی ان کے گھر کی چوکھٹ کے قابل نہیں رہی ہوں اور وہ مجھے جلد ہی اپنی نظروں سے دور کرکے سکھ وچین کا سانس لینا چاہتے تھے' پھر یہی ہوا کہ بڑی خاموشی سے انہوں نے مجھے اپنی نظروں سے اوجھل کرکے ایک خاموشی اختیار کرلی کہ جیسے میں اس جہاں میں آئی ہی نہ تھی' اور نہ مجھ سے ان کا کوئی رشتہ' ناتہ اور تعلق تھا' اگر رشتہ تھا تو بس درد غم اور ٹھوکروں سے تھا اور میں جنموں کی ماری اپنی ماں' باپ' بہنوں' دادا' دادی کو اچھی طرح سے دیکھ بھی نہ سکی اور انہوں نے مجھے بڑی بے دردی اور حقارت سے ایک دن کی عمر میں لاوارث' یتیم بے بس چھوڑ کر میری گرو آپا کرن کے حوالے کردیا جو مجھ جیسی سیاہ نصیبوں کو ان کے گھر سے لاتی تھی' اور جن کے گھروں میں نرینہ اولاد ہوتی تھی تو وہ ان کے گھر میں جاکر خوشیوں کے گیت گاکر بچوں کو لوریاں اور ہزاروں دعائیں دے کر کچھ پیسے لاتی اور اپنے گھر کا چولہا جلاتی تھی' اور مجھ جیسی بدنصیبوں کی زندگی میں خوشیوں کی کرن پیدا کرتی اس لیے تو سب اسے آپا کرن کہتے تھے اور آپا کرن نے ہی مجھے سنبھالا پال پوس کر بڑا کیا' ایک نام ایک عزت' ایک وقار دیا' برے اور بھلے کام کی پہچان دی۔

مگر پھر نہ جانے کیوں اس ساری دنیا میں مجھے ایک شخص اپنا اپنا سا لگا اس کی خوب صورت باتیں لہجہ' پیار' خلوص اور میرے درد میرے غم میری فکر کو محسوس کرکے مجھے بہت اچھا لگا' اور اس کی موٹی موٹی جھیل سی آنکھوں نے اپنے سحر میں گرفتار کرکے مجھے بے قرار سا کردیا تھا۔ میری آپا گرو کرن اس کے لاڈلے بیٹے کو لوریاں دے رہی تھی اور میں ڈھولکی کی تھاپ پر اس کے بیٹے کی خوشی میں لوک گیت گارہی تھی' اور وہ مجھے اپنی نظروں سے پیار کے گیت سنا رہا تھا اور میں ساری دنیا کے غموں سے دور کسی حسین وادیوں میں پریوں کی طرح اڑ رہی تھی' سارے گھر میں خاموشی اور سناٹا چھا چکا تھا' مگر میرے لبوں پہ لوک گیت تھے' اور جب مجھے خاموشی کا احساس ہوا تو مارے شرم کے میرے لبوں پہ بے اختیار ہنسی آ گئی تو میری گرو نے اپنی کہنی مجھے مارتے ہوئے کہنے لگی۔

''اے چھوری' ذرا ہوش تو کر میں کب کی بچے کو لوری دے چکی ہوں اور تو ہے کہ ڈھولکی بجائے جارہی ہے۔'' مگر میں اسے کیا بتاتی کہ زندگی میں پہلی بار تو اتنے پیار اور چاہت سے کسی نے دیکھا ہے کہ میں اپنے ہوش گنوا بیٹھی ہوں پھر وہ ہمیں خوش دیکھ کر میری گرو کرن کو چائے پینے کا اصرار کرنے لگا اور جلدی سے اپنی نوکرانی کو بسکٹ اور دو کپ چائے لانے کا کہا تو میری گرو بھی انکار نہ کرسکی اور اس کے بیوی بچوں کے ساتھ ہم دونوں بیٹھ گئے تو کچھ دیر میں گرم گرم چائے کے ساتھ بہترین بسکٹ بھی آ گئے تو باتوں باتوں میں وہ آپا کرن سے کہنے لگا۔

فقیرانی جی آپ اس وقت بھلا کہاں جائیں گی......؟ اس وقت تو رات ہونے والی ہے اور ہمارے گاؤں کی سب گاڑیاں جاچکی ہیں اس لیے اگر مناسب سمجھیں تو آج ہمیں اپنی خدمت کا موقع دے دیں۔'' آپا کرن اس کے خلوص کو دیکھ کر انکار نہ کرسکی اور دو گھروں سے چکر لگانے

کے بعد اس کے گھر آئے تو کھانا تیار تھا' کھانا کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور تقریباً رات کے ۱۲ بجے تک باتیں ہوتی رہیں۔

رات کے تقریباً ڈیڑھ بجے میں اپنے گرو کے ساتھ ایک کمرے میں سوئی ہوئی تھی' میری آنکھوں میں نہ جانے کیوں نیند کوسوں دور تھی کہ اس دوران دروازہ کھلنے کا احساس ہوا تو میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا تو وہ میرے سامنے تھا اور دور سے ہی بولا۔

''پلیز تمنا جی آپ اپنی گرو کو سونے دیں اور زیادہ گھبرائیں مت مجھے صرف آپ سے دو باتیں کرنی ہیں۔''

یہ سن کر میں خاموش ہوگئی' تو وہ میرے قریب آ کر بیٹھ کر کہنے لگا۔

''تمنا جی ایک بات سچ کہوں کہ مجھے تم سے پاکیزہ اور سچی محبت ہوگئی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں تجھے دیکھتا ہی رہوں۔''

یہ سن کر میرا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے کہنے لگی۔

''صاحب! آپ کہاں اور ہم بدنصیب کہاں ......؟ اس لیے میں آپ کو اتنا ہی کہوں گی کہ......

چھوڑ دو محبت کے راستے' منزلیں عذاب پاؤ گے
خوشیوں کی تلاش میں' درد بے حساب پاؤ گے
ادھورے ہوں گے ارمان' ادھورے خواب پاؤ گے
پاکیزہ دوستی کی ڈگر پہ' مہکتے گلاب پاؤ گے
وصل کے موسم میں آزاد' فصلیں خراب پاؤ گے

اور یہ کہ ہمارے مقدر میں تو یہ پیار' محبت' چاہت کا کوئی لفظ شامل ہی نہیں' بس درد ہی درد ہیں' ستم ہی ستم ہیں' بے رنگ بے لطف زندگی ہے ایک زندہ لاش ہوں جو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر پھرتے ہیں

یہ سن کر وہ ہمدردانہ انداز سے بولا تھا۔ ''تمنا جی آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں ......؟ آخر آپ کے سینے میں دل ہے' جذبات ہیں' آرزوئیں ہیں' میں آپ کے درد اور جذبات کی قدر کرتا ہوں' اور آپ کو سچے دل سے چاہتا ہوں پلیز آپ انکار نہ کریں۔

زندگی میں پہلی بار اتنا چاہنے والا کوئی انسان مجھ سے میرے پیار کی بھیک مانگے گا میں نے تو یہ کبھی نہ سوچا تھا اور نہ میرے وہم گمان میں تھا کہ طارق صاحب مجھ پہ اپنا دل اپنی جان لٹا بیٹھے گا مگر میں تو سنگ مرمر کی ایک مورتی تھی اور اس سے اتنا ہی کہہ دیا۔

طارق صاحب آپ کو معلوم ہے کہ میرا رنگ' روپ' لہجہ' چلنا' پھرنا عورتوں جیسا ہے مگر میں وہ بدنصیب ہوں کہ نہ میرا عورتوں میں شمار ہے اور نہ ہی مردوں میں......میں تو ایک سنگ مرمر کی مورتی ہوں جسے آپ دیکھ تو سکتے ہیں مگر اسے اپنے دل میں بسا نہیں سکتے اور چھو بھی نہیں سکتے ہیں۔

وہ ایک بار پھر محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''تمنا جی میں آپ کو ساری عمر دیکھتا اور چاہتا رہوں گا اور کبھی بھی آپ کا دل نہیں توڑوں گا' بس آپ ایک بار ہاں تو کہہ دیں پھر اس کے بعد رات بھر......!!

زندگی کتنی حسین ہوتی ہے ایک ہمدرد اور سچے چاہنے والے کے ساتھ اس رات مجھے یہ معلوم ہوا جب صبح صادق ہوئی تو اس وقت طارق صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے تھے' کچھ دیر کے بعد آپا کرن اٹھیں تو اس وقت ناشتہ بھی آ گیا تھا اور ناشتہ کرنے کے بعد ہم دونوں نے ان سے اجازت لے لی اور رخصت ہونے لگے تو طارق نے باتوں باتوں میں آپا کرن سے اس کے گھر کا پتہ معلوم کر لیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا کہ اگر میں کسی روز آپ لوگوں کے پاس آیا تو آپ ناراض تو نہیں ہوں گے ......؟ یہ سن کر تو میں بہت خوش ہوئی تھی اور آپا کرن نے بھی کوئی برا محسوس نہیں کیا تھا اس لیے تو ایک ہفتے کے بعد ہی وہ ہمیں تلاش کرتا ہوا آپا کرن کے گھر تک پہنچ گیا اور اس نے اسی وقت دو ہزار روپے نکال کر دیئے کہ وہ کچھ سودا سلف' کھانے پینے کا سامان لائے تو یہ دیکھ کر آپا کرن تو بہت خوش ہو کر اس پہ صدقے اور واری جارہی تھی اور جلدی سے بازار جا کر فروٹ' گوشت وغیرہ لائی اور میرے سامنے رکھ دیئے پھر اس دن کے بعد طارق آپا کرن کی ہمدردی حاصل کرتا گیا اور اپنے پیسے پانی کی طرح بہانا شروع کر دیئے جس کے بعد آپا کرن کا رویہ بدلنے لگا اور بات بات پہ مجھ پہ خفا ہو جاتی اور غصے میں کہتی۔

''تمنا! تم آج کل بہت خراب ہوتی جارہی ہو اور خیرات کے بہانے سے باہر جا کر تم لوگوں سے دوستی اور محبت کے چکر چلانے لگی ہے۔'' یہ سن کر تو جیسے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور دکھ اور افسوس میں نڈھال سی ہوگئی اور آپا کرن کے آگے لاکھ قسمیں کھائیں مگر طارق نے بہت اچھی طرح سے اس کے کان بھرے تھے اس لیے اس نے میری ایک بھی نہ مانی اور اب تو بات بات پر غصے ہو کر بہت برا بھلا کہہ کر مجھ پہ ہاتھ بھی اٹھانے شروع کردیئے اور میرے گالوں پہ تھپڑوں کی بارش بھی برسانے لگ گئی تھی' میں خاموش کھڑی سب کچھ سہتی رہتی اور سنتی رہتی اور طارق کھڑا تماشہ دیکھتا رہتا۔

ایک دن تو آپا کرن نے مجھے لاتوں' گھونسوں اور تھپڑوں سے برا حال کر کے مجھے بے ہوش سا کردیا جب مجھے ہوش آیا تو طارق کھڑا مسکرا رہا تھا میں نے آگے بڑھ کر اس کے آگے ہاتھ جوڑے اور منتیں کرنے لگی کہ پلیز آپ آپا کرن کو سمجھا دیں کہ میں ایسی بری نہیں ہوں جیسا وہ سمجھ رہی ہیں یہ سن کر وہ بڑی مکاری سے بولا تھا۔

''تمنا! جی آپا کرن کی آپ فکر نہ کریں اس کو خوش اور خاموش رکھنا میرا کام ہے' مگر آپ کو میرے دل کی بات ماننی پڑے گی اور اپنی ایک رات میرے نام کردیں۔''

طارق کی یہ بات سن کر مجھے اس پر بہت غصہ آیا اور میں نے اسے بہت برا بھلا کہا کہ تم نے سچی اور پاکیزہ محبت کا کہا تھا تو اب اتنی گری ہوئی بات کرو گے میں نے تو یہ کبھی بھی نہ سوچا تھا' مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپا کرن کو آپ ہی نے میرے بارے میں اکسایا ہے اور میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے' میری بات سن کر وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

''آپ بھی کتنی سیدھی سادی اور بھولی بھالی ہیں کہ ابھی تک میری سازشوں اور عقلمندی کو نہیں سمجھ سکی ہیں کہ میں نے ہی تمہاری کرن آپا کو تمہارے خلاف بڑھکایا ہے تاکہ تم باہر کسی بھی شخص کے سامنے نہ جاؤ اور نہ خیرات وغیرہ لینے جاؤ کیونکہ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں اور میں اسی طرح معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کو دوستی اور محبت کے نام پہ الو اور بے وقوف بنا کر اپنے جال میں پھنساتا ہوں ورنہ تو ایک عمر لگ جاتی ہے مگر ایک لڑکی بھی ہاتھ نہیں آتی۔

اس کی ذلیل اور گھٹیا سوچ اور باتوں پر مجھے بہت دکھ اور افسوس ہوا اور بے اختیار رونے لگی مگر اس ستم ظریف کو ذرا بھی احساس نہیں ہوا اور مجھے روتا ہوا چھوڑ کر چلا گیا تو میں اٹھ کر باہر ایک پارک میں چلی گئی اور جب رات کے تقریباً ۱۰ بجے میں آپا کرن کے گھر آئی تو وہ غصہ میں آگ بگولا ہو کر مجھ پر برس پڑی' اور تھپڑوں کی بارش برساتے ہوئے مجھے ایک کمرے میں لے جا کر بند کردیا اور پھر طارق کے ساتھ مل کر میری ہڈی پسلی ایک کردی۔ میں اپنی بدنصیبی پہ دن رات روتی رہتی' سسکتی رہتی' اور اپنے آپ کو کوستی رہتی تھی کہ میں نے طارق کی طرف پیار اور محبت سے نگاہ اٹھا کر بہت بڑی غلطی کی جس کی سزا مجھے یہ مل رہی تھی کہ میں روٹی کے ایک نوالے اور پانی کے ایک گھونٹ کے لیے ترس رہی تھی مگر ان کو مجھ بے کس پہ ذرا بھی رحم نہ آیا یہ تو اللہ پاک کا فضل و کرم ہوا کہ ایک رات میں ان کی قید سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوئی اور سیدھا ٹرین پر سوار ہو کر یہاں چلی آئی مگر یہاں تو منظر ہی کچھ اور ہے کہ گلی' کوچوں' بازاروں' ہوٹلوں' شاپنگ سینٹرز' میں حسین و جمیل خوبرو دوشیزائیں بڑے ناز و انداز سے ٹہل رہی ہیں اور خیرات مانگ رہی ہیں جبکہ لوگ ان حسین دوشیزاؤں کی نازک اداؤں پر وہ بڑے فخر اور خوشی سے انہیں ۵۰ اور ۱۰۰ اور پانچ سو روپے بھی دیتے ہوئے ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتے اور جب کوئی معذور' بیمار' بے کس' نابینا ان سے خیرات' صدقات مانگنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے تو ان پر سو بخار چڑھ جاتے ہیں اور ان کی شکل خراب ہو جاتی ہے۔

آخر یہ تماشہ کب تک جاری رہے گا......؟ اور کتنی معصوم بھولی بھالی لڑکیاں ایک روٹی کے ٹکڑے کے لیے اپنے گھر سے باہر نکلیں گی اور یہ عیاش' اوباش امیرزادے ان کی عزت' آبرو سے کھیلتے رہیں گے۔

تمنا فٹ پاتھ پر بیٹھی کشادہ سڑک پر دوڑتی ہوئی خوب صورت اور رنگین گاڑیاں دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ دور سے ایک کار سڑک کراس کرنے کی کوشش میں آگے بڑھ رہی تھی کہ اس کے سامنے ایک کوچ آگئی کار سڑک کو چھوڑ کر فٹ

پاتھ پر دوڑنے لگی اور چند ہی لمحوں میں تمنا کو کچلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی اور تمنا فٹ پاتھ پر تڑپ رہی تھی' لوگوں کا ایک بڑا ہجوم تھا بہت ہی حسین دلکش اور لمبی لمبی کاروں کے امیرزادے ایک نظر اسے دیکھ کر اپنی گاڑی کو آگے بڑھا دیتے کہ کہیں اس کی ہلاکت کا ذمہ دار انہیں ٹھہرایا نہ جائے یا پھر کوئی ہمدرد غریب ان سے یہ نہ کہے کہ اس کو اسپتال تک لے جاؤ تو پھر ان پر مصیبت آن پڑے اور ان کا قیمتی وقت ضائع ہو جو عیاشی اور بے حیائی کے اڈوں پر گزارتے ہیں اس طرح ایک ایک کر کے سب اپنی منزل کی جانب گامزن ہوگئے اور تمنا کی لاش ان مردہ ضمیر انسانوں کی بے حسی پہ ہنستی رہی کہ حضرت امام غزالیؒ نے بھی ایک دن ارشاد فرمایا تھا کہ سب انسان مردہ ہیں' زندہ وہ ہیں جو علم والے ہیں' سب علم والے سوئے ہوئے ہیں جاگ وہ رہے ہیں کہ جو عمل والے ہیں' تمام عمل والے گھاٹے میں ہیں' فائدے میں وہ ہیں جو اخلاص والے ہیں' سب اخلاص والے خطرے میں ہیں کامیاب وہ ہیں جو غرور اور تکبر سے پاک ہیں۔

آج تو خود غرض' تکبر' غرور' انا پرستی کی تو انتہا ہوگئی تھی کہ رات بھر تمنا کی لاش کھلے آسمان تلے پڑی رہی اور جب صبح سویرے خاک روب' گلیوں' بازاروں کو سجانے کے لیے نکلے تو خونخوار کتے تمنا کے گرد گھیرا تنگ کیے ہوئے تھے جنہیں دیکھ کر وہ یہ سمجھنے لگے کہ شاید کوئی جانور مر گیا ہے یا پھر کوئی رات کی تاریکی میں اپنا گناہ چھپانے کے لیے اپنا ناجائز بچہ پھینک کر گیا ہے کہ اب تو یہ کوئی جرم' گناہ ہی نہیں رہا تھا' اور آئے دن کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں' گلیوں' فٹ پاتھوں کے کناروں پر کوئی ناجائز بچہ تڑپ تڑپ کر اپنی زندگی کی بازی ہار جاتا ہے' مگر یہ بڑے بڑے محلوں' جاگیروں میں رہنے والے بہت ہی دانا' عقل مند ترقی پذیر لوگ ان پر ذرا بھی دھیان نہ دیتے اور میونسپل والے ان معصوم بچوں کو نئی زندگی دے کر دارالامان' فاؤنڈیشن یا کسی فلاحی ادارے میں پہنچا دیتے یا پھر مردہ بچوں کو منوں مٹی تلے دفن کر دیتے کہ جس طرح تمنا کی قبر کھود کر اس کی لاش کو اٹھایا گیا تو کوئی دل کوئی آنکھ رونے اور سسکنے والی نہیں تھی نہ اس کے لیے دعا فاتحہ پڑھنے والا تھا نہ اس کا سوئم اور چہلم کرنے والا تھا وہ بیچاری ان ناجائز بچوں کی طرح انسان کی کوک سے جنم لے کر بھی انسانوں کے پیار' وفا' خلوص اور احساس سے محروم ہو کر منوں مٹی تلے دفن ہو کر اس شہر خموشاں میں اپنی آہ وفریاد کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی تھی اور اس کی روح چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

اے ظالم......!
اے جابر......!
اے انسانیت کے دشمن
اندھیروں کے حامی
تو......
لوگوں کو قید کر کے
اپنے ظلم وستم سے
ان کے ہونٹوں پہ
چپ کی مہر تو لگا سکتا ہے
مگر......!
تیرے ظلم کی داستان
جبر کی داستان
سلاخوں کے پیچھے قید ہو نہیں سکتی
کسی تہہ خانے میں
زمین کے گڑھے میں دفن ہو نہیں سکتی
تو لاکھ جتنا بھی چاہے
کسی مظلوم' بے کس' بیوہ' یتیم کی سوچ
فکر' خیال......
اور آواز چپ ہو نہیں سکتی......!!!!

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی رنگارنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھولیں گی

برگد کا درخت	ثوبیہ امبر
خالی خانے	صباء عیشل
بے وفا	فرح بھٹو
سیاہ چہرہ	معصومہ ارشاد نقوی
میری چاہت گلابوں سی	شہباز اکبر الفت
غلطی محبت	مونا نقوی
ازلی تضاد	س ن مخمور
فہد	عائشہ تنویر
کائی	نائمہ غزل
بھوک	دستگیر شہزاد

برگد کا درخت

ثوبیہ امبر

'میرے اندر برگد کا بوڑھا درخت اگ آیا ہے۔جس کے چھتنار پتے ہر وقت آہٹ کے خوف سے لرزتے رہتے ہیں۔اس درخت کی اداسی نے مجھے گھیرے میں لے لیا ہے اور میں وقت کی آس سے بے نیاز اس اداسی کو اپنا سب کچھ دان کر بیٹھی ہوں۔ مجھے عشق نہیں، کوئی روگ نہیں، میں نے محبت کا کلمہ نہیں پڑھا اور میں کوئی دیوداسی بھی نہیں لیکن میری روح نے صدیوں کا گیان اسی درخت کے نیچے لیا ہے۔ابھی بھی میں اس خاموش تنہا پارک میں لکڑی کے بینچ پر بیٹھی، اس میدان کے وسط میں اگے درخت پر نظریں گاڑے بیٹھی ہوں۔ مجھے لگتا ہے یہ صدیوں پرانا بوڑھا، اداس درخت، میرے اندر اگ آیا ہے اور اس نے اداسی کا تمام سناٹا میرے اندر بھر دیا ہے۔' ڈائری کو بند کر کے کچھ دیر مزید اس نے اس درخت کو دیکھا تھا۔شام کے ڈھلتے سائے ابھی اپنے پیروں پر بھاگتے آ رہے تھے لیکن ان کا بسیرا ابھی پورے پارک پر نہ تھا۔کچھ درختوں کے پتوں سے چھنتی شام کی مدھم دھوپ اس کے کان میں سرگوشیاں کر رہی تھی اور اسے یہ پارک، یہاں اترتی ہوئی شام، ڈھلتی دھوپ کے سائے، اور یہ برگد کا درخت بہت پسند تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے اس نے اپنی زندگی کی اداس ترین شامیں یہاں گزاری تھیں۔اس درخت میں کہیں وقت چھپا ہوا تھا۔۔۔اور اسے لگتا تھا یہ درخت کئی داستانیں سناتا تھا۔ایسی داستانیں جن میں کئی نوحے تھے۔

دھوپ کی آخری کرن کے ساتھ وہ بھی پارک سے نکلی تھی۔ اسے اندھیرے سے، شام سے، اور گہری تاریکی سے ایک عجیب خوف محسوس ہوتا تھا۔

پارک سے باہر نکلتے دروازے پر وہ کسی سے ٹکرائی تھی جو موبائل فون پر بہت بری طرح مصروف تھا شاید۔

'سوری' اس نے بے نیازی سے کہا تھا اور ایسے آگے بڑھا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔اس کے بیک پیک سے کچھ سامان نکل کر زمین پر گرا تھا اور وہ فطری ہمدردی سے مجبور ہو کر اسے آواز دے کر سامان پکڑایا تھا۔

'شکر ہے ایک اور دن گزر گیا ہے۔' اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور وہ شام کو دفتروں سے نکلے، تھکے، پژمردہ اور کچھ خوش چہرے دیکھ رہی تھی۔ اس بڑے شہر کی ٹریفک اور قطار بہت لمبی تھی۔ لیکن اسے گھر جانے کی جلدی بھی نہیں تھی۔ اس کے سامنے ایک ہجوم بے معنی تھا۔رینگتی ٹریفک سے وہ کافی دیر بعد گھر پہنچی تھی اور اپنا بیگ کہیں صوفے پر پھینک کر وہ بیڈ پر اوندھے منہ گر گئی تھی۔ آج پھر اسے قنوطیت کا شدید دورہ پڑا تھا۔ اور اسے شدید نیند آتی تھی۔۔۔اس کی نیند کا دورانیہ بڑھ جاتا تھا اور وہ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کبھی آنکھ نہ کھولے اور زندگی کا چہرہ نہ دیکھے۔۔۔وہ زندگی جس کا چہرہ خوشگوار کبھی نہ تھا۔

صبح سے رشیداں نے تیسرا چکر لگایا تھا کہ 'بڑے صاحب' ناشتے کی ٹیبل پر انہیں بلا رہے ہیں۔ پچھلے تین ہفتے سے اس کا سامنا اپنے باپ سے نہیں ہوا تھا۔ وہ پچھلے تین ہفتے سے ملک سے باہر تھے اس لیے وہ اپنے کمرے میں ہی ناشتہ اور کھانا وغیرہ منگوا رہی تھی۔ آج وہ بہت بد دلی سے نکلی تھی۔

'نورت! یہ کیا بات ہوئی کہ میں تین ہفتے بعد آیا ہوں اور آپ کو مجھ سے ملنے اور حال پوچھنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے؟' وہ ڈائننگ ٹیبل پر اس فیملی کے ساتھ ایسے بیٹھی تھی جیسے مہمان بیٹھتے ہیں۔ اس کی ماں اور چھوٹے دو بھائی قطعاً بے نیاز تھے جیسے وہ اس گفتگو کو سن ہی نہیں رہے تھے۔

'جی' وہ خاموشی سے فرائی انڈے کو کانٹے سے الجھاتی رہی تھی۔

''مانا کہ ریشم تمہاری سگی ماں نہیں ہے لیکن سگی ماں سے کم پیار نہیں دیا اس نے۔ ہر چیز تو ہے تمہارے پاس۔'' بہت مرتبہ دہرائے ہوئے جملے اس کی کانوں کی سماعت سے پھر سر مارنے لگے تھے اور اس کے ذہن نے کسی بھی جملے کا اثر قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں کا چہرہ دیکھا تھا جو بالکل سپاٹ تھا اور کبھی کبھار اسے لگتا تھا یہ عورت سنگ مرمر کا کوئی مجسمہ ہے۔ اس قدر خوبصورت، اس قدر بے تاثر چہرہ اور اس قدر ٹھنڈے تاثرات۔ پچھلے پندرہ

سال سے وہ سنگ مرمر کے مجسمے کی طرح تنی ہوئی تھی۔خوبصورت، مغرور اور بے نیاز۔اس نے ایک مرتبہ اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھ کر ماں کی گود میں بیٹھنا چاہا تھا اور اس نے بہت نرمی سے اسے گود سے نیچے اتار دیا تھا۔اس کے بعد کبھی اس نے اپنے بھائیوں جیسی کوئی حرکت نہیں کی تھی کی۔وہ بچپن میں بوڑھی ہوگئی تھی اور زندگی نے ایک بہت بڑا خلا اس کے اندر بھر دیا تھا۔اس نے یہ خلاء اپنے لفظوں سے، بھرنے کی کوشش کی تھی۔وہ خاموش تھی اور اس کے لفظ مرہم بنتے اس کی ڈائری کے صفحوں پر بکھرتے رہتے تھے۔گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں گھر کے لان میں وہ کسی درخت کے سائے یا اوٹ میں رہتی تھی۔گڈے گڑیا کی شادی وہ اکثر اکیلے ہی کرتی تھی اور بچپن سے جب جوانی میں قدم رکھا تھا تو علینہ اس کی تنہائی میں داخل ہوئی تھی۔اس نے اسے دوست بنا کر ہی دم لیا تھا۔

وہ دونوں متضاد تھے۔وہ جتنی کم گو تھی علینہ اتنی باتونی، وہ جتنی تنہائی پسند، علینہ اتنی ہی لوگوں کی دوستوں کی شیدا۔اور سچ تو یہ تھا اگر وہ دو چار لوگوں سے مل لیتی تھی تو یہ اس لڑکی کی مرہون منت تھا، اس کی کوششیں ہی تھیں ورنہ وہ گھر سے نہ نکلتی۔

'چلو آرٹ ایگزیبیشن ہے آواری میں۔کوئی بالکل نیا آرٹسٹ ہے۔' وہ اس کمرے میں اس کے سر پر کھڑی تھی اور وہ جانتی تھی اب وہ اسے یہاں سے لیے بنا نہیں ہٹے گی۔اس نے تیار ہونے میں عافیت جانی تھی۔

تصاویر کے ساتھ ساتھ پینٹنگز بھی رکھی گئی تھیں۔آرٹسٹ کو پہاڑوں سے کوئی خاص انسیت تھی اور اس کا اظہار تصاویر اور پینٹنگز دونوں میں کیا گیا تھا۔تصاویر بہت مشکل اینگل سے لی گئی تھیں کافی پینٹنگز لینڈ اسکیپ تھیں۔

'مجھے کوہ پیمائی سے عشق ہے۔میں کچھ نہ کچھ کرنے کے شوق میں مبتلا رہتا ہوں۔چاہے وہ آرٹ ہو، سفر ہو چاہے وہ کوئی نیا ایڈونچر لیکن کوہ پیمائی میرا پہلا اور آخری عشق ہے'

نیوز رپورٹر سے کہتا ہوا وہ خوشگوار لگ رہا تھا۔اب نیوز رپورٹر اگلے سوالات کر رہا تھا۔مصور کیمرہ کی روشنی میں میڈیا سے بات کر رہا تھا۔

'نورت! یہ لڑکی مجھے تم جیسی لگ رہی ہے۔'علینہ ایک تصویر کے سامنے کھڑی تھی۔

وہ اس تصویر کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی تھی۔ایک درخت تھا جو ایک لڑکی کے دھڑ کی جگہ کھڑا تھا اور اس کی شاخیں کسی جال کی طرح پھیلی تھیں اور یہ چہرہ اور نقش بلاشبہ اس کا ہی چہرہ تھا لیکن اس چہرے پر آنکھیں بند تھیں اور نقوش میں ایک اداسی اور ٹھہراؤ تھا۔وہ شاید اس چہرے کے بارے میں کوئی مغالطہ کر سکتی تھی لیکن وہ درخت۔۔۔۔وہ وہی برگد کا درخت تھا جس سے اسے شدید محبت تھی اسے جب کچھ خوبصورت لکھنا ہوتا تھا وہ اس کے سامنے جا کر بیٹھ جاتی تھی۔۔۔اور جب اسے لگتا اب وہ کبھی نہیں لکھ پائے گی وہ درخت اسے انسپائر کر دیتا تھا۔اس پینٹنگ کے سامنے کھڑی وہ بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

'کیسی لگی آپ کو پینٹنگ؟' آواز کے تعاقب میں وہ دونوں مڑی تھیں اور نورت کی آنکھوں میں ابھرنے والی حیرت اب یقین بن گئی تھی۔وہ وہی تھا جس سے وہ اس دن پارک میں ٹکرائی تھی اور جس کے بیک پیک سے پینٹ برش اور دیگر سامان زمین سے گرا تھا۔اس کے گلے میں اس دن ایک کیمرہ بھی لٹک رہا تھا اور شناسا مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تھی۔اسے اس سے خوف محسوس ہوا تھا۔کیا وہ اتنی دیر اتنے غور سے اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ اس کا چہرہ اتنا واضح پینٹ کر سکتا تھا۔کیا وہ اس کی جاسوسی کر رہا تھا؟ آخر کیوں؟

وہ وہاں سے کب بھاگتے ہوئے نکلی تھی اور کب گھر پہنچی تھی اسے کچھ خبر نہ ہوئی تھی۔زندگی میں پہلے ہی بہت کم لوگوں اور رشتوں پر اس کا اعتبار تھا۔وہ کئی دن تک اس پارک میں نہیں گئی۔اسے لگتا تھا کہ اب وہ کبھی اس پارک میں نہیں جا سکے گی۔

'مجھے بہت خوف آتا ہے کہ کہیں میں لائبریری کی اس کتاب کی طرح نہ بن جاؤں جو بہت قیمتی، بہت خوبصورت ہوتی ہے لیکن وہ لائبریری کے سب سے آخری کونے میں پڑی ہوتی ہے۔گزرے دنوں کی گرد اس پر جمتی رہتی ہے اور وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔بس وہ بے کشش اور غیر جاذب ہو جاتی ہے حالانکہ ہوتی بہت قیمتی ہے۔'

آج بہت دن بعد وہ پارک میں آئی تھی۔ لکھنے کے باوجود دل کسی طور پر سکون نہیں تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کی ذات کے تحفظ کے قیمتی احساس کو چھین لیا ہو۔ آج وہ ابھی اسے نظر نہیں تھا آیا۔ اگر وہ اسے نظر آجاتا تو شاید وہ اسی وقت اٹھ جاتی۔

اگلے دن پارک آنے سے پہلے وہ اپنی ڈائری ڈھونڈتی رہی تھی جو اسے کہیں نہیں مل رہی تھی۔ یعنی وہ ڈائری کل اس پارک کے بینچ پر ہی چھوڑ آئی تھی۔ اسے گھر سے پارک تک جانا بہت طویل سفر لگا تھا۔ حالانکہ ڈائری میں اس کی ذات کی نم مائیگی کی گواہی دیتے لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا لیکن ایک عجیب خوف تھا۔ وہ اپنا آپ کسی پر بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ اس بینچ تک آئی تھی اور وہ خالی تھا۔ اس نے باقی تمام بینچ بھی دیکھ لیے تھے اور پھر تھک ہار کر وہیں آکر بیٹھ گئی تھی۔

''آپ غالباً یہ ڈھونڈ رہی ہیں' وہ اس کے سامنے، ہاتھوں میں اس کی ڈائری لیے کھڑا تھا۔ حیرت تھی کہ آج وہ اس سے خوفزدہ نہیں ہوئی تھی۔

اس نے وہ ڈائری پکڑ لی تھی۔

''اس دن آپ وہ پینٹنگ دیکھ کر ایسے بھاگی تھیں جیسے میں کوئی بھوت ہوں۔ آپ یقین کریں میں آپ کے جیسا ہی ایک آرٹسٹ ہوں۔ آپ لفظوں میں بات کہتی ہیں اور میں رنگوں میں۔'' وہ بینچ کے دوسرے کونے پر ٹک گیا تھا۔

''میں کسی خوبصورت درخت کی تلاش میں اس پارک تک آیا تھا اور یہ برگد کا درخت مجھے اپنی پینٹنگ کے لیے سب سے زیادہ پسند آیا تھا۔ میں اور آپ ایک ہی ٹائم پر پارک آتے تھے لیکن مجھے حیرت تھی کہ آپ نے بھی کسی کو نوٹس ہی نہیں کیا نہ مجھے اور نہ ہی کسی اور کو اور ایک دن درخت کی دوسری طرف میں اپنے ایزل پر یہ درخت بنا رہا تھا اور آپ سامنے بینچ پر تھیں اور مجھے لگا کہ درخت کے وجود سے لپٹی اداسی سے زیادہ اداسی تو اس لڑکی کے پور پور سے جھلکتی ہے۔ اور اداسی بہت کم لوگوں کو خوبصورت بناتی ہے اور آپ ان میں سے ایک ہیں۔''

وہ اسے سن رہی تھی اور اس کے پورے وجود سے سماعتیں ٹپک رہی تھیں۔

'نہیں مجھے نہیں سننا چاہیے' اسے دماغ نے کئی آوازیں لگائیں لیکن دل لفظوں کے فسوں میں ڈوب گیا تھا۔

''مجھے عورت کی عزت کرنا آتی ہے۔ بہت ساری لڑکیاں میری دوست ہیں بالکل ویسے جیسے بہت سارے لڑکے میرے دوست ہیں۔ لیکن اپنی فی میل دوستوں کی عزت میں لڑکوں سے زیادہ کرتا ہوں۔ ان میں سے کچھ جذباتی ہیں، کچھ غصیلی، کچھ پریشان ہیں۔۔۔ لیکن اتنا اداس کوئی نہیں ہوتا۔'' وہ اسے دیکھ رہا تھا اور وہ اسے دیکھنے سے کترا رہی تھی۔ دل پر پڑنے والی دستک سے وہ دروازہ کھل جانے سے ڈر رہی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت پینٹنگز بناتا تھا۔

اگلے دن پارک میں وہ خالی ڈائری لیے بیٹھی تھی۔

''آپ کبھی کچھ بولتی بھی ہیں؟'' وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا اندازہ اسے اس آواز کے بینچ پر ٹک جانے کے بعد ہوا تھا۔ وہ ہنسی تھی۔

''چلو ہنسی تو دیکھ لی۔۔۔ اب آواز بھی سن لوں گا۔''

''ہاں بولتی ہوں لیکن کم۔'' وہ اسے دیکھ رہی تھی جو وہیں اپنا ایزل اسٹینڈ لگا رہا تھا۔

''ویسے میں ایک نیچرل سین پینٹ کر رہا ہوں۔۔۔ ایک پہاڑی ایک آبشار۔۔۔ آپ دیکھ کر بتائیں بھلا' وہ اپنا سامان نکال رہا تھا اور اس دن دیر تک وہ دونوں ساتھ رہے تھے۔ وہ اس ہل اسٹیشن کو پینٹ ہوتے دیکھ رہی تھی۔ کچھ کہے بغیر وہ جانتے تھے کہ کل وہ دونوں وہیں ملیں گے۔

اگلے دو مہینے اس کی زندگی کے خوبصورت ترین دنوں پر مشتمل تھے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی باتیں بھی کر سکتی ہے اور زندگی میں اتنے رنگ بھی ہو سکتے ہیں اور زندگی اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی تھی اور مکمل بھی۔

'مجھے کوہ پیمائی سے عشق ہے۔۔۔ کل میں جاؤں گا۔ اس کے بعد آکر مجھے تمہارے پیرنٹس سے ملنا ہے اور مجھے تمہیں جلد از جلد اپنا نام اور اپنی زندگی دینی ہے۔ اب ہم بارہ مارچ کو ملیں گے۔۔۔ یہاں اسی جگہ اسی وقت۔' اس نے

لکڑی کی بینچ پر پڑے اس کے مرمریں ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ نورت کو لگا اس کا لمس اس کی طرح سچا تھا۔
اس کے جانے کے بعد وہ اس سے موبائل کے ذریعے رابطے میں تھی لیکن قراقرم کی طرف روانہ ہونے کے بعد وہ رابطے میں نہیں تھا۔ اس کے لیے وہ اسے بتا چکا تھا لیکن اس کا موبائل فون اس کے بعد کبھی بھی آن نہیں ہوا۔ ہزار وسوسوں کو روز وہ مارتی تھی کہ ۱۲ مارچ کو اس پارک میں ملنے سے پہلے وہ کوئی بدگمانی اپنے دل میں نہیں آنے دے گی۔ وہ وہاں آئے گا اور ضرور آئے گا۔ اس سے ضرور ملے گا۔
۱۲ مارچ وہ طے شدہ وقت سے بہت پہلے وہاں موجود تھی۔ آج کا دن رینگ رینگ کر گزر رہا تھا اور وقت سرکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔
ابھی دوپہر ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی اور وہ اس بینچ پر ٹک گئی تھی۔ وہ اسے دیکھنے اور ملنے کو بے تاب تھی۔ دوپہر، سہ پہر میں اور پھر شام میں کب ڈھلی وہ نہیں جانتی تھی۔ لیکن اس کے اندر بہت گہری رات اتری تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے فون ملایا تھا اسے وہی جواب ملا جو پچھلے دو ہفتے سے مل رہا تھا۔ فون بند تھا یہ سن کر ہمیشہ اس کا دل بند ہوتا تھا۔ اگلا پورا مہینہ وہ اس پارک میں آتی رہی تھی۔ کبھی اسے لگتا کہ وہ تھوڑی سی وہیں رہ جاتی تھی کبھی بھی مکمل گھر نہیں جاتی تھی۔ ایک مہینے بعد ساری امیدوں کو وہیں کسی کونے میں مٹی میں دفن کر کے گھر آ کر خوب روئی تھی۔ جو امیدیں دل کی تکلیف بڑھائیں انہیں دفن کرنا بہتر تھا۔ اس نے موبائل فون کی سم کاٹ کر پھینک دی تھی اور ماضی کا دروازہ سختی سے بند کیا تھا۔ وہاں سوائے دھوکے کے کچھ نہیں تھا۔

☆☆

عروسہ خالہ کو ابھی کینیڈا سے آئے ہفتہ ہوا تھا کہ ان کی بڑی بیٹی تانیہ نے آج پھر اس سے اصرار کرنا شروع کر دیا تھا۔
'مجھے جانا ہے اس پارک میں۔ بہت قیمتی اور بہت نایاب پودے ہیں اور میرا سبجیکٹ باٹنی ہے۔ سب سے پہلے مجھے وہ پارک دیکھنا ہے اور بعد میں باغ جناح' وہ اسے ایک ہفتے سے ٹال رہی تھی۔ خالہ نے اسے اپنے گھر بلایا تھا جو کہ اس کے اپنے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔
''مجھے پانچ سال ہوئے میں کبھی نہیں گئی۔''
''تو اب چلی جائیں میرے ساتھ۔''
'تم ڈرائیور کو کہو تمہیں لے جائے' اس پارک میں وہ اپنی محبت، اپنی امیدیں، اپنا ایک گم شدہ حصہ دفن کر آئی تھی۔ وہ پچھلی آدھی دہائی سے کبھی وہاں نہیں گئی تھی۔ اس دن سے آج تک اس نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا۔ اس کے اندر وقت تھم گیا تھا۔ اور وہی سناٹا تھا جو بچپن میں اس کے اندر تھا جب اس کی سوتیلی ماں نے اسے اپنی گود سے اتارا تھا۔
وہ تانیہ کی ضد کے ہاتھوں اس وقت اس پارک میں تھی اور پارک میں اکا دکا چھوٹی موٹی تبدیلیاں آئی تھیں۔ نیا جاگنگ ٹریک اور ایک دو جگہ لگے ہوئے بینچ تھے۔ تانیہ ایسی ہی خوش تھی جیسے بچے کھلونوں کی دکان میں جا کر خوش ہوتے ہیں۔ اسے اس درخت سے محبت تھی وہ بھولی نہیں تھی لیکن اس نے خود کو یہ بات یاد کرنے سے باز رکھا تھا۔ تانیہ کونے میں لگے کسی درخت کی طرف جا رہی تھی اور اس کے قدم خود بخود اس بوڑھے برگد کے درخت کی طرف بڑھ گئے تھے۔
اس نے سامنے وہ بینچ دیکھا جہاں اسے اس کا اور اپنا سراپا محبت کے رنگوں میں ڈوبا دکھائی دیا تھا۔ ایک محبت کا رنگ جانے سے اس کی زندگی نے کسی بھی اور رنگ کو پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔
'نورت!' اپنے عقب سے ابھرتی اس آواز پر اسے گمان گزرا تھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ وہ مڑی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ بوڑھا برگد کا درخت وہاں ہوگا لیکن اسے یہاں دیکھنے اور اس کی آواز سننے کے بارے میں اس نے قطعاً نہیں تھا سوچا۔
وہ اس کے سامنے تھا۔ جس کے جانے کے بعد اس کے لفظ اپنی موت آپ مر گئے تھے اور وہ اتنی ادھوری ہوئی تھی کہ آج تک وہ کوئی کتاب مکمل نہیں پڑھ سکی تھی، کوئی کام مکمل نہیں ہوتا تھا، کیونکہ اس کی ذات کا کوئی حصہ اس پارک میں پڑا

رہ گیا تھا۔
وہ بالکل ویسے ہی بھاگ جانا چاہتی تھی جیسے وہ اسے پہلی بار ملنے پر بھاگ گئی تھی لیکن اس کے قدم جم گئے تھے۔ وہ چاہنے کے باوجود بھاگ نہیں سکی تھی۔ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔
''آج میں گھر سے دعا کر کے آیا تھا کہ اگر خدا نے مجھ سے کچھ بہت قیمتی لے لیا ہے تو اس کے بدلے میں مجھے تمہیں دے دے۔ میں نے اس کے لینے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اتنی دعا تو خدا کو بھی مان لینی چاہیئے۔'' وہ اس کے قریب آیا تھا اور وہ دھندلائی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا سارا غصہ پانی بن کر بہہ رہا تھا اور اس کا پتھر کا وجود موم ہوتا جا رہا تھا۔
''میں ۱۲ مارچ کو نہیں آیا۔۔۔ میں اس کے دو مہینے بعد آیا تھا۔ اور کئی مہینوں تک آتا رہا تھا۔۔۔ لیکن تم نہیں آئیں تھی۔ میں کیوں نہیں آیا اس کا جواب یہ ہے۔' اس نے اپنی پینٹ کے دائیں پائنچے کو اٹھایا تھا جہاں سے مصنوعی ٹانگ جھانک رہی تھی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔
'تمہارا نمبر بند تھا اور وہ واحد رابطہ تھا جو میرے پاس تھا۔ چار سال سے میں ۱۲ مارچ کو یہاں آتا ہوں کہ شاید تم آجاؤ۔ آدھی دہائی ہوئی کہ میں اس احساس جرم کے ساتھ جیتا رہا ہوں کہ میں نے محبت پر سے تمہارا اعتبار دھندلا دیا ہوگا۔' وہ اس کے بالکل قریب تھا کہ اس کی مانوس خوشبو اس کی سانسوں میں گھل گئی تھی۔
'جب میں پہاڑ سے گرا تھا تو کسی کو امید نہیں تھی میں بچ جاؤں گا۔ لیکن مجھے لگا تھا مجھے تمہاری محبت نے مرنے نہیں دیا۔ ایک مہینے بعد مجھے ہوش آیا تھا اور میرا فون اس حادثے میں گم گیا تھا۔ تمہارا نمبر مجھے یاد تھا۔ لیکن تمہارا نمبر بند تھا اور جب میں تھوڑا چلنے لگا تھا تو بیساکھی کے سہارے سب سے پہلے یہاں آیا تھا اور اکثر آتا رہتا تھا لیکن تم کبھی نہیں آئیں۔'
وہ آنکھوں میں ہلکا پانی لیے اسے شکوے بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔۔۔ اس کے سارے لفظ گونگے ہو گئے تھے۔ وہ اس کے دل پر محبت کی پہلی گواہی تھا اور آخری بھی۔ محبت کے نام پر اگر کوئی چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آتا تھا تو وہ یہ چہرہ تھا۔ اس نے اس کے کشادہ سینے میں منہ چھپایا تھا۔ آنسو اس کی شرٹ بھگو رہے تھے۔
'اور آج تو تھوڑی سی سودے بازی خدا سے کر کے، دعائیں مانگ کے آیا تھا کہ مجھے تم چاہیئے ہو بس۔'
اس کے دل پر پڑا پانچ سال کا اندھیرا ایک دم چھٹا تھا۔ اسے احساس ہوا تھا کہ پارک میں کھلنے والے بے شمار پھولوں کی خوشبو بہت دلفریب تھی اور وہ شخص دنیا کا خوبصورت ترین شخص تھا۔ وہ اسے پھر بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔
'زیادہ گریس فل ہو گیا ہوں نا؟ ٹانگ کٹوا کر؟' اسے دیکھتے بولا تھا
اس نے ہاں میں سر ہلایا تھا۔۔۔ وہ رو رہی تھی لیکن ساتھ ہنس رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں سے زیادہ محبت تھی۔

......☆☆......

خالی خانے
صباء عیشل

وسیع کمرے کے درمیان خوبصورت مسہری رکھی تھی، جس کی پائنتی سے ٹیک لگائے ایک شاندار شخصیت کا حامل نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ نوجوان کی نگاہیں سامنے والی دیوار پر مصور کی تخلیق کردہ تصویر پر جمی تھیں۔ وہ خالی نگاہوں سے بظاہر تصویر کو دیکھ رہا تھا، لیکن دراصل اس کا دل و دماغ کہیں اور تھا۔ مسہری پر بچھی بے شکن چادر اس بات کی گواہ تھی کہ شب بھر کسی نے اس پر کمر ٹکانے کی زحمت نہیں کی۔ آنکھوں کی سوجن اور چہرے کی سرخ رنگت اس کے اندرونی کرب کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ دسمبر کی ٹھٹھرا دینے والی سردی میں وہ بنا کسی لحاف اور سویٹر کے پچھلے کئی گھنٹوں سے اسی حالت میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔

کسی کی بھرائی ہوئی آواز اسے بہت قریب سے سنائی دی۔

"میری بددعا ہے تمہارے دل کے خالی خانے میں صرف میرا نام گونجتا رہے۔"

سوکھے پپڑی جمے ہونٹوں سے سسکاری نکلی تھی۔۔ اس نے جلتا سگریٹ ایش ٹرے میں بری طرح مسلا۔ یہ عمل اس کے اندر کی منتشر سوچوں کو ظاہر کر رہا تھا۔

"ہاہاہاہا۔۔!! میرے دل میں کبھی کوئی خالی خانہ نہیں ہو سکتا۔۔ میں ہاشم صغیر احمد ہوں ناقابل تسخیر۔۔" بولنے والے کے لہجے میں غرور تھا اور انداز ایسا جیسے سامنے والے کو نیچا دکھانا چاہتا ہو۔

"دل خالی وہاں ہوتے ہیں جہاں کسی کی کمی ہو۔۔ میں مکمل ہوں۔۔ سو فیصد مکمل۔۔" اس نے ایک بار پھر بات کا سرا وہیں سے جوڑا اور آخری تین لفظ زور دے کر ادا کیے تھے۔۔

کچھ یادیں تازہ ہو رہی تھیں، کچھ بھولے مناظر روشن ہو رہے تھے۔ سیپ میں موتی بن رہا تھا سنبھل نہ سکا تو بے رنگ شفاف موتی سیپ سے لڑھک گیا۔ سیاہ گھنگھور آنکھوں میں گویا سیلاب امڈ آیا تھا۔ بارش ٹپ ٹپ برسنے لگی۔۔

نوجوان اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر بائیں طرف کو مسلنے لگا۔ اچانک دل کے کسی حصے میں شدید درد اٹھا تھا شاید کوئی خالی کونا درد سے بھر گیا تھا۔ تھکن سے چور بدن کو سمیٹتے وہ بڑی مشکل سے تپائی تک پہنچا اور گلاس کو حرکت دیئے بنا جگ اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ شدید ٹھنڈ اور کپکپاتے وجود کے باوجود وہ جگ کا سارا پانی ایک ہی سانس میں پی گیا تھا لیکن اندر آگ کی لپٹیں تھیں کہ بجھنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔ دو قدم آگے بڑھ کر قد آدم کھڑکی کا شیشہ وا کیا تو باہر کے کہر زدہ موسم کو اندر آنے کا راستہ مل گیا۔۔۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہانپ رہا تھا جیسے میلوں کا فاصلہ طے کر کے لوٹا ہو۔ سانسوں کے ساتھ منہ سے نکلنے والا دھواں اور صبح کی گہری دھند مل کر کچھ تخلیق کر رہی تھیں۔

اب دھند پر وہ منظر حاوی ہو گیا تھا۔ چمکتی سیاہ بڑی آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں کا منظر جن سے قطرہ قطرہ بہتے آنسو موتیوں کی بکھری لڑی کی مانند ادھر ادھر پھسلتے جا رہے تھے۔۔۔۔۔

☆......☆☆......☆

بچپن سے لیکر بڑھاپے تک ان گنت خواہشات انجانے میں ہماری محرومیاں بن جاتی ہیں۔ چہرے خوابوں میں بدل جاتے ہیں۔ ہر محرومی دل میں اپنا ایک الگ گوشہ بنا کر ڈیرہ جما لیتی ہے۔ مختلف اوقات میں بہلا پھسلا کر سلائی گئی خواہشات جب اچانک سے آنکھیں کھول لیں تو ہر خواہش دل میں اپنے نام کا ایک خالی خانہ بنا لیتی ہے۔ کچھ لوگ ان خالی خانوں کی حقیقت جان کر نظر انداز کر دیتے ہیں تو کچھ ان خالی خانوں کو متبادل سے بھرنے کی کوشش کرتے ہیں اور تیسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جن کو اپنی ذات پر بے انتہا مان ہوتا ہے، اتنا کہ وہ کسی اور سے متاثر ہو جائیں، اس خیال کی تو ان کی سوچ تک رسائی بھی ممکن نہیں ہوتی۔ دوسروں کو مسحر کرتے کرتے ان میں غرور و تکبر کے مادے کی زیادتی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ صرف "میں" کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نزدیک ان کی ذات میں کبھی بھی کسی قسم کی کوئی خالی جگہ باقی نہیں ہوتی۔

وہ بھی ایک ایسا ہی شخص تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ ناقابل تسخیر ہے۔ اس کے اعصاب اتنے مضبوط تھے کہ ماں کے مرنے پر اس کی آنکھ سے ایک آنسو تک نہ نکلا تھا۔ وہ خود کو سب سے برتر سمجھتا تھا۔ کرب، درد، رنج اور ملال جیسے الفاظ جو دکھ جیسے جذبے کیلئے استعمال ہوتے تھے اس نے اپنی زندگی کی لغت سے نکال باہر کیے تھے۔ جوانی اس پر غضب کی آئی تھی۔ اس کی شخصیت میں سحر تھا، جو دیکھتا متاثر ہوئے بنا رہ نا سکتا تھا۔ اپنی شخصیت کا اس نے جی بھر کر فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ خود کو ایسی سرسبز و شاداب وادی سمجھتا تھا جہاں پورا سال بہار اودے، کاسنی، گلابی، پیلے، سرخ و سفید پھول لئے ہر طرف خوشبو بکھیرتی رہتی ہے۔ تعلیمی سفر کے دوران بہت سی رنگین تتلیاں اس کے آس پاس منڈلاتی رہیں اور اس نے ان پر اپنی خوبصورتی اور جوانی کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے، ایک ایک کر کے ان گنت تتلیوں کے رنگوں کی چمک ماند کی تھی، ان کے پروں کو پیروں تلے مسلا تھا۔ ہر نئے دن ایک جیسے رنگ ڈھنگ لیکن نئے نام کی تتلیوں سے کھیلتا اب وہ اکتا رہا تھا۔ یونہی ایک دن اس نے بہت سے چہروں کے درمیان اس کو دیکھا۔ گندمی رنگت، دلکش نقوش لیکن حسین
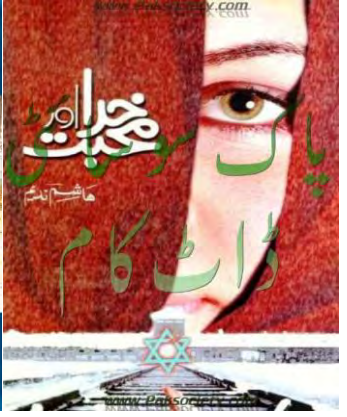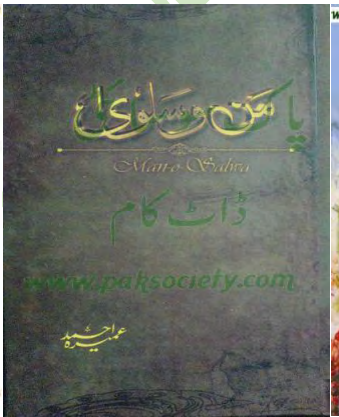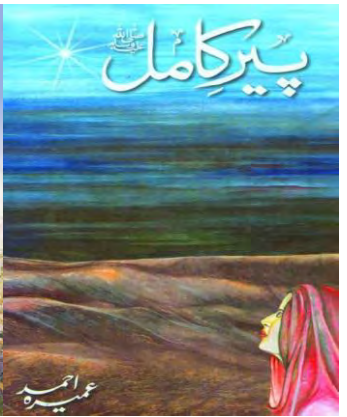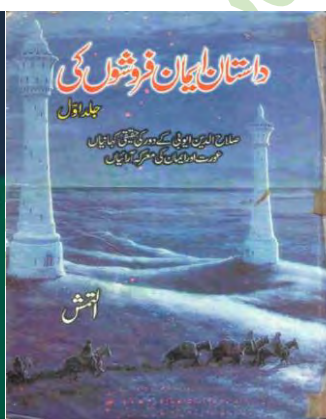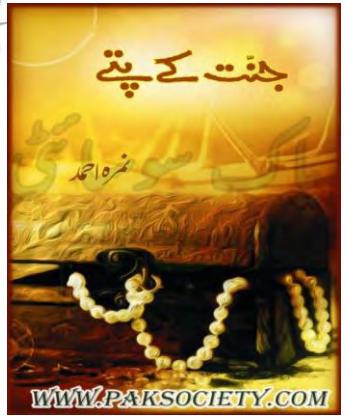
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

آنکھوں میں اس کے لئے نفرت ہلکورے مار رہی تھی۔ وہ حیران ہوا۔ ہاشم صغیر سے کوئی نفرت کرے یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔؟

انسان خواہشات کا پتلا ہے۔ یہ مل گیا اچھا ہے پر وہ۔۔!!!!وہ اس سے زیادہ خوبصورت۔

اور وہ والا۔۔!!!!!وہ تو دونوں سے زیادہ شاندار۔۔

جو مل جائے وہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو، سستا ہی ہے، اور جو نہ مل سکا وہ خواہ عام ہی ہو، اسے دسترس میں لانے کیلئے کوشش ضرور کی جاتی ہے۔۔ اور یہی اس کے ساتھ ہوا۔

ساحر سحر میں مبتلا ہو گیا، نا قابل تسخیر آخر تسخیر ہو گیا تھا۔۔ وہ بدل رہا تھا۔ مستی اور اداؤں والی اپسرائیں اب اس کو متاثر نہیں کرتی تھیں۔ اسے علم ہی نا ہوا وہ کب پھولوں، جگنوؤں اور موسم کی باتیں کرنے لگا۔۔ اس نے وہ سب کیا جس سے وہ اس ایک سلونی لڑکی کی آنکھوں میں اپنے لئے محبت دیکھ سکتا۔۔

قطرہ قطرہ پانی برستا رہے تو پتھر میں سوراخ ہو جاتا ہے یہاں تو جیتا جاگتا، سانس لیتا موم وجود تھا۔ پہلے شناسائی پھر دوستی اور دوستی بڑھتے بڑھتے قربت میں بدل گئی تھی۔ نفرت ایسے چھپ گئی جیسے کبھی ظاہر ہی نا ہوئی تھی۔

ذومعنی باتیں ہونے لگیں۔

ڈھکے چھپے الفاظ میں عہد و پیمان ہوتے رہتے۔

لب خاموش ہوتے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو ہوتی۔

کبھی جو غلطی سے ہاتھ سے ہاتھ ٹکرا جاتے تو ایک ثانیے کو دھڑکن رک سی جاتی۔۔ دل ایک نئی لے پر دھڑکنے لگا تھا۔

ساری رات سپنے بنتے گزر جاتی۔۔۔۔

لفظوں کا سہارا کون لیتا معنی خیز خاموشیاں اظہار کے لمحات پیدا کرتیں۔

☆......☆☆......☆

وہ جانتی تھی اس کا محبوب انا پرست تھا خود سے کبھی پہل نا کرے گا۔ گھر میں تعلیمی سفر کے اختتام کے بعد اس کی ڈولی اٹھانے کی باتیں ہونے لگیں تو اس نے اظہار کرنے کا سوچ لیا۔

"پڑھائی کے بعد کیا کرو گے۔" اس نے بات کا آغاز کیا۔

"مجھے کیا کرنا ہے ابا کا جما جمایا کاروبار ہے سات نسلیں بھی گھر بیٹھے کھاتی رہیں تو کم نہیں ہونے والا۔" ایک ہاتھ ذرا اوپر کر کے اس نے درخت کے چند پتے توڑے اور ان کو توڑ توڑ کر پھینکنے لگا۔

"اور شادی کے بارے میں کیا سوچا؟ کب کرنی ہے؟" آج پہلی بار اس موضوع پر بات ہونے لگی تھی۔ نینوں میں جذبات کا گہرا سمندر موجزن ہو گیا۔ دونوں چلتے چلتے پارک کی سنگی کرسیوں پر آبیٹھے تھے۔

"شادی میری ترجیح کبھی نہیں رہی۔ کچھ سال تو بالکل نہیں کرنی۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" وہ اس کی کہانیاں سناتی آنکھوں کو بغور دیکھتے بظاہر انجان بن کر پوچھ رہا تھا۔

"اس لئے میرے گھر والے میری شادی جلدی کرنا چاہ رہے ہیں۔" وہ ہولے سے بولی۔

"اچھا!!!! یہ تو خوشی کی بات ہے۔ ویسے تمہاری شادی کا میری شادی سے کیا تعلق؟" اس خوبصورت شخص کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تو گندمی رنگت والی لڑکی کے تمتماتے گالوں کی چمک اچانک ماند ہو گئی۔ مسکراتے لب ایک پل کو سکڑے اور پھر حیرانی سے کھل کر رہ گئے۔ آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ وہ محبت کے لبادے میں چھپے اس سارے کھیل کو سمجھ گئی تھی۔

سیاہ گھنی باڑ کے پیچھے ایک تارا ٹمٹمایا تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ لفظوں کی وادیوں کے سارے حرف بے معنی ہو گئے تھے۔ کہنے کو کچھ نا تھا۔ پھر کپکپاتے لب کھلے۔

"میری دعا ہے تمہارے دل کے خالی خانے میں صرف میرا نام گونجتا رہے۔"

"ہاہاہاہا۔۔!! میرے دل میں بھی کوئی خالی خانہ نہیں ہوسکتا۔۔ میں ہاشم صغیر احمد ہوں ناقابل تسخیر۔۔"دل خالی وہاں ہوتے ہیں جہاں کسی کی کمی ہو۔۔ میں مکمل ہوں۔۔ سو فیصد مکمل۔۔"

کسی انہونی کے انتظار میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ سانولی سلونی لڑکی اب اپنا ضبط کھو رہی تھی۔

ٹمٹماتا تارا باڑ کی قید سے آزاد ہوکر ٹوٹ کر گرا تھا اور اسکے بعد ایک ایک کر کے سیکڑوں ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہے۔ وہ فاتحانہ انداز میں اس کو ہارتا دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

طوفان تھما تو وہ چلی گئی تھی کبھی نا واپس آنے کیلیے۔

محبت کے رنگ برنگے دھاگوں نے اس کو اپنے جال میں بری طرح جکڑ لیا تھا۔ اس کا خالص وجود اتنا بڑا دھوکا برداشت نا کر سکا اسی رات اس نے آخری ہچکی لی وہ کہانی میں امر ہوگئی۔

☆......☆☆......☆

اس کا پور پور دکھ رہا تھا۔

کسی پرانے کپڑے کی طرح بظاہر وہ مضبوط نظر آرہا تھا لیکن اندر سے ایک ایک ریشہ دھجیوں کی طرح چبھ رہا تھا۔

زہریلی یادوں کی پٹاری کسی ناگ کی مانند اسے سالوں سے ڈس رہی تھی۔

آج تو تکلیف اور بھی زیادہ تھی آج سے کئی سال پہلے اسی دن کسی نے اسے اس کے دل کے خالی خانے پر اپنا نام گونجنے کی بد دعا دی تھی۔

وہ ماضی میں لوگوں کے دل میں بنائے اپنے نام کے خانے گن رہا تھا جن کو بنا کر وہ بھول گیا تھا۔۔

ماں، نازلین۔۔ثمینہ۔۔ اس سے پہلے نگین اور عاشی۔

اور پھر اپنے دل کے خالی خانے دیکھتا ہر خانہ اپنے نام کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے اپنے اندر جھانکا چھوٹے چھوٹے دانوں سے بھرے خانوں میں ایسی تکلیف تھی جیسے سیکڑوں سوئیاں چبھ رہی ہوں۔

جملہ پھر سے گونجا تھا۔

وہ اپنا ہاتھ زور سے سینے پر مسلنے لگا جہاں موجود خالی خانے اس کے وجود کو سناٹوں سے بھر رہے تھے۔

......☆☆......

بے وفا

فرح بھٹو

میں قلم کو اپنے ہونٹوں میں دبائے، کورے کاغذ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ ذہن خالی خالی سا محسوس ہو رہا تھا۔ اوائل مارچ کے دن تھے۔ شام کی ٹھنڈی ہوائیں میرے کھلے بالوں کو بکھیر رہی تھیں اور میں ان کی اٹھکیلیوں سے پریشان ہو کر اپنے چہرے پر آتے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے ہٹا رہی تھی۔

سارے گھر میں کچھ سکون والی جگہ گھر کی چھت تھی، سو میں روز شام کو یہاں آکر اپنے لکھنے لکھانے کا شوق پورا کیا کرتی تھی۔

میں کوئی بڑی لکھاری نہیں۔ بس اردو ادب سے بے انتہا لگاؤ میرے قلم اٹھانے کا سبب بنا، چونکہ ذہنی رجحان جس طرف ہو انسان اسی جانب مائل ہو جاتا ہے۔ سوشل میڈیا پر بھی میں نے کئی ادبی گروپس ڈھونڈ نکالے۔ جہاں آئے دن افسانہ نویسی کے مقابلہ جات کروائے جاتے تا کہ مجھ جیسے نوآموز لکھاریوں کو سیکھنے کا موقع ملے اور قلم کو جلا بھی۔

فیس بک کے ایک گروپ میں ان دنوں ایک ایونٹ ہو رہا تھا جس کے لئے مجھے مائیکرو فکشن لکھنا تھا۔

میں نے مائیکرو فکشن پر ابھی تک قلم نہیں اٹھایا تھا، اسی لئے کچھ الجھن کا شکار تھی۔ ایسا افسانہ جو مختصر پر اثر اور آخر میں کچھ چونکانے والا ہو۔

میں نے مائیکرو فکشن کے لوازمات زیر لب دہرائے۔

ابھی میں اسی طرح ادھیڑ بن کا شکار تھی کہ چھت پر ہماری ملازمہ خیراں دھلے کپڑوں سے بھری بالٹی اٹھائے چلی آئی۔ میں بے خیالی میں دیکھنے لگی، وہ ایک ایک کر کے جب سب کپڑے بالٹی سے نکال کر الگنی پر سکھانے کے لئے ڈال چکی تو مجھے محویت سے اپنی طرف دیکھتے پا کر قریب چلی آئی۔

''باجی کوئی کہانی لکھ رہی ہو؟''

ہمیشہ کی طرح اس کے لہجے میں اشتیاق جھلک رہا تھا۔ میرے معمول سے وہ واقف تھی۔

''ہاں خیراں، اب مجھے تنگ مت کرو۔ ویسے بھی میں یکسوئی سے لکھنا چاہتی ہوں۔''

میرے انداز سے بیزاری ظاہر تھی پر وہ باز نہ آئی اور میرے سامنے ہی زمین پر اکڑوں بیٹھ گئی۔

''باجی، میری زندگی پر بھی کہانی لکھونا۔''

وہ حسب توقع فرمائشی انداز سے بولی تو مجھے کوفت ہوئی۔

''خیراں مجھے نہیں لکھنا تمہاری زندگی پر کچھ!'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''کیوں جی؟'' اس نے بھی ترنت پوچھا۔

''ایسا کیا نیا ہے تمہاری زندگی میں؟ وہی روایتی سیدھی سپاٹ زندگی جو تم جیسی ملازم پیشہ عورتوں کی ہوتی ہے نشئی شوہر چھ سات بچے، سارے کنبے کا بوجھ تمہارے سر پر اور جو تم کماتی ہو وہ پیسے تمہارا میاں مار پیٹ کر کے تم سے چھین لیتا ہے۔

میں نے کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتے بیزاری سے کہا تو اس کا منہ اتر گیا۔

''اس کے علاوہ بھی کئی باتیں ہیں!'' وہ ٹھنک کر بولی۔

''خیراں میری بات سنو۔ مجھے سیدھی سادی کہانی نہیں لکھنی۔ مجھے کچھ ایسا لکھنا ہے جو کچھ چونکانے والا ہو۔'' میں نے رسانیت سے اسے سمجھایا۔

''ہاں تو میری زندگی میں ہے نا بہت کچھ چونکانے والا۔'' خیراں ایکدم پر جوش ہوئی۔

''کیا ہے؟'' میں نے لمبی سانس کھینچ کر اسے کوفت سے دیکھا۔

''میرا گھر والا صرف نشہ نہیں کرتا۔ عورتوں کے ساتھ بھی تعلقات رکھتا ہے۔'' وہ تھوڑا قریب کھسک آئی اور اپنی طرف سے جیسے دھماکا کیا۔ میری ہنسی نکل گئی۔

''ایسے کنگلے کو عورتیں کہاں سے ملتی ہیں؟

''وہ بیڑیاں باندھتا ہے باجی ہر وقت نشہ تھوڑی کرتا ہے۔''

میری ہنسی سے خیراں بدمزہ ہوئی۔

'پھر سب کو اپنی حیثیت کے حساب سے عیاشی مل ہی جاتی ہے۔

اس نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ میں مسکراتی رہی۔

''گھر میں لے آتا ہے عورتیں اور...... ! ایکا یک خیراں کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

میری مسکراہٹ دم توڑ گئی۔

یہ مرد بھی نا۔۔۔۔ جاہل انسان بیوی در در جھاڑو پونچھا کر رہی ہے برتن کپڑے دھو کر پیسے گھر لا رہی ہے اور وہ بے غیرت!

میں جذباتی سی ہوگئی۔

بہر حال ہر جگہ یہی چل رہا ہے، مرد امیر ہو چاہے غریب بڑا ہی بے وفا ہوتا ہے۔

میری عورتوں والی رگ پھڑکی۔

''خیر یہ بھی عام سی بات ہے مطلب اس میں بھی چونکانے والا کوئی عنصر نہیں۔'' میں نے خیراں کو افسوس سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہے نا ایک چونکانے والی بات!'' خیراں مصر ہوئی۔
''کیا بات ہے چونکانے والی؟'' میں نا چاہتے ہوئے بھی غصہ ہوئی۔
''میرا انتقام باجی۔'' اس کی چھوٹی آنکھیں چمکنے لگیں تو میں چونک گئی۔
''کیسا انتقام؟''
''میرے گھر والے کی بے وفائی کا جی۔'' وہ میرے چونکنے کا مزہ لیتے بولی۔
''تم کیا کہنا چاہتی ہو خیراں؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔
''میرے چھ بچے جن کو وہ اپنا خون سمجھ کر اتراتا پھرتا ہے۔''
ان میں سے تین ہی بس اس کے ہیں اور باقی...
وہ بات ادھوری چھوڑ کر پراسراریت سے مسکرانے لگی تو میں گنگ سی رہ گئی۔

......☆☆......

سیاہ چہرہ

معصومہ ارشاد نقوی

اس کی سیاہ رنگت سے آئمہ کو ہمیشہ سے ہی چڑ تھی۔ اوپر سے جب وہ گھر سے نکلتی تو ایک بڑی سی چادر میں خود کو ڈھانپ لیا کرتی تھی جو کہ آئمہ کو اور بھی عجیب لگتا تھا
"ایسی صورت پر نقاب کا فائدہ ہی کیا ہے جس پر اول تو کسی کی نظر پڑے گی نہیں اگر مانو غلطی سے کسی نے دیکھ بھی لیا تو سوائے لاحول ولاقوۃ پڑھنے کے اور کچھ کہے گا بھی نہیں" وہ اکثر اس کے ساتھ چلتے ہوئے ایسے ہی الفاظ سے اس کو احساس محرومی میں مبتلا کرنے کی ناکام سی کوشش کیا کرتی تھی مگر ان چمکتی آنکھوں میں کبھی ناشکری کی نمی نہیں لا پائی تھی۔ وہ ہر بار مسکرا کر بس اتنا ہی کہتی تھی۔
"آئمہ مجھے میرے رنگ و روپ سے کوئی شرمندگی نہیں کیونکہ یہ میرے رب نے میرے لیے چنا ہے۔ اس لیے مجھے میری خوبصورتی میں کوئی کمی نظر نہیں آتی اور دیکھ لینا ایک دن تم کو بھی وہ حسن ضرور نظر آئے گا۔" اس نے جو دعویٰ کیا تھا وہ آج بالکل سچ ثابت ہوا تھا۔ آج ہر زباں پر اس کی ہی تعریف تھی کوئی کہہ رہی تھی کہ
"واہ! کیا نور آیا ہے چہرے پر۔" تو ساتھ میں بیٹھی ایک اور عورت اس کو کہتی
"آتا بھی کیوں نہیں اللہ اپنے پیار کرنے والوں پر اپنے نور کی بارش اسی طرح سے ہی کیا کرتا ہے۔"
کچھ تو اس کی پوری زندگی کی کمائی کا صلہ بتا رہی تھی اس نور کو
"اللہ کے ان خاص بندوں میں سے تھی مرحومہ، جو صبر و شکر کا دامن ہاتھ میں تھامے عبادت کا عروج پا لیتے ہیں"۔ آج پہلی بار اس کا چہرہ سیاہ چادر سے عاری تھا اور آج ہی اس کے سیاہ چہرے پر بے انتہا نور چھایا تھا۔ بلاشبہ آج وہ کسی اپسرا سے کم نہیں لگ رہی۔ آج تو کفن کی سفیدی بھی اس کے حسن کے آگے ماند پڑ گئی تھی۔ سفید کفن میں لپٹے اس سیاہ وجود میں آج آئمہ کو وہ خوبصورتی نظر آ گئی تھی جس کا دعویٰ اس نے اپنی زندگی میں کیا تھا۔

......☆☆......

میری چاہت گلابوں سی

شہباز اکبر الفت

کچھ رشتے، ناتے، نام کے، حوالوں کے محتاج نہیں ہوتے، احساس کی ڈور انہیں اس قدر مضبوطی سے باندھ دیتی ہے کہ الگ ہونے اور دور چلے جانے کا تصور بھی محال ہو جاتا ہے

میرا اور شازیہ کا تعلق بھی کچھ ایسا ہی تھا، ہمارے درمیان نہ دوستی تھی نہ دشمنی، نہ محبت اور نہ ہی نفرت، ہوزری کی ایک فیکٹری میں ہم صبح ملے، اجنبیت کی دیوار دوپہر کے وقت اس لمحہ ڈھے گئی جب اس نے ٹفن کھولا، انڈا پراٹھے کی اشتہا انگیز خوشبو جونہی میرے نتھنوں سے ٹکرائی، میں نے پلٹ کر دیکھا اور اس نے مسکرا کر جھٹ کھانا میرے آگے رکھ دیا، یہ اس غیر محسوس تعلق کی ابتداء تھی جس نے آگے چل کر محبت جتنی وسعت اختیار کر لی، ایک بڑی سی میز پر، ایک ساتھ کھڑے ہو کر کام کرتے ہوئے شاید دل بھی ایک ساتھ دھڑکتے تھے، کم از کم میرا تو یہی حال تھا، خاص طور پر جب وہ زندگی سے بھرپور قہقہہ لگاتی تھی اور میرا دل اس کے عارض پر پڑنے والے گڑھوں میں ڈوب ڈوب سا جاتا تھا۔

محبت کی کہانی کہیں بھی، کہیں سے بھی شروع ہو سکتی ہے، کسی گھر، دفتر، فیکٹری، پارک، اسکول، اسٹاپ حتیٰ کہ کوئی عام سافٹ پاتھ بھی کسی پیار کرنے والے کے لئے وصل کا مقام بن سکتا ہے

محبت کبھی بھی، کسی سے بھی ہو سکتی ہے، یہ مال و دولت، جاہ و حشمت، رنگ، نسل، مذہب اور قوم نہیں دیکھتی، دل تو کسی مہندی والے ہاتھوں سے بنے پراٹھے، گرما گرم چائے، تلسی سپاری اور کوکو موکے ایک پیکٹ پر بھی ہار سکتا ہے

محبت انسانی خمیر میں شامل، خیر سے گندھا ہوا، وہ انمول جذبہ ہے جو دل کی دھڑکن اور سانس کی ڈور سے کسی اٹوٹ اور دائمی رشتے کی طرح جڑا ہوا ہے، یہ امجد جاوید کے بے رنگ پیا، محمود ظفر اقبال ہاشمی کے سفید گلاب اور سباس گل کے لفظوں میں تو دل کا سجدہ ہے، قوس و قزاح کے سارے رنگ اس کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں، اس کی خوشبو سے روح معطر جبکہ اس پر ایقان بندے کو رب کے قریب لے جاتا ہے یہ تو ایک بے موسمی پھل ہے جو پت جڑ، ساون، بسنت اور بہار کے سارے ذائقے اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، یہ تو وہم و گماں، زباں و بیاں اور زمان و مکاں کی قید سے آزاد، خلائے بسیط کی وسعتوں تک میں پھیلی ایک لامحدود نعمت ہے جو ازل سے ابد تک ہمیشہ موجود رہنے کے لئے بچھا دی گئی ہے

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہی نہیں کہ محبت دراصل ہے کیا؟ یہ کس طرح دل پر وار کرتی اور کتنے رنگ بدلتی ہے؟

محبت... وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر ٹھنڈی آہیں بھرنے، غمگین گانے سننے، المیہ شاعری، ناول اور افسانے پڑھنے کا ہی نام نہیں ہے، یہ کوئی کھلونا بھی نہیں ہے کہ پسند آنے پر اسے پانے کے لئے دل بچوں کی طرح مچل جائے

محبت ہونا بھی ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا، یہ تو ایک عطا ہے، گوہر نایاب ہے جو صرف نصیب والوں کو ہی ملتا ہے

محبت تو بابا بلھے شاہؒ، وارث شاہؒ، سچل سرمستؒ، رحمان باباؒ کے صوفیانہ کلام، شاہ حسینؒ کی کافیوں میں ملتی ہے جنہیں سن کر ہاتھ پاؤں اور دل و دماغ وجد میں آ جائیں

محبت تو شاید ہما نامی پرندے جیسی ہوتی ہے جس کے سر پر سوار ہو جائے اسے بادشاہ بنا دے، یا پھر پارس پتھر کی طرح جو لوہے کو چھو کر بھی سونا بنا دے

محبت کے لئے صرف ایک چیز ضروری ہوتی ہے اور وہ ہے ایک پیار بھرا دل، دل جو میں پہلی ہی نظر میں اس کے آگے ہار بیٹھا تھا

اسے پھولوں سے پیار تھا اور گلابوں سے عشق، گلاب کی اقسام اور خواص کے بارے میں اس کی معلومات بھی خاصی حیرت انگیز تھی، خاص طور پر میرے لئے، وہ باتونی اس قدر روانی سے بولتی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس کی ہر بات کا یقین کرنا پڑ جاتا

☆☆......☆☆

فیکٹری کے سبزہ زار میں فوارے کے پاس، پھولوں کی وہ باڑھ پہلی بار اسی نے مجھے دکھائی تھی جس میں نیلے، پیلے، سرخ، گلابی اور سفید رنگ کے مہکتے ہوئے گلاب کے پھول دل و دماغ کو معطر کر دیتے تھے، گلابوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ بہت پر جوش ہو جایا کرتی تھی، اس کا چہرہ کھل کھل سا جاتا اور وہ دور کہیں آسمان کی وسعتوں میں کھو جاتی، ایسے وقت میں اس کے گلاب چہرے کو تکتے رہنا میری سب سے بڑی خوشی ہوتی تھی

''سرخ رنگ کا گلاب محبت کی علامت ہوتا ہے'' اس نے گویا انکشاف کیا۔

''اچھا! اور یہ گلابی رنگ کا؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا
''گلابی رنگ کا گلاب دوستی کا اظہار کرنے کے لئے دیا جاتا ہے'' اس نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔
''اور نیلا گلاب؟'' اب کی بار میری نظر ایک مہکتے ہوئے نیلے گلاب پر پڑی تھی۔
''نیلے گلاب کا تو مجھے نہیں پتہ۔'' اس نے کندھے اچکائے
''اور سفید گلاب؟'' ابر کی طرح اجلے اور شفاف سفید گلاب پر میری نظر جم کر رہ گئی۔
''سفید گلاب اپنے نام اور رنگت کی طرح تقدس اور پاکیزگی کی علامت ہوتا ہے'' اس نے کہتے ہوئے بڑے احترام سے سفید گلاب کا پھول توڑا اور چوم کر بالوں میں سجالیا۔
ایک دن میں نے پیلے گلاب کی خاصیت پوچھی تو وہ ہونٹ سکیڑ کر بے پروائی سے بولی۔
''پیلا گلاب نفرت کی علامت ہوتا ہے''
''ہائیں! بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی پھول نفرت کی علامت ہو اور وہ بھی گلاب کا؟'' میں نے احتجاج کیا۔
پتہ نہیں، میں نے تو یہی سنا ہے'' اس نے ٹالنا چاہا
''غلط، کس سے سنا، بتاؤ۔'' میں نے پہلی بار کھلم کھلا اختلاف کیا، میرے دل کو ٹھیس پہنچی تھی، باقاعدہ بحث پر اتر آیا
''چھوڑو بھی، اگر یہ پھول تمہیں یہ محبت کی علامت لگتا ہے تو تم اپنی محبوبہ کو پیلا گلاب دے کر اپنے پیار کا اظہار کر دینا'' اس نے ہنس کر اپنی طرف سے بات ہی ختم کر دی

☆☆......☆☆

اس گلابوں جیسی لڑکی کیلئے محبت کا شگوفہ کب کھل کر مہکتا ہوا گلاب بنا، مجھے پتہ ہی نہیں چلا، اس کی خوشبو نے تن اور من کو مہکا سا دیا تھا، اس کے سوا کچھ نظر بھی نہیں آتا تھا، ہر طرف گلاب کی کیاریوں کے خوش رنگ منظر، فضا میں رچی خوشبو اور موسیقی کی مدھر تان سے زندگی بہت خوب صورت لگنے لگی تھی، کئی بار سوچا، ایک قدم آگے بڑھوں، گھٹنا ٹیکوں، سر جھکاؤں اور ایک سرخ گلاب آگے بڑھا کر چاہت کا اظہار کر دوں، عقل کہتی تھی کہ یہ ممکنات میں سے ہے مگر ایک عاشق صادق کے لئے یہ مرحلہ بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا، میں اتنی ہمت کہاں سے لاتا؟ کھو دینے کا ڈر ہمیشہ پا لینے کے جذبے پر حاوی ہو جاتا تھا
وسط اپریل کی ایک چمکیلی صبح، کیاری کے پاس سے گزرتے ہوئے سرخ گلاب کو دیکھ کر میں ایک لمحہ کے لئے رک گیا، امید و بیم کی ایک ملی جلی کیفیت کے ساتھ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے توڑا اور کچھ کہے بغیر اس کی طرف بڑھا دیا، اس کا ردعمل خاصا سخت اور قدرے غیر متوقع تھا۔
''یہ کیا ہے؟''
''گلاب کا پھول۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔
''مجھے کیوں دے رہے ہو۔'' اس نے سرد لہجے میں پوچھا
''تمہیں پسند ہے نا۔'' میں ہڑبڑا سا گیا۔
''تو؟'' اس نے گھورا۔
اس کی آنکھوں کی تو ویسے ہی تاب نہیں لا پاتا تھا، جواب دینے کی بجائے خاموشی سے سر جھکا لیا۔
''سرخ گلاب دینے کا مطلب سمجھتے ہو؟'' اس کا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔
''جی۔'' میں نے جی کڑا کر کے کہہ دیا، کچھ لمحے کے لئے ہر طرف سکوت طاری ہو گیا۔
''تو پھر؟'' اب کی بار اس کا لہجہ تھوڑا نرم پڑ گیا۔
''پھر یہ کہ تم سے پیار کرنے لگا ہوں اور اپنا بنانا چاہتا ہوں۔'' اب اظہار میں تاخیر کا کوئی مطلب نہیں تھا۔
''رک جاؤ ایاز، ایسا مت کرو، میں نے تمہارے بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچا۔'' میرے دوٹوک اظہار پر اس نے احتجاج کیا

''بات اب سوچنے سمجھنے کی حد سے آگے نکل گئی ہے شازی، یقین کرو اگر تم نہ ملی تو مر جاؤں گا۔'' آنسو بے اختیار ہی بہنے لگے تھے۔

''شٹ اپ۔۔کوئی کسی کے لئے نہیں مرتا، آئندہ میرے ساتھ اس موضوع پر بات مت کرنا، سمجھے؟'' وہ چلائی اور پاؤں پٹخ کر آگے بڑھ گئی

☆☆......☆☆

قربتیں بڑھنے سے فاصلوں کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں، میرے ساتھ بھی یہی ہوا، کچھ دیر بعد ہم پھر ایک ساتھ کھڑے کام کر رہے تھے لیکن اب ہمارے درمیان گویا صدیوں کا فاصلہ پیدا ہو گیا تھا، ماحول پر خاموشی کی ایک گہری چادر تن گئی تھی، سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس سے اتنے سخت رویہ کی توقع نہیں تھی، کسی سے پیار کرنا اور اس کا اظہار کر دینا کوئی اتنا بڑا جرم بھی نہیں تھا، دن رات تڑپتا رہا، چپ چاپ آنسو بہاتا رہا، کئی بار بلیڈ سے کلائی پر اس کا نام بھی چھیدا، دسمبر کی کہر آلود راتوں میں شرٹ اتار کر گھاس پر لیٹ جانا اور سگریٹ پھونکتے رہنا عادت سی بن گئی تھی، حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس دن کے بعد گلاب کی وہ کیاری میرا تو مستقل ٹھکانہ بن گئی تھی مگر اسے دوبارہ وہاں کبھی نہیں دیکھا، شاید میری وہاں موجودگی کے پیش نظر ہی اس نے وہاں آنا چھوڑ دیا تھا۔

''یہ بہت غلط بات ہے ایاز۔'' ایک دن اس کی بڑی بہن نے میرا راستہ روک لیا۔

''کیا آپی؟''

''یہی تمہارے اور شازیہ کے درمیان بے رخی والا معاملہ، ایک جگہ، ایک ساتھ کام کرنا ہے تو پھر یہ رویہ نہیں چلے گا۔'' انہوں نے بڑے پیار سے سمجھایا۔

''آپی، وہ خود ہی اب بات نہیں کرتی، میں کیا کروں؟'' میں نے مریل سے لہجے میں کہا۔

''تم بات کر کے تو دیکھو، اگر اسے کسی بات پر غصہ آیا ہو گا تو اب تک ختم ہو گیا ہو گا، وہ زیادہ دیر دل میں بات رکھنے والی نہیں ہے۔'' آپی نے یقین دلایا تو میرے مردہ وجود میں جیسے نئی جان پڑ گئی ہو، اسے گلاب پسند تھے، اسے گلاب دے کر ہی منایا جا سکتا تھا، میں دوڑ کر کیاری سے گلاب کا پھول توڑ لیا لیکن اب کی بار اس کا رنگ گلابی تھا، دوستی کے اظہار کی علامت، کم از کم دوستی پر تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے حسب سابق بے اعتنائی سے پوچھا۔

''گلاب کا پھول۔'' میں نے چہک کر کہا۔

''مجھے کیوں دے رہے ہو۔'' اس کا لہجہ بدستور سرد تھا۔

''تمہیں پسند ہے نا۔'' میں ایک بار پھر ہڑ بڑا سا گیا۔

''تو؟'' اس نے ایک بار پھر مجھے گھورا۔

اف، اس کی آنکھیں، تاب کہاں سے لاتا؟

''گلابی رنگ کے گلاب دینے کا مطلب سمجھتے ہو؟'' اس کا لہجہ مزید سخت ہو گیا

''جی، یہ رنگ دوستی کی علامت ہے، دوستی کے اظہار کے لئے دیا جاتا ہے، ہم دوست تو بن سکتے ہیں نا؟ میرے ملتجیانہ لہجے پر اس نے گہری سانس لی اور بڑے تحمل سے بولی

''اگر تم پہلے یہ گلاب دے دیتے تو شاید سوچتی لیکن اب نہیں، تم میرے نزدیک دوست ہوتے لیکن تم دوستی کا مطلب محبت ہی سمجھتے رہو گے لہٰذا میں یہ قبول نہیں کر سکتی۔'' اس نے میرا گلابی گلاب حتمی طور پر واپس میری طرف سرکا دیا۔

اس کے بغیر میرا گزارا بھی نہیں تھا اور بات کئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا، زندہ رہنے کے لئے کچھ تو کرنا تھا، اگلی صبح میں اس کے لئے نیلا گلاب توڑ کر لے گیا، اس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے میرے سر پر سینگ اگ آئے ہوں۔

''اب یہ کیا ہے یار؟'' بہت دنوں بعد میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی
''یہ نیلا گلاب ہے اور اس کا مطلب مجھے بھی نہیں پتہ، لہٰذا کچھ سوچے سمجھے بغیر قبول کرلو، اس کا مطلب سردست یہی سمجھ لو کہ اب ہمارے ہمارے درمیان کچھ نہیں'' میں نے خوش دلی سے نیلا گلاب اس کی طرف بڑھایا۔
''ڈرامے بند کرو اور سیدھی طرح کام پر لگ جاؤ'' وہ بے ساختہ ہنسنے لگی لیکن اس نے گلاب کا پھول نہ پکڑا۔
''او کے لیکن یہ پھول۔''
''میں یہ بھی نہیں لے سکتی ایاز، تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟'' وہ زچ سی ہوگئی
''مجھے آج کھل کر سمجھا ہی دو کہ تم مجھے کیا سمجھانا چاہتی ہو؟'' میں نے سنجیدہ ہوئے بغیر اپنے دل کی بات کہہ دی۔
''میں جانتی ہوں کہ تم مجھے بہت پیار کرتے ہو اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہاری چاہت بالکل گلابوں جیسی ہے، سچی، خالص اور معطر لیکن میں اسے قبول نہیں کرسکتی، میں نے واقعی تمہارے بارے میں کبھی ایسا نہیں سوچا، تم یہ سوچ کر مجھے بھول جاؤ کہ میں تمہارے پیار کے قابل ہی نہیں۔'' اس کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی اتر آئی تھی۔
''آخر ایسا کیوں؟'' اب احتجاج کی باری میری تھی۔
''مجھے نہیں پتہ کہ ایسا کیوں ہے؟ بس ایسا ہی ہے، دیکھو، محبت کوئی زبردستی کا سودا نہیں ہے، یہ دل کی باتیں ہیں، دل کب کس پر آجائے، کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن مجھے افسوس ہے کہ وہ تم نہیں ہو۔'' اس نے صاف صاف کہہ دیا۔

☆☆......☆☆

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا، کامران کسی طوفان کی طرح اس کی زندگی میں آ گیا، سٹیچنگ ڈیپارٹمنٹ کا پیٹرن ماسٹر، مردانہ وجاہت کا نمونہ، خوش شکل، خوش لباس اور لچھے دار گفتگو کا ماہر پہلے دوستی اور پھر محبت، تھوڑے دنوں میں ان دونوں کی محبت کی داستانیں پوری فیکٹری میں گونجنے لگیں، میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، کانوں سے سن رہا تھا لیکن شاید پتھر کا ہوگیا تھا، بظاہر میں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا اور خلاف توقع اب کی بار اس کے ساتھ معمول کا رویہ برقرار رکھا، بظاہر ہر تعلق سے انکاری ہونے کے باوجود وہ اپنی ساری داستان عشق مجھے سناتی رہی اور میں نم حلق کے ساتھ سنتا رہا۔

کامران اب اس سے فیکٹری سے باہر اکیلے میں ملنے کی ضد کرنے لگا تھا، شازیہ کو اس کی نیت پر شبہ نہیں تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اپنی بڑی بہن کی موجودگی میں وہ اس کے ساتھ کہیں باہر نہیں جاسکتی تھی، دونوں بہنوں میں کامران کی وجہ سے کئی بار تلخ کلامی بھی ہو چکی تھی، پھر ایک دن اس کی بہن بخار کی وجہ سے فیکٹری نہ آسکی اور اسی شام چھٹی کے وقت کامران موٹر سائیکل لے کر آ گیا، شازیہ نے ایک نظر میری طرف دیکھا، میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے منع کیا لیکن خلاف توقع اس نے نظریں چرالیں اور دوسرے ہی لمحے وہ بائیک پر اس کے پیچھے بیٹھ چکی تھی

☆☆......☆☆

اگلی صبح میں فیکٹری صرف اپنا حساب لینے گیا، اب مجھے وہاں کام نہیں کرنا تھا، کئی دنوں سے مجھے وہاں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اپنی محبت کو کسی دوسرے کے ساتھ دیکھ کر برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا، میری بھی ہمت جواب دے گئی تھی، خاص طور پر کل والے واقعہ کے بعد، اکاؤنٹ سیکشن سے اپنے واجبات کی وصولی کے بعد سٹیچنگ ڈیپارٹمنٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے عقب سے کامران کے بے ساختہ قہقہے کی آواز سنی، وہ شاید اپنے دوستوں کو کل والے واقعہ کی تفصیلات بتا رہا تھا، اس کا قہقہہ کسی پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اتر گیا، گیٹ کے قریب اور گلابوں کی کیاری کے پاس، میں نے اس کا ہیولہ سا دیکھا، اس کی پشت دوسری طرف تھی، میرے قدم بے ساختہ اس کی طرف بڑھ گئے
''میں جا رہا ہوں، ہمیشہ کے لئے، تمہاری دنیا سے بہت دور'' میں نے دھیمے سے لہجے میں اطلاع دی
''مجھے چھوڑ کر؟'' سوال غیر متوقع تھا
''جی'' نہ چاہنے کے باوجود بھی میرا لہجہ سپاٹ ہوگیا۔

وہ آہستگی سے مڑی، گلابوں جیسی اس لڑکی کا بجھا ہوا چہرہ، متورم آنکھیں اور بکھرے ہوئے بال، لمحہ بھر میں ہی ساری کہانی سمجھا گئے

''آج کوئی گلاب نہیں دو گے؟''

''کیوں؟''

''نشانی کے طور پر، ہمیشہ سنبھال کر، اپنے دل سے لگا کر رکھوں گی''

''کون سا؟''

''کوئی سا بھی'' اس کے نم لہجے میں صدیوں کی تڑپ تھی اور ساتھ ہی اس کی نظریں پیلے گلاب پر جم گئیں جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ نفرت کی علامت ہے حالانکہ میرا آج بھی ایمان ہے کہ اللہ کا بنایا ہوا کوئی پھول نفرت کی علامت نہیں ہو سکتا

ہوس کو محبت کا نام دینے والے نہ صرف اللہ کے گناہ گار ہوتے ہیں بلکہ قانون، اخلاق، معاشرہ اور انسانیت کے بھی مجرم بن جاتے ہیں

وہ اپنی خوبیوں اور خامیوں سے قطع نظر میرا پیار تھی، میرا عشق صوفیانہ،، میری محبت سچی تھی، محبت ہمیشہ سچی، خالص اور پاک ہوتی ہے، میں نے کشکول کی طرح پھیلی اس کی دونوں ہتھیلیوں کے بیچ، تقدس اور پاکیزگی کی علامت ''سفید گلاب'' رکھ دیا۔

......☆☆......

غلطی محبت
مونا نقوی

سمجھایا تھا اسے جوان لڑکی کے ماتھے پہ اک دفعہ بدنامی کا ٹیکا لگ جائے تو مر کے بھی نہیں اترتا مگر مجال ہے جو اس نے بھی کان بھی دھرے ہوں۔ اتنے لاڈ پیار سے پالا اسے بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی پر اس پر سوتیلے باپ کا سایہ کرنا بھی گوارا نہ کیا میں نے بیس سال بیوگی کے شرافت اور عزت سے گزارے اپنے دامن پہ ایک بھی داغ نہیں لگنے دیا کیا خبر تھی یہ مورکھ اس عمر میں میرے سر میں راکھ ڈال دے گی۔ ماسی مجیداں زمین پہ بیٹھی بس بولے جا رہی تھی آنسو اس کے گالوں سے بہہ کے زمین پہ گرتے اور جذب ہوتے جا رہے تھے۔

''کسی کو منہ دکھانے کا نہیں چھوڑا اس نے۔'' زمانہ تھوں تھوں کرے گا میرے بڑھاپے اور اس کی جوانی پر۔'' ماسی مجیداں نے اب کے روتے ہوئے اپنی رانوں پہ دو ہتھڑ مارتے ہوئے کہا۔

''چپ کر جا ماسی مجیداں کیوں اس طرح شور مچا کے محلے والوں کو سناتی ہے گھر کی بات گھر کے اندر ہی رہنے دے۔'' میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''باجی عارفہ کب تک چھپی رہے گی اس کی کرتوت اک نہ اک دن سب جان ہی جائیں گے۔ ارے بے شرم بے حیا یہ سب کرنے سے پہلے موت کیوں نہ آ گئی تجھے۔'' ماسی مجیداں نے پاس پڑی چھڑی اُٹھائی اور بے اختیار چھانو کو مارنے لگی۔ ''بد بخت تو نے اک بار بھی اپنی بوڑھی ماں کے بارے میں نہ سوچا کہ کیا منہ دکھائے گی دنیا کو۔''

''چھوڑ دو اُسے ماسی ہوش کے ناخن لو کیوں دنیا کو خود پہ ہنسنے کا موقع دیتی ہو۔'' میں نے ماسی مجیداں کو چھانو سے دور ہٹاتے ہوئے کہا۔

''ہائے میری بُری قسمت جو اس منحوس کو جنا، کاش یہ پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتی یا میں نے اس کا گلا دبا دیا ہوتا۔ یہ دن دیکھنے سے پہلے خدا نے مجھے موت دے دی ہوتی۔'' ماسی مجیداں چھڑی اک طرف پھینک کر سر پکڑ کے زمین پہ بیٹھ کر روتے ہوئے بولی۔ چھانو کب سے بت بنی زمین پر بیٹھی تھی۔ اک زندہ لاش کی طرح، ایسے لگ رہا تھا کہ ماسی مجیداں

کے اس واویلے کا اُس پہ کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا اور ماسی کے چھتریاں برسانے پہ بھی اُس نے اف تک نہ کی تھی۔ وہ بس نظریں جھکائے زمین کو تکے جا رہی تھی وہ شرمندہ تھی یا ڈھیٹ بنی بیٹھی تھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''تُو ہی بتا باجی عارفہ کوئی مشورہ دے کیسے اِسے دنیا کے سامنے لے جاؤں کہ میرا دامن بھی داغدار نہ ہو۔''

ماسی نے ملتجیانہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تو تجھے یہی مشورہ دوں گی ماسی کہ جیسے بھی ہو جس سے بھی ہو جلد شادی کروا دے اِس کی۔ اپنے خاندن میں دیکھ، بہن بھائی یا کوئی رشتہ دار جو تجھے تجھے اِس بدنامی سے بچا سکے۔''

''ہونہہ بہن بھائی، رشتہ دار'' ماسی نے قدرے ناگواری سے کہا۔ ''مجھ بیوہ کو عرصہ ہوا وہ لوگ زندہ دفنا چکے۔ اب اُن کے سامنے جا کر ہاتھ پھیلاؤں کہ کوئی اپنے بیٹے کے لیے میری بدکردار بیٹی کا رشتہ لے لے۔'' ماسی نے حقارت آمیز نظروں سے چھانو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اِس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ماسی مجیداں۔

بس میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے اب۔ ماسی کچھ سوچتے ہوئے اُٹھی اور چھانو کا بازو پکڑ کر کھینچ کر اُٹھاتے ہوئے بولی۔ چل میرے ساتھ باجی شہناز کے کلینک پہ اُن سے سے کہتی ہوں یہ قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کر کر دیں۔''

''نہیں اماں تو جو سوچ رہی ہے میں ایسا کچھ نہیں چاہتی۔'' چھانو جو کب سے خاموش بیٹھی ماں کی جلی کٹی سن رہی تھی یہ بات سن کے اُسے جیسے کرنٹ سا لگا تھا اک جھٹکے سے اپنا بازو ماں کے ہاتھوں سے چھڑاتے ہوئے بولی۔

''یہ نہیں چاہتی جنم جلی تو کیا چاہتی ہے۔ کون اپنائے گا تجھے گناہ کی اس پوٹلی کے ساتھ۔''

وہی اپنائے گا اماں۔'' اتنا کہہ کے چھانو چپ ہوگئی۔

''اگر اُس نے ایسا نہ کیا تو۔'' ماسی مجیداں نے فکرمندی سے کہا۔

''اپنائے گا اماں اُس نے وعدہ کیا ہے مجھ سے۔'' چھانو نے آہستگی سے کہا۔ وہ اپنی خالہ سے بات کرنے گیا ہے آتے ہی میرا ہاتھ مانگے گا۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو بدبختے۔ ورنہ تیری ماں نہ جیون جوگی رہے گی نہ کسی کو منہ دکھانے جوگی۔''

''ماسی نہ خود بول نہ اِسے بُرا بھلا کہہ خاموش رہ کہہ جو رہی کہ وہ وعدہ کر کے گیا ہے۔''

''اللہ کرے وہ زبان کا پکا نکلے۔ باجی عارفہ میری عزت رکھنا کسی کو کچھ بتانا مت۔'' ماسی نے منت سماجت کرنے والے انداز میں کہا۔

''فکر نہ کر ماسی مجیداں یہ راز ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہے گا۔ انشاللہ خدا بہتر کرے گا۔''

میں ماسی مجیداں کو تسلی دیتی گھر آ گئی۔

ماسی مجیداں بہت محنتی عورت تھی شوہر کے مرنے کے بعد اُس نے کافی محنت سے اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ بھرا اور اُس کی ہر ضرورت پوری کی بھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ کبھی کسی کے گھر کا کام کاج کر دیا کبھی کسی کا اور لیتی بھی بس اپنی محنت کا جائز پیسہ تھا یہی وجہ تھی کے پورے گاؤں میں سب ماسی کی بہت عزت کرتے تھے اور اُس نے عزت ہی کمائی تھی عمر بھر مگر اُس کی بیٹی نے اُس کی عزت داؤ پہ لگا دی تھی۔ اگر وہ لڑکا چھانو کو اپنانے سے انکار کر گیا تو کیا بنے گا چھانو کا۔ کہیں ماسی مجیداں نے خود کو یا چھانو کو کوئی نقصان پہنچا لیا تو۔ ماسی کے چہرے سے ٹپکتی بے بسی اور دکھ دل دُکھا رہا تھا۔

☆☆

کہاں چلا گیا تھا تو اکمل روز ہی آتی تھی ڈیرے پر اماں سے سو بہانے لگا کر اُسے میرا یوں گھر سے نکلنا اچھا نہیں لگتا۔ پھر بھی آتی رہی اک تُو ہے کہ نہ تیرا اتا تھا نہ پتا۔''

''ارے دم تو لے میری سوہنی کچھ مجھے بھی بولنے کا موقع دے۔''

''لے ہوگئی چپ بول کیا بولنا ہے تجھے؟'' چھانو نے خفگی سے کہا۔

ناراض تو مت ہو میری شہزادی۔ اکمل نے پیار سے چھانو کی ٹھوڑی سے پکڑ کر اُس کا چہرا اوپر کرتے ہوئے کہا۔ ”تو جانتی ہے اکواک خالہ ہے میری رشتے میں نہ کوئی ماما نہ چاچا۔ ماں باپ بچپن میں ہی مر گئے تھے خالہ نے ہی پال پوس کے بڑا کیا ہے۔ فون آیا تھا ربیعہ کا کہ خالہ بیمار ہے بہت یاد کرتی ہے مجھے۔ بس خالہ کے اصرار پہ رکنا پڑا چند دن وہاں۔“

”خالہ کے اصرار پر یا ربیعہ کے اصرار پر رکنا پڑا۔“ چھانو نے خفگی سے سر کو ہلکے سے جھٹکتے ہوئے کہا تو اکمل کی ہنسی چھوٹ گئی۔

اوئے نہ جل نہ جل میری ملکہ، ربیعہ ہو یا کوئی اور کوئی بھی تیری جگہ نہیں لے سکتا۔ میرے دل پر تو بس تُو ہی راج کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔“

”اگر خالہ نے بھی اصرار کیا قسمیں دیں کہ اُس نے تجھے پالا تو بدلے میں اُس کی کسی بیٹی سے شادی کر لے تو؟“

”مت لا ایسے بُرے خیال دل میں ایسا کچھ نہیں ہوگا ویسے بھی بتا چکا ہوں خالہ کو کہ مجھے کوئی اور پسند ہے۔“

”سچی تو نے بتا دیا خالہ کو میرا۔“ چھانو نے خوشی سے نہال ہوتے ہوئے پوچھا۔

سچی مچی......بس خوش رہا کر تُو۔ ارے اکمل دنیا سے بے وفائی کر سکتا ہے تجھ سے نہیں۔“

”جانتی ہوں اکمل تُو مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ تجھ پر تو اپنی سانسوں سے بھی زیادہ اعتبار ہے مجھے۔ بس جلدی سے آجا واپس۔ عزت سے لے جا اپنے ساتھ جس دن تُو آجائے گا اماں کی ناراضگی اور شکوہ بھی ختم ہو جائے گا۔“ وہ اپنی چارپائی پہ لیٹی مستقبل کے خوب صورت تانے بانے بُن رہی تھی اور خالہ مجیداں اپنی اکلوتی بیٹی کے مستقبل کو لے کے پریشان اور بے چین ہو کے تسبیح پڑھ رہی تھی۔

......☆☆......

اکمل، چوہدری سلطان کا ماما تھا۔ ساتھ والے گاؤں میں رہتا تھا یوں تو وہ روز بھی آجا سکتا تھا مگر چوہدری کے ڈھور ڈنگروں کی حفاظت اور اُنہیں چارہ پانی ڈالنے کے لیے رات دن ڈیرے پر ہی رہتا تھا ڈیرے کے ساتھ ہی بڑی نہر بہتی تھی جس پر اکثر گاؤں کی عورتیں کپڑے دھونے آتی تھیں۔ چھانو بھی اپنی سہلیوں کے ساتھ نہر پر کپڑے دھونے اور اپنی بکریوں کو پانی پلانے اور چرانے لاتی تھی۔ دو سال پہلے موسم گرما کے آغاز پر صبح ہی صبح چھانو اپنی سہلیوں کے ساتھ کپڑے دھونے آئی اکمل کی نظر جونہی چھانو کے بے داغ چمکدار چہرے پر پڑی تو وہیں دل ہار بیٹھا کتنی بار نہر سے پانی بھرنے کے بہانے گیا۔ مگر چھانو کے حسن کا رعب دیکھ کے اک لفظ بھی نہ بول پایا۔ چھانو بھی اِس بانکے سجیلے اجنبی لڑکے کو دیکھ کر دل دے بیٹھی تھی۔ کپڑے سکھانے اور اُتارنے تک وہ دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے پیام محبت پڑھ اور بھیج چکے تھے۔ دونوں کے درمیان خاموش محبت کا آغاز ہو چکا تھا۔ شاید یہ بھی محبت کا کوئی رنگ تھا جو خاموشی خاموشی میں ہی دونوں کو اک دوسرے کے رنگ میں رنگ گیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ دونوں کی ملاقاتیں ہونے اور بڑھنے لگیں یہاں تک کہ دونوں نے جیون بھر ساتھ نبھانے کا عہد کر لیا۔ عہد بھی ایسا کہ موت کے سوا کوئی دوسرا نہ توڑ سکے۔ انہوں نے کب یہ سوچا تھا کہ محبت کی دیوی یوں اچانک اُن پر مہربان ہو جائے گی۔ وقت گزرتا رہا دن مہینے اور موسم بدلتے رہے اور اُن کی محبت شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ اکمل نے اک دن اُسے بتایا کہ خالہ جلد اُس کے گھر آ کر اُس کی ماں سے میرے لیے رشتہ مانگنے گی۔ چھانو ہواؤں میں اڑنے لگی تھی جس کے ساتھ عمر بھر ساتھ نبھانے کا خواب دیکھا تھا جلد اُس خواب کو تعبیر ملنے والی تھی۔ پہلے وہ اکمل سے کچھ جھجکی اور لاج شرم کے پردے میں رہتے ہوئے ملتی تھی مگر جہاں یہ خوشخبری سنا کے اکمل کا رویہ اُس کے ساتھ بے باک ہوا تھا بلکہ چھانو بھی اب خود کو اُس کے سامنے بے بس اور کمزور بنا دیتی تھی۔ جس سے اکمل کو اور بھی شہ ملتی تھی۔ اُس کی کمزوری دکھانے کا انجام یہ ہوا کہ چھانو کے بدن میں اک ننھی جان پلنے لگی تھی جیسے ہی چھانو کو علم ہوا تو اُس نے اکمل کو بتایا اور جس دن سے بتایا تھا اُسی شام اکمل اپنی خالہ کو لانے کے بہانے اپنے گاؤں چلا گیا اور اب ایک ہفتہ ہو گیا تھا اُس کی کوئی خیر خبر نہ تھی۔ اُس کے دل میں ہول اُٹھنے لگے تھے مگر اگلے ہی لمحے اکمل کی بے تحاشہ محبت اور وعدے دل کو ڈھارس بندھا دیتے تھے۔

''کب آئے گا اکمل، بول کچھ اک ہفتہ ہونے کو آیا ہے۔'' ماسی مجیداں نے تھکے اور ہارے ہوئے انداز میں چھانو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''جلد آئے گا اماں میرا دل کہتا ہے۔''

پہلے بھی تیرے دل نے مجھ بڑھیا کو خوار کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر وہ نہ آیا تو میں جیتے جی مرجاؤں گی۔''

''خیر کا سوچ اماں، خیر ہی ہو گی ان شاء اللہ۔''

کاش تو اپنی منہ زور جوانی کے آگے بند باندھ لیتی تو نہ تجھے اُس کا انتظار کرنا پڑتا نہ مجھے یہ دن دیکھنا پڑتا۔''

''میں نے بہت غلط کیا ہے اماں جانتی ہوں۔'' چھانو نے شرمندہ سی نظریں زمین پر گاڑھ دیں۔ مگر اماں مجھے اکمل کی محبت پر اندھا یقین ہے۔ وہ زبان اور وعدوں کا پکا ہے۔ کوئی مجبوری ہی ہے جو نہیں آیا پر دل کہتا ہے جلد آئے گا۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو جیسا تو کہہ رہی ہے ورنہ زمانہ طعنے دے دے کے مار ڈالے گا جیتے جی ہمیں۔

☆☆

مجھے پتا تھا تو ضرور آئے گا اماں نے تو امید ہی چھوڑ دی تھی۔ وہ سمجھتی تھی تُو کبھی نہیں آئے گا۔ خالہ نہیں آئی تیری؟''

اکمل کو دیکھتے ہی چھانو کی جان میں جان آگئی تھی۔

''خالہ نہیں آئی بیمار ہے وہ۔ رضیہ نے پیغام دیا تھا تیرا کہ جب آؤں تجھے ملتے ہوئے جاؤں۔

''اگر رضیہ پیغام نہ دیتی تو کیا تو نہ آتا مجھ سے ملنے۔'' چھانو نے روہانسی ہو کے پوچھا۔

''سو کام ہوتے ہیں مجھے میں کوئی ویلا نہیں ہوتا جلدی بول کیا بات ہے۔'' وہ تیوری چڑھا کے بولا۔

''یہ تو کس لہجے میں بات کر رہا ہے جیسے چھانو کو جانتا ہی نہ ہو تُو۔''

ماسی مجیداں اکمل کو گھر داخل ہوتے دیکھ کر جلدی سے باجی عارفہ کو بلا لائی تھی۔ چھانو کے ساتھ غیروں جیسے بات کرتے دیکھ کر باجی عارفہ سے رہا نہ گیا تو بول پڑی۔

''تُو نے وعدہ کیا تھا خالہ کو ساتھ لائے گا چھانو کا ہاتھ مانگنے۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے میرا میں کیوں کہنے لگا ایسا۔ میرا تجھ سے کیا تعلق۔'' وہ غصہ سے بولا۔

''کوئی تعلق نہیں تو رضیہ کے کہنے پہ ملنے کیوں آ گیا؟ کیا میرے ساتھ گزارے وقت اور لمحوں کا انکار کر سکتا ہے تُو؟

''لگتا ہے ماسی مجیداں تیری بیٹی باؤلی ہو گئی ہے لے جا اسے کسی دماغ کے ڈاکٹر کے پاس۔ پتہ نہیں کیا چل رہا اس کے دماغ میں۔''

اکمل نے منہ پھیر کر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں انجان بن رہا ہے اکمل۔ کیا تُو نہیں جانتا کہ کیوں کہہ رہی ہوں مجھے اپنا لے۔'' چھانو کے آنسو اُس کے رخساروں پہ روانی سے بہہ نکلے تھے اور وہ سنگدل بنا کھڑا کہہ رہا تھا۔

نہیں آ رہا۔ سمجھ بن رہا ہوں انجان۔ کیونکہ میں نہیں جانتا کیا کہہ رہی ہے تُو۔

''میں تیرے.....'' چھانو کی نظریں شرمندگی سے جھک گئیں۔

''اوے دماغ تو نہیں چل گیا تیرا کس کے گناہ کی پوٹلی میرے سر منڈنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ارے تیرے ساتھ چند بار ہنس بول کیا لیا تُو سمجھی اُلو ہوں میں جو تُو کہے گی مان لوں گا۔ جا بی بی اِس بچے کے اصل وارث کو ڈھونڈھ۔''

''ایسے تو نہ بول اکمل کیوں جھوٹ بول رہا ہے رحم کھا مجھ پر میری حالت پر۔'' چھانو نے اکمل کے آگے جوڑ کر گڑ گڑاتے ہوئے کہا۔

''تیرے علاوہ قسم ہے جو کسی کو آنکھ اُٹھا کر دیکھا ہو یا کسی نے تیرے علاوہ چھوا ہو مجھے۔''

دیکھ چھانو میں ہاتھ جوڑتا ہوں تیرے آگے آگے مت لگا یہ الزام مجھ پہ۔ مجھ سے کیوں دشمنی نکال رہی ہے۔'' اکمل نے کمال ڈھٹائی سے چھانو کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہا۔

''دشمنی کیوں نکالوں گی اور کس بات کی؟''

''دیکھ میں جانتا ہوں تیرا شوکت کے ساتھ چکر تھا۔ ماسی اِسے کئی بار سمجھایا وہ اچھا لڑکا نہیں۔ نہ ملا کر اُس سے مگر نہیں میں نے دونوں کو دھمکی دی تھی کہ بتا دوں گا تمہارے گھر والوں کو۔ بس اب دونوں مل کے پھنسا رہے ہیں مجھے۔ چھانو کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ تُو نہیں اپنانا چاہتا نہ اپنا پر میری وفا پہ الزام تو نا لگا۔''

''دیکھ تُو رحم کر مجھ پہ تُو کہہ تو شوکت کو منا لوں تیرے لیے اکو اک سہارا ہوں اپنی خالہ اور اُس کی بیٹیوں کا۔ چوہدری نے سنا تو بوٹی بوٹی کر دے گا میری۔''

''لڑکی کا دماغ خراب جو تیرا نام لے رہی۔''

باجی عارفہ نے غصہ سے کہا۔

''دیکھ باجی عارفہ میری طرف سے یہ جائے بھاڑ میں۔ میرا اس سے کوئی واسطہ تعلق نہیں۔ خالہ کی بیٹی بچپن کی منگ تھی میری اب گیا ہوں تو اُس شادی کر کے آیا ہوں۔ ماسی کوئی بندوبست کر اِس کا یا جس کے ساتھ منہ کالا کیا اِس نے اُسے ڈھونڈھ کے اُس سے شادی کر دے اِس کی۔'' وہ لفظوں کے تیر و پتھر برساتا انجان بن کے نکل گیا۔ چھانو کے پیروں تلے سے زمین اور سر سے آسمان کھسک گیا تھا۔

اُس کے الفاظ تھے یا جلتے ہوئے انگارے اُسے اپنا رُواں رُواں جلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اماں اور باجی عارفہ سے نظر ملانے کی تاب نہ رہی تھی اُس میں وہ نظر جھکائے اندر چلی گئی وہ پھوٹ پھوٹ کے رونا چاہتی تھی مگر آنسو اُس کی آنکھوں میں منجمد ہو کے رہ گئے تھے۔

......☆☆......

''تو جانتی ہے چھانو میں تجھ سے کتنا پیار کرتا ہوں۔''

''ہاں جانتی ہوں اِس کھیت سے لے کر وہ جو آخری کھیت کا کنارا نظر آ رہا ہے اُس سے بھی زیادہ۔ بس ایسی ہی مثالیں دینا آتی ہیں تجھے۔''

''ارے میں ٹھہرا اَن پڑھ جاہل مجھے فلاسفروں والی باتیں نہیں آتیں۔'' اکمل نے معصومیت سے کہا۔

''فلاسفروں والی باتیں نہ کر پر مثال تو کوئی ڈھنگ کی دیا کر۔'' چھانو نے خفگی سے کہا۔

''جب تُو سامنے ہوتی ہے تو مجھ سے ڈھنگ کی بات کی ہی کب جاتی ہے۔ جو تھوڑی بہت عقل ہے وہ بھی تیرے اِس حسین روپ کو دیکھ کے کہیں گم ہو جاتی ہے۔''

''میرے روپ کا واقعی رعب ہے تجھ پر یا ایسے ہی باتیں بناتا ہے بس۔'' چھانو نے خوشی اور نہ یقین آنے والے ملے جلے تاثرات سے پوچھا۔

''قسمے تیری محبت اور تیرے حُسن کے رعب میں تو میرا پور پور ڈوبا ہوا۔ ہر وقت ڈرتا رہتا ہوں کہیں تجھے کھو نہ بیٹھوں۔ کوئی ایسی بات نہ کہہ دوں جو تجھے ناگوار گزرے اور تجھے مجھ سے دور کر دے۔''

''مت لایا کر ایسے وہم دل میں اکمل، چھانو تیری ہے اور تیری ہی رہے گی۔ مجھے یقین ہے تُو پوری دنیا کو دھوکا دے سکتا ہے پر کبھی مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ چھانو نے اکمل کے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''بس اپنا اعتبار یونہی قائم رکھنا مجھ پر میں تجھے کبھی شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔''

''کاش تُو میرا اعتبار یونہی قائم رکھتا اکمل۔ تو بھلے مجھے نہ اپناتا مگر میری محبت اور میری وفا پہ الزام لگا کے نہ جاتا۔ تُو تو جانتا تھا کہ جب سے تجھے دل دیا تجھے چاہا کسی اور کو آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھا۔ میں نے تو تجھ سے پہلے بھی کسی کو آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھا تھا۔ کاش تیرے جھوٹے پیار کا لبادہ پہلے ہی اتر جاتا میرے سامنے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا مجھے۔ یا شاید میری آنکھوں پہ پٹی بندھی تھی جو تیری جھوٹی محبت کے پیچھے چھپی تیری مکروہ شکل نہ پہچان پائی میں۔ تُو تو کہتا تھا میرے علاوہ کسی کو بیوی کے روپ میں دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا پھر خالہ کی بیٹی سے نکاح کیوں پڑھوا آیا۔ میرے ساتھ کیے سب وعدے کیوں توڑ ڈالے؟ تجھے میرے ہر سوال کا جواب دینا ہو گا اکمل۔ وہ کچھ سوچ کے اپنی چارپائی سے اُٹھی ماسی مجیداں نیند کی گولی کھا کے بے سدھ سو رہی تھی۔ وہ چپکے سے دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔

☆☆

سردیوں کا موسم تھا وہ ننگے پاؤں گاؤں کی گلیوں سے گزرتی چوہدری سلطان کے ڈیرے پر پہنچ گئی۔ یہ کوئی پہلی بار نہ تھی کہ وہ اِس وقت چوہدری کے ڈیرے پر آئی۔ اُس کی اور اکمل کی کئی ملاقاتوں کا گواہ تھا یہ ڈیرہ۔ شاید کوئی بھینس کھل گئی تھی تبھی اکمل جاگ رہا تھا۔ اندھیرے میں چھانو کے سیاہ ہیولے کو دیکھ کہ اُس نے پوچھا۔ ''کون ہے وہاں۔۔ لیکن وہ بنا جواب دیے بڑھتی گئی۔

جو کوئی ہے وہی رک جائے۔ رات اندھیری اور دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔

''ڈر نہیں اکمل میں ہوں چھانو۔''

''چھانو تُو۔ اس وقت کیا لینے آئی ہے۔ کوئی پرانی یاد تازہ کرنے آئی ہے۔'' پہلے تو وہ تھوڑا گھبرایا ہوا بولا پھر کمینگی سے پوچھنے لگا۔

''آج بس سب حساب چکانے آئی ہوں۔'' وہ زخمی شیرنی کی طرح اکمل پر جھپٹتے ہوئے بولی۔

''لگتا ہے تو پاگل ہو گئی ہے صدمے سے جو اِس حالت میں اتنی سردی میں گھر سے نکل آئی ہے۔ میری مان رحم کھا خود پر چلی جا واپس۔''

''اگر نہ جاؤں تو؟''

''تیری مرضی ہے میری طرف سے صبح تک رکی رہ۔ جیسے تیرے گھر تجھ سے کسی بھی رشتے سے مُکر گیا تھا کل صبح گاؤں والوں کے سامنے بھی مُکر جاؤں گا۔''

''کتنا آسان ہے نا تیرے لیے یوں ہر بات سے مُکر جانا بے غیرت انسان۔'' وہ غصہ سے بے قابو ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاہاہاہا۔۔ ترس آرہا ہے مجھے تجھ پہ اگر تو سمجھ رہی ہے کہ تُو آکے میری منت سماجت کرے گی اور میں تجھے اپنا لوں گا تو تُو بالکل غلط سمجھ رہی ہے۔ میں نے تو شادی کر لی اُس سے جسے بچپن سے چاہا ہے۔''

''میں نہ تو تیری منت سماجت کرنے آئی ہوں نہ ہی تجھ سے یہ منوانے کہ تیرا مجھ سے کیا رشتہ ہے۔''

''پھر کس لیے آئی ہے رنگین یادوں کو پھر سے تازہ کرنے۔'' وہ کمینگی سے بولا۔ ''تیرے ساتھ عمر بھر رشتہ نہیں رکھ سکتا کیونکہ تُو میرے لیے دل بہلانے والے کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی نہ پہلے نہ اب تجھے کبھی بھی شریک سفر کے طور پر دیکھا ہی نہیں میں نے۔ میں کھیلا اور جی بھر کے کھیلا تجھ سے جب دل بھر گیا تو پھینک دیا تجھے اور پھینکی ہوئی چیز کون دوبارہ استعمال کرتا ہے۔''

''تو کیا تُو نے کبھی بھی مجھ سے پیار نہیں کیا؟''

نہیں کبھی بھی نہیں کیا نہ اُس وقت جب تجھے پہلی بار دیکھا تھا نہ تب کیا جب تیرے اتنے قریب آگیا تھا اور اس حالت میں تو کبھی کر ہی نہیں سکتا۔

''بکواس بند کر بے غیرت۔ اندھیرے میں نجانے کیسے اور کہاں سے اُس کے ہاتھ درانتی لگ گئی تھی اُس کے ایک ہی وار سے اکمل کی شہہ رگ کٹ گئی تھی۔ خون کا فوارہ ایک چھانو کے چہرے اور کپڑوں پہ آپڑا۔ اکمل اُس کے قدموں میں گرا تڑپ رہا تھا اور چند ہی لمحوں میں ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ اب بھاگتے بھاگتے فصلوں کو عبور کر رہی تھی۔ گھر داخل ہوتے ہی اُس نے دروازہ بند کیا اور بند دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر ہانپنے لگی۔ مسجد سے صبح کی اذان کی آواز شروع ہوئی ماسی مجیداں کب سے اُس کا انتظار کر رہی تھی اُس کے خون آلود چہرے اور کپڑوں کو دیکھ کے اپنے ہوش سنبھالتے چھانو کی طرف دوڑی۔

''یہ کیا کر آئی ہے چھانو کہاں گئی تھی؟''

''ماردیا اُسے میں نے ماں۔ مجھے محبت کے جھانسے میں پھنسا کے بدکرداری کا الزام لگانے والے کو موت کی نیند سلا دیا میں نے تاکہ وہ پھر کسی اور چھانو کی زندگی خراب نہ کر سکے۔ میں نے اُس عزت کے لٹیرے کو اُس کے انجام تک پہنچا

دیا ہے اماں۔‘‘

’’اُٹھ منہ ہاتھ دھو کپڑے بدل اس سے پہلے کوئی تجھے اس حال میں دیکھ لے۔‘‘

’’میں نے فیصلہ کرلیا ہے اماں کل میں خود تھانے پیش ہو جاؤں گی۔‘‘

’’مجھ نصیبوں جلی کو کس کے سہارے چھوڑ جائے گی تو۔‘‘ ماسی مجیداں نے اپنا منہ پیٹتے ہوئے کہا۔

میں تو خود کو نہیں سنبھال سکتی تجھے کیا سہارا دوں گی اماں۔ میرے جیسی بیٹیوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے جو لڑکیاں ماں باپ سے چھپ کے محبت کا کھیل کھیلتی ہیں۔ آنکھیں بند کر کے کسی اجنبی کے ساتھ عمر بھر ساتھ چلنے کے خواب دیکھنے لگتی ہیں۔ خود ہی سپنوں کے راج کمار ڈھونڈنے نکل پڑتی ہیں۔ ایسی لڑکیاں اپنے ہی ہاتھوں اپنی ذات کو رسوائیوں کی بدنما سیاہیوں سے داغ دار کر لیتی ہیں۔ جو لاکھ دھونے کے بعد بھی اپنے انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ رسوائیاں پھر عمر بھر اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ وہ دروازے کے پاس ہی بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

......☆☆......

’’آپ کو کسی پہ شک ہے چوہدری صاحب؟‘‘

تھانیدار نے اکمل کی لاش کو دیکھ کر اُس پہ کپڑا اوڑھاتے ہوئے کہا۔

’’نہیں تھانیدار صاحب کسی پہ شک نہیں بڑا شریف اور سیدھا سادا تھا یہ لڑکا۔‘‘

’’پھر شاید ڈاکے کا کوئی معاملہ ہے۔‘‘

’’اگر ڈاکہ ہوتا تو میرے مال ڈنگروں میں سے کوئی اک آدھ کم ہوتا سب کھڑے ہیں۔‘‘

’’اسے میں نے قتل کیا ہے چوہدری صاحب۔‘‘ ماسی مجیداں کے لاکھ روکنے پر بھی وہ ڈیرے پر آ گئی تھی اور اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا۔

’’اشکے بھئی کڑیئے تیری دیدہ دلیری پہ۔‘‘ چوہدری اکرم نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے سر سے لے کر پاؤں تک چھانو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

’’جرم کیا تھا اس بچارے کا جو جان لے لی تو نے اس معصوم کی۔‘‘ چوہدری چھانو کے قریب ہو کے بولا۔

’’ہونہہ معصوم۔‘‘ چھانو نے حقارت سے کہا۔

’’یہ اسی قابل تھا چوہدری صاحب۔ یہ قاتل تھا میرے پیار اور عزت کا۔‘‘

پیار اور عزت کے قاتل کی ایسی سزا پہلی واری دیکھی اور سنی ہے۔ چوہدری اکرم نے چھانو کی بات کی ہنسی اڑاتے ہوئے کہا۔

’’میرے دل سے کھیلا تھا یہ کھلونا سمجھ کے اور جی بھر گیا تو پھینک دیا۔ اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ چھانو نے اپنے رخساروں پہ بہہ نکلنے والے آنسوؤں کو ہتھیلی سے رگڑ کر صاف کرتے ہوئے کہا۔

’’یہ تو اب تجھے قانون بتائے گا کیا حق تھا کیا نہیں۔ لے جائے اسے۔ چوہدری نے تھانیدار کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

......☆☆......

’’میری رانو کا اک بڑا سا گھر ہوگا محلوں کی طرح۔ اُس محل میں میری لاڈو راج کرے گی۔ ایک بہت پیارا شہزادہ آئے گا اپنے سفید گھوڑے پہ بٹھا کے لے جائے گا میری شہزادی کو۔‘‘ ماں چھانو کے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے بولی۔

اماں شہزادے اور محل تو بس فلموں ڈراموں میں ہوتے ہیں اصل زندگی میں نہیں۔ چھانو نے اپنے تئیں ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

تجھے جب یہ سب ملے گا میری چندیا تو تو مان جائے گی کہ اصل میں بھی ہوتا ہے۔‘‘ وہ جیل کی چار دیواری میں بیٹھی اماں کی کب کی کی ہوئی باتیں یاد کر رہی تھی۔

اماں تو نے مجھے محلوں اور شہزادے کے خواب دکھائے آج دیکھ قسمت نے تیری بیٹی کی قسمت میں کتنا بڑا محل لکھ دیا ہے۔ وہ پچھلے پانچ سال سے جیل میں تھی عادل اُس کے پلو کا دامن پکڑے اُس کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ اُسے اب فکر تھی تو عادل کے مستقبل کی۔ اماں اُس سے ہر دوسرے دن ملنے آتی تھی۔ عمر قید ہو جانے کے بعد ماسی مجیداں کے پاس کوئی وکیل کرنے کے پیسے نہ تھے۔ مگر اب چند سالوں سے وہ اک وکیل کے گھر کام کر رہی تھی۔ وکیل صاحب بہت دردمند دل رکھنے والے انسان تھے انہوں ماسی مجیداں کی زبانی اُس کی بیٹی کی ساری روداد سننے کے بعد چھانو کا کیس مفت لڑنے کا وعدہ کیا تھا مگر چھانو نے اُن سے صرف یہی منت کی کہ کسی طرح اُس کے ننھے عادل کو جیل سے نکلوا دیں وہ اس جیل کی چار دیواری سے مانوس ہو گئی تھی اور اپنی سزا پوری کر کے نکلنا چاہتی تھی۔ وکیل صاحب نے چند پیشیوں کے بعد عادل کے جیل سے رہائی کا حکم نامہ حاصل کر لیا تھا۔ چھانو جہاں اپنے بیٹے کے جیل سے نکلنے پر خوش تھی وہیں اُس کی جدائی کا سوچ کے کے مغموم بھی تھی۔

اماں میرے عادل کو پڑھا لکھا کے اچھا انسان بنانا۔ اسے کبھی نہ بتانا کہ اس کی ماں کہاں گئی چند دن روئے گا پھر بھول جائے گا مجھے۔ عادل ماسی مجیداں کی گود میں بیٹھا ماں کو روتا دیکھ کے منہ بسور رہا تھا۔ اُس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اک جیل کی چار دیواری سے آشنا تھا یا یا ماں سے۔ نانی کو وہ اب کچھ کچھ پہچان رہا تھا۔

"تو فکر نہ کر چھانو میں اسے اپنے کلیجے سے لگا کے رکھوں گی۔ اسے اک اچھا انسان بناؤں گی۔

اُس نے آخری بار بیٹے کو سینے سے لگایا منہ چوما اور اماں کے حوالے کر دیا ماسی مجیداں کے کندھے سے لگا وہ ماں کو دیکھ دیکھ کے روتا جا رہا جیل کا گیٹ عبور کرتے ہی ماسی اک ٹھیلے کے پاس رکی عادل کو کھانے کی کوئی چیز لے کر دی وہ اب خوشی سے نانی کی انگلی تھامے اچھلتا کودتا جا رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کے چھانو کو یقین آ گیا تھا کہ وہ جلد اُسے بھول جائے گا۔

......☆☆......

ازلی تضاد

س ن مخمور

مہمان خانے کا ایک دروازہ چوہدری رئیس الدین مرحوم کی محل نما حویلی میں کھلتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ چوہدری مرحوم کے پوتے اسماعیل الدین کے انتظار میں گزرتا وقت با آسانی کٹ جاتا تھا، اندرونی ہال نما کمرے میں پرانے وقتوں کی چوہدرانی کی بیٹھک آج بھی لگتی تھی اور محلے کی ہر عمر کی عورت اپنی اپنی رام کہانی دوپہر تلک چوہدرانی کو سناتی رہتی تھی۔ ان کی آوازیں مہمان خانے تک آتی تھیں۔ کبھی ساس اپنی بہو کے پھوہڑپن کا رونا روتی تو کبھی بہو اپنی ساس کے ظلم کی داستان سناتی۔ یوں بڑھاپے کا یہ دور بھی گھریلو سازشوں، معرکوں اور ساس بہو کے ازلی مسائل کے حل کے لئے دیئے گئے قیمتی مشوروں میں گزر رہا تھا۔ سفیدی سر پر سج چکی تھی، چہرے پر جھریوں کا راج قائم ہو چکا تھا مگر پرانے وقتوں کی ہوا اپنے تن میں بسائے چوہدرانی میں آج بھی وہی کرختگی اور سختی موجود تھی جو آج سے بتیس سال پہلے شوہر کی وفات پر اس کے بھائیوں سے عدالتی کارروائیوں کے دوران دیکھی گئی تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد جعل سازی سے اس کے دیوروں نے ہر وہ چیز جس پر اس کا اور اس کی اولاد کا حق تھا ہتھیا لی تھی۔ بس لے دے کر یہ ایک حویلی ہی رہ گئی تھی جس پر وہ قابض نہ ہو سکے۔ گھر کی قیمتی چیزیں اور اپنا زیور بیچ کر اس نے اپنے بیٹے ریاض الدین کو اس قابل کیا تھا کہ وہ آج شہر کی ایک اچھی کپڑا بنانے والی کمپنی میں منیجر کے عہدے پر فائز تھا اور شریف باپ کی شریف اولاد ہونے کے ناتے اپنی بیوہ ماں کی ہر ذمہ داری اپنے سر لے کر اپنی چھوٹی بہن کی ایک اچھے گھرانے میں شادی کروانے کے بعد اپنا گھر بسا کر باپ کی بنائی اس حویلی میں اپنے چھوٹے سے گھرانے کے ساتھ زندگی کا لطف لے رہا تھا۔

"اری موئی ہاجرہ کہاں مر گئی؟"

"جی آئی بڑی بیگم۔" ہاجرہ کی آواز دور رسوئی سے آتی محسوس ہوئی
"آئی کی بچی!! جلدی جا اور دیکھ اسماعیل نہا کر فارغ ہوا؟؟ ماسٹر جی انتظار کر رہے ہیں؟"
"دیکھ لے جمن کیسی عورت میرے بچے کے سر ڈالی ہے، کمبخت خود تو سست ہے، میرے پوتے کو بھی سست بنا دیا ہے اس نے۔"
چوہدرانی نے پاس بیٹھی جمن سے شکوہ کرتے ہوئے اپنی بہو کی روایتی تعریف کی۔
"چوہدرانی جی اب مجھ کو کیا معلوم تھا کہ چودھویں کے چاند میں گرہن لگا ہوا ہے۔"
"اگر گرہن لگا ہوتا تو بھی اچھا ہوتا وہ تو ایک وقت کے لئے لگتا ہے ناں، یہ موئی تو ہر وقت ہی کے لئے آنکھ کا کانٹا بن گئی ہے۔" چوہدرانی نے اپنی لاکھوں میں ایک بہو کا کھاتہ کھول دیا۔
"مجھے تو لگتا ہے تو نے اس نکمی کے ماں باپ سے بوری بھر پیسہ لیا تھا تا کہ اس کو کسی کے سر تھوپ دے۔"
"ہائے ہائے اللہ معاف کرے، لعنت ہو اس کی مجھ پر اگر میں گھر بسوانے کے پیسے لوں۔ اللہ رسول واسطے کام کرتی ہوں میں۔ بس اپنی عاقبت سنوارنے کی خاطر۔ قسم لے لو چوہدرانی مجھ کو اس کے کچھن معلوم ہوتے تو سات جنم گھر میں ہی بٹھوا لی اس کو۔" جمن بی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔
"اری سانپ لوٹتے ہیں میرے سینے پر، صبح کا گیا میرا بچہ شام کو تھکا ہارا گھر آتا ہے تو جنم جلی کی خرافات شروع ہو جاتی ہیں، کبھی اپنی طبیعت خرابی کا بہانہ تراش کر میرے معصوم کو گھر میں آرام تک نہیں کرنے دیتی، بس ڈاکٹروں، حکیموں کے چکر لگاتی رہتی ہے۔ اور کبھی ماں کی طبیعت خرابی کا بہانہ کر کے اس سے ملنے کو جاتی ہے، میں نے تو کل رات ریاض میاں سے کہہ دیا کہ بس دو مہینے میں ایک بار اس کو میکے لے کر جائے۔ کیا ہر ہفتے کا تماشا لگایا ہوا ہے۔ کبھی بھائی بیمار، کبھی باپ کی یاد، کبھی ماں بیمار۔۔۔"
"ارے چوہدرانی مجھے تو شک ہوتا ہے کہیں اس نے کوئی تعویذ وغیرہ گھول کر تو نہیں پلایا ہے ریاض میاں کو، جو اس کی ہر کہی مانے مانے پھرتے ہیں۔" جمن بی نے بہت خوبی سے جلتی آگ میں تیل ڈالتے ہوئے کہا۔
"جمن تو نے تو دل لگتی کہہ دی۔ سچ مجھے بھی کبھی کبھی یہ ہی شک ہوتا ہے، ذرا آنکھ بچتی ہے تو ریاض میاں کے تکیے کا آئے دن جائزہ لیتی رہتی ہوں کہیں کوئی تعویذ تو نہیں ڈال رکھا موئی نہیں۔"
"سر سے دیکھو تو دوپٹہ اترتا ہی نہیں مگر کیسے دیدے مٹکائے ہر آئے گئے کو دیکھتی رہتی ہے۔ بھلا شریف گھرانے کی لڑکیاں ایسا کرتی ہیں۔ مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتیں نہ یہ اور نہ اس کی ماں، دونوں ایک جیسی ہی ہیں میسنی فطرت کی۔"
چوہدرانی شکایات، شکوک اور کردار کشی کا دائرہ بڑھاتے ہوئے اپنی بہو رانی کی ماں کو بھی توپوں کی زد میں لے آئی۔
"بس بیاہ کے دو ماہ بعد ہی موئی نے اپنی کینچلی اتار پھینکی تھی۔ اب دیکھو اتوار کو صبح منہ اندھیرے سے کام کا ناٹک کر رہی ہے جیسے اتنے چھوٹے سے گھر کا کام کرنا کوئی دودھ کی نہر نکالنے کے مترادف ہے۔ بکتی ہے کہ اتوار کے لئے بھی نوکر رکھ لیں۔ ہائے میرا بچہ کما کما کر تھکے جاتا ہے اور یہ اپنی عیاشی پر لگی رہتی ہے، ایک بچے کو کیا جنا۔ کہتی ہے اب کام نہیں ہوتا کمر جواب دے گئی ہے۔ لعنت ہو اس کام چور پر۔ میں نے تو صاف ریاض میاں کو منع کر دیا کہ ایک دن تو اپنی بیگم کو ہاتھ پاؤں ہلانے دو۔ بس اس غریب ہاجرہ پر ہی بس چلتا ہے اس کا جو رسوئی کے لئے اتوار کو بھی بلا لیتی ہے اضافی روپے دے کر۔ نانجار میرے لعل کی کمائی ایسے ہی اڑائے دیتی ہے۔" چوہدرانی نے انکسار کی حد کرتے ہوئے اچھی بھلی حویلی کو چھوٹا سا گھر بناتے ہوئے دل کے پھپھولے پھوڑنا شروع کر دیئے۔
"چوہدرانی چھوڑو اب اس کلموئی کا کیا ذکر کرنا یہ بتاؤ ریاض میاں نظر نہیں آ رہے کیا اتوار کو بھی نوکری پر گئے ہوئے ہیں؟؟"
"ارے کیا پوچھتی ہو!! اسی نگوڑ ماری نے اپنے پلو سے باندھ رکھا ہے، کہتے ہوئے جی خون کے آنسو روتا ہے، زن مرید بنا ہوا ہے رئیس الدین غوری کا واحد سپوت، جوانی برباد کر دی تو نے ریاض میاں کی اس چھوکری سے شادی کروا کر۔ مہارانی کپڑے دھو رہی ہے اور میرا لعل کاٹھ کے الو کی صورت اس کی نوکری کر رہا ہے۔ گیلے کپڑے اوپر چھت پر

پھیلا رہا ہوگا۔شرم آتی ہے اس زن مریدی پر، یہ ہی دیکھنے کو زندہ تھی میں کہ میرا گبرو جوان، پڑھا لکھا بیٹا بیوی کی غلامی کرے۔"

دہائیوں اور شکایات کا نہ ختم ہونے والا یہ سلسلہ مزید جاری رہتا کہ باہر حویلی کے دوسرے صدر دروازے پر کسی کی دستک نے سلسلہ منقطع کر دیا

"اری ہاجرہ!! دیکھ پرلے صدر دروازے پر کوئی آیا ہے۔"

چند لمحے سماعت میں کسی کی آواز سنائی نہ دی شاید چوہدرانی اور جگن بی دوسری طرف صدر دروازے پر آنے والے کے بارے میں جاننے کے لئے خاموش تھے کہ کمرے کی فضا میں یک دم چوہدرانی کی بیٹی رانیا کی بھرپور آواز گونجی:

"السلام علیکم!! کیسی ہیں آپ دونوں۔۔اور اتنے دونوں بعد نظر آئیں خالہ آپ۔۔۔بھئی اب تو یہاں کوئی کنوارہ نہیں رہا ہے، لگتا ہے آپ غلطی سے آگئی ہیں۔۔میرا بھانجہ ابھی تو بہت چھوٹا ہے بیاہ کے لئے۔"

اور کمرہ تینوں عورتوں کے قہقہوں سے گونج اٹھا۔

"اچھا اماں بھیا تو ہیں ناں گھر پر؟؟ کل تو ان سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی تھی۔"

"گھر پر تو ہیں مگر وقت نہیں اس کے پاس ہمارے لئے۔"

"اماں ایسا کیوں کہہ رہی ہیں آپ؟؟" رانیا نے تعجب سے اپنی ماں سے سوال کیا۔

"ارے کیا کہوں میری چندا!! تیرا بھیا باہر سیٹھ کی نوکری کر کے آتا ہے تو گھر آکر تیری بھابھی کی نوکری کرتا ہے، ہمارے لئے تو وقت ہی نہیں اس کے پاس۔ میں تو کڑھتی رہتی ہوں اپنے جوان بیٹے کی زن مریدی دیکھ کر۔" چوہدرانی نے بیٹی کے آگے بھی پٹارا کھول دیا

"اماں جان!! بھابھی کو آپ نے شروع ہی سے بہت ڈھیل دے رکھی تھی اب اس کے نتائج تو بھگتنے ہی ہوں گے۔"

"بیٹی کروں گی اس کا علاج بھی، لاؤں گی کوئی تعویذ بڑے بابا سے، تم سناؤ کیسی ہو؟؟۔ رات آرام سے گھر پہنچ گئی تھیں؟؟"

"جی اماں جان رات یہاں سے نکلے تو میں نے شکیل سے کہا کہ مجھے کچھ چیزیں لینی ہیں تو پھر ہم اپنی مطلوبہ چیزیں لے کر تھوڑی دیر ہی سے گھر پہنچے تھے۔"

"تجھے آج پھر یہاں دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔"

"اماں جان!! آج شکیل کے کچھ مہمان آرہے تھے تو میں نے کہا مجھ سے تو کام ہوگا نہیں، انعم کی پیدائش کے بعد سے تو میں کسی کام کی نہیں رہی، اگر رسوئی میں کچھ دیر بھی کھڑی ہو جاؤں تو کمر جواب دے جاتی ہے اس لئے شکیل نے مجھے یہاں چھوڑ دیا کہ گھر میں رہوں گی تو گھر والے کام کرنے کا کہیں گے۔ اس لئے اماں جی کی طبیعت کا بہانہ کر کے دن بھر اماں کے پاس رہو، پھر رات کو کھانے سے کچھ وقت پہلے وہ مجھے لینے آجائیں گے۔ کیونکہ رات میں تو فرحین اور اس کی بچیاں بھی موجود ہوں گی گھر پر، لہٰذا برتن دھونے کا اور دیگر کام وہ کر لیں گی۔ اور میں آرام۔۔۔" رانیا نے پورا منصوبہ سنا کر بھرپور قہقہہ لگایا۔

"ارے بٹیا!! مگر فرحین کیسے راضی ہوگی کام کرنے پر؟؟؟ تو ایسا کر رات کا کھانا یہاں ہی کھا کر کچھ دیر سے گھر جانا۔"

"اماں جان فرحین سے شکیل خود کہہ دیں گے آخر چھوٹی بہن ہے اپنے بھیا جی کا کہا تھوڑی ٹالے گی۔"

"ارے رانی میں تو امید لگائے بیٹھی تھی کہ اب جب تجھ سے ملوں گی تو تو امید سے ہوگی۔" جگن بی نے گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا۔ آخیر بہت دیر ہوگئی تھی ان کو بولے ہوئے۔

"خالہ جان کیسی باتیں کرتی ہیں!!! انعم کی پیدائش نے جان نکال دی ہے۔ اب مزید کا سوچ کر لرز جاتی ہوں۔ نہ بابا میں تو کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوں۔"

"صحیح کہا بٹیا، ایک اولاد ہی کافی ہے، میری بچی کو جگن الٹی پٹی نہ پڑھا۔ دیکھ ویسے ہی کتنی کمزور ہو گئی ہے۔ بس میری چندا کے لئے ایک ہی بہت ہے۔"

چوہدرانی نے بیٹی کی تائید کرتے ہوئے مزید کہا۔
"اچھا شکیل کیوں نہیں رکے؟ کچھ وقت تو ساتھ بیٹھ جاتے۔ ایک کپ چائے ہی پی لیتے۔"
"ارے اماں جان!! ناشتے کے بعد میں نے مشین لگالی تھی ہفتے بھر کے کپڑے دھو کر فارغ ہوئی تو انھوں نے کہا کہ میں یہاں آنے کی تیاری کروں اور کپڑے وہ خود پھیلا دیں گے۔"
"صدقے جاؤں!! جتن تجھ سے کیا ہر شکوہ واپس لیتی ہوں، بہو دلوانے میں جو کوتائی تو نے کی اس کی تلافی داماد دلوانے میں پوری کردی۔ کتنا پیارا بچہ ہے میری بچی کا کتنا خیال رکھتا ہے، خوشی خوشی اس کے کام کرتا ہے، اللہ تیرا بڑا شکر ہے۔ مالک نظر نہ لگے میرے داماد کو۔"
چوہدرانی داماد کی اعلٰی دامادی پر اللہ کا شکر ادا کئے جا رہی تھی اور میں مہمان خانے میں بیٹھا زیرِ لب مسکراہٹ لئے اس تمام تضاد کو اپنی سماعت میں محفوظ کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ زمانہ کتنا ہی بدل جائے، اس کی سوچ کتنی ہی مختلف ہو جائے مگر یہ ریت نہیں بدل سکتی کہ غیر کی بیٹی غیر ہی رہتی ہے۔

......☆☆......

قید

عائشہ تنویر

"مما مجھے بھی سیب کھانا ہے۔"
وہ بہت نفاست اور توجہ سے سیب کاٹ رہی تھی کہ موٹی پتلی قاشیں اس کی ساس کو پسند نہیں تھیں، جب علی نے اس کا دوپٹہ کھینچا۔
"اچھا، صبر کرو، دیتی ہوں ابھی"
اس نے ٹرے میں دودھ، سیب رکھتے بے توجہی سے کہا تھا۔
اندر داخل ہوتا اس کا شوہر ٹھٹک کر اسے گھورنے لگا۔
"خبردار جو تم نے بچوں کو دیا تو، پتہ بھی ہے اماں کو اچھی خوراک کی ضرورت ہے اتنا امیر نہیں میں کہ پھلوں کی پیٹیاں خرید لاؤں۔"
اس نے قریب آ کر درشت لہجے میں کہا تھا۔ آواز بلند نہیں تھی لیکن لہجے کی سختی سے علی سہم کر اس کے ساتھ لگ گیا تھا اور وہ چیخ کر بولی تھی۔
"وہ آپ کی اماں ہیں تو یہ بھی آپ ہی کے بچے ہیں، باپ کے ہوتے ہوئے ہر چیز کو ترستے ہیں لیکن آپ کو تو بیوی بچے کبھی نظر ہی نہیں آئے۔"
"جو کر سکتا ہوں سب کرتا ہوں لیکن تم لوگوں کا ناشکرا پن ہی نہیں جاتا"
وہ ٹرے اٹھا کر بڑبڑاتا ہوا نکل گیا تھا، وہ لب بھینچے اس کی پشت کو گھورتی رہ گئی۔
کم پیسوں میں بھی وہ دونوں بہت مطمئن زندگی گزار رہے تھے، انہیں ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہیں تھی سوائے احسن کی والدہ کے۔
وہ اپنے بارے میں بہت حساس تھیں، باقاعدگی سے بڑے بڑے پرائیویٹ اسپتالوں کے چکر، پھل، دودھ، میوے، گوشت، یخنی سب کچھ ہی انہیں اپنی صحت کے لئے ضروری لگتا اور ان کے منہ سے نکلی بات پوری کرنا احسن کا فرض تھا۔
اسے کسی بات پر اعتراض نہیں تھا مسئلہ تب ہوا جب بچے بڑے ہونے لگے، محدود وسائل کے سبب جب دنیا جہان کی نعمتیں گھر میں آتیں لیکن انہیں استعمال کا حق صرف اماں کا ہوتا تو بچوں کی ضد اسے جھنجلا دیتی۔ بچے سامنے

چیز دیکھ کر کب تک صبر کرتے اور وہ کتنا منع کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر سارے پیسے کھانے میں ہی اڑا دیئے تو باقی اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ اپنی ذات تک تو وہ صبر کی عادی تھی لیکن اپنے بچوں کی یہ حق تلفی اب اس کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی اب تو روز ان ہی باتوں پر ان کی تو تو میں میں ہو جاتی۔

آج کل تو واقعی اماں کی طبیعت بہتر نہیں تھی۔ بظاہر تو بخار ہی تھا لیکن کمزوری تھی کہ جان نہیں چھوڑ رہی تھی۔ ایک ڈاکٹر سے دوسرے ڈاکٹر تک جاتے، ہزاروں کے ٹیسٹ کرواتے ان کی ساری بچت ختم ہو گئی تھی۔ احسن کا ارادہ اب بائیک بیچنے کا تھا جبکہ وہ چاہتی تھی کہ اگر کچھ بکنا ہی ہے تو اس کے زیور بک جائیں، بائیک تو ضرورت کی چیز ہے لیکن کچھ بھی بکنے سے پہلے اماں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

دکھ کی لہر نے ان سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بچے دادی کو یاد کرتے اور وہ بھی رنجیدہ ہو جاتی۔ ساس، بہو کے اختلافات اپنی جگہ لیکن ساتھ رہنے سے محبت تو ہو ہی جاتی ہے۔

سب سے زیادہ فکر اسے احسن کی تھی۔ ماں سے اسے بے انتہا محبت تھی اب ان کی جدائی کیسے برداشت کرے گا۔ گھر مہمانوں سے بھرا تھا، تعزیت کے لئے آنے والوں کا ہجوم لگا تھا۔ بظاہر تو احسن نارمل ہی لگ رہا تھا لیکن اندر سے اس کی کیا حالت ہو گی وہ جانتی تھی۔

چند دن بعد اسے موقع ملا اکیلے احسن سے بات کرنے کا، وہ اس کے پاس بیٹھ کر دھیرے دھیرے اماں کی باتیں کرنے لگی تا کہ وہ بھی بول کر، رو کر اپنے دل کا غم نکال دے۔ یوں گھٹن کا شکار نہ ہو۔

احسن نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما

"سب نے ایک دن جانا ہے، اماں بھی چلی گئیں۔ میں آزاد ہو گیا۔ ساری تنخواہ اپنے بچوں پر خرچ کروں گا۔ بس یہ کچھ قرضے اتر جائیں تو علی کے لئے سائیکل بھی لاؤں گا"

احسن بول رہا تھا اور وہ ششدر بیٹھی ایک ہی جملے پر اٹکی تھی۔

"میں آزاد ہو گیا"

......☆☆......

کانچ
نائمہ غزل

"مت جاؤ نا پلیز مجھے چھوڑ کر" اس نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا، جسے اس نے بیدردی سے جھٹک دیا۔

"یوں بچوں جیسی باتیں مت کرو منال، جب میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے تو تم پلیز میرے راستے کی دیوار بننے کی کوشش مت کرو۔"

"دیوار نہیں ہوں میں تمہارے راستے کی، تم میری راہوں میں کانٹے بو رہے ہو" اس نے کرلاتے ہوئے کہا

"تم دیکھو، ادھر دیکھو۔" اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ان میں بس ایک خوشی کی لکیر محسوس کی ہے میں نے، جو بس تمہارے نام کی صورت میری زندگی میں شامل ہے، ایسا مت کرو میرے ساتھ۔" آنسو گالوں کو بھگونے لگے تھے۔

"منال تم سمجھ نہیں رہی ہو۔" اس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

"تو تم سمجھ جاؤ نا" اس نے بیقراری کے عالم میں فوراً کہا۔

"میں نہیں لے جا سکتا ہوں تمہیں اپنے ساتھ۔" اس نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

"مت لے جاؤ، نہیں مت لے جاؤ، مگر یہ، یہ نام مجھ سے مت چھینو، پلیز......!" اس نے بے بسی سے کہا۔

"نہیں مجھے یہ بھی ظلم لگتا ہے تمہارے ساتھ، اس نام کے ساتھ تمہاری آگے کی زندگی اور کٹھن ہو جائے گی۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"نہیں ہوگا ایسا کچھ، میں اس نام کے سہارے، تمہارے انتظار کے سہارے بہت آرام سے اپنی زندگی بسر کر سکتی ہوں، بس تم یہ ایک احسان اور کر دو مجھ پر، میں تمہارے علاوہ کسی اور کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی سچ میں۔" اس نے دیوانگی کے عالم میں کہا۔

"نہیں منال! یہ بات میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں، جب کوئی اور تمہاری زندگی میں آئے گا تم بھول جاؤ گی سب، ہاں شروع میں ایڈجسٹ ہونے میں شاید کوئی مسئلہ ہو لیکن پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد تمہیں اپنی یہ باتیں بیوقوفی لگنے لگیں گی اور انتظار کیسا جب میں کبھی واپس ہی نہیں آؤں گا۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"نہیں ایسا کبھی کچھ نہیں ہوگا، تمہاری سوچ ایسی ہے، تم سوچ سکتے ہو ایسا، منال نہیں، منال نے تو ان پانچ سالوں میں تم سے جدا رہنے پر رنگ اوڑھنا چھوڑ دیئے تو پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ رنگوں اور جگنوؤں سے کبھی دوبارہ دوستی کر سکے۔" اس نے سسکی دباتے ہوئے کہا۔

"منال تم۔" وہ زچ ہو گیا۔

"اچھا۔ جاؤ تم چلے جاؤ، جاؤ آزاد کیا تمہیں، ہر ہر وعدے، ہر دعوے سے مگر......!" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور سرد سے لہجے میں کہا

"معاف نہیں کروں گی میں تمہیں کبھی۔" اس کا سرد لہجہ جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی تک میں اتر گیا، اچانک ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی، اس نے اپنے اردگرد دیکھا کمرے کے خواب ناک ماحول میں جیسے کچھ دیر پہلے دیکھے گئے خواب میں موجود وجود کے لہجے کی ساری سردی اتر آئی تھی، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور ذہن سے خواب کو محو کرنے کی کوشش کرنے لگا سائڈ ٹیبل پر دھرے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پی گیا، مگر کسی کے لفظوں کی بازگشت اس کے کانوں میں گونج کی صورت برس رہی تھی۔

"میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی، کبھی نہیں۔"

......☆☆☆......

عجیب اجاڑ سا موسم ہو رہا تھا، ٹنڈ منڈ سے درختوں کے گرد بکھرے سوکھے زرد پتے الگ اداس سا سماں باندھ رہے تھے، وہ اپنی دھن میں مگن، دھیمی چال چلتے ان بکھرے پتوں کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔

"چرر" پہلا قدم رکھتے ہی پتوں نے پرزور احتجاج کیا، وہ ٹھٹک گیا۔ اس کا انہماک ٹوٹ گیا تھا، ہر قدم پر چرچرانے والے نوحہ کناں پتوں کا درد جیسے اسے اپنے سینے کے اندر محسوس ہو رہا تھا، وہ کچھ دور چل کر روش کے ایک طرف نسب بینچ پر بیٹھ گیا۔

"تمہارے بغیر مجھے یہ دنیا کسی زرد موسم کی مانند محسوس ہوتی ہے" کسی کا بے بسی کے انداز میں ادا کیا جانے والا جملہ اس کے کانوں میں گونجا۔

"زرد موسم تو اس کی زندگی میں کب سے ٹھہرا ہوا تھا اور اب میں اسے زرد پتوں کی مانند کچلتا ہوا کس طرح آ گیا ہوں" اسے یاد آیا پچھلے پانچ سال سے وہ اسے انتظار کی سلیب پر لٹکا کر بیرون ملک گیا ہوا تھا، اس کی ہر ای میل میں آخری یہ جملہ ضرور شامل رہا کرتا تھا، ہاں وہ جب بھی اس سے بات کرتی تو انتہائی ہشاش بشاش لہجے میں شروعات کرتی تھی مگر آخر میں آ کر جیسے ہی لہجہ بھیگنے لگتا وہ کچھ بھی کہے بغیر کال ڈسکنیکٹ کر دیا کرتی تھی، پھر تھوڑی ہی دیر میں اس کی ای میل آ جاتی جس میں وہ یہ جملہ لکھنا نہیں بھولتی تھی، وہ لمحہ بھر کے لیے اپنی بے حسی پر حیران ہو گیا۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی، آخری بار کب بات ہوئی تھی بھلا

"اوں......!" بہت زور دینے پر بھی کچھ یاد نہیں آیا۔

"دسمبر کی بارہ تاریخ۔" اس کے ذہن میں نسوانی لہجہ گونجا، ہاں شاید یہی، اسے یاد آیا، اس دن اس نے بات تو کوئی

نہیں کی تھی، مگر آج اسے یاد آرہا تھا کہ کال کے دوسری طرف سانسوں کے زیر و بم میں اس کی بے اعتنائی کے کتنے ہی شکوے نہاں تھے، اس نے اس کی چپ سے اکتا کر کال کٹ کر دی تھی۔

"زرد پتے! آہ" اس نے ایک سانس فضا میں خارج کی زرد پتے تو کچلے جانے پر پرزور احتجاج کرتے ہیں مگر انسانوں کے روندے جانے کے نوحے جب آنکھوں سے عیاں ہو رہے ہوں، ہم ان سنی کر جاتے ہیں، آنکھیں پڑھنے کے دعویدار اکثر اس کے لیے تاویلیں گھڑ لیا کرتے ہیں۔ کیا ان آنکھوں کے جگنو بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ دوبارہ روشن نظر آئیں گے، کیا زرد پتے پیروں کے نیچے کچلے جانے کے بعد اپنی اصلی حالت میں واپس آسکتے ہیں، اس نے اس دن کے بعد کوئی بات نہیں کی تھی مگر کال کر کے شاید ایک دوبار اور کچھ کہنے کی کوشش کی تھی، مگر لب لفظوں کے بجائے بس سسکیوں میں ہی ڈھلے ہوئے تھے، اور وہ بے حسی کی تصویر بنا اس سے ہمیشہ بیزار ہی رہا، اسے یقین نہیں آرہا تھا جس کو اس نے اتنی بیدردی سے ٹھکرایا تھا کبھی اس کی محبت کا دعویدار رہا تھا، کس لیے چھوڑا تھا اسے، میرے لیے؟؟ اس نے خود سے سوال کیا، اسے تو اچھی طرح پتہ تھا مشرقی وفا کے سامنے میری جیسے حسن کے سامنے ذرا دیر بھی نہیں ٹک پاتے، پھر کیوں؟؟

"خود اپنی بھنورا صفت عادت کی وجہ سے" اندر سے بیساختہ جواب آیا تھا، اسے تو مغرب جا کر ہی پتہ چلا تھا کہ وہ کیا ہے، اس کے اندر کی ہوس زدہ گندگی وہاں جا کر ہی تو کھل کر سامنے آئی تھی، پہلے کچھ عرصے تو وہ خود کی ایسی تصویر دیکھ کر حیران رہ گیا تھا، پھر آہستہ آہستہ مغرب کے تمام رنگ اس نے یوں اوڑھے کہ مشرق سے بالکل ہی بیزار ہو گیا، وہ اسے ساتھ کس طرح لے آتا، جبکہ اسے اپنے پیروں میں کسی قسم کی کوئی بیڑی رکھنا منظور نہیں تھی، اس نے اس کے اوپر ایک آخری احسان کرنا چاہا تھا اسے خود سے بندھے نکاح کے بندھن سے آزاد کرنے کے لیے، وہ بس اسے یہی بتانے کے لیے واپس آیا تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی کی شروعات کسی اور کے ساتھ کر سکتی ہے۔۔ مگر......!!!، اس نے بے اختیار اپنے پیروں تلے نظر کی، سرخ روش اسے ایسے محسوس ہوئی جیسے کسی جیتے جاگتے انسان کے خون سے رنگی گئی ہو، جو اس کی بے حسی کے ہاتھوں اس کے پیروں تلے آکر روندی گئی تھی، اس نے سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، کچھ دیر اسی پوزیشن میں بیٹھے رہنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا اور دوڑ کر پارک کے داخلی دروازے کی اور بڑھا، مگر کچھ ہی دیر میں وہ واپس آکر اسی بینچ پر براجمان ہو گیا اب اس کے ہاتھ میں ایک سگریٹ کی ڈبیا تھی، اس نے ایک سگریٹ سلگا کر ہونٹوں سے لگائی اور بینچ کی پشت گاہ سے سر ٹیک کر بیٹھ گیا، کچھ ہی دیر میں وہ دھویں کے مرغولے میں بننے والی شبیہہ سے مخاطب تھا۔

"مجھے نہیں ہے تمہاری کوئی پروا، تم جیو یا مرو، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا" شبیہہ ساکت ہی رہی، وہ چونک کر سیدھا ہوا، خالی بیجان آنکھوں والی شبیہہ اس کے اضطراب میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ مگر وہ ہولے ہولے بڑبڑا رہا تھا۔

"مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

......☆☆......

بھوک

دستگیر شہزاد

میں یونہی کھڑکی پر آن کھڑی ہوئی تو میری نگاہ سامنے سے آتے ہوئے ایک بائیس تیئیس سالہ خوبرو نوجوان پر جا ٹکی اسے دیکھتے ہی اچانک میرے دل میں ہزاروں آرزوئیں کروٹیں لینے لگی لاکھوں خواہشیں مچلنے لگیں خواہشیں اور ایسی خواہشیں کہ ہر خواہش پر دم نکلے پھر آہستہ آہستہ میرے تن بدن میں ایک عجیب قسم کی سنسناہٹ پھیلنے لگی اور بدن پر لاکھوں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ کسا ہوا بلاؤز مزید کسنے لگا تھا۔ ساڑھی تو آج میں نے باندھی ہی نہ تھی الغرض صبح ہی سے میں اس کیفیت سے دوچار تھی گزشتہ دو مہینوں سے رہ رہ کے مجھ پر یہ کیفیت طاری ہو رہی تھی جب بھی مجھ پر اس کیفیت کا نزول ہوتا میرے برتاؤ میں ایک طرح کا وحشی پن در آتا میں ایک ایسے حیوانی جذبے کے زیر اثر

آ جاتی جو دنیا کا سب سے زیادہ شدید اور طاقتور جذبہ ہوتا ہے جس کے مداوا کی خاطر میں رات بھر تڑپنے پر مجبور ہوجاتی میری سانسیں بے ہنگم ہوجاتیں اور میں تھک کے بستر پر ڈھیر ہوجاتی جب سانسیں قدرے قابو میں آ جاتیں تب میں سیل فون اٹھا کر اپنے شوہر صدام سے جو برائے روزگار سعودی عرب میں مقیم تھا اس سے رابطہ قائم کرتی صدام سیل فون کی اسکرین پر میرا نام فلیش ہوتے دیکھ کر حسب معمول ریسیونگ سوئچ آن کرتے ہی والہانہ انداز میں سلام عرض کرتا میں جواب میں مختصر اور یافت کرتی۔

''کب آ رہے ہو ظالم؟'' صدام کی جانب سے جو جواب ملتا اس سے میں بے طرح جھنجلا جاتی اور فوراً رابطہ منقطع کر کے ایک بھدی سی گالی دیتی ہوئی سیل فون بستر پر اچھال دیتی۔

میرا بیاہ صدام سے ہوئے چار سال بیت چکے تھے بیاہ کے وقت وہ شہر کے ایک برج کے تعمیراتی کام میں کسی ٹھیکیدار کے ساتھ ویلڈر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا لیکن ورلڈ بینک کی طرف سے رقم کی فراہمی روک دیے جانے سے یہ کام التوا میں چلا گیا اور تمام کے تمام مزدور بے روزگار ہوگئے۔

صدام تین چار مہینے بیروزگاری جھیلتا رہا مگر جوں ہی اسے احساس ہوا کہ مذکورہ پروجیکٹ اب سیاست کی نذر ہو چکا ہے اس نے فوراً سعودی عرب کی ایک کنسٹرکشن کمپنی کی ویکنسی دیکھ کر الریاض میں واقع الامان ٹریولز کے آفس میں اپنا پاسپورٹ جمع کرا دیا اور پندرہ دنوں کی قلیل مدت میں دو سال کے معاہدے پر سعودی عرب پہنچ گیا اب اسے سعودی عرب گئے ہوئے سولہ مہینے گزر چکے ہیں اور معاہدے کے مطابق واپس آنے میں محض آٹھ مہینے رہ گئے ہیں مگر میرے لیے اب شوہر کے بغیر آٹھ دن بھی گزارنا محال تھا اسی سبب آج میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ چاہے جو ہو میں اب اس آزار سے نجات حاصل کر کے رہوں گی۔

وہ نوجوان مکمل طور پر میری نگاہوں کے حصار میں تھا نیلے رنگ کی جینز اور فیروزی رنگ کی ٹی شرٹ میں ملبوس ہاتھ میں ایک چھوٹا سفری تھیلا بال الجھے بکھرے، چہرے پر تھکن اور پریشانی کے آثار باوجود اس کے مردانہ وجاہت قابل رشک تھی میں نے اسے مدہوش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے ہونٹوں پر زبان پھیری پھر سرد آہ بھرتے ہوئے بڑبڑائی۔

ہائے میری زندگی کے افق پر آج تک ایسا وجیہہ مردانہ مکھڑا نہیں جگمگایا تھا جسے دیکھ کے پور پور سنسنا اٹھے اسی گھڑی نوجوان نے وہاں سے گزرتے ایک راہ گیر سے کچھ دریافت کرنا چاہا تھا مگر وہ پل بھر کے بغیر لاعلمی کا اظہار کرتا ہوا آگے بڑھ گیا، اس کے اس رویے سے نوجوان کے چہرے پر تشویش کا سایہ قدرے گہرا ہوگیا وہ چند لمحے یوں ہی ساکت کھڑا بے بسی سے اِدھر اُدھر تکتا رہا پھر انتہائی بوجھل قدموں سے آگے بڑھا۔

اسے جاتے دیکھ کر میں نے پکارا۔

''سنو۔''

وہ ٹھٹک گیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا جوں ہی ہم دونوں کی نگاہیں آپس میں ٹکرائیں میں نے اسے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا نوجوان پہلے تو جھجکا پھر آہستہ آہستہ اپنا رخ میری کھڑکی کی جانب کر لیا جب وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا اس کا چہرہ بری طرح مرجھایا ہوا تھا نیز ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اس سے قبل کہ نوجوان لب کشائی کرتا میں نے دریافت کیا۔

''شاید تم کسی کی تلاش میں ہو؟''

''ج......ج......ج......جی آپ یاسر علی کو جانتی ہیں؟'' وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

''کون یاسر علی جو یو بی ایل بینک میں سپروائزر ہیں؟'' اس کے چوڑے سینہ اور بازوؤں کی پھڑکتی مچھلیوں کو نگاہوں میں جذب کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''نہیں......ریکروٹنگ ایجنٹ ہیں یہیں کہیں رہتے ہیں۔''

''پتا کیا ہے ان کا؟''

''قصبہ پھول پور کے ہیں۔''
''میں قصبہ کا نہیں یہاں کا پتا پوچھ رہی ہوں۔''میں زچ ہو کر بولی۔
نوجوان کے چہرے پر زہر خند مسکراہٹ پھیل گئی۔
''بھابی جی میرے پاس پتا ہوتا تو چار دنوں سے یوں مارا مارا کیوں پھرتا؟
''ارے بابا یہ لاہور شہر ہے لاہور۔''
''تمہارا پنڈ نہیں یہاں کسی سے بھی پوچھ پچھار کر آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے یہاں تو پڑوسی پڑوسی کو نہیں جانتے پہچانتے۔''میں نے دلبرانہ انداز سے کہا۔
''ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں بھابی جی لیکن کیا کروں میرے ساتھ ٹریجڈی ہوئی ہے۔''
''ٹریجڈی کیسی ٹریجڈی؟''اس کی پیشانی پر استعجاب کی سلوٹیں پڑ گئیں۔
''میں اسٹیشن سے گلبرگ آنے والی بس میں سوار ہونے کے لیے جوں ہی بڑھا اچانک دھکم پیل مچ گئی کسی نے میرا پرس اچک لیا پرس ہی میں کئی عزیزوں کے پتے اور فون نمبر تھے۔'' کہتے کہتے اس کی آواز رندھ گئی۔
''تو کیا تم گاؤں سے آئے ہو۔''
''جی، لاہور کا پہلا سفر ہے؟''
''یہ یاسر علی کون ہیں تمہارے؟''
''بڑے بھائی...... یہاں گلبرگ میں کوئی چار سال سے رہتے ہیں۔''
''پھر تو ڈونٹ وری...... فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' کہتے ہوئے ایک بار پھر اس کے سراپا کو سوچتی نگاہوں سے ٹٹولتے ہوئے کہا۔
''تم کافی تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ایک کام کرو اندر آجاؤ کچھ آرام کرلو تمہارے بھائی کا پتا ہم پھر لگالیں گے۔'' یہ جملہ ادا کرتے ہوئے میرے ذہن کا دوسرا ٹریک سوچ رہا تھا کہ اچھا ہے کہ بے سہارا ہے اسے سہارا دے کر آسانی سے رام کیا جاسکتا ہے۔ میری اس پیشکش سے نوجوان کا چہرہ کھل گیا۔
نوجوان جھجکتے ہوئے یوں ہی گھر میں داخل ہوا میں نے جلدی سے دروازہ بولٹ کردیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے سیدھے بیڈروم میں لے آئی اور کیف و مستی سے سرشار لہجے میں کہا۔
''یہاں تکلف کی کوئی ضرورت نہیں اسے اپنا ہی گھر سمجھو اور جیسے چاہو آرام کرو۔''
وہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور میری جانب ملتمس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
''بھابی جی میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔''
میں اسی مستی کی کیفیت میں شوخ لہجہ میں بولی
''ارے بھابی اور دیور کے درمیان کم بخت یہ احسان کہاں سے گھس آیا اور اس سے لگ کر بیٹھ گئی ایسا کرتے ہوئے مجھے پورا یقین تھا کہ جلد ہی اس کے جذبات برانگیختہ ہوجائیں گے اور وہ میری گل بدنی کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر میرے شباب کے سامنے بے قرار ہوجائے گا لیکن کافی دیر بعد بھی میرے اس عمل سے نوجوان کے اندر ہوس کے بھیڑیے غرائے نہ ہی آنکھوں میں چاہت کی مستابیاں چھوٹیں وہ بس یوں ہی بے جان لاش کی طرح پڑا خلا میں تکتا رہا میں جھنجلا گئی کہیں اس کی مردانگی ناکارہ تو نہیں پھر مجھے خیال آیا کہ کچھ مردوں کو مشتعل کرنے کے لیے رجھانا پڑتا ہے اس خیال کے آتے ہی میں اچھل کر فرش پر آن کھڑی ہوئی دوپٹہ تو پہلے ہی میرے بدن پر نہ تھا میں نے ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے اپنے بدن کو مزید نمایاں کیا ایسا کرتے ہوئے میرا سینہ اس قدر تنا کہ بلاؤز پر ٹنکے تین بٹنوں میں درمیانی بٹن بلاؤز سے جدا ہو کر فرش پر آ رہا اس پر بھی نوجوان کی آنکھوں میں نہ شہوت کا چمن ذرا آباد ہوا نہ ہی چہرے پر ہیجان کی کلیاں چٹکیں میں چونک پڑی۔
''ارے یہ کیا تشنہ دیں تو صحرا میں نخلستان دیکھ کے خوش ہوتے ہیں اور یہ ہے کہ......!''پھر سوچا شاید وہ بے توجہی کا

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

شکار ہو رہا ہے چنانچہ اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی خاطر بلاؤز سے جدا ہوئے بٹن کو فرش سے اٹھا کر اسے دکھاتے ہوئے قدرے اٹھلا کر کہا۔

''او...... بیٹھے بٹھائے ایک کام بڑھ گیا اب اسے ٹانکنا ہوگا۔'' اور کسی فیشن شو کی ماڈل کی مانند بیڈ روم میں کیٹ واک کرنے لگی قدرے توقف کے بعد ترنگ میں آ کے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دوبارہ انگڑائی لی نیز گردن کو پشت کی جانب جھکاتے ہوئے بدن کو کمان بنا لیا میرے اس عمل سے سینے پر آباد کبوتروں کا جوڑا گھونسلے سے باہر آنے کو پھڑ پھڑانے لگا اس پر بھی نوجوان کی آنکھوں کا سمندر پرسکون رہا دور دور تک شہوت کی کوئی بھی لہر نہ تھی چاروناچار میں تیر کی طرح سیدھی ہوگئی اور قدرے مایوسی سے خلا میں گھورتے ہوئے سوچنے لگی۔ یہ کیسا مرد ہے لاہور صفت بدن کا نظارہ پانے کے بعد بھی اس کی مردانگی فیصل آباد میں زلزلہ نہیں آ رہا ہے کہیں اس کی مردانگی قحط زدہ علاقہ تو نہیں؟ میں اسی سوچ میں مستغرق تھی کہ نوجوان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''بھابی جی......'' میں چونک پڑی اور میری سوچ کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

''پلیز ایک گلاس پانی پلا دیں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' کہتے ہوئے میں کچن کی جانب لپکی ساتھ ہی زیر لب بڑبڑاتی رہی ارے ظالم پانی کیا میں تو تجھے اپنی جوانی پلانے کی جستجو میں سراپا صراحی بن چکی ہوں لیکن......

میں بجائے پانی کے شیشے کے شفاف گلاس میں شربت روح افزا لے آئی اور اس کی جانب بڑھاتے ہوئے عاجزانہ لہجہ میں کہا۔

''معذرت چاہتی ہوں میں مہمان نوازی کے فرض سے غافل رہی اس نے کسی تاثر کے بغیر میرے ہاتھ سے گلاس تھام کر گٹ گٹ سارا شربت حلق سے نیچے اتار لیا اور مجھے پرممنون نگاہوں سے تکنے لگا۔

''ایک گلاس اور لاؤں؟'' میں نے اس کے دیکھنے کے انداز پر استفسار کیا۔

''کچھ کھانے کو...... بچا ہو تو...... بہت تیز بھوک لگی ہے۔ تین دنوں سے کچھ نہیں کھایا ہے نا۔''

''ہائے اللہ میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔'' کہتی ہوئی کچن کی جانب دوڑی چند لمحے توقف کے بعد ایک رکابی میں سالن اور دو روٹیاں لیے حاضر ہوئی۔

''او...... تمہاری قسمت کا اتنا ہی بچا تھا۔''

وہ دونوں رکابیاں میرے ہاتھ سے جھپٹتے ہوئے بولا۔

''زندہ رہنے کے لیے اتنا بہت ہے پھر وہ کھانے پر ایسے ٹوٹ پڑا جیسے مہینوں بعد اسے رزق میسر آیا ہو، اس کے کھانے کے بعد اس ڈھنگ پر میں نے تاسف سے سوچا کاش ایسے ہی مجھ پر ٹوٹ پڑتا اور میرے بدن کو خوب نوچتا کھسوٹتا۔ بہرحال دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دونوں رکابیاں صاف کر دیں اس دوران میں پانی کی بوتل کے علاوہ ایک عدد سیب اور دو کیلے رکھ کے ٹوائلٹ کی جانب چلی گئی تھی۔

پانی پی کے نوجوان نے ایک ڈکار لیا اور اپنے پروردگار کا شکر ادا کیا پھر بیڈ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں، میں جب لوٹی تو دیکھا سیب اور کیلے یوں ہی دھرے ہیں اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر آنکھیں موندے پڑا ہے میں چند لمحات اسے یوں ہی ہولناک نگاہوں سے تکتی رہی۔ پھر قدرے مہکتی آواز میں کہا۔

''ارے تم نے یہ پھل نہیں کھائے۔''

میری آواز پر اس نے ہولے سے آنکھیں کھولیں پھر جیسے پلکیں جھپکانا ہی بھول گیا اس کی اس ادا پر میرے چہرے پر تبسم رقص کرنے لگا اور میں لپک کر اس کے پہلو میں جا پہنچی۔ پھر اس کی ٹھوڑی پکڑ کر استفسار کیا۔

''مجھے دیکھ کر یوں مبہوت کیوں ہو گئے، ایسا جان پڑتا ہے جیسے مجھے پہلی بار دیکھ رہے ہو۔''

''جی...... نہیں نہیں...... ہاں شاید اس کے لہجے میں بوکھلاہٹ در آئی پھر کچھ سوچتے ہوئے دریافت کیا۔'' شاید آپ نہانے جا رہی ہیں۔''

''نہیں تو۔'' میں نے پر استعجاب لہجہ میں کہا۔

''پھر...... آپ نے کپڑے......؟''

''تنہائی میں کپڑے بوجھ لگتے ہیں تم دیکھ ہی رہے ہو۔اتنے بڑے گھر میں تنہا رہتی ہوں۔''

''کیا۔''اس کا چہرہ استعجابی ہوگیا پھر کروٹ ہوکے میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں یوں گاڑ دیں جیسے آنکھوں کے راستے میرے وجود کے صحرا میں داخل ہونا چاہ رہا ہو موقع کو غنیمت جان کر میں نے مزید اس کے قریب ہوگئی تا کہ وہ میرے بدن کی گرمی کو محسوس کر سکے۔

''تم نے پھل نہیں کھائے تمہیں تو بڑی تیز بھوک لگی تھی۔''

''ہاں اس نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔''بھابی جی پورے تین دنوں سے بھوکا تھا۔''

''اف میرے اللہ تین دنوں سے متواتر؟''میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''ہاں شریعت کے مطابق مجھ پر حرام اور مردار بھی حلال ہو چکا تھا کہتے ہوئے میری پشت اس کا ہاتھ حجابانہ انداز میں آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگا۔

''لیکن میں تو سولہ مہینوں سے بھوکی ہوں۔مجھ پر کیا کیا چیزیں حلال ہوئی ہیں بتا سکتے ہو۔''میں نے جذبات کے لہجے میں سرگوشی کی۔میری اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور کسی بھوکے شیر کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑا وہ مجھ کو اپنی بانہوں کے حصار میں کستا ہوا بولا۔

''بھابی جی......ایک بات کہوں۔''اس کے لب پھسپھسائے۔

''آپ بلا کی حسین ہیں۔''

''تم بھی تو غضب کے مرد ہو۔''کہتے ہوئے میں نے آنکھیں بند کرلیں اور خوشی کے ہنڈولے میں جھومنے لگی۔

انجام کار دونوں دوڑتے دوڑتے اپنی منزل کو پہنچ گئے اور منزل پا جانے کی سرشاری نے ہمیں مدہوش کردیا تھا تقریباً گھنٹہ بھر بعد میری مدہوشی زائل ہوئی میں نے فوراً خود کو نوجوان کے پہلو سے الگ کرلیا اور خود کو پشیمانی کے گرداب میں محسوس کرنے لگی کیونکہ اب مجھ پر انکشاف ہو چلا تھا کہ جسم کی بھوک سے کہیں زیادہ پیٹ کی بھوک ہوتی ہے اور اسی بھوک کے سلسلے میں میرا شوہر بھی میرے حسن وشباب میری خوش بدنی کی لذت چھوڑ کر دیار غیر میں روٹیاں بٹورنے گیا ہے۔

......☆☆......

ذوق آگہی

سباس گل

رمضان کی آخری رات

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رمضان کی آخری رات میں آپ کی امت کے لیے مغفرت و بخشش کا فیصلہ کیا جاتا ہے آپ سے دریافت کیا گیا وہ شب قدر ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ شب قدر تو نہیں ہوتی لیکن بات یہ ہے کہ عمل کرنے والا جب اپنا عمل پورا کر دے تو اس کو پوری اجرت مل جاتی ہے۔

بحوالہ: مسند احمد، معارف الحدیث

کتاب: اسوۂ رسول اکرم ﷺ

......☆......

روزہ چھوڑنے کا نقصان

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، جو آدمی سفر وغیرہ کی شرعی رخصت کے بغیر اور بیماری جیسے کسی عذر کے بغیر رمضان کا ایک روزہ بھی چھوڑے گا وہ اگر اس کے بجائے عمر بھر بھی روزے رکھے تو جو چیز فوت ہوگئی وہ پوری ادا نہیں ہو سکتی۔

بحوالہ: مسند احمد، معارف الحدیث

کتاب: اسوۂ رسول اکرم ﷺ

ایس حبیب خان...... کراچی

حجاج بن یوسفؒ نے سیکھا

حجاج بن یوسفؒ نے ایک دفعہ طبیب سے فرمائش کی کہ مجھے طب میں سے کچھ اچھی باتیں بتاؤ۔ تو طبیب نے کہا۔

- گوشت میں صرف جوان جانور کا کھاؤ۔
- جب دوپہر کا کھانا کھاؤ تو تھوڑا سو جاؤ۔
- اور شام کا کھانا کھا کر پیدل چلو چاہے تمہیں کانٹوں پر ہی چلنا پڑے۔
- جب تک پیٹ کی پہلی غذا ہضم نہ کر لو دوسری ہرگز نہ کھاؤ۔
- جب تک بیت الخلانہ جاؤ سونے کے لیے بستر پر نہ جاؤ۔
- پھلوں کے نئے موسم میں پھل کھاؤ، جب موسم جانے لگے تو پھل کھانا چھوڑ دو۔
- کھانا کھا کر پانی پینے سے بہتر ہے زہر پی لو یا پھر کھانا ہی نہ کھاؤ۔

عبدالجبار رومی انصاری...... لاہور

خزاں رسیدہ

سنو، کبھی تم نے بادلوں کے پیچھے چاند کو دیکھا ہے جو کوشش کرتا ہے کہ بادل ہٹیں تو اپنی روشنی چاروں طرف پھیلا دے مگر بادل بھی ضد میں آگے سے نہیں ہٹتے، کچھ ایسا رشتہ میرے اور تمہارے درمیان ہے، میں چاند ہوں چاہتی ہوں کہ تمہاری چاہت کا اظہار سب کے سامنے کروں، مگر بادل سماج ہیں جو مجھے روکتے ہیں ایسا کرنے سے میرے منہ پر آجاتے ہیں لیکن میں کوشش میں ہوں کہ تمہارا ساتھ نہ چھوٹے مگر سماج آڑے آجاتا ہے اور آخر سماج کی جیت ہو جاتی ہے اور بادل سے سب طرف پھیل جاتے ہیں اور بارش برسا دیتے ہیں تم اگر سمجھو تو یہ بارش کے قطرے نہیں بلکہ میری بے بسی کے آنسوؤں کے نمکین قطرے ہیں جو تمہاری جدائی میں میری آنکھوں سے بہہ نکلتے ہیں بارش تو ہر بار ہی ہوتی ہے مگر میں پھر بھی پیاسی رہ جاتی ہوں اور خزاں کے پتے کی مانند ڈھے جاتی ہوں سہہ نہیں پاتی سماج کی اس دشمنی کو۔

انتخاب: ریاض بٹ...... حسن ابدال

دنیا کی حکمتیں

عالم میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے اس دور کی عدالتیں کچہریاں اور مختلف محکمے، اسکیمیں اور انتظامات ناکام اور فیل ہیں پورے ٹائم کی حکومتیں غیر معیاری اور تشویشناک صورتحال میں چونکہ ان کے پاس طریقہ راحت نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی کی جان وعزت مال محفوظ نہیں ہے لیکن امت مسلمہ کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے ہمارے سرکار محمد ﷺ نے اس سے زیادہ مایوس کن حالات میں اپنا پاکیزہ طریقہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور عالم کی حکومتیں اس پاکیزہ طریقہ کو اپنا کر امن و امان سے ہمکنار ہوئیں۔

آج بھی حضرت محمد ﷺ کا لایا ہوا پاکیزہ طریقہ اپنانے

اور اس کو دعوت کے ذریعے عام کرنے کی ضرورت ہے۔
آج بھی پورا عالم امن و امان سے ہمکنار ہو سکتا ہے اور ابدی راحتوں سے فیضیاب ہو سکتا ہے۔
احسان سحر...... میانوالی

جوانی، دیوانی

عالم جوانی مخلوق کے سر پر خالق کا وہ جواہرات سے بھرا ہوا تاج ہے جس کی چمک دمک سے ہر دیکھنے والے کی آنکھ زرخیز ہو جاتی ہے یہ وہ ہرا بھرا گلشن ہے جس کے جاذب نظر پھولوں میں مسرت و شادمانی کا رنگ ہے یہ وہ پر بہار وادی ہے جس میں حقیقی راحت و آرام کا سر چشمہ بہتا ہے۔ جب عالم شباب آیا تو جسم میں بجلی کی طرح رو دوڑنے لگی دل میں نت نئی تمناؤں کا ہجوم رہنے لگا دماغ ہے کہ فلک پرواز تخیلات سے نت نئی راہیں بنا کر پیش کرتا ہے آنکھیں ہیں کہ وہ دیدہ خون بن کر کسی غارت گر صبر و قرار کے جمال جہاں آرا کو دیکھنا چاہتی ہیں جس کی نگاہ تسکین سوز نے متاع دل پر ڈاکہ مارا ہو۔
اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرت کے قریب اور ماحول کے مطابق بنایا ہے لیکن آج کے انسان کا نہ صرف طرز زندگی غیر فطری ہے بلکہ یہ خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کی بجائے اسے اپنی خواہشوں کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے کوشاں ہے یہی غیر دانشمندانہ سوچ انسان کو گناہوں کی گہری دلدل کی طرف دھکیل دیتی ہے ان دنوں میں صبر و ضبط، تحمل برداشت پارسائی کا امتحان ہوتا ہے مبارک ہیں وہ لوگ جو اس پر خار راہ سے اپنے عفت و عصمت کے دامن کو بچا کر گزر جاتے ہیں اور اس جنت کی طرف دوڑتے ہیں جہاں ہمیشہ کی زندگی اور ہمیشہ کی جوانی ہے۔
عائشہ اعوان...... رحیم یار خان

بے بسی

ویسے تو بے بسی کی بہت سی صورتیں ہیں لیکن سب سے بھیانک صورت وہ ہے جس میں آپ کو اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کا بھی حق نہیں ملتا، آپ کی زندگی کا فیصلہ آپ کے اصولوں کے خلاف ہو رہا ہوتا ہے اور دربان کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑے ہوتے ہیں کیسے کیسے نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں دوسروں کی زندگی کے فیصلے کرنے کا اختیار ہوتا ہے اور اس پر قسمت کی ستم ظریفی کہ وہ نااہل لوگ اپنی نااہلی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں انسان کی ناکامی پر اس کو الزام دیا جاتا ہے کوئی یہ نہیں سوچتا کہ کیا وہ فیصلہ اس نے خود کیا تھا جس پر وہ ناکام ہوا ہے واہ رے قسمت زندگی کس کی اور فیصلے کس کے کاش فیصلہ کرنے والا یہ سوچ لے کہ جس کی زندگی کا فیصلہ میں کرنے جا رہا ہوں اس کی بھی تو کوئی اپنی سوچ ہوگی اس نے بھی تو کچھ سوچا ہوگا۔
حسین جاوید...... منچن آباد

متوازن شخصیت

ایک روایت کے مطابق پیغمبرﷺ نے فرمایا عقلمند شخص کے لیے لازم ہے کہ اس پر کچھ گھڑیاں گزریں۔
☆ایسی گھڑیاں جبکہ وہ رب سے باتیں کرے۔
☆ایسی گھڑی جبکہ وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔
☆ایسی گھڑی جبکہ وہ خدا کی تخلیق پر غور کر رہا ہو۔
☆اور ایسی گھڑی میں جبکہ وہ کھانے پینے کی ضرورتوں کے لیے وقت نکالے۔
گویا خدا کا وفادار بندہ وہ ہے جس کے روز و شب کے لمحات اس طرح گزریں کہ کبھی اس کی بے قراریاں اس کو خدا کے اتنا قریب کر دیں کہ وہ اپنے رب سے سرگوشیاں کرنے لگے کبھی یوم الحساب میں کھڑے ہونے کا خوف اس پر اس طرح حادی ہو کہ وہ دنیا ہی میں اپنا حساب کرنے لگے کبھی کائنات میں خدا کی کاریگری کو دیکھ کر وہ اس میں اتنا محو ہو کہ اس کے اندر اس کے خالق کے جلوے نظر آنے لگیں، اس طرح گویا خدا سے ملاقات میں اس کے لمحات گزرے یہ الفاظ کسی انسان کا تعارف نہیں ہیں اس میں خود پیغمبر اسلامﷺ کی اپنی شخصیت بول رہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپﷺ کے ظاہری جسم کے اندر جو پاک روح تھی اس میں ہر وقت کسی قسم کے ایمان افروز احساسات جاری رہتے تھے حقیقت یہ ہے کہ جو شخص خود ان گھڑیوں کا تجربہ نہ کر رہا ہو وہ کبھی اتنے اعلیٰ الفاظ میں اس بات کو بیان ہی نہیں کر سکتا سبحان اللہ۔
جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

رمضان اور روزہ

حضرت سلمانؓ کہتے ہیں نبی کریمﷺ نے شعبان کی آخر تاریخ میں ہم لوگوں کو وعظ فرمایا کہ ”تمہارے اوپر ایک

مہینہ آرہا ہے جو بہت مبارک مہینہ ہے اللہ تعالیٰ نے اس میں روزہ کو فرض فرمایا ہے اور رات کے قیام کو (تراویح) ثواب کی چیز بنایا ہے، اس ماہ مبارک میں ایک فرض ستر فرض کے برابر ہوتا ہے یعنی ثواب ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے جو کسی کا روزہ افطار کرائے خواہ ایک کھجور سے ہی افطار کرائے اس کے لیے گناہوں سے معافی اور جہنم سے خلاصی ہے اس ماہ مبارک کا پہلا عشرہ رحمت، دوسرا مغفرت اور تیسرا جہنم سے آزادی ہے یہ مہینہ صبر کا ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے جو شخص اس ماہ میں اپنے ماتحت (ملازم) کے بوجھ کو ہلکا کردے رب کبریا اس کی مغفرت فرماتے ہیں چار چیزوں کو اپنے اوپر لازم کرلو کلمہ طیبہ اور استغفار کی کثرت کرو اور جنت کی طلب اور آگ (جہنم) سے پناہ مانگو اس مقدس ماہ میں ایک رات ایسی ہے (شب قدر) اس کی عبادت ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے جو بندہ کسی روزہ دار کو پانی پلائے گا اللہ پاک قیامت کے دن میرے حوض سے اس کو ایسا پانی پلائیں گے جس کے بعد جنت میں داخل ہونے تک پیاس نہیں لگے گی۔

ایک روایت ہے ابن عباسؓ نے حضور اکرم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جنت کو رمضان شریف کے لیے خوشبوؤں سے دھونی دی جاتی ہے اور شروع سال سے آخر سال تک رمضان کی خاطر آراستہ کیا جاتا ہے جب رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو عرش کے نیچے سے ایک ہوا چلتی ہے جس کا نام مثیرہ ہے (جس کے جھونکوں کی وجہ سے) جنت کے درختوں کے پتے اور کواڑوں کے حلقے بجنے لگتے ہیں جس سے دل آویز سریلی آواز نکلتی ہے خوش نما آنکھوں والی حوریں اپنے مکانوں سے نکال کر جنت کے بالا خانوں کے درمیان کھڑی ہو کر آواز دیتی ہیں کہ کوئی ہے؟ اللہ کی بارگاہ میں ہم سے منگنی کرنے والا تا کہ حق تعالیٰ اس کو ہم سے جوڑ دے۔ پھر وہی حوریں جنت کے داروغہ رضوان سے پوچھتی ہیں کہ یہ کیسی رات ہے جو جواب میں کہتا ہے یہ رمضان المبارک کی پہلی رات ہے جنت کے دروازے محمد ﷺ کی امت کے لیے آج کھول دیے گئے ہیں اور روزہ داروں پر جہنم کے دروازے بند کردیے گئے ہیں سرکش شیاطین کو قید کر کے دریا میں پھینک دیا گیا ہے۔

اللہ کے حکم سے رمضان کی ہر رات ایک فرشتہ (منادی) آواز لگاتا ہے کوئی مانگنے والا ہے جس کو میں عطا کروں، کوئی توبہ کرنے والا ہے کہ میں اس کی توبہ قبول کروں کوئی ہے مغفرت چاہنے والا کہ میں اسے بخش دوں۔

اس مقدس ماہ میں روزانہ وقت افطار ایسے دس لاکھ آدمیوں کو جہنم سے خلاصی دی جاتی ہے جو جہنم کے مستحق ہو چکے تھے اور آخری دن رمضان، یکم رمضان سے آخری دن تک جتنے بندے جہنم سے آزاد کیے گئے ان کے برابر آخری روزے میں آزاد کردیے جاتے ہیں چار قسم کے لوگوں کے علاوہ سب کو معاف کردیا جاتا ہے ایک شرابی دوسرا والدین کا نافرمان تیسرا قطع رحمی کرنے والا اور چوتھا کینہ رکھنے والا۔

محمد یاسر اعوان......رحیم یار خان

ماں

وہ بچہ تقریباً چھ سات سال کا تھا جب اس کی والدہ وفات پا گئی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ اس کے والد نے دوسری شادی کرلی کچھ دن تو اس کی نئی امی نے خوب پیار کیا لیکن حقیقی ماں جیسا نہیں والد بھی شادی کے بعد رویے میں تبدیلی لے آیا دن گزرتے رہے والد اپنے کام میں مصروف ہو گیا رات کو دیر سے آتا بچہ سو چکا ہوتا ایک دن اتفاق سے والد جلدی گھر آ گیا بچے کو جاگتے دیکھ کر اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔

پیار سے پوچھا اچھا یہ بتاؤں تمہاری پہلے والی امی زیادہ اچھی تھی یا نئی والی امی، بچے نے بڑی معصومیت سے جواب دیا پہلے والے امی جھوٹی تھی اور نئی والی سچی ہے والد نے پوچھا کہ وہ کیسے جھوٹی تھی اور یہ کیسے سچی، بچے نے بڑی معصومیت سے جواب دیا کہ پہلے جب میں مستی کرتا تھا پہلے والی امی کہتی تھی اب اگر تم نے مستی کی تو شام کو کھانا نہیں دوں گی لیکن پھر بھی میں مستی کرتا اور باہر چلا جاتا تھا جب شام ہوتی تو وہ سارے محلے سے مجھے ڈھونڈ لاتی اور ہاتھ پاؤں دھوتی اور کھانا کھلاتی تھی۔

نئی والی امی سچی اس لیے ہیں کہ اس نے مجھے مستی کرنے سے منع کیا اور کہا اب اگر مستی کرو گے تو کھانا نہیں ملے گا اور آج تین دن ہو گئے میں بھوکا ہوں

علی اصغر انصاری......مچن آباد

اچھی باتیں

انسان اس دولت پر کیوں اتراتا ہے جو اگر حلال ہے تو حساب دینا پڑے گا اور اگر حرام ہے عذاب سہنا پڑے گا۔

دنیا میں انسان تو بہت ہیں لیکن ان میں سے چند ایک ہی ہیں جو خوشبوؤں سے مہکتے ہیں۔

جب پانچ سیکنڈ کی مسکان سے فوٹو اچھی ہوسکتی ہے تو ہمیشہ مسکرانے سے زندگی اچھی ہوسکتی ہے اس لیے ہمیشہ مسکرائیں۔

وہ کون سا کام ہے جو اللہ کو بہت پسند ہے لیکن نبی پاک ﷺ نے کبھی نہیں کیا جواب یہ ہے کہ حضور نبی پاک ﷺ نے کبھی اذان نہیں دی، کیونکہ اگر پیارے نبی پاک اذان دیتے تو کائنات کی ہر چیز مسجد میں پہنچ آتی اور نظام کائنات رک جاتی۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

انوکھا لاڈلا

صبح ہوچکی تھی بیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔

ماں نے سرہانے جاکر پیار سے کہا اٹھ جاؤ بہت دیر ہوگئی ہے تمہیں اسکول جانا ہے۔

''نہیں، میں آج اسکول نہیں جاؤں گا۔''

''تم دو دن سے غیر حاضر ہو، بہت بری بات ہے۔'' ماں نے قدرے خفگی سے کہا۔ ''تم اسکول جانے سے کیوں جی چراتے ہو؟''

''میں اسکول جاتا ہوں تو وہاں سب بچے اور استاد مجھ سے نفرت کرتے ہیں وہاں میرا دل نہیں لگتا آخر میں اسکول کیوں جاؤں۔''

''میرے پیارے بیٹے اسکول جاؤ۔ اس لیے کہ اب تم باون سال کے ہوگئے ہو اور تم اس اسکول کے پرنسپل ہو، آج کل گھوسٹ اسکولوں کے ساتھ ساتھ گھوسٹ اساتذہ کی بھی شامت آئی ہوئی ہے۔

عبدالرحمان...... کراچی

شکست

ہمارے نواب میاں کو کوئی ملازمت نہ ملی تو اپنے پرانے دوست کے کہنے پر مطب کھول لیا اور باہر بڑے سے تختی پر لکھوا دیا۔ ''تین سو روپے میں اپنا مکمل علاج کرائیں اگر ہم علاج نہ کرسکے تو آپ کو ایک ہزار روپے دیں گے۔ ایک بار ضرور آزمایئے۔'' کسی لالچی نے یہ تختی پڑھا تو سوچا کہ چلو ہزار روپے ہی کماؤ۔ مطب میں آیا اور بولا ''مجھے کسی بھی چیز کا ذائقہ محسوس نہیں ہوتا بہت علاج کرایا کہیں سے بھی آرام نہیں آیا آپ کا اشتہار پڑھ کر آیا ہوں۔'' نواب میاں نے شاگرد کو آواز دی اور کہا دس نمبر ڈبے میں سے دوا نکالو اور موصوف کو تین قطرے پلا دو۔'' جیسے ہی وہ قطرے لالچی کے منہ میں گئے وہ تھوتھو کرتا بولا یہ کیا یہ تو پیٹرول ہے نواب میاں، مبارک ہو آپ کے منہ کا ذائقہ ٹھیک ہوگیا ہے نکالو تین سو روپے۔'' لالچی نے جی کڑا کر کے تین سو روپے دے دیے اور اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔

اب وہ اپنی رقم نکلوانے کی ترکیب سوچنے لگا اور کسی نئی بیماری کا سوچ کر کچھ دنوں بعد پھر مطب آ گیا نواب میاں سے کہنے لگا جناب کچھ دنوں سے میری یادداشت کام نہیں کررہی۔ نواب میاں نے پھر شاگرد کو آواز دی اور کہا وہ دس نمبر ڈبے سے دوا نکالو اور مریض کو تین قطرے پلا دو۔

''لیکن یہ دوا تو زبان کا ذائقہ ٹھیک کرنے کی ہے۔'' لالچی جھٹ بول اٹھا۔ نواب میاں بولے میاں مبارک ہو آپ کی یادداشت واپس آگئی لایئے ہماری فیس۔

زین الدین شانی...... ریلوے کالونی

سبق

میں اپنے بچوں کو اپنی حیثیت سے زیادہ مہنگے اسکول میں پڑھا رہا ہوں لیکن چھوٹی گاڑی میں اسکول چھوڑنے جاتا تو شرم آتی۔ دوسرے بچے بڑی بڑی گاڑیوں میں آتے ہیں۔ کل میرا بیٹا اسکول سے ایک بچے کے ساتھ باہر نکلا۔ میں نے دیکھا وہ بچہ ایک رکشے میں بیٹھ کر چلا گیا۔ رکشے والا لے کر روانہ ہوگیا۔ گھر آکر میں نے بیٹے سے دوست کا پتا معلوم کیا سوچا اس کے باپ کو جاکر سمجھاؤں گا کہ رکشے میں بچے کا آنا جانا ٹھیک نہیں۔ وہاں پہنچ کر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور...... اور وہی رکشے والا باہر نکلا۔

شہروز...... کراچی

خوش بوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

غزل

خوابِ غفلت سے جگا دے، قوم کو بیدار کر
یاوہ گوئی چھوڑ دے ، الفاظ کو تلوار کر
تجھ کو بخشی ہے خدا نے دولتِ ذوقِ سخن
جھوٹ کی تردید کر ، سچائی کا پرچار کر
تجھ پہ لازم ہے کہ تو تصویر کا ہر رُخ دکھا
جو نہ مانے بات اس کو چھوڑ، مت تکرار کر
جو تری آنکھوں سے تیرے درد کو سمجھا نہیں
اس کے آگے خود کو مت شرمندۂ اظہار کر
یوں نہ ہو کہ وقت کی آندھی تجھے بھی لے اُڑے
آنے والے کل کی خاطر خود کو تُو تیار کر
لے نہ ڈوبے تجھ کو تیری سادہ لوحی ہم سفر
بازی گر ہے راہبر ، خود کو ذرا ہشیار کر
اہلِ ایماں پر نہ فتوے شرک و بدعت کے لگا
بت انا کے انکساری سے قمر مسمار کر

محمد قمر شہزاد آسی......کراچی

مکمل غزل......احباب کی نظر

میرے افکار میرے بعد گلشن میں پھول کھلائیں گے
مجھے مٹانے والے دیکھنا خود ہی مر جائیں گے
تیری چاہت میں صنم! زخم سینے پر کھائیں گے
لب سی لیں گے، اشک آنکھوں میں نہ لائیں گے
حق کی صدا میں خود کو سولی چڑھا جائیں گے
دل کے اوراق سے تیری یادیں جلا جائیں گے
اک غزل ایسی کہہ جائیں گے، دنیا یاد رکھے گی
آخری ملاقات کا حال سب کو بتا جائیں گے
اگر کوئی تیرے اجڑنے کا سبب پوچھے کامران
لب پہ نام لائے بغیر دل کا حال سنا جائیں گے

کامران مغل......کراچی

کئی دنوں سے
مجھے وہ میسج میں لکھ رہی تھی
جنابِ عالی
حضورِ والا
بس اِک منٹ مجھ سے بات کر لیں
میں اِک منٹ سے اگر تجاوز کروں
تو بے شک نہ کال سننا
میں زیرِ لب مسکرا کے لکھتا
بہت بڑی ہوں
ابھی نئی نظم ہو رہی ہے
وہ اگلے میسج میں پھر یہ لکھتی
سسکتی روتی بلکتی نظموں کے عمدہ شاعر
تم اپنی نظمیں تراشو لیکن
کبھی تو میری طرف بھی دیکھو
کبھی تو مجھ سے بھی بات کر لو
بس اک منٹ میری بات سن لو
میں ہنس کے لکھتا
فضول لڑکی
بہت بڑی ہوں
بس اِک منٹ ہی تو ہے نہیں ناں
وہ کئی دنوں تک خموش رہتی
پھر ایک دن میں نے اُس کی حالت پہ رحم کھا کر
جواب لکھا
بس اک منٹ ہے
اور اک منٹ سے زیادہ بالکل نہیں سنوں گا
تو اُس نے او کے لکھا اور اک دم سے کال کر دی
میں کال پک کر کے چپ کھڑا تھا
وہ گہرا لمبا سا سانس لے کر
اُداس لہجے میں بولی سر جی
میں جانتی ہوں کہ اِک منٹ ہے
اور اک منٹ میں
میں اپنے اندر کی ساری باتیں کسی بھی صورت نہ کہہ سکوں گی
سلگتی ہجرت زدہ رُتوں کو اُداس نظموں میں لکھنے والے
عظیم شاعر
خدا کی دھرتی پہ رہنے والے
اُداس لوگوں کا دکھ بھی لکھنا

کبھی محبت میں جلتے لوگوں کا دکھ سمجھنا
ابھی تو آدھا منٹ پڑا تھا
مگر وہ لائن سے ہٹ چکی تھی
وہ اِک منٹ کی جو کال تھی ناں
وہ تیس سیکنڈ میں کٹ چکی تھی
میں کتنے برسوں سے اگلا آدھا منٹ گزرنے کا منتظر ہوں
وہ نرم لیکن اُداس لہجے میں بات کرتی
اُداس لڑکی مری سماعت کے
ادھ کھلے در سے یونہی اب تک لگی ہوئی ہے
ہٹی نہیں ہے
بہت سے سالوں سے چل رہی ہے
وہ کال اب تک کٹی نہیں ہے
میثم علی آغا......اٹلی

غزل
دیوانگی سی چھا گئی انکی ادا کے بعد
اب خود میں رہا ہی نہیں ہوں نگاہ کے بعد
مجھ کو ملا دے یار میرا اے میرے خدا
مانگوں گا نہ کچھ میں بس اس دعا کے بعد
یہ عشق ہے نماز میری حج بھی یہ ہی ہے
آؤں گا اس سے باز نہ میں بھی سزا کے بعد
جس میں صنم سمایا صنم خود وہ ہو گیا
اب بچ ہی کیا گیا ہے فنا و بقا کے بعد
الفت کا ابر برس رہا تھا کہ یک بہ یک
وہ سیخ پا ہوا کیوں میرے مدعا کے بعد
سچ کہہ رہا ہے وہ کہ وفا دار ہے بہت
آیا وہ تھا ضرور پر آیا قضا کے بعد
اب کچھ غرض نہیں ہے غلامِ طاہر کو بھی
دکھتا نہیں ہے کچھ اسے اپنے پیا کے بعد
غلامِ طاہر محمد نصر من اللہ شاہ قادری......راولپنڈی

راہِ سفر میں
ایسے ہی منزل نہیں ملتی
یہاں کچھ پانے کے لیے
بہت کچھ کھونا پڑتا ہے
بہت سے لوگ ملتے ہیں
بہت سے روگ لگتے ہیں
بہت سے دل تڑپتے ہیں
مگر سمجھوتا کرنا پڑتا ہے
کبھی رستے میں گرتے ہیں
کبھی منزل کو تکتے ہیں
پھر ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے
کہ اک احساس ہوتا ہے
کہ منزل دور ہی سہی
مگر منزل پا ہی لیں گے ہم
اسی اک آس کو لیے
غم و خوشی کو ساتھ لیے
روانہ ہم سفر پر ہیں
بہت سی آزمائشوں سے
گزر کر بھی نہیں بھٹکے
پھر اک دن حوصلہ ہوا
کہ منزل مل ہی جائے گی
ہاں
منزل مل ہی جائے گی
شاعرہ: آبروِ نبیلہ اقبال......راولپنڈی

غزل
جاگتے رہنا اب ضروری ہو گیا ہے
رات بھر رونا اب ضروری ہو گیا ہے
عشق کی مرضی جہاں چاہے جھکا دے
کچھ نہیں کہنا اب ضروری ہو گیا ہے
عشق کرنے کی حماقت ہو گئی تھی
ہر ستم سہنا اب ضروری ہو گیا ہے
کیا ترے لفظوں میں واعظ دم نہیں ہے؟
کیا لہو بہنا اب ضروری ہو گیا ہے؟
لوگ پاگل مجھ کو کہنے اب لگے ہیں
ہوش میں رہنا اب ضروری ہو گیا ہے
آج اس نے زندگی کی ہے دعا دی
سو مرا مرنا اب ضروری ہو گیا ہے
رمضان نجمی......ضلع بھکر

غزل
اشکوں سے گال بھگوئے ہوں گے

جب بھی دل کھول کے روئے ہوں گے
میری آنکھوں سے نیندیں چرانے والے
خود کہاں چین سے سوئے ہوں گے
رات بھر جاگی ہوئی آنکھ گلابی ہو گی
اور پلکوں پہ کئی خواب پروئے ہوں گے
جہاں میں دیکھو جہاں دو دلوں کے بیچ
دنیا نے نفرت کے ہی بیج بوئے ہوں گے
پچھتاتے ہوں گے وہ مجھے چھوڑ کر شامی
ان کے لب پہ کئی برسوں سے نوحے ہوں گے

احتشام شامی......اٹک

محبت

محبت اور ہی شے
بھلا دو خواب کے قصے
حقیقت اور ہی شے ہے
ایسے جینا نہیں آسان
محبت اور ہی شے ہے
یہ سانسوں کا تسلسل ہے
اسے آنے دو جانے دو
اگر تم روک لیتے ہو
تو دم گھٹنے کا اندیشہ
اگر تم چھوڑ دیتے ہو
تو غم بڑھنے کا اندیشہ
سو اس پہلے قدم سے
لوٹنے کا عہد کر لو

نسیم سکینہ صدف

نئے افق اپریل کے سرورق کی غزل

پیاری سی لڑکی ساز بجائے
ساز کے سر تال ملائے
جیسے کوئی وہ نغمہ چھیڑے
نازک دل کے تار ہلائے
اجلے اجلے رنگوں میں رنگی
میٹھی لبوں پہ مسکان سجائے
سنہری زلفیں دلکشی بکھیریں
سونے جیسے تار چمکائے
مہکتی جائے وہ خوش بو کی مانند
اور نئے افق کی بزم مہکائے
دل کو بھائے پیاری سی صورت
جب جب پیار کا گیت سنائے
کانوں میں بھی رس گھولے رومی
ساز کے ساتھ جب آواز ملائے

عبدالجبار رومی انصاری......لاہور

غزل

مقدر ان دنوں کیا ہے اپنا
ہوا میں بھی دیا جلتا ہے اپنا
ضرورت کیا کسی بھی رہنما کی
ہمارے سامنے رستہ ہے اپنا
ہمیں کیا خوف آئے آئینے سے
ہمارے پاس تو چہرہ ہے اپنا
بہت ہی دور تک جائیں گے شعلے
الاؤ میں لہو جلتا ہے اپنا
ہم اپنی ذات میں اترے تو دیکھا
ہمارے پاؤں میں دریا ہے اپنا
وہی مانوس خوش بو آ رہی ہے
پرایا شہر بھی لگتا ہے اپنا
خلیل آ جائیں گے اس دن پرندے
شجر اپنے ہیں اور سایہ ہے اپنا

کلام: خلیل احمد
انتخاب: پرنس افضل شاہین......بہاولنگر

غزل

زندگی سے کیا گلہ قسمت ہی ہار گئی
محبوب کی یاد میرے دل کو مار گئی
رو رو کے کیا میں نے اپنے دل کا برا حال
چشم دل بھی اشک بار گئی
تیرا نام میرے دل پہ لکھا ہے
تیری یاد آئی اور نہ گئی یار گئی
تیری آنکھوں کی نمی دل پر اثر کرتی ہے
ایک چشم کی شعاع سینے کے پار گئی
اٹکھیلیاں کرتا رہا، نہ دیکھا دنیا کو میں نے
جب محبت ہوئی تو ہر چاہت بے کار گئی
ساری عمر جس کے پیچھے بھاگا تھا میں چاند

وہی مجھے یاد جدائی کا پہنا ہار گئی

عامر خان چاند......کوٹ ادو

غزل

عروج فن ہو میسر زوال سے پہلے
خدا دکھائے وہ دن ماہ و سال سے پہلے
کیا ہے شوق نے برباد مجھ کو بھی ورنہ
قلم تھا ہاتھوں میں میرے کدال سے پہلے
نہ جانے کس لیے اب دور دور رہتے ہیں
روش یہ عام نہیں تھی سوال سے پہلے
تری ادائیں بھی دیکھیں گے مہرباں لیکن
نگاہ ہٹے تو ذرا خدوخال سے پہلے
گلاب خوشیوں کے کھلتے تھے دل کے آنگن میں
اے ماں میں خوش تھا ترے انتقال سے پہلے
کریں گے تیری بھی باتیں مگر ٹھہر اے دل
مزاج دیکھتے ہیں عرض حال سے پہلے
نجومی کہتے ہیں نیر وصال ممکن ہے
طویل ہجر ہے لیکن وصال سے پہلے

نیر رضوی......لیاقت آباد، کراچی

غزل

آتا ہی نہیں مجھ کو
غلط کو بجا لکھنا
یہ بھی کار خیر ہوگا
میری خموشی کو صدا لکھنا
میں برہنا ہو تیرے لیے
خدارا اس مجسم کو حیا لکھنا
کبھی جو بھولے سے یاد آئے
نام محبت کی خاطر وفا لکھنا

خواجہ حسین......منچن آباد

غزل

آؤ بڑھا لیں میل جول اب وقت بھی گزر جائے گا
قائم تو رہے گا بھرم پر دل ٹوٹ جائے گا
ہاں محبت رہ گیا ہے آپ سے سلگتی جان کا
نہیں تبسم ریز پرکھنے میں تو خیال رلائے گا
گر آپ رکھ لیں گے مجھ سے قرابت کا مذاق
دم آخر جو ٹہر گیا کوئی معتبر کہلائے گا
رنگت ہے گوری یوں پھر الفت ہوگی کالی زلفوں کی
کاجل آنکھوں سے دیکھیے کیا روز روشن جھلملائے گا
نیم غیظ ہوگیا دل ترے بیابی کے بہر مقصود سے
اب جو ہوگا سر قلم تو راہ سوئے ظن پائے گا
یوں توفیق نہ رہی چارہ گر کو ترے ایمان کی
زعم ہے درویش کا دل سے چوٹ کھائے گا

سید عبداللہ توفیق......حیدرآباد

چہرہ

ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے
ایک بارہ تیرہ سالہ چہرہ جھانکا
وہ چہرہ
پیار کے پھولوں کی طرح تازہ تھا
اور آنکھیں
پہلی محبت کی طرح شفاف
لیکن اس کے ہاتھ میں
ترکاری کاٹتے رہنے کی لکیریں تھیں
اور ان لکیروں میں
برتن مانجھنے والی راکھ جمی تھی
اس کے ہاتھ
اس کے چہرے سے بیس سال بڑے تھے

کلام: پروین شاکر
انتخاب: ایم جے قریشی......ڈی آئی خان

غزل

اداس تو تم بھی ہو گے میرے بغیر
لگے گا دل کہاں تمہارا میرے بغیر
کوئی اپنا پرایا گر نظر آیا تم کو
کہاں ادب سے سلام کرو گے میرے بغیر
شمع کیوں پروانے کے سنگ سے جلتی
تم بھی یوں چل رہے ہو گے میرے بغیر
اپنا تو شام و سحر کٹتا ہے یونہی سفر
اک قدم بھی نہ چل سکو گے میرے بغیر
آنکھ میں تھے آنسو لبوں پر مسکراہٹ
عنبرین کیسے جانوں خوش رہو گے میرے بغیر

عنبرین اختر......لاہور

بیس سال بعد

زرین قمر

یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو نا کردہ قتل کے جرم میں جیل میں عمر قید کاٹتی ہے اور اپنی جوانی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار کر جب واپس گھر آتی ہے تو اس کے اولدین لاپتا ہوتے ہیں ان کے بارے میں کوئی اطلاع دینے والا میسر نہیں ہوتا پھر وہ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے اپنے والدین کو ڈھونڈنے کا مصمم ارادہ کر لیتی ہے اور حالات اور واقعات کی گرہیں کھلتی جاتی ہیں اپنے عزم و ہمت سے وہ اس راز سے پردہ اٹھانے میں کیسے کامیاب ہوتی ہے، پڑھیے اس کہانی میں جو زمانے کی ستائی ہوئی ایک باہمت لڑکی کی آپ بیتی ہے۔

میں نے کھلی فضا میں آ کر چاروں طرف نظر دوڑائی اور ایک گہری سانس لی میں نے سوچا کہ میرا ایک ہی قدم مجھے ایک دنیا سے دوسری دنیا میں لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن ایسا ہمیشہ ہی نہیں ہوتا وہ کچھ خاص ہی لمحے ہوتے ہیں جو اچانک آپ کی دنیا بدل دیتے ہیں مجھ پر بھی آج وہ لمحہ وارد ہوا تھا جب میں ایک دنیا سے دوسری دنیا میں قدم رکھ رہی تھی' دوسری دنیا یعنی حقیقت کی دنیا' سیمنٹ' سریا اور بڑی بڑی اینٹوں سے بنی مضبوط دیواروں سے باہر کی دنیا' آزاد اور حقیقی دنیا' یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ان دیواروں اور لوہے کے کانٹے دار تاروں کی دنیا سے باہر آ گئی تھی جہاں میں نے زندگی کے بے شمار سال گزارے تھے جن کا کبھی میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی مجھے یقین نہیں تھا کہ میں کبھی یہاں سے آزاد بھی ہو سکوں گی جہاں مجھے اچھے کھانوں کا ذائقہ بھی بھول گیا تھا مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے کوئی ایسی دولت مل گئی ہو جس کی مجھے کبھی امید ہی نہیں تھی یہ میرا پہلا دن تھا' پہلا دن میری آنے والی زندگی کا پہلا دن' میں نے اس لمحے کا بہت لمبا انتظار کیا تھا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس وقت میرے جذبات کیا تھے' دل چاہتا تھا کہ اپنے باہر کی ہر چیز کو اپنے اندر سمالوں چاہے وہ آزاد ہوا ہو یا میرے گرد بکھرے خوبصورت مناظر' میرے خیال میں اس لمحے کے لیے آزادی کا لفظ بہت چھوٹا تھا میں بوجھل قدموں سے سامنے کھڑی ٹیکسی میں بیٹھ گئی جو جیل کی انتظامیہ نے منگوا کر دی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ آج کی دنیا میں آزاد کون ہے ہر کسی پر کوئی نہ کوئی ذمہ داری ہے جو اسے پوری کرنی ہے' سوائے ان کے جو کسی حادثے کی وجہ سے اپنے رشتے داروں اور چاہنے والوں سے کٹ کر رہ گئے ہوں یا جنہیں زبردستی ان کے خاندانوں سے الگ کر دیا گیا ہو' ایسے لوگ کوئی حیثیت نہیں رکھتے' انہیں تو انسان ہی نہیں مانا جاتا جنہیں زبردستی قید کر دیا جاتا ہے' بدنام کر دیا جاتا ہے اور نفرت کا شکار کر کے جانوروں جیسی زندگی جینے پر مجبور کر دیا جاتا ہے ان کی بھلا کیا ذمہ داری ہو سکتی ہے؟ لیکن ہاں امیدیں ان کے دلوں میں بھی پلتی ہیں کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی اپنے پیاروں سے ملیں گے ایسا ہی دن جیسا آج میری زندگی میں آیا ہے جس کے لیے میں نے برسوں دعائیں مانگی تھیں اور اب میں اپنی نئی زندگی کی طرف سفر کر رہی تھی' اس زندگی کی طرف جو میں بیس سال پہلے گزار رہی تھی مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں جنت کا کوئی پرندہ ہوں جو برسوں لوہے کے جال والے پنجرے میں بند رہا ہے اور اب اڑنے سے ڈر رہا ہے جب اس کے لیے آزاد فضاؤں کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں' ایسے میں انجانی زندگی میں قدم رکھنے کا خوف زیادہ شدید ہوتا ہے کہ نجانے ہمارے ساتھ آگے کیا ہونے والا ہے بچھڑے ہوئے لوگ ہم سے کیسے ملیں گے' ان کے رویے ہمارے ساتھ کیسے ہوں گے میں اپنے خیالوں میں مگن ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی کھڑکی سے باہر گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھ رہی تھی جیسے جیسے مناظر میری آنکھوں سے گزر رہے تھے ویسے ویسے میری سوچ کے گھوڑے بھی اپنی سمت اور رفتار بدل رہے تھے اور مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور اپنے سامنے لگے شیشے میں مسلسل مجھے گھور رہا ہے۔

''سنو پیاری! کیا کوئی تمہارا پیارا تمہارا منتظر ہے؟'' ڈرائیور نے اپنے کاندھے سے میری طرف دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میرے امی اور ابو'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ میں اپنے خیالات میں اتنا محو تھی کہ میں نے اس کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ مجھے تو بس یہ خوشی تھی کہ اپنے گھر کی طرف سفر کر رہی ہوں اور اس خوشی میں میں نے اپنے جیلر کا بھی شکریہ ادا نہیں کیا تھا جس نے مجھے ٹیکسی منگوا کر دی تھی مجھے کچھ سفر اس ٹیکسی سے کرنا تھا اور پھر ٹرین سے اپنے گاؤں روانہ ہونا تھا پھر اسٹیشن سے گھر تک کا سفر مجھے پیدل ہی طے کرنا تھا جہاں سے میں بیس سال پہلے گئی تھی' اب تو سب مجھے بھول بھی گئے ہوں گے' شاید کوئی بھی مجھے نہیں پہچانے گا نہ ہی میرے ماضی کے بارے میں کوئی جانتا ہوگا' سوائے میرے گھر والوں کے' مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میرے ماں باپ مجھے گھر پر دیکھ کر خوش ہوں گے یا نہیں' کیونکہ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ میری وجہ سے انہیں بدنامی ملی تھی اور میں پچھلے بیس سال سے ان سے نہیں ملی تھی شاید وہ مجھے اپنی اولاد کہنے پر شرمندگی محسوس

کرتے ہوں اور لوگوں کو یہ نہ بتانا چاہتے ہوں کہ ان کی بیٹی جیل میں عمر قید کاٹ رہی ہے انہیں یقین ہی نہیں آتا ہوگا کہ ان کی پھول جیسی نازک بیٹی سرانہ ایسا بھیانک جرم بھی کرسکتی ہے' میں اب بھی وہ وقت نہیں بھولی جب میرے والدین نے روتی ہوئی آنکھوں اور سسکیوں کے درمیان مجھے رخصت کیا تھا' مجھے امید تھی کہ شاید ان کا غصہ کم ہوجائے اور وہ ایک دوماہ بعد مجھ سے ملنے آجائیں اور خاص طور سے ان خطوط کے بعد جو میں نے انہیں جیل سے لکھے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا' مجھ سے ملنے آنا تو کجا انہوں نے کبھی میرے خطوط کا جواب بھی نہیں دیا کبھی کال کرکے مجھ سے بات بھی نہیں کی۔ مجھے تو یہ ڈر بھی تھا کہ شاید میری رہائی کے بعد جب میں گھر جاؤں تو وہ مجھے گھر میں بھی داخل نہ ہونے دیں لیکن میری جیلر نے مجھے یقین دلایا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا وہ تمہیں دیکھ کر خوش ہوں گے تم سے ملیں گے' تمہیں گھر میں خوش آمدید کہیں گے اور میرا خیال تھا کہ روٹھے ہوئے والدین کو منانا زیادہ آسان ہوگا' بہ نسبت اس کے کہ میں اپنے رہنے کے لیے کرائے پر کوئی گھر یا فلیٹ لوں اور نئے سرے سے زندگی کا آغاز کروں اس کے لیے اخراجات بھی کرنا ہوں گے اور میرے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا میری 37 ویں سالگرہ میں دو مہینے باقی تھے' میں اگر جیل میں ہوتی تو میری جیلر ہمیشہ کی طرح میری سالگرہ پر کچھ تالیاں بجا کر مجھے خوش کرنے کی کوشش ضرور کرتی لیکن اب میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

جس طرح اکیلے نئی زندگی کا آغاز کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا اس طرح اپنے والدین کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کچھ اجنبیوں کے ساتھ وقت گزارا جائے بیس سال کے عرصے میں وہ میرے لیے اور میں ان کے لیے بالکل اجنبی ہوگئے تھے میں نے ایک گہری سانس لی' ڈرائیور اب بھی شیشے سے میری طرف جھانک رہا تھا۔

''کافی عرصے بعد گھر جارہی ہو؟ ہے ناں؟'' ڈرائیور نے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' میں نے ناگواری سے کہا کیونکہ میرے خیال میں اسے یہ پوچھنے کا حق نہیں تھا۔

''تمہارے حلیے سے ایسا ہی لگتا ہے' میں ایسے لوگوں کو پہلے بھی مل چکا ہوں۔'' اس نے پراعتماد لہجے میں کہا جیسے جیل سے لوگوں کو ان کے گھروں پر پہنچانا اس کی روزمرہ زندگی کا حصہ ہو۔

''حلیے سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ میں اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ میں اس کی موجودگی میں خود کو محفوظ نہیں سمجھ رہی ہوں۔

''ہاں' تم دوسروں کی طرح ہی لگ رہی ہو بالکل خالی الذہن' جیسے کے دوسرے لگتے ہیں جو جیل سے باہر جاکر اپنی زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنا چاہتے ہیں' شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جیسی زندگی وہ ماضی میں گزار کر آتے ہیں' آئندہ ویسی زندگی گزارنا نہ چاہتے ہوں' تم بھی ایسی ہی لگ رہی ہو جیسے نئی زندگی کا سامنا کرنے سے ڈر رہی ہو لیکن یقین کرو سب ٹھیک ہوگا۔'' ڈرائیور نے کہا۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اللہ پر بھروسہ رکھو جب وہ مشکلوں سے آزاد کرتا ہے تو نئی زندگی کو آسان کردیتا ہے۔'' ڈرائیور کی آواز میں اعتماد تھا میں اپنی سیٹ پر ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھ گئی' مجھے اچھا لگا تھا کہ اس نے مجھ سے ہر کسی کی طرح یہ نہیں پوچھا تھا کہ مجھے جیل کیوں ہوئی تھی اور اگر وہ پوچھتا بھی تو میں کبھی بھی اسے سچائی نہیں بتاتی۔ بات کرتے کرتے ڈرائیور نے اپنا سر اٹھایا تو میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا وہ خوش شکل اور کلین شیو تھا اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی لیکن میرا اندازہ غلط بھی ہوسکتا تھا کیونکہ میں نے اپنی آدھی زندگی میں جن مردوں کو دیکھا تھا وہ سب یونیفارم میں ہوتے تھے اور دیکھنے میں ایک جیسے لگتے تھے۔

''مجھے جیلر نے ہدایت کی ہے کہ تمہیں تمہارے والدین کی رہائش گاہ پر چھوڑا جائے جبکہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا میں زیادہ تر سواریوں کو شہر کے صدر مقام پر چھوڑ دیتا ہوں وہاں سے وہ خود جاتے ہیں لیکن تمہارے لیے لیڈی جیلر کی ہدایت تھی کہ تمہیں تمہارے گھر پر چھوڑا جائے۔'' ڈرائیور نے کہا اور میں نے سکون کا سانس لیا ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ اسے آگے ٹرین سے جانا ہوگا۔

اس کا مطلب تھا کہ مجھے ٹیکسی میں لمبا سفر کرنا تھا۔
''میں بہت کم شہر سے باہر ٹیکسی لے جاتا ہوں۔'' ڈرائیور نے پھر کہا۔ شاید وہ میری خاموشی توڑنا چاہتا تھا۔
''ٹھیک ہے۔'' میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔
گرمی بہت شدید تھی اور میری نظریں ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر گزرتے ہوئے منظر پر تھیں جہاں سرسبز کھیتوں میں گائیں گھاس چر رہی تھیں وہ منظر میں نے بہت سالوں بعد دیکھا تھا میں نے ڈرائیور پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی میں اپنے والدین کے بارے میں سوچ رہی تھی جو کافی بوڑھے ہو گئے ہوں گے اور شاید وہ سوچ رہے ہوں کہ میں مر چکی ہوں۔ تبھی انہوں نے مجھ سے رابطہ نہ کیا ہو لیکن مجھے میری لیڈی جیلر نے بہت سمجھایا تھا اور امیدیں دلائی تھیں کہ آخر کار میرے والدین مجھے قبول کر لیں گے اور میں ان کے ساتھ محفوظ اور پرسکون رہوں گی' میں نے اپنے تصور میں اپنے والدین کے گھر کو لانے کی کوشش کی کہ اب وہ کیسا ہوگا میں اتنے سالوں میں کبھی بھی اپنا بیڈروم نہیں بھلا سکی تھی حالانکہ میں جانتی تھی کہ جس دن پولیس مجھے اس گھر سے گرفتار کر کے لے گئی تھی اب وہ بہت بدل گیا ہوگا شاید وہاں میرے بچپن کی یادیں نہ ہوں یا وہ چیزیں نہ ہوں جو مجھ سے متعلق تھیں مجھے یاد ہے پولیس حکام نے میرے ہاتھوں کو میری پشت پر کر کے مجھے آہنی کڑیاں لگا دی تھیں اور میری والدہ چیخ رہی تھیں۔
''کیا یہ بہت ضروری ہے؟'' وہ چیختی رہیں لیکن کسی نے نہیں سنا میں نے جاتے جاتے مڑ کر اپنے بیڈ پر نظر ڈالی تھی جہاں میں کچھ دیر پہلے پرسکون نیند سو رہی تھی اور میرے بیڈ کے قریب دیوار پر ایک پھولوں کا پوسٹر لگا تھا جو مجھے بہت پسند تھا کیا اب وہ چیزیں ویسی ہی ہوں گی یا میری ماں نے میری تمام نشانیاں ختم کر دی ہوں گی' مجھے احساس ہو رہا تھا کہ جب میں وہاں جاؤں گی اور ان تبدیلیوں کو دیکھوں گی تو مجھے دکھ ہوگا۔
وہ طویل راستہ آخر کار کٹ گیا تھا مجھے یاد نہیں تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے کیا باتیں کیں اور میں نے اس کی کن کن باتوں کا کیا جواب دیا میں اپنے خیالوں میں گم تھی آنے والے وقت اور حالات کے بارے میں خدشات میں مبتلا تھی کہ مجھے پھر ڈرائیور کی آواز نے چونکا دیا۔
''تمہارا فکر مند ہونا قدرتی ہے' لیکن اللہ سے امید رکھو جو ہوگا اچھا ہی ہوگا دیکھو تمہارا گھر آ گیا ہے۔'' ڈرائیور نے کہا تو مجھے خوشی محسوس ہوئی کیونکہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرا گھر کس جگہ ہے یہاں اتنے سالوں میں بہت تبدیلیاں آ چکی تھیں میں حیرت سے اپنے گھر کو دیکھ رہی تھی۔
''مجھے لیڈی جیلر نے ایڈریس اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔'' ڈرائیور نے کہا۔
میں نے تشکر سے اس کی طرف دیکھا' میں اس کی بے حد ممنون تھی لیکن مجھے حیرت تھی کہ میرے والدین مجھے ملنے دروازے تک بھی نہیں آئے تھے انہیں میرا انتظار نہیں تھا؟ میں ٹیکسی سے اتر گئی اور میں نے اپنے پیچھے ٹیکسی کے ٹائروں کے چرچرانے کی آواز سنی جو تیزی سے گھوم کر واپس جا رہی تھی اور اپنے پیچھے خاصی دھول اڑا رہی تھی' میں اس دھول کو آنکھوں میں جانے سے بچانے کے لیے اپنے ہاتھوں کا سایہ کیے ہوئے تھی اور گھر کی طرف دیکھ رہی تھی۔
مجھے اس کارڈ کی بھی ضرورت نہیں تھی جو جاتے جاتے ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے تھما دیا تھا اور جس پر اس کا نام اور فون نمبر درج تھا' میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اس نے میرے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا تھا شاید وہ میری ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا چکا تھا' مجھے اس وقت کسی اور چیز کی پروا نہیں تھی سوائے اپنے والدین سے ملنے کے' میں نے اس کارڈ کو اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا جو مجھے جیل سے دیا گیا تھا اور جس میں میرا کچھ سامان تھا میں اپنے بیس سال پرانے ڈیزائن کے بنے ہوئے گھر کے سامنے کھڑی تھی نہ یہ بہت بڑا تھا نہ بہت چھوٹا ایک درمیانے سائز کا معمولی سا گھر تھا لیکن اب بھی اس میں میرے لیے میرے بچپن کی طرح بہت اٹریکشن تھا' اس کی سفید دیواریں اب بھی ویسی ہی تھیں اور باہر کے بڑے سیاہ گیٹ کے ساتھ اب بھی گلاب کی جھاڑیاں موجود تھیں جن میں پھول کھلے ہوئے تھے ان کی خوشبو نے مجھے مسحور کر دیا اور میں آنکھیں بند کر کے گہری گہری سانسیں لینے لگی میں بار بار آنکھیں کھول بند کر رہی تھی جیسے مجھے اپنے سامنے موجود منظر پر یقین نہیں

آرہا ہو یہ لمحے میرے دل میں اترتے جارہے تھے۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد تھا جب میں پہلی بار اپنے والدین کے ساتھ اس گھر میں آئی تھی میں اس وقت چھ یا سات سال کی رہی ہوں گی مجھے لگا تھا جیسے یہ کوئی محل ہو وہ اس کے کمروں میں بھاگتی پھر رہی تھی اور اپنی پوری آواز سے شور مچا رہی تھی کہ میں شہزادی ہوں اور اتنے عرصے بعد آج بھی مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا یہ گھر میرے والدین کے خوابوں کی تعبیر تھا جو انہوں نے بڑی محبت اور لگن سے بنایا تھا لیکن اس وقت یہ کوئی محل نہیں لگ رہا تھا اس کا کلر جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا جگہ جگہ مٹی کے ڈھیر تھے گھر کا باغ یوں اجڑ گیا تھا جیسے برسوں سے اس کی دیکھ بھال نہ ہوئی ہو تب ہی مجھے ایک بار پھر اپنے والدین کا خیال آیا وہ وقت کے ساتھ بوڑھے ہوگئے ہوں گے ان میں گھر کی دیکھ بھال کرنے کی طاقت نہیں ہوگی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک...... اوہ خدا نہ کرے کوئی ایک اب اس دنیا میں نہ ہو۔ اس خیال کے آتے ہی میں پھر پریشان ہوگئی کیونکہ میرے خیال میں آج کا دن جتنا میرے لیے اہم تھا اتنا ہی ان کے لیے بھی تھا آج سے ہم اپنی فیملی کی ایک نئی زندگی کی ابتدا کرنے والے تھے۔

❋......❋......❋

نورڈنین اور راحیلم ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے نورڈنین کے ہاتھ میں آج کا اخبار تھا وہ بغور ایک اشتہار پڑھ رہا تھا جس میں ایک شادی شدہ جوڑے کو ملازمت کے لیے دعوت دی گئی تھی عورت میں بہترین کھانا پکانے کی صلاحیتیں اور مرد میں ایک اچھے باغ کی دیکھ بھال کرنے کی قابلیت ہونے کی شرط تھی اور ان دونوں میں یہ صلاحیتیں موجود تھیں انہوں نے حال ہی میں ایک اچھی اور مالدار فیملی کی ملازمت چھوڑی تھی۔ یہ اچھے اور بڑے دولت مند گھرانوں میں ملازمت کرتے تھے۔

''تم نے یہ اشتہار دیکھا راحیلم۔'' نورڈنین نے پوچھا۔

''نہیں شاید میری نظر اس پر نہیں پڑی۔'' راحیلم نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''دیکھو یہ اپنے مطلب کی جگہ لگتی ہے۔'' نورڈنین نے للچائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اشتہار سے پتہ چلتا ہے ان کی صحت ٹھیک نہیں انہیں ایک ہاؤس کیپر اور مالی کی ضرورت ہے جنہیں رہائش بھی دی جائے گی گھر میں صرف میاں بیوی ہی رہتے ہیں انہیں کچھ عرصے کے لیے علاج کے سلسلے میں کہیں جانا ہے اور ان کی جگہ کوئی مناسب دیکھ بھال کرنے والا جوڑا چاہیے لیکن کچھ عرصے بعد وہ جائیں گے فی الحال ان کی دیکھ بھال کرنا ہوگی۔''

پھر نورڈنین نے ایک گھنٹے کے اندر اندر اس اشتہار کے مالکان کے بارے میں وہ ساری معلومات جمع کرلی تھیں جن کی اسے ضرورت تھی اور اس کے خیال میں وہ اس کے لیے بہت اچھے مالکان ثابت ہوسکتے تھے ان کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ دنیا کے مہنگے ترین ملک میں بھی گھر خرید سکتے تھے۔

''وہ لوگ ستر سال کی عمر میں ہیں۔ مالک جو ہے ایک ریٹائرڈ سنار ہے اور اس کی بیوی ایک پرانی ماڈل ہے جس نے بڑی دولت جمع کی ہوئی ہے وہ باہر بہت کم نکلتے ہیں اور ان کا گھر آبادی سے خاصے فاصلے پر ہے قریب میں چند ہی مکانات ہیں جو فاصلے پر ہیں۔ یہ علاقہ شہر سے بہت دور ہے اور وہاں صرف وہاں کے لوگ ہی آتے جاتے ہیں زیادہ گھما گھمی والا علاقہ نہیں اور یہ جگہ ہمارے لیے بہترین ہے۔'' نورڈنین نے کہا۔

''ہمارے لیے نہیں تمہارے لیے۔'' راحیلم نے کہنا چاہا لیکن زبان روک لی وہ نورڈنین کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے پتہ تھا کہ اس کے اور نورڈنین کے تعلقات خاصے عرصے تک کشیدہ رہے ہیں اور وہ دوبارہ اس کے عتاب کو آواز نہیں دینا چاہتی تھی وہ غصے کا بہت تیز تھا اور اس پر تشدد کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا وہ زیادہ تر خود کو اس کی نظروں سے دور ہی رکھتی تھی۔

دونوں کو اندازہ تھا کہ جب مالکان ان کا انٹرویو لیں گے تو انہیں اپنے بہترین ملازم ہونے کے لیے کچھ تصدیقی خطوط بھی پیش کرنا پڑیں گے نورڈنین نے انٹرویو پر جانے کی تیاری بڑے زور و شور سے کی تھی اور جب وہ لوگ انٹرویو دینے پہنچے تھے تو گھر میں صرف مالکن تھی اور اس گھر کا مالک ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔

''مجھے مسز جیکسن کہتے ہیں مسٹر جیکسن اس وقت ڈاکٹر سے ملنے گئے ہیں انہیں دل کا کچھ پرابلم ہے۔'' مالکن نے اپنا تعارف کروایا وہ خاصی خوش گفتار تھی ان کو اس نے گھر کے پچھلے دروازے سے اندر بلایا تھا اور یہ دروازہ کچن میں کھلتا تھا مسز جیکسن کی عمر کا اندازہ نورڈنین نے لگایا تھا وہ تقریباً پچاس سال کی تھی لیکن انداز سے جوان لگتی تھی اس کا ہیئر اسٹائل جدید طرز کا بنا ہوا تھا اور بالوں کو ڈارک براؤن کلر کیا گیا تھا جس چیز نے نورڈنین کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی موٹی سی چین تھی اس کے ساتھ ہی مسز جیکسن کے کانوں کے سونے کے آویزے اس کی انگوٹھی اور کلائی میں پڑی ہوئی سونے کی خوبصورت چوڑیاں جن میں قیمتی جواہر لگے تھے ان کی امارت کا پتہ دے رہی تھیں یہ گھر نورڈنین کے لیے ایک آئیڈیل گھر تھا اس نے معنی خیز انداز میں راجلم کی طرف دیکھا اور وہ اس کا مطلب سمجھ کر زیر لب مسکرا دیا۔

''اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔'' مسز جیکسن نے نورڈنین سے کہا راجلم گفتگو میں مداخلت نہیں کر رہی تھی وہ جانتی تھی کہ نورڈنین مہارت سے معاملات طے کر سکتا ہے۔

''ہماری جب سے شادی ہوئی ہے ہم دونوں تب سے ایک ساتھ ملازمت کرتے ہیں' ہے نا ڈارلنگ؟'' نورڈنین نے راجلم سے تصدیق چاہی اور اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

''میری بیوی گھر کے کام کرتی ہے کپڑے دھونا' کھانا پکانا' صفائی کرنا اسے طرح طرح کے کھانے پکانے کا شوق ہے۔'' نورڈنین نے راجلم کی طرف تعریفی انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا شوہر ایک بہترین مالی ہے اسے اپنے کام پر کئی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔'' راجلم نے نورڈنین کی تعریف کی۔

''اور خاص طور سے پھولوں پر تو یہ بہت اچھا کام کرتا ہے ماہر ہے۔'' اس نے مزید کہا۔

''کیا واقعی؟'' مسز جیکسن نے نورڈنین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں بالکل' گلاب کے پھول تو میرے لیے بہت خاص اہمیت رکھتے ہیں۔'' نورڈنین نے جواب دیا۔

''ہمارے دو باغ ہیں ایک گھر کے سامنے کا لان جو بائیں جانب ہے دوسرا جو گھر کے پیچھے واقع ہے۔ ہم برسوں سے ان کی نگہداشت کر رہے ہیں اور وہ بہت اچھی کنڈیشن میں ہیں ہمارا پچھلا مالی سارا دن ان میں کام کرتا تھا وہ اس میں پودوں کی قلمیں لگا کر اسے مزید بڑھا رہا تھا کیا تم بھی ایسا کر سکتے ہو؟''

''بالکل کر سکتا ہوں میں اس کا ماہر ہوں۔'' نورڈنین نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے مجھے تمہارے کاغذات دیکھ کر پتہ چلا ہے کہ اس سے پہلے تم ڈیون شہر میں ملازمت کرتے تھے جہاں کئی سالوں تک ملازم رہے اور حال ہی میں تمہاری سابق مالکہ مسز جیکب کا انتقال ہو گیا' انہوں نے تمہارے لیے جو تعریفی خط لکھا ہے اس سے میں خاصی متاثر ہوئی ہوں لیکن اس میں انہوں نے اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں کیا میں یہ خط کی کاپی اپنے پاس رکھتی ہوں تم لوگ کل صبح سے کام شروع کر دینا ابھی تو تم لوگ تھکے ہوئے ہو گے۔'' مسز جیکسن نے کہا اور ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے انہیں وہ کمرہ دکھایا تھا جو ان کے لان کے پچھلے حصے میں بنا تھا اور جہاں اس ملازم جوڑے کو رہنا تھا اس موقع پر مسز جیکسن نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ڈائری میں اس جوڑے کے لیے صرف ایک لفظ لکھا تھا۔ ''Bim go'' جس کا مطلب تھا کہ بہت سے انٹرویوز کرنے کے بعد آخر کار اس نے اپنی مرضی کا جوڑا منتخب کر لیا تھا۔

''پھر ہم کل آ جائیں گے۔'' نورڈنین نے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔'' مسز جیکسن نے جواب دیا پھر وہ ایک لمحے کو چونکی تھی۔

''کہیں تمہیں نوعمر بچوں سے پریشانی تو نہیں ہوتی؟'' مسز جیکسن نے پوچھا۔

''نوعمر بچے؟'' نورڈنین کے لہجے میں حیرت تھی کیونکہ اس کی معلومات کے مطابق مسٹر اور مسز جیکسن اس گھر میں تنہا رہتے تھے۔

''ہاں' میں نے شاید تمہیں بتایا نہیں میرے نواسی

نواسے ہیں وہ بھی میرے ساتھ رہتے ہیں۔'' مسز جیکسن نے کہا اور نورڈ نین نے راجیلم کی طرف پر معنی نظروں سے دیکھا وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے پہلے معلوم ہوتا تو شاید وہ یہاں آنے کا فیصلہ ہی نہ کرتا اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے یہاں آکر غلطی کی اور وقت اور پیسہ فضول خرچ کیا جبکہ مسز جیکسن بہت خوش تھی اس کا خیال تھا کہ آخر کار اس نے ایک اچھا ملازم جوڑا چن لیا ہے۔

پھر جب وہ اپنے شوہر جیکسن کو ان کے بارے میں بتا رہی تھی تو وہ بہت خوش تھی۔

''یقین کرو جان مجھے لگتا ہے اللہ نے انہیں ہماری مدد کے لیے بھیجا ہے وہ لوگ ہمارے لیے بالکل مناسب ہیں سارے کام جانتے ہیں پہلے بھی جہاں کام کر چکے ہیں ان لوگوں نے ان کے بارے میں اچھے تعریفی خطوط لکھے ہیں۔''

جیکسن نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا تھا خاموشی سے سنتا رہا تھا پھر آخر میں بس اتنا پوچھا تھا۔ کہ کیا وہ لوگ مالی کے کام کا کچھ تجربہ رکھتے ہیں خاص طور سے گلاب کے پھولوں کی دیکھ بھال کا۔

''ہاں وہ اس کام کا ماہر ہے۔'' مسز جیکسن نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''اور ان کا نام کیا ہے؟'' جیکسن نے ایک ساتھ کئی دوا کی گولیاں نگلتے ہوئے پوچھا۔

''نورڈ نین اور راجیلم۔''

''ہوں۔'' جیکسن نے ہنکارا بھرا۔

نورڈ نین اور راجیلن نے واپس جانے کے بعد فون کر کے مسز جیکسن کی ملازمت کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ انہیں ایک اور جگہ زیادہ اچھی آفر مل رہی تھی اسے ایک خط موصول ہوا تھا جو کسی نے اخبار میں اس کا اشتہار دیکھنے کے بعد لکھا تھا اس نے لفافے سے خط نکال کر پڑھا اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

''میں اور میری بیوی ٹرورو شہر سے باہر چند میل کے فاصلے پر زمین کے ایک خطے کے مالک ہیں ہمارا آبادی سے دور ایک فارم ہاؤس ہے ہم ریٹائرمنٹ کے بعد اس زمین کے ٹکڑے کو ہی اپنی رہائش رکھنا چاہتے ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہاں کی دیکھ بھال کرنا' ہمارے لیے اکیلے ممکن نہیں ہمارے بچے نیوزی لینڈ میں رہتے ہیں اور ہمیں اندازہ ہو رہا ہے کہ ہمیں اس وقت معاوضے پر خدمات حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمیں فارم پر کام کرنے کے لیے ایک جوڑے کی خدمات درکار ہیں جو 54 بھیڑوں کے ریوڑ اور تقریباً 500 مرغیوں کے فارم کی دیکھ بھال کر سکے اس کے علاوہ تقریباً ایک سو ایکڑ کی زرعی زمین کی بھی دیکھ بھال کرنا ہوگی جس کے ساتھ ایک خوبصورت باغیچہ بھی ہے۔

تمہارے اشتہار کو دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوا کہ تم ایک جوڑے کے طور پر کام کرنے میں دلچسپی رکھتے ہو ہمارے پاس تمہارے لیے کام موجود ہے گھر کی صفائی کے کام کا معاوضہ الگ دیا جائے گا' تنخواہ کا فیصلہ انٹرویو کے وقت ہوگا رہائش دی جائے گی اگر آپ کو دلچسپی ہو تو اس فون نمبر پر رابطہ کر لیں تاکہ انٹرویو کے لیے دن اور وقت طے کیا جا سکے۔''

تمہارے خیر خواہ (چیف پیرس)

''میرا خیال ہے یہ بہتر جاب ہے۔'' نورڈ نین نے خط تہہ کر کے راجیلم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے کیا تم انہیں کال کرو گے؟''

''نہیں' ابھی نہیں' میں چند روز بعد کال کروں گا' میں انہیں یہ تاثر دینا نہیں چاہتا کہ ہمیں ملازمت کی بہت شدید ضرورت ہے۔

❀......❀......❀

مجھے کوئی امید نہیں تھی کہ جب میں جیل سے گھر جاؤں گی تو دروازے پر میرے استقبال کے لیے غبارے اور ربن لگے ہوں گے لیکن مجھے یہ توقع تھی کہ میرے والدین ناراضگی ہی سے سہی پر میرا انتظار کریں گے لیکن یہ سب بھی نہیں ہوا تھا میں نے سامنے کے دروازے پر چار بار دستک دی تھی' آوازیں بھی دی تھیں لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ یہاں کسی کو میرا انتظار نہیں تھا کیونکہ مجھے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔

میرا حیران تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا یہ ممکن ہے کہ میں جن کی اولاد ہوں' جن کا خون ہوں' وہ گھر کے اندر خاموش بیٹھے رہیں گے اور انتظار کر رہے ہوں گے کہ میں انہیں

آوازیں دینے اور دستک دینے سے تھک جاؤں تو واپس چلی جاؤں...... نہیں ایسا نہیں ہوسکتا' یہ ممکن نہیں ہے' میں نے اپنے دل کو سمجھایا ممکن ہے میری لیڈی جیلر سے کچھ غلطی ہوگئی ہو وہ انہیں وقت پر میری رہائی کی اطلاع نہ دے سکی ہو؟

''مام...... ڈیڈ......'' میں نے پھر آوازیں دیں یہاں تک کہ میرا گلا خشک ہوگیا اور میں تھک کر چپ ہوگئی' مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں سارا دن چیختی رہی ہوں حالانکہ ابھی صرف دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تھا' مجھے سخت بھوک اور پیاس لگ رہی تھی' آس پاس کوئی گھر بھی نہیں تھا' مجھے اپنی بھوک پیاس کی اتنی پروا نہیں تھی جتنا اس بات کا دکھ تھا کہ میرے ماں باپ نے مجھے ٹھکرا دیا تھا' میں نے کئی بار دروازے میں لگے لاک کے سوراخ سے اندر جھانکا تھا جہاں میز پر رکھا گلدان نظر آرہا تھا' جس میں ہمارے باغ ہی کے کچھ پھول لگے تھے۔ دیوار پر لگی کچھ تصویریں تھیں جو واضح نظر نہیں آرہی تھیں' دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے لٹکے ہوئے تھے میرے دل میں خیال آیا کہ شاید میری مام اور ڈیڈ باغ میں گئے ہوں چنانچہ میں اٹھی اور چلتی ہوئی گھر کے پچھلے حصے میں آگئی جہاں بے ترتیب جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں' میرے والد کا پسندیدہ گرین ہاؤس بھی خالی پڑا تھا یہ وہ جگہ تھی جہاں میرے بچپن میں ہریالی ہوتی تھی اور یہاں لگائے گئے ٹماٹروں کو ایوارڈ ملتا تھا' اتنے سالوں میں بہت تبدیلیاں آچکی تھیں اب ہر طرف ویرانی کا بسیرا تھا اور مجھے احساس ہورہا تھا کہ یہاں کوئی بڑا حادثہ ہوا ہوگا کہیں میرے والدین میں سے کوئی اسپتال میں تو داخل نہیں مجھے یہاں آئے ہوئے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا اور میں اب ایسی جگہ کی تلاش میں تھی جہاں کچھ دیر آرام کرسکوں...... میں جاننا چاہتی تھی کہ کیا مجھے اس گھر میں قبول کیا جائے گا یا نہیں؟ کیا میری مام اور ڈیڈ اب بھی مجھے اپنی بیٹی سمجھتے ہیں؟ میں اپنے دل کو مطمئن کرنا چاہتی تھی میں نے اس موقع پر شکر ادا کیا کہ نزدیک میں کوئی پڑوسی گھر نہیں تھا اور مجھے اس پریشان حالی میں کسی نے نہیں دیکھا تھا میرے ہاتھ میں ابھی تک وہ بیگ تھا جو میں جیل سے اپنے ساتھ لائی تھی۔

میں نے ایک بار پھر کوشش کی اور گھر کے سارے بیرونی دروازے کھولنے کی کوشش کی اور آخر کار ایک دروازہ مجھے کھلا مل گیا اور میں گھر میں داخل ہوگئی' پہلی نظر میری جس چیز پر پڑی وہ کچن کی میز پر رکھا ہوا ایک پیپر تھا جو لفافے میں نہیں تھا بلکہ اس پر چینی کی خالی پیالی رکھی ہوئی تھی اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ خط میرے لیے لکھا گیا تھا۔

''ڈیئر سمرا! ہمیں بہت خوشی ہے کہ تم گھر آرہی ہو اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم مل کر تمہیں دوبارہ نارمل زندگی شروع کرنے میں مدد کریں گے' ہمیں احساس ہے کہ جیل میں تمہارے گزارے ہوئے برس کے دوران ہم تم سے ملنے نہیں آسکے لیکن ہم اب اس کا ازالہ کردیں گے ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔

بدقسمتی سے تمہارے والد کی بہن اور تمہاری پھوپھی آنٹی برینڈا جو آسٹریلیا میں رہتی ہیں ان کا انتقال ہوگیا ہے چنانچہ ہم یہ خط تمہارے لیے چھوڑ کر جارہے ہیں' کیونکہ ان کی تدفین کے انتظامات کرنا ہیں انہوں نے شادی نہیں کی تھی چنانچہ ان کے بچے بھی نہیں ہیں وہ تنہا زندگی گزار رہی تھیں۔

ہمیں امید ہے ہم دس دن میں واپس آجائیں گے' تمہارے جیل سے آنے کے بعد فریزر میں کافی کھانا موجود ہے اور کچھ بریڈ اور ملک باتھ روم کی الماریوں میں بھی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ تمہارے گھر آنے کے وقت ہم وہاں موجود نہیں ہوں گے ہم نے تمہاری بہن مرجانہ کو اپنے جانے کے بارے میں نہیں بتایا ہے کیونکہ ہم اسے پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تم آرام سے گھر میں رہو ہم جلد ہی واپس آجائیں گے پھر بہت سی باتیں کریں گے۔''

بہت پیار (مام اینڈ ڈیڈ)

اس خط نے مجھے اور پریشان کردیا تھا پہلے تو وہ مجھ سے ملنے جیل نہیں آئے اور اب جو خط لکھا اس میں اور ہی طرح کے جذبات کا اظہار تھا یہ میرے لیے حیران کن تھا پھر انٹی برینڈا کے بارے میں میں بالکل بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کون تھی پھر اگر مام اور ڈیڈ کو وہاں جانا ہی پڑا تھا تو وہ مجھے کوئی فون نمبر دے کر جاسکتے تھے تاکہ میں انہیں فون تو

کرسکوں اور خود کو مطمئن کرسکوں۔

میں نے ہرگز نہیں سوچا تھا کہ جیل سے رہائی کے بعد میرا پہلا دن ایسا گزرے گا۔ پہلے تو وہ ٹیکسی ڈرائیور جسے میرے بارے میں پوری معلومات تھیں کہ میں نے کس جرم میں جیل میں بیس سال گزارے اور اب ایک خالی گھر میرا استقبال کررہا تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہورہی تھی کہ میرے والدین نے اپنی ضعیف العمری کے باوجود گھر کو بہت صاف ستھرا رکھا ہوا تھا گھر میں موجود چیزوں کے اوپر بہت ہلکی سی مٹی کی تہہ تھی یوں لگ رہا تھا جیسے انہوں نے یہاں سے جانے سے پہلے گھر کی اچھی طرح صفائی کی ہو گھر کا سارا فرنیچر اور برتن بھی وہی تھے جو مجھے یاد تھے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ گھر کے باغ اتنی خراب حالت میں کیوں تھے پھر میں سارے گھر کا جائزہ لینے لگی جگہ جگہ میری تصویریں لگی ہوئی تھیں لیکن وہ سب آڑی ترچھی لگی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے بڑی جلدی میں لگائی گئی ہو پھر ایک تصویر پر میری نظریں رک گئی تھیں یہ میری وہ تصویر تھی جو جیل جانے کے واقعے سے پہلے لی گئی تھی اس وقت میں سولہ سال کی تھی تصویر میں میں مسکرارہی تھی میں بہت خوش تھی میں اس وقت نہیں جانتی تھی کہ اس تصویر کے بننے کے صرف ایک ماہ بعد ہی میری زندگی میں ناگوار تبدیلی آجائے گی تب میں بہت معصوم اور احمق تھی اس تصویر کو دیکھنے والا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ تصویر میں موجود لڑکی قتل بھی کرسکتی ہے ہاں قتل...... جس کے لیے مجھے عمر قید ملی تھی۔

جب میں زینہ چڑھتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف جارہی تھی تو میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا میں سوچ رہی تھی کہ کیا میرا کمرہ اب بھی ویسا ہی ہوگا جیسا میں چھوڑ کر گئی تھی، پھر میں نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا تھا میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے کیونکہ سارا گھر دیکھنے کے بعد مجھے امید تھی کہ جیسے گھر پہلے والی حالت میں موجود تھا میرا کمرہ بھی ابھی تک ویسا ہی ہوگا لیکن وہی ایک کمرہ تھا جسے تبدیل کیا گیا تھا میں اسے پہچان نہیں سکی تھی میرے بیڈ پر کاغذوں کا پلندہ رکھا تھا اور میں دروازے میں کھڑے کھڑے ہی بتاسکتی تھی کہ یہ وہ خطوط تھے جو میں نے اپنے والدین کو جیل سے لکھے تھے، ان خطوط کو دیکھ کر میرے منہ سے بے ساختہ وہ جملہ ادا ہوگیا جو میں دوسروں کے منہ سے سننا چاہتی تھی لیکن میرے کان یہ جملہ سننے سے محروم رہے تھے۔ ''گھر میں خوش آمدید سمرانہ''

❁......❁......❁

نورڈنین اور راحیلم نے جیف پیرس کے ہاں ملازمت کرلی تھی اور نورڈنین نے راحیلم کی ڈیوٹی لگادی تھی کہ وہ سائے کی طرح جیف کی بیوی جین کے پیچھے لگی رہے گی گھر کی ہر چیز کا پتہ رکھے گی ان کی ہر ضرورت کا پتہ رکھے گی، جین بھی بہت خوش تھی بہت سے کام اس کے کہنے سے پہلے ہی ہوجاتے تھے وہ حیران تھی کہ نورڈنین اور راحیلم دماغ پڑھنے کی صلاحیت رکھتے تھے انہیں اندازہ ہوجاتا تھا کہ اب جیف یا جین اس سے کس کام کے لیے کہنے والے ہیں وہ دونوں بے حد مستعد تھے۔

''کیا آپ مطمئن ہیں مسز جیف۔'' راحیلم ہاتھ باندھے جین کی خدمت میں موجود تھی جین نے حیرت سے اسے دیکھا وہ اس وقت راحیلم کی موجودگی کی توقع نہیں کررہی تھی اور اس کے ہر وقت پیچھا کرتے رہنے کو پسند نہیں کرتی تھی۔

''راحیلم! تم یوں ہر وقت میری ٹوہ میں نہ رہا کرو۔'' جین نے کہا اور راحیلم مسکرادی۔

''میں معذرت چاہتی ہوں مسز جیف۔'' راحیلم نے اپنے سفید ایپرن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا نہیں تھا۔''

''ارے...... تم پریشان ہوگئیں؟ میں تو مذاق کررہی تھی۔'' جین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اوہ...... میں سمجھی آپ مجھ سے پریشان ہوگئی ہیں۔''

''تم سے میں کیسے پریشان ہوسکتی ہوں۔'' جین نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا پھر اس نے میز پر رکھی ایک سنہری سونے کی پیالی اٹھائی تھی۔ ''دیکھو میں برسوں سے اسے استعمال کررہی تھی صرف اس لیے کہ یہ میری ماں کی نشانی ہے اور جیف کو پسند ہے لیکن آج جب تم نے اسے چمکایا تو مجھے اس کی اہمیت کا احساس ہوا۔ یہ سونے کی پیالی اب اپنی قدر و قیمت دکھارہی ہے۔''

''میں نے بیس منٹ تک اسے رگڑ کر صاف کیا ہے۔'' راجیلم نے کہا۔

''ہوں' اس گھر میں ایسے بہت سے قیمتی نوادرات ہیں جن پر تمہیں توجہ دینا ہوگی۔'' جین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایسی ہی ایک قیمتی سونے کی پیالی میری پچھلی مالکن کے پاس بھی تھی۔'' راجیلم نے کہا۔

''اچھا واقعی؟'' جین نے ہنس کر کہا۔

نورڈنین اور راجیلم کو جیف کے گھر کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن وہ اس کے کام سے بہت حد تک مطمئن ہوگئے تھے اور ان پر اعتماد بھی کرنے لگے تھے۔

''راجیلم' میرا خیال ہے ہمیں یہاں کام کرتے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے میں اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا اب ہمیں یہاں سے نکلنے کی تیاری کرنا چاہیے اور موقع دیکھ کر ہاتھ صاف کرنا چاہیے۔'' ایک روز نورڈنین نے اس سے کہا تو اس کا دل چاہا کہ وہ نورڈنین کی بات ماننے سے انکار کردے اتنے اچھے مالکان کو دھوکا دینے کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن وہ اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے انکار کے بعد نورڈنین اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا وہ اس سے جھگڑا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

❀......❀......❀
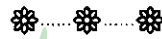
پہلی رات میں نے جیسے ہی تکیے پر سر رکھا تھا مجھے فوراً ہی نیند آگئی تھی اور پھر میری آنکھ تیرہ گھنٹے بعد کھلی تھی میں بیس سال بعد اپنے کمرے کے آرام دہ بستر اور پرسکون ماحول میں سوئی تھی اور جب میری آنکھ کھلی تو کچھ دیر کے لیے میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں کہاں ہوں کیونکہ اس سے پہلے تو میری آنکھ جیل کی کال کوٹھری میں کھلتی تھی جس کی میں عادی ہوچکی تھی پھر ایک ہفتہ پلک جھپکتے گزر گیا تھا' مجھے مام اور ڈیڈ کی کوئی خبر نہیں تھی میں گھر کا چپہ چپہ چھان چکی تھی کھانے پینے کی ضروری اشیاء جیسے بریڈ' دودھ' مکھن' چینی وغیرہ ختم ہوچکی تھیں وقت گزارنے کے لیے میرے پاس کوئی مصروفیت نہیں تھی ایسے میں میں نے ان خطوط کا تفصیلی جائزہ لینے کا فیصلہ کیا جو میں اپنے والدین کو لکھتی رہی تھی اس کا تو مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ لفافوں سے باہر تھے تو انہیں پڑھا جاچکا تھا پچھلے دو دن سے میں لیڈی جیلر کا بھی انتظار کررہی تھی کیونکہ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے آئے گی لیکن وہ نہیں آئی تھی اس نے مجھے ایک مختصر سا خط لکھا تھا کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ نہیں آسکی چنانچہ اگلے ہفتے آئے گی اور میں نے سوچا کہ ممکن ہے تب تک میرے والدین بھی واپس آجائیں۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میں گھر سے باہر نکلوں اور کچھ دور تک چہل قدمی کروں اس طرح اطراف کا جائزہ بھی لینے کا موقع ملے گا اور میں نے یہاں آتے ہوئے راستے پر ایک سپر اسٹور بھی دیکھا تھا جہاں سے مجھے کھانے پینے کا کچھ سامان بھی مل سکتا تھا' میں اکیلے رہتے رہتے بور ہوگئی تھی اکثر خود کلامی کرنے لگتی تھی اور میرا خیال ہے کہ یہ پاگل پن کی پہلی نشانی ہوتی ہے' میں نے جیل میں اپنی اس عادت پر قابو پانے کی پوری کوشش کی تھی۔

میں جب گھر سے نکلی اور گھر کے باہر کے راستے سے چلتی ہوئی اس سمت بڑھی جدھر کچھ فاصلے پر اسٹور واقع تھا تو وہاں چہل پہل بالکل نہیں تھی صرف ایک کتا میرے آگے آگے چل رہا تھا اور راستے میں ایک کار کھڑی نظر آئی تھی جس کا مالک اس کے قریب نہیں تھا کچھ دور جانے کے بعد مجھے اسٹور نظر آنے لگا تھا دور دور کچھ عمارتیں موجود تھیں مجھے جو اسٹور نظر آرہا تھا اسے ڈاک خانے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا' میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے خریداری کے سامان کی فہرست نکالی اور اسٹور میں داخل ہوگئی' مجھے وہاں خوش کن ٹھنڈک کا احساس ہوا اور میں خود کو خریداری کرنے کے لیے تیار کرنے لگی کیونکہ میں ایسے کاموں سے بیس سال سے دور تھی دل میں ایک ہلکی سی ہچکچاہٹ تھی میں اکثر راتوں کو تصور میں دیکھتی تھی کہ میرے ہاتھوں میں کچھ رقم ہے اور میں کچھ چیزیں خرید رہی ہوں' پچھلے بیس سالوں میں یہ میری شدید خواہش رہی تھی اور یہ خواہش اب پوری ہونے جارہی تھی۔ مجھے 20 پاؤنڈ کا نوٹ باتھ روم کی الماری میں سے ملا تھا یہ بہت زیادہ رقم نہیں تھی لیکن اس سے میں اتنا سامان تو لے ہی سکتی تھی جو میرے والدین کے آنے تک چلتا رہے یہ نوٹ میرے والدین نے اسی مقصد کے لیے وہاں رکھا تھا اور یہ بات

انہوں نے اپنے ایک نوٹ میں میرے لیے لکھ دی تھی میں نے خریداری کرتے ہوئے ان کی ہدایات کا خاص خیال رکھا تھا اور کوئی فضول خرچی نہیں کی تھی' خریداری کے بعد میں نے کاؤنٹر پر جا کر رقم ادا کی تھی اور جب میں واپسی کے لیے اسٹور کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی تو میں نے ایک بوڑھی عورت کو دیکھا جو پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہی تھی' میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس پر توجہ دیئے بغیر یہاں سے نکل جاؤں گی۔ میں لوگوں کے بے مقصد سوالات کا سامنا کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی پھر میں نے یہی کیا تھا میں اس کو نظر انداز کر کے اس کے قریب سے گزر گئی تھی اور اسٹور کے دروازے سے باہر آ گئی تھی۔

وہ بہترین لباس پہنے ہوئی تھی لگتا تھا کوئی اچھی ملازمت کرتے رہنے کے بعد اچھی پینشن پر ریٹائر ہوئی ہو' اس کے ہاتھ میں واکنگ اسٹک تھی اور وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی میں بیس سالوں میں خاصی تبدیل ہو چکی تھی میں نہیں چاہتی تھی کہ اگر مجھ سے میرے یا میرے والدین کے بارے میں پوچھا جائے تو مجھے بتانا پڑے کہ وہ مجھے تنہا چھوڑ گئے ہیں اس کی وجہ میں خود بھی نہیں جانتی تھی اور لوگوں سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی اگر اس علاقے میں کوئی ایسا موجود بھی تھا جسے سمرانہ جیکب یاد ہو تو وہ اسے مجھ سے تشبیہ نہیں دے سکتا تھا کیونکہ میں بہت بدل گئی تھی۔

''تم سمرا ہو؟ ہے نا؟'' اس نے پشت سے آواز لگائی اور میرا ہاتھ پکڑ لیا میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور آگے بڑھی۔

''مجھے یقین ہے تم سمرا ہو...... سمرانہ جیکب تم بالکل اپنی ماں سے ملتی ہو...... بے چاری مسز جیکب۔'' میں رک گئی اور میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''اوہ...... مجھے معلوم تھا...... تم ہی سمرا ہو۔'' اس کی آنکھوں میں حیرت تھی میرا دل چاہا کہ میں اس سے پوچھوں کہ وہ کون ہے لیکن میں رک گئی کیونکہ اس نے ایک ایسی بات کہی تھی جس نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ''بے چاری مسز جیکب'' کیا وہ ان کے بارے میں کچھ جانتی تھی اس خیال کے آتے ہی میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''ہاں' میں سمرا ہوں...... ؟ آپ کون ہیں...... ؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جوڈ ِتھ اسٹیون ہوں...... میں پوسٹ آفس میں کام کرتی تھی۔'' اس نے بتایا اور شاید میں اسے پہچان گئی اپنے والدین کے ساتھ مجھے کئی بار پوسٹ آفس جانے کا اتفاق ہوا تھا۔

''بہت سالوں پہلے جو ناگوار حادثہ ہوا تھا مجھے امید ہے اس نے تمہیں بہت زیادہ نہیں توڑا ہوگا۔'' اور میں گنگ سی ہو کر رہ گئی میں اسے کوئی جواب نہیں دینا چاہتی تھی کیونکہ اس طرح مجھے اس جرم کے بارے میں بھی بات کرنا پڑتی جو میری سزا کی وجہ بنا تھا شاید وہ میرے جذبات کو سمجھ گئی چنانچہ دھیرے سے مسکرائی اور میرا کاندھا تھپتھپایا۔

''مجھے امید ہے تمہاری ماں کی بیماری ٹھیک ہو گئی ہوگی۔''

''بیماری...... کیسی بیماری؟''

''اوہ...... دراصل میں نے اسے کافی عرصے سے نہیں دیکھا شاید اٹھارہ سال ہو گئے ہیں...... یا شاید زیادہ ہو گئے ہوں' میں جب بھی اس سے پوچھتی تو یہی پتہ چلتا کہ وہ بیمار ہے پھر بعد میں بھی یہی بتایا جاتا رہا۔''

''یہی بتایا جاتا رہا ہے سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ وہ بستر پر پڑی ہے...... گھر کا ملازم یہی بتاتا تھا' میرا خیال تھا کہ اب جب تم گھر آ گئی ہو تو سب کچھ ٹھیک چل رہا ہوگا۔''

''گھر کا ملازم؟'' میں بڑبڑائی۔

''کیوں؟ کیا تمہارے والدین نے تمہیں اس بارے میں نہیں بتایا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''انہوں نے گھر میں ایک جوڑے کو ملازم رکھا تھا' تمہارے جانے کے کچھ ہی عرصے بعد...... میں نے کچھ عرصے سے انہیں بھی یہاں نہیں دیکھا...... میرا خیال ہے کہ تمہارے واپس آنے کے بعد ان کی ضرورت بھی نہیں رہی ہوگی۔'' وہ مسلسل بولے جا رہی تھی میں دھیرے سے مسکرا دی میں اس سے جلد از جلد پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔

''اگر تمہیں بوریت محسوس ہو اور کچھ خوشگوار تبدیلی چاہو یا یہ معلومات لینا چاہو کہ کسی کی دیکھ بھال کیسے کی جاتی ہے تو مجھ سے ضرور ملنا...... میں اب بھی اسٹور کے اوپر والے حصے میں رہتی ہوں۔'' اس نے ہاتھ سے اسٹور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے بھی اپنے شوہر کی اس کی موت سے پہلے پندرہ سال تک تیمارداری کی تھی...... مجھے خاصا تجربہ ہے میں تمہاری مدد کرسکتی ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی' بہت شکریہ۔'' میں نے کہا لیکن مجھے یقین تھا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی اور میں کبھی اس کے پاس نہیں جاؤں گی۔

''اپنی ماں کو میرا پیار دینا۔'' اس نے کہا اور واپس مڑگئی۔

''جی' ضرور۔'' میں نے کہا میں حیران تھی کہ میرے والدین نے کبھی مجھے گھر کے ملازموں یا مام کی صحت کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا۔

❁......❁......❁
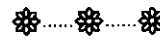
نورڈنین اور راحیلم سارے دن کی مصروفیت سے فارغ ہوکر اپنے کمرے میں آگئے تھے اور نورڈنین چاہتا تھا کہ اب راحیلم ایک بیوی کی ذمہ داری پوری کرے' اس کا دل بہلائے اس کا رویہ راحیلم کے ساتھ کبھی اچھا نہیں رہا تھا راحیلم مجبوراً اس کے ساتھ وقت گزار رہی تھی وہ کچھ عرصے سے اپنی طبیعت میں گرانی محسوس کررہی تھی اور نورڈنین سے دور دور رہنا چاہتی تھی وہ جانتی تھی کہ اس کا انجام کیا ہوگا' یا تو نورڈنین وقتی طور پر اس کی بے رخی کو نظرانداز کردے گا اور یا اس پر تشدد کرے گا نورڈنین کافی رات گئے تک اسے مناتا رہا تھا لیکن جب وہ نہیں مانی تھی تو اس سے زبردستی شروع کردی تھی اور آخری حربے کے طور پر راحیلم نے خود کو باتھ روم میں بند کرلیا تھا اب وہ مسلسل دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

''راحیلم' دروازہ کھولو...... میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔''

''جاؤ......نورڈنین میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اس نے کراہ کر کہا۔

''میں جانتا ہوں......تم تھکی ہوئی ہو اور پھر صبح دوبارہ ہمیں کام کرنا ہوگا......تم باہر آجاؤ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔'' نورڈنین نے پھر اسے سمجھایا لیکن وہ نہیں مانی پھر نورڈنین نے دو تین بار اور اسے آوازیں دی تھیں اور تب تک وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئی تھی۔

صبح ہوتے ہی نورڈنین نے پھر اسے آوازیں دی تھیں اور جب اس نے دروازہ نہیں کھولا تھا تو اس نے دھکا مار کر دروازہ توڑ دیا تھا اور اسے گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے گیا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے نا کہ میں تمہیں اس حرکت پر کیا سزا دیتا ہوں؟'' اس نے غرا کر کہا اور پھر اپنی پتلون سے اپنی چمڑے کی بیلٹ نکال کر اس کی پٹائی شروع کردی وہ رو رہی تھی سسکیاں لے رہی تھی معافیاں مانگ رہی تھی لیکن نورڈنین کافی دیر تک اسے مارتا رہا تھا یہاں تک کہ جب وہ تھک گیا تھا تو بیلٹ ایک طرف پھینک دی تھی اور ہاتھوں سے اسے مارنا شروع کردیا تھا وہ اس کے چہرے' کمر اور ٹانگوں پر گھونسے برسا رہا تھا پھر تھک ہار کر باہر چلا گیا تھا راحیلم نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا تھا اور پھر مالکوں کے گھر میں جاکر کام میں مصروف ہوگئی تھی اور ناشتہ کرتے ہوئے جین نے جیف کو بتایا تھا کہ اسے اس جوڑے سے خوف محسوس ہوتا ہے۔

''تم کیا کہہ رہی ہو؟'' جیف نے حیرت سے کہا۔

''ہاں' میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ...... رات میں نے عجیب وغریب آوازیں سنی ہیں۔''

''کیسی آوازیں؟''

''نورڈنین نے راحیلم سے بہت لڑائی کی ہے۔''

''لڑائی؟''

''ہاں لڑائی ...... بلکہ لڑائی کہنا مناسب نہیں ہوگا اس نے راحیلم کو مارا ہے اس پر تشدد کیا ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' جیف نے پوچھا۔

''میری تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں' وہ بہت بری طرح اسے مار رہا تھا۔''

''ارے تو تم نے مجھے کیوں نہیں جگایا؟''

''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی تو میں اکیلی ہی سیڑھیوں سے نیچے آئی اور آوازیں سنتی رہی وہ باتھ روم میں

گھس گیا تھا جہاں راجیلم چھپی ہوئی تھی اور اسے مار رہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ وہ اسے مار ہی ڈالے گا لیکن خدا کا شکر ہے میں نے ابھی اسے دیکھا ہے۔"

"کیا وہ ٹھیک ہے؟"

"اگرچہرے اور ہاتھوں پر نیل پڑے ہونا ٹھیک ہونے کی علامت ہے تو وہ ٹھیک ہے اور زندہ ہے۔"

"کیا اس نے کچھ بتایا؟"

"بس اتنا کہ وہ سیڑھیوں سے پھسل گئی اسے چوٹیں آئی ہیں اور آج کوئی کام نہیں کر سکے گی۔" جین نے کہا۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" کچھ دیر بعد جین نے جیف سے پوچھا تھا۔ "میں نہیں چاہتی کہ ہمارے گھر میں ایسی صورتحال پھر ہو کیا ہوگا اگر وہ طیش میں آ گیا اور اس نے ہم پر حملہ کر دیا؟" جین نے خوفزدہ انداز میں کہا اس کی بات پر جیف نے کچھ دیر سوچا تھا اور پھر پیار سے جین کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

"میرے پاس اس کا دیا ہوا تعریفی خط ہے اس کے پچھلے مالکان کا جن کی رہائش ڈیون میں ہے ہم کیونکہ ان ملازمین سے بہت متاثر ہو گئے تھے تو میں نے کوئی تحقیق نہیں کی تھی میرا خیال ہے آج میں فون پر ان کی پچھلی مالکن سے بات کرتا ہوں۔" جیف نے کہا۔

"لیکن انہوں نے تو بتایا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا تھا؟"

"ہاں' یہ تو مجھے یاد نہیں لیکن ہاں کوئی تو ہوگا جو ہمارے فون کا جواب دے گا یا گھر کی ڈاک وغیرہ چیک کرتا ہوگا ہمیں رابطہ تو کرنا چاہیے۔"

"تو پھر یہ کام آج ہی کر لو جیف...... میں نے اس باتھ روم سے آتی ہوئی جو آوازیں سنی ہیں وہ مجھے خوفزدہ کر رہی ہیں۔"

❀......❀......❀
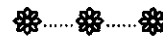
مجھے دو خط موصول ہوئے تھے ایک خط لیڈی جیلر کا تھا جو ٹائپ ہوا تھا اور دوسرا خط ہاتھ سے لکھا ہوا تھا اس خط کو ہی میں نے پہلے کھولا تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ وہ خط میرے والدین نے مجھے لکھا ہوگا اور اس میں انہوں نے بتایا ہوگا کہ وہ کب تک واپس آ رہے ہیں اس لیے بڑے شوق سے خط پڑھنا شروع کیا۔

"ڈیئر مسز جیکب!

میں آپ کو یہ خط آپ کے ملازمین نورڈنین اور راجیلم کے بارے میں لکھ رہا ہوں' میں نے اور میری بیوی نے انہیں بہت جلدی میں ملازمت دی تھی چنانچہ ان کے دیے ہوئے ریفرنس کی تصدیق نہیں کر سکے تھے ہم نے محسوس کیا ہے کہ آپ نے ان دونوں کے بارے میں بہت سی اچھی باتیں لکھی ہیں لیکن میں آپ کا بہت مشکور ہوں گا اگر آپ فون پر بات کرنے کے لیے مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں۔"

آپ کا خیر خواہ (جیف پیرس)

خط میں جیف کا پتہ بھی درج تھا' میں نے خط پڑھ کر ایک طرف رکھ دیا اور اپنے قریب رکھے ٹھنڈے دودھ کے چند گھونٹ لیے میں سوچ رہی تھی کہ کوئی خاص ہی بات ہوگی جس نے جیف پیرس کو خط لکھنے پر مجبور کیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی خیال آیا کہ نورڈنین اور راجیلم شاید میرے والدین کے بارے میں کچھ ایسی بات جانتے ہوں جو میں نہیں جانتی' میرے گھر کا فون کٹ گیا تھا چنانچہ لیڈی جیلر نے بھی مجھے خط ہی بھیجا تھا کیونکہ میرے والدین جب گئے تھے تو ٹیلی فون کا بل ادا نہیں کیا تھا' لیڈی جیلر نے مجھے اپنے گھر میں بتایا تھا کہ وہ دو ہفتے تک مجھ سے ملنے آئے گی میرے پاس تقریباً چودہ دن تھے جن میں' میں اس راز سے پردہ اٹھا سکتی تھی کہ میں اپنے گھر میں تنہا کیوں ہوں؟

میں احمق نہیں تھی' نہ ہی مجھے اکیلے رہنے سے خوف آتا تھا میں نے بیس سال جیل میں تنہا ایک کال کوٹھڑی میں گزارے تھے لیکن اب میں جن حالات سے دوچار تھی اس میں مجھے خطرے کی بو آ رہی تھی اور میں اس معاملے پر جتنا سوچ رہی تھی اتنا ہی میرا یقین بڑھتا جا رہا تھا کہ میرے والدین آسٹریلیا میں نہیں ہیں' مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اب بھی جیل میں ہوں' میں زندہ نہیں ہوں میں ایک کال کوٹھڑی سے ایک خالی اور ویران گھر میں منتقل کر دی گئی ہوں اور جس کا زندہ لوگوں کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جب سے مجھے بوڑھی جوڈتھ اسٹیون نے گھر کے ملازمین کے بارے میں اطلاع دی تھی تب سے میرے

دماغ میں ایسی ہی باتیں آرہی تھیں کہ کیا میرے والدین زندہ ہیں؟ میں جیف کا خط پڑھنے کے بعد اس سے ملنا چاہتی تھی اور نورڈنین راجیلم کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھی میں ان سے پوچھنا چاہتی تھی کہ میرے والدین کہاں ہیں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مجھے کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جس سے میں اس سلسلے میں مشورہ کرسکوں اور جان سکوں کہ یہاں کیا ہوتا رہا ہے اور شاید ایسی کوئی بھی انفارمیشن مجھے جوڈیتھ سے مل سکتی تھی چنانچہ میں نے اس سے ملنے کا فیصلہ کیا حالانکہ پہلے میں فیصلہ کرچکی تھی کہ میں اس بوڑھی عورت سے نہیں ملوں گی میں خوفزدہ تھی میں اپنے بارے میں بہت سے سوالات کے جواب نہیں دینا چاہتی تھی لیکن اب نئی صورت حال نے مجھے اس سے ملنے پر مجبور کردیا تھا۔

میں بڑی عجلت میں جوڈیتھ سے ملنے گئی تھی اور اس کا دروازہ جلدی جلدی کئی بار کھٹکھٹایا تھا۔

''میں آرہی ہوں۔'' مجھے جوڈیتھ کی آواز سنائی دی تھی۔

''اوہ سمرانہ یہ تم ہو۔'' وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی اور دروازہ کھول کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''میں تو ناامید ہوچکی تھی کہ شاید تم مجھ سے ملنے نہ آؤ۔'' اس نے کہا وہ لاٹھی ٹیک کر آہستہ آہستہ زینہ چڑھنے لگی تھی جس میں میں نے اس کی مدد کی۔

''یہ لاٹھی میرا بڑا سہارا ہے...... اگر یہ نہ ہوتی تو میرا چلنا اور بھی مشکل ہوتا۔''

''اللہ تعالیٰ آسانیاں پیدا کرتا ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

جب میں اس کے فلیٹ میں داخل ہوئی تو حیران رہ گئی اس کا فرنیچر خاصا ماڈرن تھا اور اس کے ٹی وی لاؤنج میں 50" کی LED لگی ہوئی تھی۔

''کیا یہ کام کرتی ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میری نظر بہت کمزور ہوگئی ہے مجھے ایسی اسکرین کی ضرورت تھی میرا خیال ہے تم نے تو ابھی تک اتنی بڑی اسکرین نہیں دیکھی ہوگی۔ میں جب فلم دیکھ رہی ہوتی ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں سینما ہاؤس میں بیٹھی ہوں۔'' اس نے کہا اور مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا میں بیٹھ گئی لیکن میں خاموش تھی میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں بات کیسے شروع کروں۔

''کیا بات ہے!تم کچھ پریشان ہو۔'' اس نے میرے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔

''ہاں'' میں نے دھیرے سے کہا اور اس نے پیار سے میرے گھٹنے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''مجھے بتاؤ...... میں بھی تمہاری ماں جیسی ہوں بہتر مشورہ دوں گی۔'' اس نے بڑے پیار سے کہا اور میں نے ایک ایک کر کے ساری باتیں اسے بتادیں جس کے بعد میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی' مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری ساری فکریں' دکھ' پریشانیاں آدھی بانٹ لی ہوں اور اس اپنائیت کے احساس سے میرا دل اور آنکھیں بھر آئیں اور میں رو پڑی وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر مجھے گلے سے لگالیا۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے...... تم نے پولیس کو اطلاع دی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں' میں خوفزدہ تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''تمہیں پولیس کو بتانا چاہیے...... گھبراؤ نہیں۔''

''اگر انہوں نے سوچا کہ میں چونکہ جیل میں تھی اور اب جو گھر میں حالات ہیں ان میں میرا کچھ ہاتھ ہے تو؟'' میں نے خوف سے کہا تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔

''میں قسم کھاتی ہوں مسز جوڈیتھ میں بے قصور ہوں...... اس معاملے میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔'' میں سانس لینے کے لیے ذرا رکی تھی۔

''مجھے تم پر یقین ہے۔'' مسز جوڈیتھ نے کہا وہ خاصی متاثر نظر آرہی تھیں۔

''کیا واقعی؟ تمہیں میرا یقین ہے؟'' میں نے بے یقینی سے پوچھا کیونکہ اس سے پہلے کبھی کسی نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کسی نے بھی مجھ پر یقین نہیں کیا تھا میرے وکیلوں تک نے میرا یقین نہیں کیا تھا اور میرا دفاع نہیں کیا تھا جج نے بھی مجھے صفائی کا موقع نہیں دیا تھا۔

''ہاں میں تم پر یقین کرتی ہوں تم قاتل نہیں ہو سمرانہ میں یہ بات جانتی ہوں اور دوسرے بھی جانتے ہیں تمہیں

صرف پھنسایا گیا اور بس۔'' جوڈ-تھ بول رہی تھی اور میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''پھنسایا گیا؟'' میں نے دہرایا یہ لفظ مجھے اچھا لگا تھا بہ نسبت اس کے کہ لوگ مجھے قاتلہ کہیں۔

''ہاں' کیونکہ وہ اس لڑکے پر تو کوئی الزام نہیں لگا سکتے تھے جو تمہیں جگہ جگہ لیے پھر رہا تھا چنانچہ انہوں نے تمہیں ہی مورد الزام ٹھہرایا...... یہ بہت شرم کی بات ہے اور میرے خیال میں تمہارا تعلق ایک شریف گھرانے سے ہے تمہاری فطرت میں کوئی غلط کام کرنا تھا ہی نہیں۔'' جوڈ-تھ بول رہی تھی اور میں اسے حیرت سے تک رہی تھی۔

مجھے یاد تھا میرے والدین ٹونی اسکاٹ کو پسند نہیں کرتے تھے وہ مجھ سے چار سال بڑا تھا' وہ میرا ہیرو تھا مجھے دنیا کی پروا نہیں تھی کہ وہ اس کے بارے میں کیا کہتی ہے' میں اس سے محبت کرتی تھی لوگوں کا خیال تھا کہ اس لڑکے کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا لیکن مجھے اس سے سروکار نہیں تھا کہ وہ کون ہے کس فیملی سے ہے' کس سے ملتا ہے کیا کرتا ہے' میں تو بس اس کے پیار میں دیوانی تھی پھر جب میری مام کو پتہ چلا تو انہوں نے مجھ پر پابندی لگادی اور میرا گھر سے نکلنا بند کردیا تب میں اسے خط لکھا کرتی تھی اور جس رات میری زندگی رک گئی یا یوں کہوں کہ میری زندگی کا رخ خراب حالات کی طرف مڑ گیا اس رات میں اندھیرا پھیلنے کے بعد چپکے سے گھر سے نکل گئی تھی اس سے ملنے کے لیے' اور میرے اس فیصلے نے میری آئندہ آنے والی زندگی کو برباد کردیا۔

سچائی یہ تھی کہ ٹونی اسکاٹ کو مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کی نظر میں میں صرف ایک احمق سی اسکول گرل تھی جو والہانہ اسے چاہتی تھی اور اس نے اس رات بھی مجھے نظر انداز کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور وہ مجھے گاؤں کے اس شیلٹر میں نہیں ملا تھا جہاں اس کے دوستوں نے اس کے موجود ہونے کی اطلاع مجھے دی تھی میں اسے اردگرد ایک گھنٹے تک ڈھونڈتی رہی تھی اور پھر میں نے اسے ایک کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا اور میں اس کے چہرے کے ان ناگوار تاثرات کو کبھی بھول نہیں سکتی جب اس نے میری آوازوں پر پلٹ کر مجھے دیکھا تھا اس کے چہرے پر نفرت تھی میں پیار میں اندھی ہورہی تھی اور بلا جھجک کار میں بیٹھ گئی تھی میں نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اس نے مجھے کار میں بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا میں بس اس کے برابر میں کسی ہالی وڈ فلم اسٹار کی طرح لپک کر بیٹھ گئی تھی اور یوں ظاہر کررہی تھی جیسے میں بہت بڑی اور سمجھدار ہوں میں بس یہ چاہتی تھی کہ وہ مجھے پیار کرے میں کتنی احمق تھی۔

مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میں جس کار میں بیٹھی تھی وہ چوری کی تھی اور صرف دس میل پر واقع ایک پیٹرول پمپ اسٹیشن پر ڈکیتی کی واردات میں استعمال کی گئی تھی پھر ہم گاؤں سے زیادہ آگے نہیں نکلے تھے کہ ہمیں نیلے رنگ کی گاڑیوں نے گھیر لیا تھا جن پر پولیس جیسی لائٹس لگی ہوئی تھیں مجھے موقع کی سنگینی کا احساس ہوا تو میں بچوں کی طرح رونے لگی تھی میں چاہتی تھی کہ ٹونی مجھ سے سیٹ بدل لے لیکن وہ نہیں مانا تھا کیونکہ گاڑی میں چلارہی تھی اور میں چاہتی تھی کہ جب پولیس کار روکے میں کار نہ چلارہی ہوں لیکن ایسا نہیں ہوا تھا اور میں زور زور سے رونے لگی تھی۔

''شٹ اپ احمق لڑکی؟ میں نے تمہیں اپنے ساتھ آنے کے لیے نہیں کہا تھا۔'' ٹونی نے غصے سے مجھ سے کہا اور پھر اس نے نفرت سے مجھے کئی گالیاں دیں جو میں آج تک نہیں بھولی ہوں' میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ مجھ سے اتنی حقارت سے اتنی گندی گفتگو کرسکتا ہے ہماری کار کے سامنے پولیس کی کاروں نے ہمارا راستہ روک لیا تھا اور ایک پولیس والا ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں پستول لیے ہوئے ہماری طرف بڑھا تھا لیکن ٹونی نے مجھے دھکا دے کر کار سنبھال لی تھی اور چلادی تھی اور سامنے کھڑے پولیس مین کو کچل دیا تھا مجھے یقین تھا وہ نہیں بچے گا مجھے یاد ہے میں بہت چیخی تھی میں نے ٹونی سے التجائیں کی تھیں کہ وہ خود کو پولیس کے حوالے کردے لیکن اس نے میری ایک نہ سنی تھی اور کار کو تیزی سے چلاتا ہوا وہاں سے لے گیا تھا کچھ آگے جاکر ہماری کار الٹ گئی تھی اور لڑھکتی ہوئی ایک درخت سے ٹکرا گئی تھی۔

ٹونی موقع پر ہی ہلاک ہوگیا تھا میں اس کی ٹوٹی ہوئی کھوپڑی کو آج تک نہیں بھلاسکی ہوں اور شاید میری موت تک یہ میرا پیچھا کرتی رہے گی' مجھے اس حادثے میں صرف

ایک کھروچ آئی تھی اور کورٹ نے میرے بچنے کو ایک معجزہ قرار دیا تھا میں کار سے نکل کر جنگل کی طرف بھاگ گئی تھی جہاں سے ایک راستہ مجھے میرے گھر کے دروازے تک لے آیا تھا اور میں چپکے سے گھر میں داخل ہو کر اپنے بیڈروم میں جا کر لیٹ گئی تھی' کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ میں کچھ دیر کے لیے باہر بھی گئی تھی' میرا خیال تھا کہ میں گھر پہنچ گئی ہوں اور محفوظ ہوں لیکن یہ میری غلطی تھی۔

کار ٹکرانے کے بعد میری طرف کا دروازہ سختی سے بند ہو گیا تھا میں ادھر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی چنانچہ مجھے ٹوٹی کی باڈی کے اوپر سے گزر کر دوسرے دروازے سے نکلنا پڑا تھا اور مجھے اسٹیئرنگ وہیل بھی پکڑنا پڑا تھا اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے اور انہیں اس پر میرے فنگر پرنٹس مل گئے تھے۔

''تو تمہارا کہنا ہے کہ تمہارے والدین لاپتہ ہیں؟'' میری تمام بات سننے کے بعد جوڈیتھ نے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں' میں نے تصدیق کی' جب میں جیل سے واپس آئی تو وہ وہاں نہیں تھے مجھے کچن کی ٹیبل پر یہ پیپر ملا تھا لیکن اس پر مجھے کچھ یقین نہیں ہے کیونکہ مجھے یاد نہیں کہ ہمارے کوئی رشتہ دار آسٹریلیا میں ہیں۔''

میں نے پیپر جوڈیتھ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا اور اس نے اشارے سے مجھے قریب میز پر رکھا ہوا میگنی فائن گلاس اٹھانے کے لیے کہا پھر اس نے بغور اس نوٹ کو پڑھا تھا اور وہ میگنی فائن گلاس کو بھی قریب اور کبھی دور کر کے ایک ایک لفظ کو دیکھ رہی تھی۔

''بڑی حیرت کی بات ہے۔'' کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

''حیرت کی بات؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں'' اس نے نوٹ کی پہلی لائن کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ لائن ملازمہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے میں اس لیے یہ بات کہہ رہی ہوں کیونکہ میں اس لکھائی کو پہچانتی ہوں' جب میں پوسٹ آفس میں ملازم تھی تو وہ میرے سامنے پوسٹل کارڈز پر سائن کیا کرتی تھی مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اسی کی لکھائی ہے۔'' جوڈیتھ نے کہا پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے بات جاری رکھی تھی۔

''لیکن مجھے تمہاری اس بات سے اختلاف ہے کہ آسٹریلیا میں تمہارے رشتہ دار نہیں ہیں میری معلومات کے مطابق تمہاری پھوپھی بہت عرصہ پہلے یہاں سے ہجرت کر کے آسٹریلیا چلی گئی تھیں اور پھر واپس نہیں آئیں لیکن وہ رابطے میں تھیں اور تمہاری والدہ ہر کرسمس پر ایک کارڈ آسٹریلیا ضرور بھیجتی تھیں۔

''واقعی؟'' میں نے حیرت سے کہا اور مجھے خیال آیا کہ میں وہ خط بھی جوڈیتھ کو دکھاؤں جو جیف پیرس نے مجھے نورڈنین اور راحیلم کے بارے میں لکھا ہے چنانچہ میں نے وہ خط بھی اس کی طرف بڑھا دیا اور وہ آہستہ آہستہ اسے بھی پڑھنے لگی کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور خط کو اپنی گود میں رکھ لیا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ کوئی ایسا مسئلہ ہے جسے اس نے خط میں لکھنا مناسب نہیں سمجھا ہے اس جوڑے کی کچھ باتیں مجھے بھی عجیب لگتی تھیں خاص طور سے جو عورت تھی وہ یوں لگتی تھی جیسے زندگی سے عاری ہو کبھی میں نے اسے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔'' جوڈیتھ نے کہا۔

''اور اس کے ساتھ جو مرد تھا وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بہت تیز دکھائی دیتا تھا' سخت چہرے والا جیسے کوئی ظالم شخص ہو۔''

''کیا مجھے مسٹر جیف کو فون کرنا چاہیے؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''ہاں ہاں...... بالکل...... تم اسے ابھی فون کرو...... تم میرا فون استعمال کر سکتی ہو۔'' جوڈیتھ نے کہا۔

❁......❁......❁

''تم نے جیف پیرس اور اس کی بیوی جین میں کوئی تبدیلی محسوس کی ہے؟'' نورڈنین نے راحیلم نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

کوئی چیز چار دن سے نورڈنین کو تنگ کر رہی تھی وہ تین راتوں سے سویا نہیں تھا وہ کافی کافی دیر اپنے بستر پر پڑا چھت کو گھورتا رہتا تھا وہ پریشان تھا اور راحیلم خوش تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہیں انہوں نے اس رات ہمیں جھگڑا کرتے سن تو نہیں لیا؟'' نورڈنین نے اس سے

پوچھا۔
''جھگڑا کرتے؟ تم نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور تم اسے جھگڑا کہتے ہو؟'' راحیلم نے کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی بس نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔
''نہیں؟ میرا خیال ہے نہیں۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''جب وہ دونوں سونے گئے تو بہت نشے میں تھے انہوں نے کچھ زیادہ ہی پی لی تھی۔''
''بکواس مت کرو تم جھوٹ بول رہی ہو اب جیف مجھ پر بہت آرڈر چلانے لگا ہے وہ پہلے کی طرح مجھ سے باتیں کر کے خوش نہیں ہوتا اور میرے ساتھ وقت نہیں گزارنا چاہتا۔'' نورڈنین نے کہا۔
''ہوسکتا ہے وہ موسم کی تبدیلی سے پریشان ہو اس کا اثر فصلوں پر اچھا نہیں پڑ رہا۔'' راحیلم نے کہا۔ ''لیکن میں نے تو کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی ہے۔'' اس نے بات بنائی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ یہ جھوٹ ہے کیونکہ اس نے بھی محسوس کیا تھا کہ جین کے اسے دیکھنے اس سے بات کرنے کا انداز بدل گیا تھا وہ ہر صبح اب اسے یوں دیکھتی تھی جیسے اس کے جسم پر نئے نیل کے نشان ڈھونڈ رہی ہو وہ جانتی تھی کہ اس کے اس جھوٹ کے باوجود کہ وہ سیڑھیوں سے گر گئی ہے جین نے یقین نہیں کیا تھا اور اس نے نورڈنین اور اس کی لڑائی کی آوازیں بھی سن لی ہوں گی نورڈنین نے اسے ہدایت کردی تھی کہ وہ بات چیت کرنے میں محتاط ہو جائے اس کے کسی لفظ سے مالکوں کو یہ اندازہ نہیں ہونا چاہیے کہ نورڈنین اسے مارتا ہے۔
جین کا رویہ راحیلم کے ساتھ بہت مہربان ہو گیا تھا جیسے اسے اندازہ ہو گیا ہو کہ راجیل کسی جہنم میں زندگی گزار رہی ہے وہ اس کے کاموں کی بہت تعریف کرنے لگی تھی۔
''تم نے بہت مزیدار سوپ بنایا ہے لو تم بھی چکھو۔'' جین نے اس کی طرف چمچ بڑھاتے ہوئے کہا وہ اس وقت اس کے ساتھ کچن ہی میں تھی اور کام میں اس کی مدد کروا رہی تھی۔
''ہاں واقعی یہ تو بہت مزیدار ہے۔'' راحیلم نے ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔
''میں جانتی ہوں اس نے تمہیں مارا ہے۔'' اچانک جین نے کہا اور وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔
''تم جانتی ہو...... ہم تمہاری مدد کرسکتے ہیں۔'' جین نے سرگوشی کی اور راحیلم کے ہاتھ کانپنے لگے اس کی نظریں فرش پر جم گئیں۔
''تمہیں ضرورت نہیں ہے کہ تم اس ظلم کو برداشت کرتی رہو۔'' جین نے کہا اور اسی وقت جیف کچن میں داخل ہوا۔ راحیلم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا لیکن جیف کو دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔
''بہت سردی ہے ایک کپ چائے بنا دو راحیلم۔'' جیف نے کہا۔
''نہیں' راحیلم۔'' جین نے مداخلت کی جیف نے اسے حیرت سے دیکھا اور اسی وقت جیف کے موبائل کی بیل بجی اور جیف موبائل پر کال ریسیور کرنے کے لیے کچن سے نکل گیا۔
''ہیلو کیا آپ مسٹر پیرس ہیں؟'' دوسری طرف سے نسوانی آواز سنائی دی جو کسی جوان عورت کی تھی۔ جبکہ جیف کو امید تھی کہ اس کی بات کسی بوڑھی عورت سے ہوگی۔
''ہاں' میں بات کر رہا ہوں۔'' جیف نے کہا۔
''میں سمرانہ جیکب بول رہی ہوں' آپ نے میری والدہ کو خط لکھا تھا ان کے پچھلے ملازم کے سلسلے میں۔''
''اوہ جی ہاں...... کال کرنے کا شکریہ۔'' جیف نے کہا۔
''آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ میری والدہ نے انہیں کوئی تصدیق نامہ دیا تھا؟'' سمرانہ نے کہا۔
''ہاں' یہ درست ہے' انہوں نے اس جوڑے کی بڑی تعریف لکھی تھی چنانچہ ہم نے انہیں فوراً ملازم رکھ لیا۔''
''تو اب کیا پرابلم ہے؟''
''ہمیں ان پر کچھ شک ہے' کیا آپ ان دونوں سے واقف ہیں میرا مطلب ہے نورڈنین اور راحیلم سے۔''
''نہیں' بالکل نہیں۔ اگر آپ سچ پوچھیں تو میں کافی عرصے سے یہاں نہیں تھی اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے والدین نے کوئی ملازم رکھے تھے مجھے ان کے بارے میں ابھی پتہ چلا ہے۔''
''اوہ...... اچھا...... کیا آپ کی والدہ نے آپ کو بتایا تھا

کہ وہ کیسے تھے؟''

''مسٹر پیرس میرے والد اور والدہ لاپتہ ہیں اور ہمسائیوں کے کہنے کے مطابق میری والدہ گھر سے نہیں نکلتی تھیں، انہیں برسوں سے کسی نے نہیں دیکھا میرے والد بھی لاپتہ ہیں۔''

''کیا؟'' جیف نے حیرت سے کہا اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

''آپ کا خط ملا تو میں بہت خوش ہوئی کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ ان ملازمین کا میرے والدین کے معاملے سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے میرے والدین کے گھر میں کچھ نہ کچھ ناگوار واقعہ ضرور ہوا ہے۔''

''آپ کی مراد ناگوار واقعے سے کیا ہے؟'' جیف نے تجسس سے پوچھا۔

''سارے گھر میں ریت کی ایک ہلکی سی تہہ تھی سوائے میرے کمرے کے جہاں شاید سالوں سے صفائی نہیں ہوئی، جبکہ میرے والدین میرے کمرے کو سالوں بغیر صفائی اور دیکھ بھال کے نہیں چھوڑ سکتے تھے وہ یہ کیسے کر سکتے تھے کہ سارا گھر صاف کروائیں اور صرف میرا کمرہ چھوڑ دیں؟ اور ہمارے باغ جو ہمارے والد کی توجہ کا مرکز تھے جن کی سجاوٹ پر انہیں انعامات ملتے تھے وہ کھنڈر اور بیابان میں بدل جائیں؟''

''کیا آپ نے پولیس کو اطلاع دی؟'' جیف نے پوچھا اس کی آواز میں خوف نمایاں تھا۔

''ابھی تک تو نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''دراصل میں چاہتی تھی کہ پہلے نورڈنین اور راجیلم سے مل لوں شاید وہ میرے والدین کے معاملے پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔''

''کیا کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں؟'' جیف نے پوچھا۔

''مجھے کچن کی ٹیبل پر ایک خط ملا تھا جس میں لکھا تھا کہ میری ایک رشتہ دار جو آسٹریلیا میں رہتی تھیں اچانک ان کا انتقال ہو گیا ہے اور میرے والدین کو اچانک ان کی تدفین کے انتظامات کے لیے جانا پڑا ہے۔''

''اوہ یعنی یہی ایک اطلاع ملی ہے تمہیں؟''

''ہاں، اور پتہ نہیں یہ بھی درست ہے یا نہیں، کیونکہ یہ خط جو بظاہر میری والدہ کی طرف سے لکھا گیا ہے اس خط کو انہوں نے نہیں بلکہ راجیلم نے لکھا ہے۔ میں نے یہ خط اپنے علاقے کی پچھلی پوسٹ ماسٹر کو دکھایا تھا انہوں نے اس کی لکھائی پہچان لی ہے مجھے بھی وہ لکھائی اپنی والدہ کی نہیں لگ رہی تھی۔''

''اب آپ کیا کریں گی مس جیکب؟'' جیف نے پوچھا اور نورڈنین کا خیال آتے ہی اس کو خوف محسوس ہونے لگا جو شخص اپنی بیوی کو اس بے دردی سے مارتا ہو وہ کتنا ظالم ہو سکتا ہے اور پھر اب اسے جو باتیں پتہ چلی تھیں انہوں نے تو اسے حیران کر دیا تھا۔

''میں کوشش کروں گی کہ جلد از جلد آپ سے مل لوں میں اس ملازم جوڑے کو دیکھنا چاہتی ہوں اور ان سے کچھ سوالات بھی پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''آپ کے خیال میں آپ کو یہاں پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟'' جیف نے فکرمندی سے پوچھا اس کی آواز میں خوف نمایاں تھا اور اس نے بہت دھیمی آواز سے یہ بات کہی تھی کہ کہیں قریب موجود راجیلم یا نورڈنین اس کی بات نہ سن لیں۔

''میں اب ان لوگوں کو اپنے گھر میں بھی نہیں دیکھنا چاہتا جتنی جلدی ممکن ہو ان سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔'' جیف نے کہا۔

''میں کل آؤں...... کل ضرور آ جاؤں گی۔'' سمرانہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔

''سب خیریت ہے ڈارلنگ تمہارا چہرہ دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے جیسے تم نے کوئی بد روح دیکھ لی ہو۔'' جین نے کمرے میں آتے ہوئے کہا جو کچن سے سیدھی ادھر ہی آ گئی تھی۔

''اوہ...... جین بینک میں ہماری بھاری رقم...... وہ ہمیں ٹھکانے لگا کر ہماری رقم پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔'' جیف نے کہا معاملہ کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

''ہمیں ابھی باہر جانا ہے...... ابھی اسی وقت۔'' جیف نے جین سے کہا اور وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''اس وقت لیکن کہاں؟ اور کیوں؟'' جین نے پوچھا۔

''بس جلدی کرو اپنا کوٹ لو اور یہاں سے نکلو......

فوراً" جیف نے دھیمی آواز میں کہا۔
پھر وہ دونوں بڑی عجلت میں گھر سے چلے گئے تھے جاتے جاتے جین نے راحیلم کو گھر کے کام کے سلسلے میں کچھ ہدایات دی تھیں اور جب وہ جیف کے ساتھ کار میں بیٹھ رہی تھی تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی اہم بات ہے جو جیف اس سے گھر کے باہر جا کر کرنا چاہتا ہے۔
"میرے خیال میں میں ٹھیک سوچ رہی ہوں...... ہے نا؟" جین نے جیف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں تم ٹھیک سوچ رہی ہو۔" جیف نے سنجیدگی سے کہا اور کار آگے بڑھا دی۔
"جیف پلیز بتاؤ کیا بات ہے؟" کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد آخر کار جین چپ نہ رہ سکی۔ "میرا خیال ہے کہ تم سے فون پر مسز جیکب کی بات ہوئی ہے۔" اس نے کہا وہ سوچ رہی تھی کہ ایسی کیا بات ہے جو جیف اس سے گھر میں نہیں کہنا چاہتا تھا۔
"میں بتا دوں گا۔" جیف نے کہا۔
"اب تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔" جین نے کہا اور جیف نے کار آہستہ کر کے سڑک کے سائڈ میں کھڑی کر دی۔
"کیا بات ہے؟" جین نے پوچھا۔
"مجھ سے فون پر جس کی بات ہوئی وہ مسز جیکب نہیں بلکہ ان کی بیٹی تھی۔"
"کیا؟"
"ہاں مسٹر اور مسز جیکب لاپتہ ہیں اور اب سے نہیں بلکہ بہت سالوں سے لاپتہ ہیں۔" جیف نے کہا۔
"بہت سالوں سے؟ تمہارا کیا مطلب ہے؟" جین نے پوچھا اس کی آواز کانپ رہی تھی۔
"مسز جیکب کی بیٹی کا کہنا ہے کہ گھر برسوں سے ویران پڑا ہے۔"
"اور ہمسائے؟ ان کا کیا کہنا ہے...... کیا وہ اس بارے میں کچھ جانتے ہیں؟" جین نے پوچھا۔
"وہاں زیادہ لوگ نہیں رہتے لیکن جو ہیں ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے مسز جیکب کو برسوں سے نہیں دیکھا۔"

"اس کی کوئی معقول وجہ؟"
"گھر میں ان کی بیٹی کے لیے ایک نوٹ موجود تھا جس میں لکھا تھا کہ انہیں اچانک کسی رشتہ دار کی موت پر آسٹریلیا جانا پڑا ہے جبکہ وہ خط مسز جیکب کی نہیں بلکہ راحیلم کی ہینڈ رائٹنگ میں ہے۔" جیف نے کہا اور جین نے اپنے دونوں ہاتھ حیرت سے اپنے منہ پر رکھ لیے وہ غیر یقینی انداز سے جیف کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"کل ان کی بیٹی ہمارے گھر آ رہی ہے اور اس کے بعد میں اس جوڑے کو یہاں سے نکال دوں گا۔"
"اوہ مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔" جین نے فکرمندی سے کہا۔
"آج رات...... ان کی ہمارے ساتھ آخری رات ہوگی...... میں انہیں مزید ایک دن بھی اپنے ساتھ نہیں رکھوں گا۔"
"تمہارا کیا خیال ہے کیا ہمیں پولیس کو اطلاع دینا چاہیے؟"
"ہم ان سے کیا کہیں گے؟ کہ شک کی بنا پر مسز جیکب کی بیٹی ان سے ملنے آ رہی ہے؟ اور اگر وہ کچھ ثابت نہیں کر سکی؟" جین نے کہا۔
"اوہ جیف...... آج رات گھر مت جاؤ ہم آج رات کسی ہوٹل میں بھی گزار سکتے ہیں۔" جین نے کہا۔
"کیا؟ ان دو مجرموں کو اپنے گھر میں تنہا چھوڑ دیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ہمیں کل تک کا دن گزارنا ہوگا اور کوشش کرنا ہوگی کہ ہمارے رویے سے انہیں کوئی شک نہ ہو۔" جیف نے اسے سمجھایا۔

❀......❀......❀

"اس نے کیا کہا؟" میرے فون رکھتے ہی جوڈیتھ نے پوچھا۔
"وہ خوفزدہ تھا اور میرا خیال ہے کہ وہ ان لوگوں کو کل تک اپنے گھر میں برداشت کرے گا۔"
"کل تک...... کل کیا ہوگا؟" جوڈیتھ نے پوچھا۔
"میں وہاں جا رہی ہوں اور نورڈنین اور راحیلم سے خود ملوں گی بس یہی ایک راستہ ہے جس سے میں یہ جان سکوں کہ میرے والدین کہاں ہیں اس سے پہلے میں کوئی

فیصلہ نہیں کرسکتی اگر میرے سوالات کے تسلی بخش جوابات نہیں ملے تو پھر میں پولیس سے مدد لوں گی۔''

''میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں...... تم آج رات میرے پاس ہی رک جاؤ...... میں نہیں چاہتی کہ تم مزید اس گھر میں اکیلی بور ہوتی رہو۔'' جوڈیتھ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''شاید تمہارے پاس وہاں کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں ہوگا؟''

''ہاں میرے پاس کچھ نہیں ہے' فرج خالی ہوگیا ہے اور دودھ کا آخری پیکٹ میں نے صبح پی لیا تھا۔''

''اور...... تو پھر تم جیف سے ملنے اس کے گھر کیسے جاؤ گی تمہارے پاس تو پیسے بھی نہیں ہوں گے؟''

''نہیں' میرے پاس پیسے بھی نہیں ہیں۔'' میں نے کہا اور تبھی مجھے اس ٹیکسی ڈرائیور کا خیال آیا جو جیل سے مجھے میرے گھر تک لایا تھا اور اپنا کارڈ دے گیا تھا میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے وہ کارڈ نکالا۔

''میرے پاس یہ کارڈ ہے جو مجھے اس ٹیکسی ڈرائیور نے دیا تھا جو مجھے جیل سے لایا تھا۔''

''تو جلدی سے اسے فون کرو۔'' جوڈیتھ نے کہا۔ ''اور پیسوں کی بھی پروا مت کرنا...... ہمیں مل کر تمہارے والدین کا پتہ لگانا ہے میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

❁......❁......❁
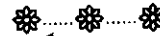
نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور میرے بلانے پر آجائے گا اور جب میں نے اسے فون کیا تو وہ فوراً راضی ہوگیا اور دوسرے روز صبح ٹھیک آٹھ بجے مسز جوڈیتھ کے گھر پہنچ گیا وہ رات میں نے مسز جوڈیتھ کے ساتھ ہی گزاری تھی انہوں نے مجھے بہت حوصلہ دیا تھا وہ رات کو کافی دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی تھیں اور مجھے سمجھاتی رہی تھیں ان کی باتوں سے مجھ میں بہت ہمت آگئی تھی اور جب ٹیکسی ان کے دروازے پر آکر رکی تو میں جانے کے لیے بالکل تیار تھی مجھے کوئی ڈر خوف نہیں تھا بلکہ میں اپنے آنے والے مستقبل سے پرامید تھی اور ان حالات سے نمٹنے کے لیے مجھ میں ایک نیا عزم پیدا ہوگیا تھا۔

میں جیسے ہی جوڈیتھ کے گھر سے باہر آئی وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیا اس کے چہرے سے عجیب سی خوشی جھلک رہی تھی جیسے کوئی اپنے کسی بچھڑے سے مل کر خوش ہوتا ہے۔

''ہم دوبارہ مل گئے۔'' اس نے ہنستے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا۔

''کیسے ہو جارج؟'' میں نے پہلی بار اس کا نام لے کر اسے مخاطب کیا جو میں نے اس کے کارڈ سے جانا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور میرے ٹیکسی میں بیٹھنے کے لیے دروازہ کھول دیا۔

''لگتا ہے کسی کے پیچھے جا رہی ہو؟'' اس نے انکوائری کرنے والے انداز میں پوچھا۔ ''کیا کوئی مشن درپیش ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''دراصل میں وہاں پہنچنے سے پہلے تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ہمیں پولیس کو بھی اطلاع دینا پڑے۔'' میں نے کہا تو وہ چونکا۔

''پولیس؟ اس کا مطلب ہے معاملہ سنگین ہے؟'' اس نے فکرمندی سے کہا۔

''ہاں' دراصل بات یہ ہے کہ......'' میں نے آہستہ آہستہ مختصر کرکے اسے ساری بات بتانا شروع کردی اور جب ہماری ٹیکسی جیف کے علاقے کی حدود میں داخل ہوئی تب تک میں اسے ساری صورت حال سمجھا چکی تھی۔

''تو اب تک تم اس گھر میں اکیلی ہی رہ رہی تھیں؟'' جارج نے پوچھا۔

''ہاں لیکن پہلے تو میں خود ہی پریشان تھی میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ بات تو مجھے کل ان خاتون نے بتائی جن کے گھر میں ٹھہری ہوئی تھی کہ میری والدہ اتنی بیمار تھیں کہ وہ خط نہیں لکھ سکتی تھیں اور جو خط میں نے انہیں دکھایا وہ جس نے لکھا تھا ہم اس سے ہی ملنے جا رہے ہیں۔'' میں نے کہا تو جارج اثبات میں سر ہلانے لگا۔

❁......❁......❁

جیف اور جین نے اپنے گھر کے ماحول کو مکمل طور پر نارمل رکھا تھا انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے نورڈنین اور راحیلم کو کسی قسم کا شک ہوا انہوں نے معمول کے مطابق ناشتہ کیا تھا اور اس وقت بھی ناشتے کی میز پر ان

دنوں کے سامنے بیٹھے تھے کہ اچانک کچن کے دروازے پر دستک ہوئی جو گھر کے پچھلی جانب کھلتا تھا۔

"اس وقت کون ہوسکتا ہے؟" جین نے حیرت سے کہا (جبکہ وہ جانتی تھی کہ یہ مسز جیکب کی بیٹی ہوسکتی ہے اس کے بارے میں جیف اسے بتاچکا تھا لیکن وہ اپنے ملازمین پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی)

"ابھی تو صبح کے نو بجے ہیں بھلا کون آسکتا ہے۔" جیف نے بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اتنی دیر میں دروازے پر دوبارہ تیز دستک ہوئی تھی اور جیف کو لگا جیسے دروازے پر ایک سے زیادہ افراد ہیں اس نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

"مسٹر پیرس؟ ہم اس علاقے کے پولیس اسٹیشن سے آئے ہیں ہمیں نورڈنین اور راجیلم نامی جوڑے کی تلاش ہے کیا وہ یہاں ہیں؟" ایک کرخت مردانہ آواز میں کہا گیا اور اس کے ساتھ ہی چار پولیس یونیفارم پہنے افراد اندر داخل ہوگئے جن کے ساتھ دو افراد سادہ کپڑوں میں تھے۔

"ہاں...... وہ یہ دونوں ہیں۔" جین نے جلدی سے اپنے سامنے بیٹھے نورڈنین اور راجیلم کی طرف اشارہ کیا اور پھر اس سے پہلے کہ نورڈنین بھاگنے کی کوشش کرتا' ایک پولیس آفیسر نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنادی تھی۔

"اور تم...... محترمہ...... تم ہمارے ساتھ چلوگی۔" دوسرے پولیس آفیسر نے راجیلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کیا ہے؟" جیف نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"ہمیں ایک منٹ دیں ہم آپ کو ابھی سب سمجھاتے ہیں۔" ایک سادہ کپڑوں میں ملبوس شخص نے کہا اور پھر وہ نورڈنین کو اس کے خلاف لگائے جانے والے الزامات پڑھ کر سنانے لگا تھا یہ سب اتنی جلدی ہوا تھا کہ جیف اور جین کچھ سمجھ نہیں پائے تھے انہیں یہ بھی پتہ نہیں چلا تھا کہ ملازم جوڑے کو کس الزام میں پکڑا گیا تھا۔

"اوہ جیف۔" جین نے خود کو جیف کے کاندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"آپ کو زحمت ہوئی اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔" ایک پولیس آفیسر نے کہا۔

"زحمت کی کوئی بات نہیں۔" "آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ ہم کتنے خوش ہیں۔" جیف نے کہا۔ "آپ کے آنے سے ہمارا کتنا حوصلہ بڑھا ہے۔"

"اپنے بارے میں ایسے تعریفی جملے عام طور پر ہمیں سننے کو نہیں ملتے ہیں۔" پولیس آفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا ہم بیٹھ کر کچھ بات کرسکتے ہیں؟ میں آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔" اس افسر نے کہا پھر اس نے زیادہ سوالات نہیں کیے تھے بس یہ پوچھا تھا کہ جیف سے اس ملازم جوڑے کی ملاقات کیسے ہوئی تھی اور وہ کتنے عرصے سے وہاں ملازمت کررہے تھے جیف نے ان کے تمام سوالات کے جوابات دے دیئے تھے' لیکن وہ بھی ان سے ایک سوال پوچھنا چاہتا تھا۔

"کیا اس معاملے سے مسز جیکب کے معاملے کا کوئی تعلق ہے؟" آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"مسز جیکب؟" آفیسر نے حیرت سے دہرایا۔ "کیا تم ان لوگوں کو جانتے ہو؟"

"نہیں' دراصل ان کی بیٹی سمرانہ جیکب ہم سے ملنے آرہی ہے وہ جاننا چاہتی ہے کہ اس کے والدین کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔" جیف نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"وہ سمجھتی ہے کہ اس کے والدین کے معاملے سے نورڈنین اور راجیلم کا کوئی تعلق ہے۔"

"اچھا' آج صبح جب ہم نے اسے فون کیا تو اسی لیے شاید اس سے بات نہیں ہوسکی ہوگی' ہاں ہم نے ان دونوں کو اسی لیے گرفتار کیا ہے۔"

"کیا وہ مرچکے ہیں؟" جیف نے پوچھا۔ "دراصل مجھے افسوس ہے مگر میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"وہ مرتے مرتے بچے ہیں اس وقت وہ ٹھیک ہیں۔" آفیسر نے جواب دیا اور اسی وقت ایک پولیس آفیسر نے اندر آکر اسے مخاطب کیا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبداللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

''جناب کوئی مس سمرانہ جیکب آئی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ وہ یہاں یہ پتہ کرنے آئی ہیں کہ ان کے والدین کہاں ہیں؟''

''انہیں اندر بھیج دو۔'' آفیسر نے کہا اور دوسرے ہی لمحے سمرانہ اندر داخل ہوئی۔

''وہ خیریت سے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں وہ خیریت سے ہیں۔'' آفیسر نے کہا۔

''وہ کہاں ہیں؟''

''وہ ابھی ابھی آسٹریلیا کے ایک اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے کمرے سے دوسرے کمرے میں منتقل ہوئے ہیں' انہیں چند ہفتے پہلے ایک فلائیٹ میں حالت بگڑ جانے پر اسپتال میں داخل کیا گیا تھا اور ان کے علاج کے دوران پتہ چلا کہ انہیں کافی عرصے تک غذا میں زہر دیا جاتا رہا تھا جس سے ان کی حالت خراب ہوگئی تھی اور وہ موت کے منہ میں پہنچ گئے تھے ڈاکٹر حیران تھے کہ وہ ہوائی سفر بھی کیسے کرنے کے قابل تھے؟''

''اوہ کیا وہ ٹھیک ہوجائیں گے؟'' سمرانہ نے پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہیں لیکن انہیں گھر آنے میں ایک یا دو ہفتے لگ سکتے ہیں لیکن تمہیں جلد از جلد وہاں لے جانے کے لیے ضروری کارروائی ہورہی ہے۔''

''واقعی؟ میں اپنے والدین سے پچھلے بیس سال سے نہیں ملی ہوں۔'' سمرانہ نے کہا۔

''ہم جانتے ہیں' تمہاری والدہ سے ہماری بات ہوچکی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے تمہارے ہر خط کا جواب دیا تھا لیکن پھر انہیں شک ہوا کہ راجیلم ان کے خطوط تمہیں پوسٹ نہیں کرتی ہے کیونکہ تم انہیں جو خط لکھتی تھیں ان میں ان باتوں کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا جو تمہاری والدہ تمہیں لکھتی تھیں۔
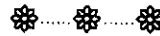
میں اس وقت ایئرپورٹ پر کھڑی ہوں اور اپنی فلائٹ کے آنے کا انتظار کررہی ہوں تاکہ دنیا کے دوسرے حصے میں جاسکوں جہاں میرے والدین ہیں کیسا سفر ہے جو میں بیس سال سے کررہی ہوں' اور بیس سال سے اپنے والدین سے جدا ہوں...... میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ نورڈنین اور راجیلم نے میرے والدین کو مارنے کے لیے کیوں منتخب کیا شاید اس لیے کہ وہ دونوں اکیلے تھے کوئی ان کی حفاظت کرنے والا نہیں تھا ان کے پاس بہت دولت تھی اور وہ بوڑھے ہوگئے تھے کہ اپنا دفاع بھی نہیں کرسکتے تھے اور پھر میرے والدین کے بعد ان کی نظریں جیف اور جین پر تھیں وہ بھی میرے والدین کی طرح دولت مند' تنہا بوڑھے اور کمزور تھے انہیں بھی مار کر ان کی دولت لوٹی جاسکتی تھی وہ بھی میرے والدین کی طرح خطرے میں تھے اور جو سب سے حیران کن بات نورڈنین اور راجیلم کے بارے میں پتہ چلی وہ یہ تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی نہیں بلکہ بہن بھائی تھے اور امیر لوگوں کے ہاں میاں بیوی ظاہر کرکے ملازمت کرتے تھے' انہوں نے اپنے والدین کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور پندرہ' سولہ سال کی عمر میں گھر سے فرار ہوگئے تھے اور تب سے ہی لوگوں کی ملازمت کرکے دولت جمع کرنا ان کا پیشہ بن گیا تھا۔

میری زندگی میں چیزیں بڑی تیزی سے تبدیل ہوئی تھیں۔ میرے والدین کی صحت تیزی سے ٹھیک ہوئی ہے اور آج اسپتال سے ان کی چھٹی بھی ہونے والی ہے۔ ہمیں تقریباً ایک ماہ آسٹریلیا میں ایک ساتھ گزارنا ہوگا اور پھر میں واپس اپنے گھر اپنے والدین کے ساتھ آؤں گی اور آپ کو ایک اور خوشی کی بات بتاؤں؟ اب جارج یہاں میرا منتظر ہوگا وہ میری زندگی میں میرے جیون ساتھی کے طور پر آنے کا فیصلہ کرچکا ہے' اور میں نے بھی رضامندی ظاہر کردی ہے وہ اس وقت بھی مجھے رخصت کرنے میرے ساتھ آیا ہے اور ایئرپورٹ پر موجود ہے میرا خیال ہے میں نے اسے اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کرکے غلطی نہیں کی ہے۔